PDFBOOKSFREE.PK
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

چینی نکتہ چینی
[illegible]

قارئین کی [illegible] پر [illegible]
[illegible]

18
جگر خراش
اثر نعمانی

محبت، دولت اور انتقام کے شعلوں میں
گھرے [illegible] کا حسرت ناک

دریچۂ عشق
مختار آزاد

محبت کی تلاش میں سرگرداں نوجوان
کی مدہوشی [illegible]

چھلانگ
بابر نعیم

ایک چالاک اور مکار مجرم کی
خونریزی کی تحیر انگیز روداد

چال باز
[illegible]

ایک [illegible] جو اپنے
[illegible] نکالنا چاہتا تھا

معجزہ
[illegible]

[illegible] کو سنبھلنے اور کمانے کی کوشش
میں مصروف [illegible] دلچسپ گھڑیاں

گرداب
[illegible] قادری

تقدیر [illegible] کی قسمت [illegible]
[illegible]

آدم خور
محمد [illegible]

شکار کی تلاش میں ایک [illegible]
سوار [illegible] کا احوال

شر گزیدہ
ثنا منظر

اس مصیبت زدہ خاندان کی
کتھا جس نے عارضی فتح پائی تھی

للکار
[illegible]
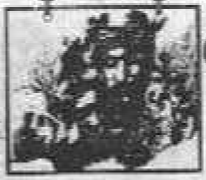
محبت کے محاذ پر لڑنے والے شخص کی جدوجہد
اسے اپنے تحفظ کی جنگ کا سامنا تھا

جادوگر
جمال [illegible]

توہم پرستی اور مافوق الفطرت واقعات
کے گرد گھومتی ایک سحر انگیز کہانی

اشارہ
[illegible]

[illegible]
[illegible]

جنگ بندی
سلمیٰ انور

فیصلے کی ان ساعتوں کا کمال
جس نے بازی کو پلٹ دیا تھا

بحر تلاطم
منظر امام

سمندر کی موجوں سے کھیلنے [illegible]
[illegible] کشتی کا [illegible] احوال

51
[illegible] کی لذت
کاشف زبیر

[illegible] شکنجے میں
جکڑی دوشیزہ کی زندگی کے [illegible]

تراش خراش
ادارہ قارئین
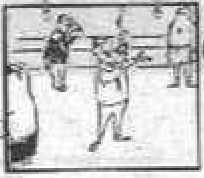
اقتباسات [illegible]
[illegible]

جلد 40 • شمارہ 07 • جولائی 2011 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021)35895313 فیکس (021)3502551
E-mail jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مدیر اعلیٰ

عزیزانِ من.... السلام علیکم!

جولائی 2011ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔ گرمی.... لوڈشیڈنگ کا عذاب.... بجٹ کی مار اور روزانہ کی بنیاد پر بڑھتی ہوئی مہنگائی.... ان سب نے مل کر پہلے ہی عام آدمی کا جینا دوبھر کر رکھا ہے کہ اب تو اخبار کے ساتھ خبریں مل رہی ہیں کہ گزشتہ برس آبِ رواں کا سیلابِ بلا جن مصائب و آلام سے لاکھوں لوگوں کو نبرد آزما کر گیا تھا، وہی ایک بار پھر قہر بن کر ٹوٹ سکتا ہے.... پچھلے برس کے موسم گرما میں سیلاب نے جو تباہ کاریاں پھیلائی تھیں، اسے سوچ کر اب بھی جسم و جاں لرز اٹھتے ہیں۔

ماہرین ماحولیات کہتے ہیں کہ عالمی موسمیاتی تغیرات کے باعث پاکستان کو جن تبدیلیوں کا سامنا ہے، ان میں سرفہرست تو اچھے سیلاب اور پھر اس کے بعد قحط کے کئی بھیانک سال شامل ہیں۔ ارضِ پاک ان چند ممالک میں سے ایک ہے، جن پر حجم کے اعتبار سے دنیا کے چند بڑے بڑے گلیشیر پائے جاتے ہیں۔ زمین کا درجہ حرارت بڑھنے کے باعث سب سے پہلے گلیشیرز ہی پگھلتے ہیں۔ جو تباہ کن سیلاب کا سبب بنتے ہیں۔ پچھلے سال ہونے والی تباہ کاری کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم بحالی کے کاموں میں ممکنہ ماحولیاتی خطرات کو سامنے رکھتے ہوئے اقدامات کرتے لیکن نظر یہی آ رہا ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ نہ تو حفاظتی اقدام ہوئے.... نہ ہی آبی ذخائر کی تعمیر کی طرف کوئی توجہ دی گئی۔ پاکستان پہلے ہی پانی کی قلت سے دوچار ہے لیکن سیلابی پانی کو مستقل کے لیے ذخیرہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جا رہی۔ چند برس تک یوں ہی سیلاب آتے اور سمندر بُرد ہوتے رہے تو جو صورت حال رونما ہوگی، اس کے بارے میں سوچ کر ہی پورا وجود کانپ اٹھتا ہے۔ آنے والے برسوں میں زراعت کا کیا بنے گا؟ تن ڈھانپنے کے لیے کپاس اور پیٹ بھرنے کے لیے چاول اور گندم سوکھی زمینوں میں کیسے اگائے جاسکیں گے؟ آپس کی دشنام طرازیوں میں سے اس کام کے لیے وقت نکالنا ہمارے لیڈروں کا اولین فرض بن چکا ہے۔

اب بھی وقت ہے.... ماحولیاتی خطرات کو سمجھیں۔ طویل المدت تناظر میں اقدامات کریں۔ روزانہ کی بنیاد پر عارضی اقدامات کی عادت نہ بدلی تو پھر مستقبل کسی کا محفوظ نہیں ہوگا۔ بارگاہِ الٰہی میں دعا گو ہیں کہ خدا ہم وطنوں کو ہر آفت سے محفوظ رکھے۔

اس کے ساتھ ہی رخصت چاہتے ہیں۔ آپ کی بزم کا رخ کرتے ہیں کہ کیا کہتے ہیں آپ لوگ گزشتہ شمارے کے بارے میں....

محمد اسماعیل اعجاز گری کی وضاحت بڑی کہانی سے "سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ کہ آپ نے خط شائع کر کے حوصلہ افزائی فرمائی لیکن آپ نے میرا نام تھوڑا سا غلط کر دیا۔ محمد اسماعیل اعجاز گری کے بجائے محمد اسماعیل ساگر لکھ دیا۔ ساگر نہیں ہوں جناب۔ (ہماری تمام قارئین سے درخواست ہوتی ہے.... وہ کم از کم اپنا نام تو صاف اور واضح لکھا کریں.... غلطیاں اسی لیے ہوتی ہیں.... ہم معذرت خواہ ہیں آپ سے) 21 جون کو شمارہ ملا۔ سرورق اس دفعہ بھی [illegible] سب سے پہلے بڑھے مجمل [illegible] کی طرف۔ سب سے پہلے سرورق [illegible] کہانی ہے.... اپنے اندر کئی سبق لیے ہوئے تھی۔ برے حالات میں سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں مگر کوئی ہوتا ہے جو مشکل سے مشکل ترین حالات میں انسان کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہوتا ہے۔ جذبہ صادق اور نیت صاف ہو تو منزل ضرور ملتی ہے۔ کڑی مسافتیں رنگ لاتی ہیں قصہ مختصر یہ رنگ ہماری پسند کا تھا۔ وہ گزر میں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی پہلے تو سوچا کہ حسب معمول پھیکا سا رنگ ہوگا۔ سرورق کے رنگ بھی اسی انداز کے ہوتے تھے۔ بھٹی صاحب رنگوں کے حوالے سے اس بار بھی دفعہ قلم نشانی کر رہے ہیں۔ جیسے ہی شروع کیا تو پتا چلا جب اینڈ ہو گیا۔ بہت خوب صورت انتخاب۔ سندھ کی سرزمین جو کہ کافی زرخیز رہی ہے مگر ان وڈیروں اور انسانیت سوز رسموں نے سندھ کا حسن گہنا دیا ہے۔ ظلم و بربریت کی یہ داستان بہت گہری ہیں۔ فروری 2005ء میں ایک کورس کے سلسلے میں اندرون سندھ کے گاؤں میں جانا ہوا۔ وہ دن آج بھی یاد ہیں۔ بے چارگی، غربت، وڈیروں کے خوف میں کٹتے دن، کیسی زندگی تھی ان کی۔ انسپکٹر ولی جائز طریقے سے بڑا کام کر گیا۔ انسپکٹر ولی بہت اچھا کردار تھا۔ اگر بہت بار دیتا تو وڈیرے کے کرتوت سے کیسے پردہ اٹھتا۔ کہانی کا اینڈ کافی دردناک تھا۔ مرشد [illegible] یہاں اس موضوع پر ایک دھواں دار قسم کا رنگ ہو تو مزہ آ جائے۔ افریقہ کے جنگل، قبائلی وچ ڈاکٹروں کے موضوع پر منظر امام صاحب سے سرورق کا رنگ ضرور لکھوایا جائے۔ خیر یہ بھی اچھی کہانی رہی۔ کاشف زبیر اس دفعہ بڑے عرصے کے بعد جلیل میاں کے ساتھ جلوہ گر ہوئے۔ جوابی کارروائی میں جلیل میاں نے اس دفعہ خوب ہاتھ دکھایا۔ ڈش رول کچھ خاص نہ لگی۔ [illegible] اگر روزنامہ اخبار کا مطالعہ کرتی تو اس کی کوششیں رنگ لاتیں۔ خیر مختصر مگر دلچسپ کہانی تھی یہ۔ انجام مجھے بہت پسند آیا۔ نوکر تک کو اپنی فرماں برداری اور ساتھ نبھانے کا خوب صلہ ملا۔ آخر کیوں نہ ملتا جب مالک کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا تو تب بھی نمک نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ مخلص وہی ہوتا ہے جو نہایت کڑے حالات میں انسان کا ساتھ دے۔ مشکل حالات میں کسی کا ساتھ دینے والا بھی تو دامن نہیں رہتا۔ [illegible] بھی خاصی دلچسپ تحریر رہی۔ عامیانہ پن میں بڑے فائدے ہیں۔ باقی میگزین زیر مطالعہ ہے۔"

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت کراچی

پراسرار ایٹم نمبر

کیا دسمبر 2012ء میں کرۂ ارض فنا ہو جائے گا

اہرام، خلا سے آنے والے اجنبیوں کی تعمیر یا کچھ اور

خدائی کا وہ جھوٹا دعوے دار جس نے نیا چاند پیدا کر دکھایا

امریکی سرزمین پر قدرت کی بنائی منحوس لکیروں کا احوال

برمودا جو بحری اور ہوائی جہازوں کو نگلتا رہا ہے

بحر اوقیانوس کی تہ میں پراسرار شہر

جادوگر جو کہہ دیتا، وہی نظر آتا

جاپان کا انوکھا جوگی، پراسرار شخصیات

سطر سطر اسرار و تجسس کے پردوں میں لپٹی تحریریں

اگست 2011ء کے سرگزشت میں ملاحظہ کریں

زحمت سے بچنے کے لیے

آج ہی آرڈر بک کرائیں

Digests of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جوہر آباد سے احمد اعجاز کی یاد آوری ”جون کے شمارے نے بھی غزل کے محبوب کی طرح دیر سے آنے کی روایت برقرار رکھی۔ سرورق پر لڑکی کے کان میں آئی رنگ کا بندہ اچھا لگا۔ موصوفہ کی آنکھوں میں ریا کا فقدان سا نظر آیا اسے نظرانداز کرتے ہم آگے بڑھ گئے۔ دوستوں کی محفل میں سب کی شستہ سگراتی باتیں پڑھیں۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ یہ محفل سدا شاد و آباد رہے اور اس میں حصہ لینے والے چاہے وہ ملک کے کسی بھی علاقے کسی بھی صوبے سے تعلق رکھتے ہوں، کسی بھی مسلک عقیدے سے وابستہ ہوں، ان سب کی اس محفل میں ایک ہی پہچان ہو۔ پاکستانیت..... اس ایک حوالے سے ہم سب پیار کی ڈور میں بندھے رہیں۔ (جزاک اللہ ہم بھی آپ کے ہم خیال ہیں) ڈاکٹر عبدالرب بھٹی ایک بہت بڑا نام، جگر خراش۔ یقیناً مزے کی چیز ہوگی، اس کا مطالعہ مؤخر کر دیا۔ اگلے ماہ دونوں حصے اکٹھے پڑھنے کا لطف اٹھائیں گے۔ گرداب کا مطالعہ شروع کیا۔ نہ جانے اے ڈی صاحب اپنی بیگم کو دیکھ کر کیوں حیران ہوئے۔ یہ تو ایک متوقع صورت حال تھی۔ کہانی بڑھنا شروع ہوئی۔ پہلے تو یوں محسوس ہوا جیسے ظفر شیرازی کو دیکھ رہے ہیں لیکن پھر اس کیفیت سے نکلے اور کچھ دیر بعد اچانک قسط ختم۔ لکھاری پڑھنے کا آغاز کیا اور منظرنگاری میں کھو سے گئے۔ ہم اپنے خوش ذوق دوستوں کو ایک بار پھر اس منظرنگاری سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ تحقیق ایک اچھی کہانی تھی۔ مجرم بچے کے کی سزا پا گئے۔ کہانی میں رومانس کی ہلکی سی مہک بہت پسند آئی۔ چنے مسکراتے کرداروں کی کہانی جوابی کارروائی پڑھی۔ مسکراہٹوں کے ساتھ سنسنی خیزی بھی۔ اس کہانی میں راجا کا کردار نہ ہونے کے برابر تھا۔ جمیل اور راجا کا ساتھ کہانی کو چکا دیتا ہے۔ ڈبل رول اپنی مصنف کے نام کی طرح ایک منفرد تحریر۔ بعض لوگ اپنے مقصد کے حصول کے لیے کس حد تک بھی جا سکتے ہیں۔ انجام بخیر، اگر مس جارج کی جگہ ہوتا تو رینڈی صاحب کو یہی کہتا کہ نیک بخت تجھے گھوڑوں سے اتنی ہی محبت ہے تو ایسا کرتے ہیں آدھے گھوڑے بیچ کر اپنا معاشی مسئلہ حل کر لیتے ہیں اور جب خود روٹیوں کے لالے پڑے ہوں، وہاں دس گھوڑوں کو پالنا آسان کام نہیں ہے۔ کہانی بہت دلچسپ تھی۔ گمشدہ بیویاں، کہانی کا افریقی پس منظر اپنی جگہ اثر بھی کشش رکھتا ہے اور اس کہانی کے انجام سے بہت خوشی ہوئی کہ اب وہ سب بندیاں ووچ ڈاکٹر کی قید سے آزاد ہو کر اپنے اپنے گھروں میں چلی جائیں گی۔“ (آپ کی خوشی کی وجہ کیا ہے؟)

سرمد مشتاق کی باتیں وکلی آزاد کشمیر سے ”ماہ جون کا شمارہ 4 تاریخ کو ایک اسٹال سے خریدا۔ ٹائٹل کے بارے میں اتنا ہی کہیں گے کہ جاسوسی کے شایانِ شان تھا۔ فہرست پر نظر مار کر محفل دل پسند میں داخل ہوئے۔ انعامی خط پر نظر پڑی تو سوچا کہ انکل نے سجاد صاحب کے ساتھ کچھ خوش گوار مذاق کیا جو ان کے خط کو انعامی قرار دیا۔ یقین مانیے سجاد صاحب کو خود بھی مشکل سے یقین آیا ہوگا کہ انعامی خط انہی کا ہے۔ (ہاں تو اوپر والا جب دیتا ہے چھپر پھاڑ کر دیتا ہے) باقی محفل میں سب ایک دوسرے کی ہجویں اور کان کھینچتے نظر آئے..... (آپ نے تو اپنے کان سنبھالے ہوئے ہیں) اس ماہ کے تین یاروں کی بات کی جائے تو جب سابق لکھاری کی قسط مزہ دے گئی۔ تابش کی ری ویو ویری پسند آئی جاسوسی کے دوسرے سلسلے وار حصے کی بات کی جائے تو ہم اسا قادری صاحب کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتے لیکن حقیقت یہی ہے کہ گرداب میں دلچسپی کا کوئی سامان ہی نہیں ہے۔ (ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں پسند اپنی اپنی... آپ کے معیار پر پوری نہیں اتری...... لیکن لاکھوں قارئین اسے بے حد پسند کرتے ہیں) مختصر شہ پاروں کی فہرست میں سے کاشف زبیر کی جوابی کارروائی نے خاصا مزہ دیا۔ جمیل کی روایتی شوخیاں، راجا کیانی اور جاچی کی بے وقوفیاں ذہن میں آ جاتی ہیں لیکن اس بار دونوں مفقود تھے۔ [illegible] آخر دم تک سسپنس برقرار رکھنے میں کامیاب رہے جو کہانی کی کامیابی کی ضامن ہے۔ انجام بخیر پر مصنف کی مکمل گرفت ہونے کی وجہ سے اسے ایک ہی نشست میں ختم کر کے دم لیا۔ [illegible] ایک آخری بات [illegible] کے ڈبے میں سے گلاب جامن بچا کر رکھا جاتا ہے کہ آخر میں کھائیں گے، بالکل اسی طرح اس گلاب جامن جیسی اس کہانی کو آخر میں پڑھیں گے۔“ (آپ کی طرح گلاب جامن ہمیں بھی پسند ہیں...... وہ بھی گرما گرم ہوں تو کیا کہنے.....)

محمد شہزاد ورسک روڈ پشاور سے اپنی پسند کا اظہار کرتے ہیں ”جون کی تپتی لمبی اور خاموش دوپہر ہو..... اور ہاتھ میں جاسوسی ڈائجسٹ ہو تو پھر جو مزہ ٹھنڈی کی روٹی کے ساتھ لسی پینے میں ہے وہی مزہ جاسوسی پڑھنے میں ہے۔ جاسوسی سے ہماری پہلی ملاقات ایک دوست نے کروائی اور طاہر جاوید مغل صاحب کی دیوی پڑھتے ہی ہم دل دے بیٹھے جاسوسی کو اور یہ رشتہ اب تک قائم و دائم ہے۔ اب بڑھتے ہیں دوستوں کی محفل میں۔ کرسی صدارت ملنے پر شیخ محمد جاوید اس طرح خوش تھے جیسے چھوٹا بچہ کھلونا دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ بہرحال، مبارک باد قبول فرمائیے۔ فریحہ احمد خان سرورق کی حسینہ کے ہونٹوں کے ایکسرے فرما رہے تھے۔ عزیر اسعاب آپ کا ہاتھ کیا ہے۔ محسن ہی دن منانے کی روایت سے دلبرداشتہ نظر آئے۔ اس کے علاوہ ماما ایمان، ہمایوں سعید راج، تصویر الحسن کے تبصرے پسند آئے۔ کہانیوں میں اس بار خلافِ توقع پہلے گرداب پڑھی۔ یہ قسط تھوڑی سی اچھی تھی۔ ورنہ گرداب میں گرداب کے سوا اور کچھ نہیں۔ ماما تو پھنس جاتی ہے ور پھر آزاد ہو جاتی ہے بس ساری کہانی اسی کے گرد گھومتی ہے۔ اس کہانی کا اب دی اینڈ ہونا چاہیے۔ اس کے بعد مغل صاحب کی لکھاری پڑھی۔ وہی کہانی جس کے لیے ہم پورا مہینا انتظار کی سولی پر لٹک کر گزارتے ہیں اور جس نے ہمیں خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ یہ قسط کافی سنسنی خیز رہی۔ تابش کا جارج کو چیلنج دینا اور پھر عمران کے ساتھ داؤ پیچ قابلِ دید تھی کہ کہانی نے شروع سے آخر تک ہمیں اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ دوسری طرف عمران کی شوخیاں اور چالبازیاں بھی جاری ہیں۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ طاہر جاوید مغل، کاشف زبیر اور ضیا الدین نواب میرے پسندیدہ رائٹرز ہیں۔ سیم فاروقی کی داستان بڑی سازشیں

پڑھ کر ایسا لگا جیسے یہ کہانی پہلے بھی پڑھی ہو۔“

افضال مرزا اینڈ صبا مرزا کی بدحواسی ”اف! جون کی گرمی اس دفعہ تو خوار کروا دیا جاسوسی نے۔ کیم مئی (واقعی لگتا ہے گرمی کا اثر بہت زیادہ ہے جب ہی کیم جون کے بجائے مئی لکھ دیا) کو ڈائجسٹ پتا کروایا ایک اسٹال والے نے کہا جاسوسی اس دفعہ لیٹ ہے۔ 5 جون مغرب کے وقت جاسوسی کا دیدار نصیب ہوا۔ ٹائٹل گرل کے کپڑوں کا کلر بہت پسند آیا۔ (ہاں.... لیکن آپ کوشش کے تحت) محترمہ کے پیلے چہرے سے لگ رہا تھا کہ کیلشیم کی کمی کا شکار ہے۔ ہیر اسٹائل بھی اچھا نہیں تھا۔ اسا پوز میں تنویر عباس بابر گورو ڈار نے انداز میں دیکھ کر ہمارے تو چھکے چھوٹ گئے۔ منظر سے نظریں چرا کر اپنی محفل کی خصوصی ہوا میں لیے پہنچ گئے لیکن وہاں بھی محمد ذاکر کی زیادتی ہماری منتظر تھی۔ بے چارہ ہمارا اعظم۔ آنہ فریحہ احمد خان! ہماری طرح سے کیا مراد ہے آپ کی۔ ذرا وضاحت کر بات کریں ہی تاکہ ہم بھی کھل کر جواب دے سکیں۔ رنگیل ماتگی آپ پڑھتے ہیں یا پڑھ جاتے ہیں؟ سب پریوں کے تبصرے ان کی طرح کیوٹ اور پیارے تھے جبکہ اللہ کی خوفناک تخلیق میں سے ہمایوں کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ غلام شبیر نے اپنی رائٹنگ کے متعلق لکھا، ذرا ادھر گور آنے والے دوستو..... آپ میں سے کس کی چیز رائٹنگ اچھی ہے؟ ”ہمیں دیکھئے اور دینے کا بڑا شوق ہے۔ مدیر اعلیٰ آپ کے چھوٹے چھوٹے جوابوں سے ہم نے بہت انجوائے کیا۔ کاش ہمارا بھی تبصرہ شائع ہو جاتا، ہمارے حصے میں بھی اچھے اچھے جواب آ جاتے۔ کہانیوں کے گلشن میں پہنچے۔ رنگوں کو پہلے وقت دیا۔ سلیم فاروقی اپنے روایاتی انداز میں لکھتے ہوئے نظر آئے۔ بس فرق اتنا تھا، ہیرو صاحب منہ میں سونے کا چمچہ لے کر نہیں پیدا ہوئے بلکہ آخر میں سونے کا چمچہ منہ میں رکھ دیا گیا۔ (واہ بھئی مان گئے..... کیا زبردست تجزیہ ہے) دوگز زمین مجموعی طور پر بہتر نہیں لگی۔ البتہ اینڈ حیرت ناک تھا۔ اکاڈمی میں تالی اور جارج کے درمیان ہونے والی ریسلنگ کے لیے زبردست انتظار کر رہے ہیں۔ مغل انکل! ابلی کے ہاتھوں ہیرو بھائی کی تھوڑی تعریف کروا دیا کریں، ہم تو پہلے ہی ہیرو بھائی کے دیوانے ہیں۔ جگر خراش دلچسپ اسٹوری لگی۔ ایک ہی دفعہ اس پر تبصرہ کریں گے۔ مختصر کہانیوں میں جمیل اور راجا سے پہلے ملاقات کی۔ کہانی پڑھتے ہوئے سب نے ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا کہ کہیں ہم پاگل تو نہیں ہو گئے۔ جمیل! ہر برائے پھڈے میں ہاتھ لازمی ڈالنا ہوتا ہے؟ شریف بچے بنو۔ انجام بخیر میں مالک اور نوکر کا انجام پُرسکون رہا۔ کہانی کچھ خواب کی طرح لگی۔ سی ڈی راکنگ جینی نے اپنی کم عقلی کی وجہ سے ایک اکھوتا بھی کھو دیا۔ مریم کے خان کی کہانی ہمیشہ کی طرح ایڈونچر سے بھرپور تھی۔“

سیالکوٹ سے محسن علی موسم کی تعریف ”ماہ جون کا شمارہ 4 تاریخ کو ہمارے خوش نصیب ہاتھوں کی زینت بنا۔ ٹائٹل پر موجود نشیلی آنکھوں والی حسینہ بالکل حوروں کی طرح تھی لیکن پہلو میں خنجر ایک آنکھ نہ بھایا۔ پس منظر پر موجود بھائی صاحب وتا کا جھانکی کرتے ہوئے پایا۔ (کہیں وہ آپ تو نہیں تھے) [illegible]“

زیشان افتخار عرف شانی کی سرگودھا جھال سے آمد ”جون کا شمارہ کڑاکے دار دھوپ کے ساتھ تین تاریخ کو ملا۔ میں تقریباً تین سال سے جاسوسی، سسپنس، سرگزشت کا خاموش قاری ہوں۔ محفل یاراں میں تقریباً تمام دوستوں کے خیالات جان کر عجیب قسم کا شوق پیدا ہوا اور قسمت آزمائی کر لی کہ شاید مجھ پانچ سال کی پیچکی کی خواہش پوری ہو جائے۔ (لیجیے ہو گئی پوری) تنویر عباس صاحب کے خیالات کا میں فین ہوں۔ بڑی جان فشانی اور دانش مندی کے ساتھ اقتباس کا چناؤ کرتے ہیں۔ عائشہ اعلیٰ بی بی وطن کے دشمنان سے تبادلۂ خیال فرماتی ہیں۔ عائشہ جی! آپ کا تبصرہ مجھے کسی کی یاد دلاتا ہے اس لیے ہر ماہ میں آپ کے تبصرے کا انتظار کرتا ہوں۔ ام ثمامہ جی! آپ کا تبصرہ بھی بھرپور جامع ہوتا ہے۔ ویری ویلڈن مس ام ثمامہ جی۔ ماما جی! سب سے پہلے میری طرف سے خانہ کعبہ کی زیارت کی مبارک باد قبول کیجیے گا۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو بیت المقدس کی حاضری کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ مجھے بھی بہت شوق ہے اور دو دکے اس کم عمری میں زیارت کا دل چاہتا ہے انیس برس کا تھا اور جیل آ گیا۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا، تمام خاندان کی آنکھ کا تارا، یونیورسٹی سے جیل میں آ گیا اور اس ماحول کو برداشت کرنا کتنا کٹھن کام ہے، بیان نہیں کر سکتا۔ میرا تمام کیریئر خاندانی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے لکھاری پڑھی۔ طاہر جاوید مغل صاحب بہت بہت مبارک باد ہو۔ اتنی زبردست اسٹوری ترتیب دی، دل خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔ تابش بھی اب خاصا یار ہو گیا ہے۔ عمران کی تعریف کے لیے الفاظ ناکافی ہیں۔ دوسری اسٹوری گرداب پڑھی جس میں بے چارے چوہدری صاحبان کی عزت کی دھجیاں اڑائی گئی ہیں۔ کیا چوہدری افتخار جیسے انسان مسلمان بھی ہو سکتے ہیں؟ قلم کی انتہا کر دی۔ ہم سلام کرتے ہیں ایک مخلص، نڈر اور دیانت دار آفیسر شہریار کو اگر حقیقت میں اس جیسے

digestpk.blogspot.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

افسر ہمارے ملک میں ہوں تو ہمارا قانون اتنا ناقص نہ ہو اور وڈیروں، جاگیرداروں کے آگے اپنا سر نہ جھکائیں بلکہ مفلس کا ساتھ اور منصفانہ فیصلے کریں۔ دیگر تمام اسٹوریز آنچل کی طرح بے پایاں و نمایاں تھیں۔"

حافظ آباد سے ماہا ایمان کی شوخیاں "ماہ جون کا شمارہ عطا کر کے کرم فرمائی سے خاصا لیٹ 7 تاریخ کو ملا۔ اتنا انتظار تو میں نے کبھی اپنے ان کا نہیں کیا جتنا اس دفعہ مجھے جاسوسی جی کا کرنا پڑا۔ ویسے تو جاسوسی مجھے ہر دفعہ 45 روپے میں ملتا ہے مگر اس دفعہ ایکسٹرا چارجز ادا کرنے پڑے۔ [illegible] صاحب کو بار بار فون کرنے تو بچ کرنے کی صورت۔ تب کہیں جا کے جاسوسی صاحب کے دیدار نصیب ہوئے۔ اس دفعہ ٹائٹل ایک ٹیپیکل جاسوسی ٹائٹل تھا جس میں تمام رنگین دلنشین عناصر موجود تھے۔ حسینہ ماہ جبینہ کے تیکھے نین بڑے مست مست تھے لیکن ریڈ لپ اسٹک نے معتوب کر دیا۔ ریڈ لپ اسٹک آؤٹ آف فیشن ہے لیکن لگتا ہے ڈاکٹر انکل نے دل میں کسی کوئی پرانی یاد تازہ کی ہے۔ سرورق میں موجود دونوں مردانہ پھنکار زدہ چہرے دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ مردوں حق کا اقبال نامہ خاصا مشکوک ہے۔ محفل میں اس دفعہ خاصی شگفتگی اور رونق ہے جو کہ ظاہر ہے منتظم خوش اندام کی وجہ سے ہی ہے۔ (اس میں کیا شک ہے) انگور سے آغا فرید صاحب پلیز مجھ پین دور کرنے کے اشتہارات پڑھا کریں کہ آپ کو اس کی سخت ضرورت ہے۔ رجیل مانگیل! اچھو! عتیق اخبار پڑھ کے روشن ہوتے ہیں۔ ہمارا ڈائجسٹ تو ذہنی سکون پہنچاتا ہے۔ پیاری تصویریں اچھی تبھی ہوں کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے۔ ہم اسے ہاشمی! خدا گدھا بنائے مگر خوش فہم نہ بنائے۔ پامیلا خان! یہ حقیقت ہے کہ دیوی کا نعم البدل کوئی نہیں۔ شیخ! ہم آپ کے گروپ کی صحت کے لیے دعا گو ہیں۔ رانا ادیب الرحمٰن! لگتا ہے جناب نے تبصرہ ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر لکھا تھا۔ ہے نا؟" (آپ کو کیسے معلوم...... کیا آپ بھی ایسے تجربے سے گزر چکی ہیں؟) عنایوں سعید! آپ کا بخار اتر گیا لیکن ہمیں چڑھ گیا ہے آفریدی کی ریٹائرمنٹ کی وجہ سے۔ ایک ہی تو کھلاڑی مجھے پسند تھا وہ بھی گیا۔ نادیہ خان! صرف موبائل پر ہی نہیں بلکہ ہر بیک ڈور رابطہ رونگ ہوتا ہے سو اجتناب ضروری ہے۔ دلنشین اور امشاء مرعی کی کمی محسوس ہوئی۔ پلیز ہر ماہ آیا کرو۔ چلتے ہیں خوب صورت تحریروں کے سیر حاصل تبصرے کی طرف۔ للکار سے آغاز کیا تو اس حقیقت سے روشناس ہوئے ہیں کہ مکالمہ نگاری کے فن میں مغل صاحب کا کوئی ہم پلہ نہیں۔ عمران کی باتیں تو بہت انجوائے کرتی ہوں۔ تابش آنچل مجھے ماورا لے تھرلے پر عمل کرتا جارج کو مقابلے کی دعوت دے بیٹھا ہے۔ امید تو ہے کہ ہیروئن کی تاج بجاتے ہوئے جارج کو شکست فاش دے گا۔ گرداب کی یہ قسط خاصی مختصر سی رہی۔ کافت ہی ختم ہو گئی۔ اثر نعمانی کی ترجمہ تحریر تیجر خراش زندگی کے تمام رنگوں کو سمیٹتی نظر آئی۔ احوال میں اقوال میں محبت کی لطافت، دولت کی طاقت اور انتقام کے شعلے لپکتے نظر آئے، جیتی کا انتظار ہے۔ کاشف زبیر کی جوابی کارروائی دلچسپ اندازیوں کی وجہ سے خاص بن گئی ورنہ اس دفعہ تشنگی کی بہت محسوس ہوئی۔ مریم کے خان کی گمشدہ بیویاں عمدہ تحریر تھی۔ [illegible] ڈاکٹر کو اغوا کرانے کا قاتل نکلا۔ ایک واقعہ میں بھی ماں کی تھی کہ بندیاں ہی گمشدہ بیویاں ہیں۔ [illegible] تحقیق سے میری غلط فہمی دور ہوئی۔ [illegible] ہاتھ سے ہوائے فرشتہ ہی تھیں ایک [illegible] بھی نکل گئے۔ رنگوں میں دوسرا رنگ [illegible] عبرت ناک تحریر تھی سمجھنے والوں کے لیے۔ جذبات پر خاص توجہ دی گئی [illegible] ڈاکٹر صاحب کی عمیق نظری کی دلیل ہیں۔ سیم فاروقی کی گری سماعتیں ان کے مخصوص انداز تحریر کی ترجمان تھی۔ [illegible] محمد خان آزادی کی تحریر [illegible] مثال تھی۔ گری اور [illegible] محسوس ہوتا مجھے آپ سے ہمدردی ہے اور مغفرت خواہ ہوں۔ اللہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔"

حسین عباس بلوچ کی فریاد و شکوہ "جون کا شمارہ [illegible] تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل پر [illegible] دوشیزہ کی سحر بھرے چہرے پر سجائے اپنی حسین آنکھوں سے کسی کو دیکھ رہی تھی۔ دوستوں کی محفل میں قدم رکھا تو بتا مخلوط تھے لیکن بدقسمتی نے اس مرتبہ بھی ہمارا ساتھ نہ چھوڑا۔ ہمارا نام [illegible] سے ہی آؤٹ تھا [illegible] پاکستان [illegible] شیخ محمد [illegible] بھی بہت لا رواں تھا۔ ماہا ایمان [illegible] آپ جاسوسی کے بے چارے مرد حضرات [illegible] عبدالعزیز ملکرانی، بہنوں سے پامیلا خان، ایم اے ہاشمی، محمد طیب، نوید ساجد، رانا ادیب الرحمٰن، ملتان سے عائشہ رانی، کرم پور سے نادیہ خان، زیارت سے تنویر احمد، اٹک سے محمد اسماعیل، تھمور سے علی آتش ان تمام دوستوں کے تبصرے نمایاں تھے۔ کہانیوں میں اس مرتبہ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ سنسنی خیز اور سسپنس سے بھرپور داستان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ تمام کردار بہت عمدہ و اعلیٰ ہیں۔ ہر شعبے سے بیسٹ اسٹوری ہے۔ گرداب میں بھی تمام کردار ہمارے اس معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں اور ہمیں اس سے سبق سیکھنا چاہیے۔ گمشدہ بیویاں مریم کے خان کی زبردست تحریر تھی۔ میر محمد بلوچ کی تخلیق بہت پیاری اسٹوری تھی۔ دیگر تمام اسٹوریز ابھی زیر مطالعہ ہیں جو کہ عمدہ و اعلیٰ ہوں گی۔ بس مجھے برداشت کرنے کے لیے تمام ساتھیوں کی نوازش۔"

کرم پور سے نادیہ خان وسیر کی بیماری "اس بار شمارہ 5 کو ملا۔ حسینہ سرورق کی لپ اسٹک کا رنگ بہت پیارا لگا۔ [illegible] میں قدم رکھا تو جناب آپ تو سیاست کا ذکر لے کے بیٹھ گئے۔ یہ کیا بات ہوئی؟ [illegible] میں بھی سیاست اور اب جاسوسی میں بھی سیاست۔ ہم جائیں تو جائیں کہاں؟ محمد جاوید! آپ غرور نہ کرنے لگ جانا۔ اسد بھائی! اب آپ کا ہاتھ کیسا ہے؟ آغا بھائی! تعویذ گنڈے سے اٹھ کر اب ماہی گیری پر آ گئے۔ پلیز اپنی بہن کو بھی کچھ مچھلیاں بھجوا دینا۔ مانگیل جی! لالٹین تو ہوتی نہیں، آپ کے چودہ طبق کیسے روشن ہو گئے۔ ماہا ایمان کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ دلنشین جی! اسٹینڈ ویچ نہ دیں پر محفل سے غائب تو نہ ہوں۔ سب کے محبت نامے اچھے تھے۔ بشریٰ آپی! آپ کہاں چلی گئیں؟ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ اثر نعمانی! ویلڈن۔ پھر آئے ہم گرداب کی طرف۔ یہ کہانی دن بہ دن بہت عمدہ ہوتی جا رہی ہے۔ سرورق کا دوسرا رنگ دو گز زمین پڑھ کے تو میں حیران رہ گئی۔ یہ تو اب عام

بات ہو گئی ہے۔ اونچی حویلی والے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں ظالم مگر جب یہ مر جائیں قبر بھی ان کو قبول نہیں کرتی۔ وڈیرا فہیم خان جس بیٹی سے نفرت کرتا تھا اس کے مرنے کے بعد اس کا جنازہ بھی نہیں پڑھایا اور خود مرنے کے بعد اسی تہ خانے میں جا کے رکھنے پر مجبور کر دیا گیا۔ انسان کو اتنا ظالم نہیں ہونا چاہیے۔ بیٹیاں تو پھول ہوتی ہیں، ان کو مہکنے دینا چاہیے۔ ولی نے اچھا کیا، بہت ہی اچھا کیا۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ اب اجازت۔ اور ہاں آج کل میرے سر میں بہت درد رہتا ہے۔ پلیز سب دعا کریں کہ میں ٹھیک ہو جاؤں۔ آمین۔" (ہماری دعا ہے کہ آپ جلد صحت یاب ہوں)

فتح پور بیہ سے سید محی الدین اشفاق کی فرمائشیں "ٹائٹل حسینہ حیران اور خوش ہے کہ ماہ بدولت اس کو مسلسل یاد رکھے ہوئے ہیں۔ پامیلا خان! خوش آمدید اس پیاری سی محفل میں۔ محسن علی! زبردست تبصرہ تھا یار آپ کا۔ عائشہ رانی! ذرا یہ تو بتائیں کہ آپ کہاں کی رانی ہیں؟" (بھئی آپ کو کیا تکلیف ہے۔ کسی کے دل کی بھی رانی ہو سکتی ہیں...... اپنے والدین کے لیے تو سدا بہار رانی ہیں) نادیہ خان! کیسی آندھی میں آپ کا جاسوسی دور تو نہیں گیا کیونکہ ہمیں اس مرتبہ جاسوسی جلدی مل گیا تھا۔ (اور آپ نے اچک لیا) ایم اے انجم! جناب ہم تو پہلے ہی مارے ہوئے ہیں۔ آسیہ پٹھانی! پلیز کم بیک۔ دونوں مل کر زرداران لوگوں کی خبر تو لیں۔ محفل کے تمام ساتھیوں سے آسیہ خان کے لیے دعائے صحت کی اپیل ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار کی طرف گئے۔ عمران کا سانپ کا زہر پینا اور میڈم صنوبر کی جان بچانا اور ان تینوں کا آپس میں ملنا اچھا لگا۔ گرداب میں پھنسی ماہ پارو کی داستان ایک ہی ٹریک پر چل رہی ہے۔ کاشف زبیر جوابی کارروائی میں جلیل سے ملاقات کروا گئے۔ جلیل نے اپنی پرانی دوست ماہ رو کی قاتل شوہر سے جان چھڑا دی۔ البتہ مشو کو اس مرتبہ بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ پہلا رنگ گری سماعتیں پڑھا، جیسے ہی ہم سیم فاروقی کا نام پڑھتے ہیں، ہم تو جیسے خیالات میں کھو جاتے ہیں کہ ان کے قلم کی رفتار کا تھم دیا جائے۔ (اس بہانے سیر تو ہو جاتی ہے جناب کی) افلاس نے مسائل کی وجہ سے وقتی طور پر جرائم کی دنیا میں پناہ لی۔ مگر آخر کار اس کے اندر کے اچھے انسان نے اس کو سیدھی راہ دکھا دی اور اکبر اور حاجی جیسے گروہ لوگوں کو سزا مل گئی۔ جاسوسی ہمیشہ کی طرح اچھا تھا۔"

ملاکنڈ ایجنسی سے صبا گل کی دھمکی "جون کا ڈائجسٹ 4 تاریخ کو مجھے مل گیا۔ سرورق بہت ہی اچھا تھا۔ انعام یافتہ خط شیخ محمد جاوید جاگانی کا تھا۔ انہیں مبارک ہو۔ دیگر ساتھیوں کی طرح میری اردو اچھی تو نہیں بہر حال کوئی غلطی اگر ہو تو آپ صحیح کر لیں کیونکہ میری تعلیم صرف آٹھویں تک ہے۔ ماہا ایمان کا لمبا چوڑا خط بہت پسند آیا۔ مالاکنڈ سے آپ بھی مجھے بے حد پسند ہیں۔ آپ کی عمر کا میں جو اندازہ لگاتی ہوں وہ 20 اور 25 کے درمیان رہی ہوگی۔ ہے نا؟ تصویر [illegible] لیکن باقی [illegible] چھپ سکتی ہیں۔ اس شمارے کی پہلی کہانی تیجر خراش اچھی کہانی تھی۔ اب اس کی دوسری قسط کا انتظار ہے۔ اس کے بعد للکار پڑھی۔ للکار کا ہیرو تابش کافی خطروں میں نظر آ رہا ہے۔ مگر موصوف اپنے بارے میں جو کر رہے ہیں تو یقین آ جاتا ہے کہ واقعی وہ جارج جیسے کسی شخص سے مقابلہ کرے گا۔ عمران بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ اس کہانی کا ہیرو عمران کو ہونا چاہیے تھا۔ گرداب بھی اچھی کہانی ہے۔ [illegible] میری بہت ہمدردی ہے۔ کاش میں ان کی کچھ مدد کر سکتی۔ آخری صفحات پر دونوں رنگ بھی بہت اچھے تھے۔ [illegible] باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ [illegible] صاحب بہت اچھے لکھاری ہیں۔ ان کی کوئی [illegible] شائع کریں اور اس کے ساتھ میرا یہ خط بھی شائع کریں پلیز۔ اس بار اگر میرا خط [illegible] سمجھوں گی۔" (خدارا ایسا تو نہ کیجیے گا)

راولپنڈی سے راحت غازی کی چاشنی بھری آمد "پہلی دفعہ جاسوسی کے [illegible] شامل ہونے کے لیے حاضر خدمت ہیں۔ اس محفل کے تمام افراد کو [illegible] جون کے جاسوسی شمارے کی بات کی جائے تو ٹائٹل میں حسینہ صرف [illegible] ڈاکٹر انکل! مجھے [illegible] آپ کا انداز بہت نرالا ہوتا ہے۔ [illegible] ماہا ایمان ہمیشہ کی طرح مجھے آپ کا تبصرہ سب سے عمدہ لگا۔ مجھے آپ اور تنویر عباس یار سب سے اچھے تبصرہ نگار لگتے ہیں۔ شیخ عرف محمود! آپ اور آپ کے دوستوں کے نام یہ 3 نمبر کیوں ہیں۔ کیا کسی [illegible] سے انٹرن شپ کر رکھی ہے؟ رانا ادیب الرحمٰن! آپ سے ایک اہم سوال کرنا ہے کہ سلاخوں کے پیچھے یہ کھلی ہواؤں اور آزادی کا احساس دلاتا ماہنامہ پڑھنے کے بعد دل کی کیفیت کیسی ہو جاتی ہے؟ تنویر احمد! آپ کے بھائی کا سن کر افسوس ہوا۔ خدا جلد آپ سے آپ کا بھائی ملا دے۔ آمین۔ کہانیوں میں سب سے پہلے تو للکار سب سے عمدہ اور سب سے اعلیٰ۔ عمدہ اور اعلیٰ سے ایک [illegible] درخواست کہ للکار کے صفحات بڑھائیں گھٹائیں مت۔ گرداب تو ایک کہانیوں کا تسلسل ہے جو ایک کے بعد ایک الف لیلیٰ کی طرح کھلتی جاتی ہے۔ یقیناً اس پہ کچھ کہنا کسی اور کہانی کو جنم دینے کے مترادف ہوگا اس لیے تو [illegible] سرورق کے رنگوں میں اولین رنگ سب سے بہتر تھا۔ گری سماعتیں نامی اس کہانی کو پڑھتے ہوئے اس کے کردار [illegible] کی جگہ میں کسی اور کو تصور کرتی رہی۔ اب یہ مت پوچھیے گا وہ کون ہے؟ بھئی کچھ پرسنل بھی ہوتا ہے۔ ہاں مگر ایک سبق اس کہانی سے ضرور ملا کہ ایمان داری انسان کا صبر آزماتی ہے جبکہ انسان تو شوقوں کا گھوڑا ہے جبکہ صبر ایک طویل مسافت کانٹوں بھری۔ دو گز زمین میں...... وڈیرہ رئیس کے ساتھ انجام کار برا ہونا ہی تھا اگر وہ زندگی میں بھی اپنے کیے کا بھگتتا تو وہ جانتا کہ اختتامی حیات میں اذیت کا مزہ کڑوا ہے [illegible]۔ تیجر خراش میں دلیس کا جوش جو کہ انتقام لینے کو بے تاب ہے یقیناً اسے کامیابی سے ہمکنار کرے گا۔ (ہمارا بھی یہی خیال ہے) ایمنز ہنستے مسکراتے چہرے والا شاہی شاہ میر اور تیمور کے کرداروں اور ان کے تڑاخ کارناموں سے بھرپور اسٹوری کو بہت مس کر رہے ہیں، ان کو دوبارہ لائیں، فولاد خان کے ساتھ (لیجیے آپ نے یاد کیا...... تینوں حاضر خدمت ہیں) پہلی دفعہ کے لیے اتنا کافی

Digests of Pakistan digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ اگر اچھا لگے تو ضرور اشاعت کے قابل جان کر مجھے اس کا صلہ دیں۔“ (ضرور)

حسن سے پامیلا خان کی خوشی اور خوف کی کیفیات ”اس مرتبہ جاسوسی کے درشن 3 جون کو ہوئے۔ ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی میں نے اپنی بے ساختہ چیخ کو بڑی مشکل سے روکا۔ پتا نہیں ڈاکر انکل مختلف کرنٹ کے چہرے اتنے بھیانک کیوں بناتے ہیں جنہیں دیکھ کر انسان کے حواس تھوڑی دیر کے لیے ساتھ چھوڑ جائیں۔ میرے خیال میں انکل مختلف کرنٹ اتنے بھی بھیانک نہیں ہوتے۔ خیر، ٹائٹل کو چھوڑ کر میں بڑی تیزی سے تکرار میں پہنچی اور اپنا خط محفل میں شامل دیکھ کر خوشی سے ایک اور چیخ مار دی۔ کرسی صدارت پر شیخ محمد سجاد عثمانی کو حیران و پریشان براجمان پایا۔ شاید وہ بھی میری طرح یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میرا تبصرہ پہلے نمبر پر کہاں سے آگیا۔ خیر میری طرف سے آپ کو بہت مبارک ہو۔ ایم عزیز اسعد! آپ کے ہاتھ کے زخمی ہونے کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ آپ کے ہاتھ کو جلد ٹھیک کرے۔ آغا فرید احمد خان ٹائٹل پر یقیناً مختلف کرنٹ تو ہوتے ہیں لیکن ہم نے ان میں وجاہت کا شدید فقدان دیکھا ہے، شاید آپ کی نظر کمزور ہے۔ ہمایوں سعید راج! آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح شاندار تھا۔ آمنہ چغتائی! آپ کہاں ہیں؟ پلیز واپس اپنے دوستوں کی محفل میں آجائیں۔ کہانیوں میں حسب معمول سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ یہ قسط بھی بہت شاندار تھی۔ عمران کی خوش گفتاری اس کہانی کو دلچسپ بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے بعد گرداب پڑھی۔ آخر کار بیان بھی مارا اپنی چالاکی سے بچ ہی گئی اور شہریار کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہوگئی۔ آخری جو ہوئی۔ پتا نہیں ماہ پارو کا آگے کیا ہوگا۔ رنگوں میں پیار رنگ بس ٹھیک ہی تھا لیکن دوسرا رنگ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا وہ گز زمین بہت ہی اچھا تھا۔ بے شک وڈیرہ رحیم خان کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کہ اسے زمین نے دو گز کی جگہ دینے سے انکار کر دیا حالانکہ اس کی سیکڑوں ایکڑ زمین تھی اسی لیے ہر انسان کو اپنی آخرت ضرور یاد رکھنی چاہیے کیونکہ قبر میں انسان سوائے اپنے اعمال کے اور کچھ نہیں لے کر جاتا۔ شہزور میں کرستان معصوم لڑکیوں کے ساتھ جو کچھ کرتا رہا سارے قارئین کو اسے سو سمیت لوٹا دیا۔ بہت اچھی کہانی تھی۔ کاشف زبیر کی جوابی کارروائی وہ تک نہیں جما سکی جوعان کا خاصہ ہے۔ مریم کے خان کی گمشدہ بیویاں بھی اچھی تھی۔ اس کے علاوہ تعلق اور ڈبل رول بھی اچھی کہانیاں تھیں۔“

ملتان سے عائشہ رانی کی شکایت ”جون کا شمارہ خلاف توقع بہت جلدی مل گیا۔ 6 جون کو ہی۔ (صرف شکر کر رہی ہوں یہ بھی انتظار نہ کرنے کے بعد) تنویر صاحب! آپ کے بھائی کے لیے دعا کرتے ہیں کہ خدا انہیں عقل ودانش عطا کرے اور وہ گھر لوٹ آئیں۔ آتش صاحب! شکریہ کہ آپ نے خود اجازت دی ہے کہ آپ کو آگے کر دوں اگر میرے ساتھ کوئی پنگا لیا تو جناب سب سے پہلے تھیں رانا ادیب الرحمن کی۔ جو لگتا ہے کہ محض بے چارے کے بہت شیدائی ہیں۔ کوئی تو ہے جس کی سوچ ہم جیسی ناقص العقل کے ساتھ ملتی ہے۔ جی جناب ایم اے انجم صاحب کی بات کر رہی ہوں۔ پامیلا خان خوش آمدید۔ عبدالعزیز بیچ ختم ہو گئے۔ بڑے خوش ہیں مگر دعا کریں کہ رزلٹ آپ کی توقع کے عین مطابق ہو۔ غلام شبیر صاحب تو مجھے آپ کی کمی محسوس ہوئی اس رسالے میں نظر آرہی ہے کیونکہ رسالہ پرنٹ ہوتا ہے ورنہ تو ہمارے اقبال بہ بے محنتی رائٹنگ کی خرابی اور درستی پر خوب تبصرے کیے جاتے۔ مگر ہم پھر بھی اپنی محفل میں آنے سے باز نہیں آئیں گے جی۔ ایم اے انجم صاحب میرے انداز آپ کو بھائے یا دہلی ”گفتگو“ گرداب پڑھی۔ جو سوچ تھی اس کے برعکس ہوا مایا تو اپنے حقوق یاد کرانے آئی تھی۔ شہریار کے تمرد کا وہ بھی انتہائی برا طریقہ سے... کشور اور آفتاب کی جاندی پیاری تھی بہت سوچی گئی۔ گردابکار پڑھی، رہ جانت پڑھنے کے لیے... والدہ میم معصوم کے حالات کس قدر... باقی کہانیاں بھی یقیناً اچھی اور عمدہ ہوں گی۔ رسالہ دیر سے ملنے کی وجہ سے محفل میں جگہ پر سبقت کی ہے اس لیے اتنا ہی تبصرہ کافی ہے۔“

فیصل آباد سے دلنشین بلوچ کی سرشاری ”جان افروز جاسوسی کا شمارہ 3 کو ملا۔ شدید گرمی میں برسات ہوگئی دل میں کئی من بارش کی بوندیں لگ کر ٹوٹ کے برسنے لگیں۔ تن من بھیگا محسوس ہوا۔ [illegible] ہوئی۔ مستفید ہونے کے بعد اس کیفیت سے کیا کہیے۔ طویل وقفے کے بعد محفل میں آئی ہوں۔ [illegible] گئی حسینہ اچھی لگ رہی ہے کہ بڑی اس کا نفیس انداز محفل کرے۔ میں تو داخل ہوں۔ کرسی صدارت پر شیخ محمد سجاد معلوم نہیں ہیں کہ نہیں کیونکہ تبصرہ بہت مختصر ہے۔ پیاری ماما ایمان! کیسی ہو؟ ایم اے انجم! تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آخر ہمسایہ شہر میں رہتے ہو۔ پامیلا! آپ خود بہت پیاری ہو جب میں اچھی لگتی ہوں۔ عائشہ رانی! ملتان کس جگہ رہتی ہو میری ہمسائیوں کو بھی پوچھتو۔ آتی ہے۔ ہمایوں سعید! مجھ ان میں لگ رہے ہو۔ نادیہ خان! میری طرف سے فریدہ کو جواب خوب دیا۔ تھینکس۔ اتنے عرصے طویل بیماری لگتی ہے۔ ابھی بھی مکمل ٹھیک نہیں۔ ڈاکٹرز نے 2 ماہ بیڈ ریسٹ بتایا ہے۔ ڈائجسٹ تھوڑا تھوڑا پڑھتی ہوں۔ خط لکھنے کی وجہ باقی دوستوں کی یاد آوری ہے۔ کہانیوں میں انگارے پڑھی۔ بے ساختہ تعریف ہونٹوں پر مچل گئی۔ وہ بلاشبہ طاہر صاحب! بہت خوب صورتی اور روانی سے تیز رفتاری سے قسط آگے بڑھ رہی ہے۔ جارج گوراب اپنے تاجش سے گھبرا رہا ہے۔ گرداب پر کچھ سستی کا شکار ہو رہی ہے۔ اسماء صاحبہ توجہ دیں۔ ماہ پارو بے چاری کا دل صدمے سے ٹوٹ گیا۔ دیکھیں اب وہ کیا قدم اٹھاتی ہے۔ باقی کچھ نہیں پڑھا بیماری کی وجہ سے کم پڑھ رہی ہوں۔ خط چھپنے کی امید پھر بھی ہے دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔“ (یقیناً)

اللہ آباد، ڈسٹرکٹ قصور سے علی آتش کی ٹھنڈی ٹھنڈی باتیں ”اس ماہ کا جاسوسی ڈائجسٹ 2 جون کو بک اسٹال کے پہلے چکر میں ہی مل گیا۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ سب سے پہلے سرورق کی ایسی کی تیسی کرنے کی سوچی لیکن اس دفعہ جاسوسی کا سرورق جاسوسی کے شایان شان تھا۔ ویسے سرورق کی حسینہ ہمیں چھوڑ کر کسی اور کو گھور رہی تھی۔ (تپش سے بچنے کے لیے اس نے نہ دیکھنے میں ہی عافیت سمجھی ہو گی...) او پر والے بھائی صاحب خوامخواہ دانت پیس کر ہمیں ڈرا رہے ہیں۔ ہمیں تو سرورق پسند آیا۔ اس دفعہ تنگ اسٹینڈ پر جاو

تانی مختصر سے تبصرے کے ساتھ کھڑے تھے۔ خیر مبارک باد قبول کریں۔ قصور امین صاحب! جو خود آتش ہو (لیکن آتش تو آپ ہو شاید...) اسے گرمی کیا کہہ سکتی ہے۔ سعید راج صاحب! ہم تو وگ کے بغیر کام چلاتے ہیں۔ تنویر احمد! خدا بزرگ و برتر آپ کو آپ کے بھائی سے ملا دے۔ آمین۔ رانا ادیب الرحمن! آنکھیں چھیا رہے تبصرے نکل رہے ہیں جاسوسی کے پیچھے۔ آپ کیا جو گھوڑا اور تھکنے کی بات کر رہے ہیں۔ عائشہ رانی! ڈاکر انکل نے آپ کو ویلکم کیسے بنا دیا۔ تبصرے سارے ہی شاندار اور جاندار تھے۔ شیخ عرف محمود اللہ تعالیٰ آپ کے گردہ کو صحت عاجلہ کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔ سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ تاجش نے جارج کو چیلنج کر کے ہمارا تو دل خوش کر دیا۔ اب آئے گا مزہ۔ قسط اچھی تھی۔ اس کے بعد اپنے فیورٹ رائٹر مرحوم اثر نعمانی کی ترجمہ کردہ اسٹوری جگر خراش پڑھی۔ اثر نعمانی صاحب کی ترجمہ شدہ اسٹوری پڑھتے ہوئے آس پاس کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ (یہاں پر دفعہ ٹھنڈک کا احساس اجاگر ہو جاتا ہوگا...) سرورق کے رنگوں میں سلیم فاروقی صاحب نے بہت پرانے موضوع پر قلم اٹھایا۔ اچھی اسٹوری تھی لیکن اگر وہ ویلکم پولیس انسپکٹر والی اسٹوریز لکھیں تو زیادہ بہتر ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی دل میں اتر جانے والی تحریر دو گز زمین پڑھی۔ اس کے بارے میں میرا قلم کچھ لکھ نہیں سکتا لیکن یہ اسٹوری خدا کی لاٹھی بے آواز ہے کا درس دے رہی تھی۔ چھوٹی کہانیوں میں کاشف زبیر کی جوابی کارروائی پڑھی۔ راجا تو پکا عارف کے پاس ہی پہنچ گیا ہے۔ اکیلا جلیل الزماں کچھ خاص مزاح پیدا نہیں کر سکا۔ اس کے بعد مریم کے خان کی گمشدہ بیویاں پڑھی۔ بیویوں سے نجات پانے کا طریقہ تو اچھا تھا۔ (ہاں تمام مردوں کی دل کی آواز بھی ہے) لیکن پاکستان کی پولیس کو چھوڑ کر باقی ممالک کی پولیس کا کیا کریں کہ اچھا بھلا کام بگاڑ دیتے ہیں۔ عفان آزاد کی شہزور بھی کرتی وکیل کی بھرتی کا درس دے رہی تھی۔ انجام تحریر میں تک کو اپنی وفاداری کا خوب صلہ ملا۔ باقی تمام اسٹوریز بھی بہترین تھیں۔ تمام ہی پسند آئیں۔“

سید شکیل حسین کاظمی کی شمولیت نامعلوم مقام سے ”4 جون کو آگ برساتی دھوپ میں بک اسٹال سے جاسوسی لیا۔ سرورق سے میرا واسطہ صرف پہلی نظر تک ہی رہتا ہے۔ (صرف سرورق کی حد تک...) لہٰذا پورے سرورق میں صرف دوشیزہ کی آنکھیں اچھی طرح جاسوسی کی عکاسی کر رہی تھیں۔ اس دفعہ اپوزیشن کو کافی اچھا جواز مل سکتا ہے دل کا غبار ہلکا کرنے کو کہ تبصرے میں ایسا کیا تھا صدارت کی کرسی۔ میں ایسا سوال پیدا ہو تو وہ تنگ حالات پر غور کرے۔ تبصروں پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا کیونکہ میں منتخب نازک سے کسی خوشگوار تعلق استوار نہیں رکھ سکتا۔ (یہ کس جوتشی بابا کا ٹوٹکا ہے؟) بہت سے محترم نام ہیں اس محفل میں جن کو بہت عرصے سے دیکھ رہا ہوں۔ سب اچھے ہیں۔ مگر کچھ لوگوں کے نام لینا ضرور پسند کروں گا جیسے تحسیر عابد عباس، ہمایوں سعید راج، دلنشین بلوچ، ام شامہ، ماما ایمان، ایم اے ہاشمی اور پاپا سمندر موج خان۔ سمندر موج خان کا تبصرہ کافی عرصے ہوا نہیں دیکھا۔ نادیہ خان کرم پور سے ایک اچھی نصیحت کے ساتھ وارد ہوئیں۔ باقی سب کے تبصرے ہمیشہ کی طرح بہترین تھے۔ پہلے انگارے پڑھی۔ اس دفعہ کہانی کافی نازک مرحلے میں آگئی ہے۔ جارج اپنے طور پر تاجش کو کمزور کرنے کی کوششوں میں لگا ہے اور غالب امکان ہے کہ ایسا کچھ ہو اور آخر میں ہار جائے اور تاجش کی جگہ عمران سامنے آجائے۔ اس کے بعد گرداب کا رخ کیا۔ انتقام میں عورت بے ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہے۔ (خوش گوار تعلق بھی نہیں ہے...) پھر بھی منتخب نازک سے پیار کے ہیں تبصرہ... یہ تجربہ ہے کہ مشاہدہ...) اور ماہ پارو نے یہ ثابت کر دیا۔ بہر حال کہانی میں دلچسپی کا عنصر مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ کاشف زبیر اور جلیل کے تازہ کارنامے پڑھے۔ ایک شفقت بیرے میں مزاح اور ایکشن دونوں دیکھنے کو ملا جو واقعی بہت خوب تھا۔ اس کے بعد سرورق کے رنگوں پر نظر ٹھہری۔ سلام سرورق اچھے کرداروں سے بنا تھا مگر پلاٹ پرانا پرانا محسوس ہوا۔ سرخ میں سندھ کی ایک اور مظلومیت بھری داستان ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی زبانی تھی۔ یہ بلاشبہ ایک بہترین کہانی تھی۔ اس دفعہ اثر نعمانی صاحب کا تلخیص شدہ ناول پورے ڈائجسٹ پر بازی لے گیا۔ جب تک اس کے بقیہ حصے کا مطالعہ نہ کرلیں، تشنگی رہے گی۔ باقی ڈائجسٹ کا مطالعہ ابھی باقی ہے۔ [illegible] (ضرور رکھیے گا)

محمد کبیر مکی سے بذریعہ ای میل ”ٹائٹل پر تو شکست آپ جانتے ہیں۔ فہرست میں اثر نعمانی اور جلیل سیریز کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ بہت عرصے کے بعد جاسوسی میں طویل ترجمہ کہانی پڑھی اور مزہ آگیا۔ باقی آئندہ بے چین کر گیا۔ میرے خیال میں سوزی زندہ ہوگی۔ انگارے بہت اچھے طریقے سے جاری ہے۔ تاجش کے مقابلے کا چیلنج سے انکار ہے۔ گرداب بس سو سو جا رہی ہے۔ کچھ بدلاؤ کی ضرورت ہے۔ رنگوں میں سلیم فاروقی کی کڑی سزا تھیں۔ ایک طویل روایتی فاروقی تحریر ثابت ہوئی۔ ایسا لگا جیسے ٹوٹے کی وہانی کی انڈین فلم دیکھ رہے ہوں۔ عبدالرب بھٹی کی تحریر بھی بس ٹھیک ہی تھی۔ یہ بھی ایک روایتی تحریر تھی۔ مختصر تحریروں میں عفان آزاد کی شہزور پہلے نمبر پر رہی۔ چوہدری کو پڑھ کے بہت مزہ آگیا بھی۔ دوسرے نمبر پر مریم کے خان کی گمشدہ بیویاں رہی۔ یہ تحریر سراغ رسانی کا ایک عمدہ شاہکار ثابت ہوئی۔ آصف ملک کی عام آدمی اچھا پلاٹ، اچھا عشق اور رواں تحریر کی وجہ سے تیسری پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ سیریز راز کی ڈبل رول مختلف پلاٹ کے ساتھ چوتھے نمبر پر رہی۔ سیم انور کی سی رائٹر مغربی معاشرے کی جھلک پانچویں نمبر پر رہی۔ تنویر ریاض کی تحریر کو ہم نے چھٹا نمبر دیا۔ میر محمد بلوچ نے تعلق کے ذریعے جاسوسی سے تعلق استوار کیا مگر ان کی تعلق کے ذریعے تعلق کی پہلی کوشش متاثر کرنے میں ناکام رہی۔ جلیل سیریز کی یہ قسط کچھ خاص مزہ نہ دے سکی۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے قابل اشاعت نہ ہو سکے۔

کبیر اعادی عرف سوئی، ٹھٹھہ۔ عبدالعزیز خان مکرانی، ضلع میانوالی۔ طارق سلطان، سرگودھا۔ ایم اے ہاشمی، ضلع وہنر۔ ہمایوں سعید راج، جھول۔ ایم عزیز اسعد، چکوال۔ رنگیل، انگیل، بڑے نوالہ۔ نوید ساجد زیدی، گولا رچی ضلع بدین۔ فاروق انجم ساہی، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔ سکن شمس، اورلالائی بلوچستان۔ کوکر خاندان کی شمولیت مختلف مقامات سے۔ ساگر کوکر، چشمہ بیراج۔ نوری کوئٹہ تنہا کوکر، کوئٹہ بلوچستان۔ راحت وفا کوکر، بھکر۔ ساگر کوکر، چشمہ بیراج۔ تحریم کوکر، خوشاب۔ تمری، گجرات۔ محمد فرقان مرزا، اسلام آباد۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جگر خراش

تلخیص و ترجمہ۔ اثر نعمانی

جیمس ہیڈلے چیس کے تحیر خیز قلم کی روانی اور اثر نعمانی کی نکتہ رس تحریر کی جولانی کا ایک خوبصورت سنگم جسے قارئین پورے انہماک سے پڑھتے ہیں۔ سطر سطر تجسس اور فتنہ انگیز حشر سامانیوں سے بنی ہوئی ایک انوکھی کہانی جس میں بے خوف حریف سازشوں کے جال سنبھالے ایک دوسرے کو بے بس و لاچار کرنے کی گھات میں لگے ہوئے ہیں، ضرب و وار لگاتے ہیں جہاں مضروب کو آہ و فغاں تک کی مہلت نہیں ملتی۔ ہوش ربا حسن اور معصوم صورتوں کا استعمال ان کے بہترین ہتھیار تھے۔ روایتی اور غیر روایتی ہتھیاروں سے لیس دو حریف جب یوں صف آرا ہوتے ہیں تو ان میں سے سچ ایک ہی ہوتا ہے، دوسرا کندۂ جہنم... کبھی کبھی جھوٹ بھی طاقت اور بربریت کے سامنے سچائی پر غالب آجاتا ہے... لیکن یہ فتح عارضی ہوتی ہے...

محبت... دولت اور انتقام کے شعلوں میں گھر جانے والے جانبازوں کا معرکۂ خاص

گھر پہنچا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ میں نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ اینڈرسن نے دروازہ کھولا۔ میں نے اسے جوش اسمتھ کے ساتھ اپنی گفتگو کے بارے میں بتایا۔

"پاپا بروئے کار ہے۔" میں نے آخر میں کہا۔ "ہمیں اس کی توقع بھی تھی۔ مسز تھورسن کو دھمکا کر تحقیقات رکوا دی گئی۔ ابھی تک ٹیری کی کوئی خبر نہیں ملی۔ جہاں تک ہینک کا تعلق ہے تو میں اس کی زندگی جہنم بنا دوں گا۔" میں نے اینڈرسن کو بم کے بارے میں بتایا۔ "میں اس کا کلب تباہ کر دوں گا، اس کی کار تباہ کر دوں گا۔ پھر اس کے گھر کی باری آئے گی لیکن میں نہیں چاہتا کہ اسے مجھ پر شبہ ہو۔ اگر ہو گیا تو وہ اپنے مافیا کے دوستوں کے پاس جائے گا اور ان سے مدد مانگے گا جس کے بعد ہم مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔"

میں اٹھ کر کچن میں گیا۔ گتے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تلاش کیا اور اس پر موٹے موٹے حروف میں لکھا۔

"یہاں سیاہ فام لوگوں کی ضرورت نہیں ہے... کے۔ کے۔ کے۔"

میں نے یہ گتا اینڈرسن کو دکھایا۔

"یہ میں کلب کے دروازے پر لگا دوں گا تا کہ ہینک کو یہ خیال نہ آئے کہ میں اس کے پیچھے پڑا ہوں۔ کار کے پاس بھی ایسا گتا ڈال دیا جائے گا۔ اس طرح ہمیں کام کرنے کے لیے وقت مل جائے گا۔ مافیا والے جلد یا بدیر سمجھ جائیں گے کہ یہ سب کچھ میں کر رہا ہوں اور وہ جوابی کارروائی کریں گے۔ ہمیں اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اپنے کام کا آغاز کرتے ہی ہمیں انڈر گراؤنڈ جانا پڑے گا۔ مجھے ایک ایسی جگہ معلوم ہے جہاں ہم رہ سکتے ہیں۔ تم کیا کہتے ہو؟"

"تمہارے خیال میں یہی مناسب ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اینڈرسن نے جواب دیا۔

"میں سونے جا رہا ہوں۔" میں کھڑا ہو گیا۔ "تم اس بم کی کارروائی سے الگ رہنا۔ اسے میں اپنے طور پر انجام دوں گا۔"

"جی نہیں۔ جہاں تم جاؤ گے، وہاں میں جاؤں گا۔"

"لیکن تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک آدمی کا کام ہے۔"

"دو آدمی ہمیشہ ایک کے مقابلے میں زیادہ مفید ہوتے ہیں۔" اینڈرسن نے کہا اور اٹھ کر اپنے بیڈ روم کی طرف چل دیا۔

میں نے جلدی سے غسل کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ تکیے پر اپنا ہاتھ اس جگہ رکھا جہاں سوزی اپنا سر رکھتی تھی۔ میں نے تصور میں اس کے چہرے پر تیزاب گرتے دیکھا۔ پھر تکلیف سے بے تاب ہو کر وہ سڑک کی طرف بھاگی اور ایک ٹرک نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے کچل دیا۔ اس رات میں سو نہیں سکا۔ کروٹیں بدلتے بدلتے صبح ہو گئی۔ سورج نکلنے کے بعد تھوڑی نیند آئی مگر صرف ایک گھنٹے کے بعد آنکھ کھل گئی۔ میں اٹھا، شیو کیا، نہایا اور کپڑے تبدیل کیے۔ اینڈرسن پہلے ہی اٹھ چکا تھا۔ اس نے کافی بنائی۔ ہم نے خاموشی سے ناشتا کیا۔

"چینگ سے بدلہ لینے کے بعد کیا کرو گے؟" اس نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔ ابھی تو یہ بدمعاش میرے ذہن پر سوار ہے۔ میں کوئی دوسری بات نہیں سوچ سکتا۔"

"میں سمجھتا ہوں مگر کیا کوئی ایسا کام نہیں جو میں کر سکوں؟"

"خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ تم میرا ساتھ دے رہے ہو تو بس دیتے رہو۔"

"اچھی بات ہے تو میں ابھی جا کر ذرا موقع کا جائزہ لیتا ہوں۔ پھر ہم کچھ کریں گے۔ تم کیا کرو گے؟"

"رات کا انتظار کروں گا۔ تمہارا دل جو چاہے کرو۔"

"تو میں کار لے جاؤں؟"

"بڑے شوق سے۔ میں گھر ہی میں رہوں گا۔ ہمیں رات کے تین بجے تک انتظار کرنا ہے جب کلب بند ہوتا ہے۔"

اینڈرسن چلا گیا۔ میں نے آہستہ آہستہ ناشتے کے برتن صاف کیے۔ میز درست کی اور کمرے میں بیٹھ کر سگریٹ پیتے ہوئے سوزی کے بارے میں سوچنے لگا۔ وقت بڑی سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ ایک بجے اینڈرسن آ گیا۔ اس نے کھانا تیار کیا۔ پھر کھانے کے دوران میں اس نے بتایا کہ ساحلی علاقے میں لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بلیک کیسٹ کلب تین بجے نہیں بلکہ ڈھائی بجے بند ہو جاتا ہے۔ چنانچہ طے ہوا کہ میں دو بجے روانہ ہو جاؤں گا تاکہ کلب کے گرد و پیش کا جائزہ لے سکوں۔ ظاہر تھا کہ مجھے بم رکھنے کے لیے کلب کے اندر جانا پڑتا۔

کھانے کے بعد مجھ سے گھر میں نہیں بیٹھا گیا چنانچہ آوارہ گردی کرنے نکل گیا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی مگر مجھے بارش کی پروا نہیں تھی۔ میں گھنٹوں یونیورسٹی کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ گھومتے گھومتے پولیس ہیڈ کوارٹر جا نکلا تو خیال آیا کہ سارجنٹ جو ہیگر سے مل لوں۔ ڈیسک سارجنٹ چارلی نیئر نے ہمدردی سے میری طرف دیکھا، سوزی کی موت پر اظہارِ افسوس کیا اور بتایا کہ ہیگر اپنے آفس میں موجود ہے۔ میں اس کے آفس میں گیا۔

"کوئی تازہ خبر؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"کوئی خاص نہیں۔" ہیگر نے جواب دیا۔ "ہمیں ایک ایسا گواہ ملا ہے جو وہیں ایک دوسری بلڈنگ میں رہتا ہے۔ اس نے سارا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کار کا نمبر بھی نوٹ کر لیا مگر کار چرائی گئی تھی۔ دونوں آدمیوں نے دستانے پہن رکھے تھے اس لیے انگلیوں کے نشانات نہیں ملے۔ کار کا ڈرائیور سیاہ فام تھا۔ بس اس کے علاوہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔"

"اسے یقین ہے کہ ڈرائیور سیاہ فام تھا؟"

"ہاں۔"

"اگر ابھی تک کوئی خاص بات معلوم نہیں کر سکے ہو تو میں تمہارا وقت ضائع نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔

ہیڈ کوارٹر سے نکل کر میں ساحلی علاقے کی طرف چل دیا۔ بلیک کیسٹ کلب کے باہر اولڈس کار کھڑی تھی جو کبھی ٹیری کی ملکیت رہ چکی تھی۔ میں نے اپنی رفتار آہستہ کر دی۔ اس وقت ساڑھے چار بجے تھے۔ میں سمندر کے کنارے پہنچا اور ویلنسکی کی شان دار لانچ کو غور سے دیکھا۔ میرے علاوہ کئی سیاح بھی لانچ کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ چینگ کے بعد اس لانچ کا نمبر آئے گا۔ اس کے لیے مجھے بہت زیادہ طاقت کا بم درکار ہوگا۔ کیا علی حسن ایسا بم بھی بنا سکتا ہے؟ مجھے معلوم ہوا تھا کہ اگر قیمت اچھی دی جائے تو وہ سب کچھ فراہم کر سکتا ہے۔ میں کافی چل چکا تھا اس لیے ایک ٹیکسی پکڑی اور گھر آ گیا۔ اینڈرسن نہیں گیا ہوا تھا۔ مجھے ابھی مزید وقت گزارنا تھا۔

اینڈرسن۔۔۔ آٹھ بجے واپس آیا۔ وہ کھانے کی کچھ چیزیں بھی لے آیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ سامان تھا۔ اس نے پوچھنے پر بتایا کہ یہ کچھ ایسی چیزیں ہیں جو کلب میں داخل ہونے اور چینگ کی کار کے توڑنے پھوڑنے میں کام آ گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ پولیس کو ایسا گواہ مل گیا ہے جس نے ڈرائیور کو بخوبی دیکھا تھا اور اس کا بیان ہے کہ ڈرائیور کوئی سیاہ فام تھا۔

"یہ بات تو کم و بیش ہمیں معلوم تھی۔" اینڈرسن نے کہا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں کرسی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ پینے لگا۔ اینڈرسن برتن دھونے میں مصروف ہو گیا۔ میرا دل وہسکی پینے کو چاہ رہا تھا مگر یہ وقت شراب پینے اور ذہن کو غبار آلود کرنے کا نہیں تھا۔ میں بم لینے کے لیے جانے لگا تو اینڈرسن بھی ساتھ ہو لیا۔ اسے کار میں چھوڑ کر میں حسن کی دکان پر گیا۔ یوم بادمری ہونے کے باوجود سیاحوں کا ہجوم ساحلی علاقے میں موجود تھا۔ اپنی بیوی سے کچھ بات کر کے حسن میرے پاس آیا۔ میں نے اس سے پوچھا بم تیار ہے، اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"یہ بم ویسا ہی ہے جیسا تم نے کہا تھا۔" وہ بولا۔ "اسے استعمال کرنا بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس کے اوپر ایک سوئچ ہے سوئچ کو داہنی طرف گھمانا ہوگا۔ اس کے دس منٹ بعد بم پھٹ جائے گا۔ جب تک سوئچ کو حرکت نہ دی جائے، بم بالکل محفوظ ہے۔ گر بھی جائے تو کوئی بات نہیں۔"

میں نے اسے باقی رقم دی جسے اس نے احتیاط سے گن کر جیب میں رکھ لیا۔ بم ایک پلاسٹک کے تھیلے میں تھا۔ اس نے وہ تھیلا مجھے دے دیا۔

"اگر مجھے کسی اور بم کی ضرورت ہو تو مل جائے گا؟" میں نے پوچھا۔ "مثال کے طور پر کوئی ایسا بم جو ایک بڑی لانچ کو ڈبو سکے۔"

"مل تو جائے گا مگر قیمت بہت زیادہ ہوگی۔" حسن نے جواب دیا۔ "بحری فوج کا ایک سارجنٹ جو میرا دوست ہے، اسے تیار کر سکتا ہے۔"

"کیا ایسا بم تم فراہم کر سکتے ہو؟"

"اگر قیمت مناسب ہو تو ہر چیز مل سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے اس سلسلے میں، میں تم سے پھر ملوں گا۔"

میں واپس آیا اور بم کے تھیلے کو پچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔

"کیا یہ بم ہے؟" اینڈرسن نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے کار اسٹارٹ کی۔ "اب ہم گھر جا کر انتظار کریں گے۔"

اپنی بلڈنگ کے گیراج میں کار کھڑی کرنے کے بعد میں نے پلاسٹک کے تھیلے سے بم نکال کر دیکھا۔ وہ سیاہ رنگ کے ایک چوکور ڈبے کی شکل میں تھا اور جیسا حسن نے کہا تھا، اس کے اوپر ایک سوئچ لگا تھا۔ میں نے بم واپس تھیلے میں رکھ دیا۔ اپنے اپارٹمنٹ پہنچ کر میں نے تھیلا میز پر رکھ دیا۔ اینڈرسن کافی بنا کر لے آیا۔ ہم نے کافی پی۔ اس نے کہا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے سونے جا رہا ہے، جب میں جانے لگوں تو اسے اٹھا دوں۔

میں نے انتظار کا وقت کمرے میں ٹہلتے اور سوچتے ہوئے گزارا۔ پونے دو بجے میں نے اینڈرسن کو اٹھا دیا۔ وہ بڑے آرام سے سو رہا تھا۔ مجھے اس پر رشک آنے لگا۔ کچھ دیر بعد ہم بم کا تھیلا اور گتے کے دو ٹکڑے ساتھ لے کر جن پر کے۔ کے کا نوٹس لکھا تھا، ساحلی علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم نے کلب سے سو گز کے فاصلے پر کار پارک کر دی۔

میں اینڈرسن کو کار میں چھوڑ کر کلب کا جائزہ لینے چل دیا۔ کلب کے قریب سے گزرا تو اندر سے موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ کلب کے قریب ایک گلی تھی جس کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ یہ کلب کے عقبی حصے کی جانب لے جاتی ہے۔ میں آہستہ قدموں سے گلی میں داخل ہوا۔ کچھ دور جا کر مجھے کلب کی ایک عقبی کھڑکی نظر آئی۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ دو سیاہ فام اِدھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔ کمرا کلب کے کچن کا پچھلا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ ایک سیاہ فام نے گندا ایپرن اتارا۔ لگتا تھا کہ وہ گھر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ دوسرا ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا۔ میں واپس گیا، اینڈرسن کو کھڑکی کے بارے میں بتایا جس کے ذریعے آسانی سے کلب کے اندر جایا جا سکتا تھا۔

ہم انتظار کرنے لگے۔ ساحلی علاقہ رفتہ رفتہ سنسان ہوتا جا رہا تھا۔ بارش تیزی سے اور مسلسل ہو رہی تھی۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ صرف کلب کی بتیاں روشن تھیں۔ ڈھائی بجتے بجتے کلب کی بیشتر بتیاں بجھ گئیں۔ کچھ ملی جلی آوازیں ابھریں اور پھر تقریباً تیس سیاہ فام مرد و عورتیں کلب سے باہر نکلے اور اپنی اپنی راہ چل دیے۔ پھر چار تو ی ہیکل سیاہ فام باہر آئے۔ یہ غالباً کلب کا اسٹاف تھا۔ وہ سب قریب ہی کھڑی ایک کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ تین بجے کے قریب چینگ اسمتھ لے برآمد ہوا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی تھا جس نے سفید جیکٹ اور چوڑے چھجے کا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ چینگ نے کلب کا دروازہ مقفل کیا۔ پھر وہ دونوں چینگ کی اولڈس کار میں بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔

"یہ دوسرا آدمی کون تھا؟" اینڈرسن نے پوچھا۔ "وہ تو سفید فام معلوم ہو رہا تھا۔"

"مجھے نہیں معلوم اور نہ ہی مجھے اس کی پروا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "چلو آؤ ہمیں ایک اہم کام کرنا ہے۔"

ہم کار سے باہر نکلے۔ میرے ہاتھ میں بم کا تھیلا اور ایک طاقتور ٹارچ تھی۔ عقبی کھڑکی کھول کر اندر داخل ہونا کچھ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ میں نے ٹارچ روشن کر دی اور اینڈرسن سے کہا کہ وہ گتے کا ٹکڑا بیرونی دروازے پر لگا دے اور خود بم لے کر اس بڑے کمرے میں آیا جہاں بار اور ڈانس فلور واقع تھا۔ ریوالور ہاتھ میں لیے کر پورے کلب کا جائزہ لیا تاکہ اطمینان ہو جائے کہ کلب میں کوئی فرد تو موجود نہیں ہے۔ مطمئن ہو کر میں بڑے کمرے میں واپس آیا۔ ہم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk
digestpk.blogspot.com

کا سوئچ دائیں طرف گھمایا اور تیزی کے ساتھ عقبی کھڑکی کے ذریعے کلب سے باہر آ گیا۔ اینڈرسن پہلے سے کار میں بیٹھا تھا۔ میں کار کا اسٹیئرنگ پکڑ کر بم کے پھٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ سوزی کی موت کا انتقام لینے کے سلسلے میں یہ پہلا قدم ہے۔ دس منٹ گزر گئے مگر کچھ نہیں ہوا۔ اینڈرسن کو شک ہونے لگا کہ بم نہیں پھٹے گا۔ پندرہ منٹ گزرے ہی تھے کہ بم ایک زوردار دھماکے سے پھٹ گیا۔ دھماکا اتنا زبردست تھا کہ ہماری کار تک ہل گئی۔ کلب کی بیرونی کھڑکیاں اڑ کر ساحلی علاقے میں جا گریں اور پھر ایک شور کے ساتھ کلب کی چھت بیٹھ گئی۔ یہ منظر میرے اطمینان کے لیے کافی تھا۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور تیزی سے آگے بڑھا تا کہ پولیس کی آمد سے قبل ساحلی علاقے سے نکل جاؤں۔ میں جو چاہتا تھا کر گزرا۔ بلیک کیسٹ کلب ہمیشہ کے لیے تباہ ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے ایک بوجھ سا اتر گیا ہو۔

''بم نے تو اپنا کام کر دکھایا۔'' اینڈرسن بولا۔ ''اب کیا کرنا ہے؟''

''تمہیں معلوم ہے ہینک کہاں رہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ضرور معلوم ہے۔''

''اب ہم وہاں جائیں گے اور اس کی کار تباہ کر دیں گے۔''

وہ مجھے راستہ بتانے لگا۔ کچھ دیر بعد ہم ہینک کی قیام گاہ پہنچ گئے۔ میں نے کار ایک طرف پارک کی۔ ہم دونوں باہر نکلے۔ لکڑی کے ڈنڈوں اور ہتھوڑوں سے لیس ہم انڈر گراؤنڈ گیراج میں داخل ہوئے۔ پھر دس منٹ سے بھی کم وقت میں ہینک کی کار ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو گئی۔ شور ضرور ہوا مگر انڈر گراؤنڈ ہونے کی وجہ سے باہر زیادہ محسوس نہیں ہوا ہوگا... اور جو کچھ ہوا ہوگا رات کے سوا چار بجے گہری نیند سونے والوں کو اس کی کیا پروا ہو سکتی تھی۔ ہم نے ٹائر تک پھاڑ دیے تھے۔ میں نے کے۔ کے۔ کے والا گتے کا ٹکڑا وہاں ڈال دیا اور ہم اپنی کار میں واپس آ گئے۔

''اب تو مطمئن ہو؟'' اینڈرسن نے پوچھا۔

''ہاں، اب میں اطمینان سے سو سکوں گا۔ شکریہ اینڈرسن۔'' میں نے جواب دیا۔

☆☆☆

سوزی کی موت کے بعد میں نے چین کی نیند لی اور بغیر کوئی خواب دیکھے سوتا رہا۔ پھر اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہو کر کمرے سے نکلا تو سوا گیارہ بج رہے تھے۔ اینڈرسن نے ناشتا تیار کر لیا تھا۔ ناشتا کرتے ہوئے اس نے مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔

''اب تو انتقام کی آگ بجھ گئی؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں ایک حد تک۔'' میں نے جواب دیا۔ ''چونکہ کار چلا رہا تھا۔ اسے سزا مل گئی۔ اب اس آدمی کو تلاش کرنا ہے جس نے تیزاب پھینکا تھا۔ اسے بھی سزا دینا ہے۔''

''ٹھیک ہے، اسے بھی تلاش کر لیں گے۔'' اینڈرسن نے کہا۔

ناشتے کے بعد میں اور اینڈرسن کار میں ساحلی علاقے کی طرف پہنچے۔ کار پارک کی اور اس جگہ گئے جہاں کبھی بلیک کیسٹ کلب ہوا کرتا تھا۔ سیاحوں کی ایک بھیڑ کلب کے ملبے کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ ساحلی علاقے کے دونوں کانسٹیبل انہیں آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ مجھے سراغ رساں لپسکی نظر آ گیا۔ میں اینڈرسن کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھا۔ ایک کانسٹیبل نے مجھے روکنا چاہا۔ میں نے لپسکی کو آواز دی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور کانسٹیبل کو اشارہ کیا کہ مجھے آنے دیا جائے۔ میں اس کے قریب پہنچا۔

''ذرا دیکھو تو۔'' لپسکی بولا۔ ''کیسی تباہی ہوئی ہے۔'' مجھے اپنے چہرے سے اطمینان کا تاثر چھپانا مشکل ہو گیا۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بم پھٹا ہو۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک کہا اور یہ ایک ایسی بات ہے جو اس شہر میں کبھی نہیں ہوئی۔'' لپسکی نے جواب دیا۔ ''میئر بہت پریشان ہے۔ ویسے وقت آ گیا تھا کہ کوئی اس کلب کو ٹھکانے لگا دے۔ جس نے بھی یہ کام کیا ہے، مکمل طور پر کیا ہے۔''

لپسکی مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''دروازے پر کے۔ کے۔ کے کا ایک نوٹس لگا تھا مگر یہ نہ مجھے فریب دے سکا نہ کسی اور کو۔ یہ کام کسی ایسے شخص کا ہے جو ہینک سے شدید نفرت کرتا تھا۔''

''ممکن ہے تمہارا خیال ٹھیک ہو۔ ابھی تم ہینک سے ملے یا نہیں؟''

''ملا تھا مگر زیادہ بات نہیں کی۔'' لپسکی نے بتایا۔ ''کسی نے اس کی کار بھی تباہ کر دی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ بھی اسی آدمی کا کام ہے جس نے کلب میں بم رکھا تھا۔ ہینک غصے میں پاگل ہو رہا ہے کہ ہم اس آدمی کو تلاش کریں۔ ٹھیک ہے، یہ ہمارا کام ہے کہ تحقیقات کریں مگر ہمیں اس کی زیادہ فکر نہیں ہے۔ ہینک کا یہ حشر ہونا ہی تھا۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔ ''سنا ہے تم نے ایجنسی کی ملازمت چھوڑ دی ہے؟''

''ٹھیک سنا ہے۔ سوزی کی موت نے زندگی سے میری دلچسپی کم کر دی ہے۔ ممکن ہے کچھ مدت کے بعد ملازمت پر واپس چلا جاؤں۔ تم لوگ سوزی کی موت کے بارے میں کیا کر رہے ہو؟''

''پوچھ گچھ جاری ہے۔'' لپسکی نے جواب دیا۔ ''ایک اور گواہ مل گیا ہے۔ وہ ایک عورت ہے۔ اس سے ہمیں اس آدمی کا حلیہ معلوم ہوا ہے جس نے تیزاب پھینکا تھا۔ حلیہ زیادہ واضح نہیں ہے لیکن اس سے مدد مل سکتی ہے۔ وہ ایک مضبوط جسم کا چوڑے شانوں والا آدمی ہے۔ اس نے سفید جیکٹ اور چوڑے چھجے کا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ اب ہم اسے تلاش کر رہے ہیں۔''

سپاٹ چہرے کے ساتھ میں نے سر ہلا دیا۔ مجھے وہ آدمی یاد آیا جو ہینک کے ساتھ کلب سے نکلا تھا۔ سفید جیکٹ اور ایسا ہی ہیٹ پہنے ہوئے۔ پھر وہ ساتھ ساتھ ہی گئے تھے۔ لپسکی بدستور مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''دیکھو ویلیس، ہینک کو تو سزا مل گئی۔'' وہ بولا۔ ''اب ہم مزید کوئی مصیبت نہیں چاہتے۔ یہ ایک بہت حساس علاقہ ہے۔ اخبارات میں بم پھٹنے کی خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی ہے۔ دولت مند آدمی بم کے دھماکوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ ابھی سے ہوٹلوں میں اگلے مہینے کی ریزرویشن منسوخ کرائی جانے لگی ہے۔ اب ہم کسی اور بم کا پھٹنا گوارا نہیں کریں گے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو؟''

''تم یہ سب مجھ سے کیوں کہہ رہے ہو؟ بہتر ہے اس سے کہو جس نے بم رکھا تھا... بشرطیکہ وہ سننے پر آمادہ ہو۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے جو چاہے کرو مگر میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ کوئی اور بم پھٹا تو ہم اس آدمی کو نہیں چھوڑیں گے۔ اسے کم سے کم پندرہ سال کی سزا ہوگی۔''

''تو اس سے کہو جس نے بم رکھا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا چلتا ہوں پھر ملاقات ہوگی۔''

اور میں لپسکی کو بدستور گھورتے چھوڑ کر ہجوم سے گزرتے ہوئے کار تک واپس آ گیا۔ میں نے اینڈرسن کو وہیں ٹھہرنے کے لیے کہا اور نیپچون تیورن پہنچا۔ البرٹی اپنی مخصوص جگہ بیٹھا تھا اور دو سیاح اس سے باتیں کر رہے تھے۔ جب وہ البرٹی کا فوٹو کھینچ کر چلے گئے تو میں آگے بڑھا۔

''سیاحوں سے آمدنی شروع ہو گئی البرٹی؟'' میں نے پوچھا۔

''او مسٹر ویلیس۔'' وہ بولا۔ ''آمدنی تو ہوتی ہی رہتی ہے لیکن سیزن اگلے ماہ سے شروع ہوگا۔'' اس نے کچھ غور سے میری طرف دیکھا۔ ''کیا غضب کا بم تھا۔ اس حرامی ہینک کو اچھی سزا ملی۔''

''کیا تم کسی ایسے آدمی کو جانتے ہو جو سفید جیکٹ اور چوڑے چھجے کا ہیٹ پہنتا ہے؟''

''ہولا منگی۔'' البرٹی کا منہ بن گیا۔ ''اس سے بچ کر رہنا مسٹر ویلیس۔''

''وہ ہے کون؟''

البرٹی نے گھبرائے ہوئے انداز میں ادھر اُدھر دیکھا اور دبی آواز میں بولا۔

''ویلنسکی کے چمچوں میں سے ایک ہے۔''

''وہ مجھے کہاں مل سکتا ہے؟''

''جب وہ یہاں آتا ہے تو ہینک کے ساتھ رہتا ہے۔ مہینے کی پہلی تاریخ سے کچھ پہلے آ جاتا ہے، مافیا کا بھتا جمع کرنے کے لیے۔''

''شکریہ البرٹی۔'' میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور واپس کار کی طرف چل دیا۔

''پولیس کو شبہ ہے کہ بم میں نے رکھا تھا۔'' میں نے اینڈرسن کو بتایا۔ ''لپسکی نے مجھے براہ راست وارننگ دی ہے۔''

''پولیس تو ہمیشہ کسی نہ کسی پر شبہ کرتی رہتی ہے۔'' اینڈرسن نے کہا۔ میں نے اسے البرٹی سے اپنی گفتگو کے بارے میں بتایا۔

''ہولا منگی کیا نام ہے؟'' اینڈرسن بولا۔ ''پھر اس کا کیا کرو گے؟''

''ایسی مرمت کروں گا کہ باقی زندگی وہیل چیئر پر گزارے گا۔'' میں نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''کب؟''

''آج شام سات بجے ہم ہینک کے اپارٹمنٹ جائیں گے اور موقع کا انتظار کریں گے۔''

''تم منگی کو سنبھالنا، میں ہینک کو دیکھ لوں گا۔'' اینڈرسن نے کہا۔

''خیال اچھا ہے۔'' میں نے کہا۔

ہم اپنے اپارٹمنٹ پہنچ کر ابھی بیٹھے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھا لیا۔

Digest of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مسٹر ویلیس!" کسی عورت کی آواز ابھری۔

"ہاں... تم کون ہو؟"

"میں مسٹر ویلنسکی کی سیکریٹری ہوں۔" جواب ملا۔ "مسٹر ویلنسکی تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم پانچ بجے سے پہلے اسپینش بے ہوٹل آسکتے ہو؟ میں لابی میں تمہارا انتظار کروں گی اور پھر ان کے سوئٹ تک لے جاؤں گی۔"

میرے جواب دینے سے پہلے اس نے ریسیور رکھ دیا۔ میں نے اینڈرسن کو بتایا۔ اس نے آہستہ سے سیٹی بجائی۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ اسپینش بے بہت مہنگا ہوٹل تھا۔

"پھر کیا تم جاؤ گے؟" اینڈرسن نے پوچھا۔

"ہاں، جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

پانچ بجنے سے چند منٹ پہلے میں ہوٹل کی لابی میں تھا۔ وہ استقبالیہ کاؤنٹر کے قریب کھڑی تھی۔ لمبا قد، سیاہ گھنگرالے بال، سبز آنکھیں۔ مجموعی طور پر بہت دلکش تھی...... متناسب جسم پر موزوں ترین لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنا خوب صورت ہاتھ ہلایا اور میری طرف آئی۔

"مسٹر ویلیس! میرا نام سانڈرا ہے۔ پورے نام کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے سب سانڈرا کے نام سے جانتے ہیں۔"

"ہیلو سانڈرا۔" میں نے اس کے سراپا پر نظریں دوڑائیں جہاں وہ سب کچھ تھا جس کی رومان پسند مرد آرزو کرتے ہیں۔ "مجھے کیوں بلایا گیا ہے؟"

"مسٹر ویلنسکی تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ "ذرا محتاط رہنا۔ جیسا وہ نظر آتا ہے، ویسا نہیں ہے۔"

وہ گھوم کر لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ ہم چھٹی منزل پر آئے۔ ایک لمبی راہداری طے کرکے وہ ایک دروازے کے سامنے رکی۔ چابی سے قفل کھولا اور گھوم کر میری طرف دیکھا۔

"محتاط رہنا۔" وہ آہستہ سے بولی اور دروازہ کھولا۔ ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ دوسری جانب ایک بڑا کمرا تھا، ہر آرائش سے آراستہ۔ میں اندر داخل ہوا۔

"مسٹر ویلنسکی۔" سانڈرا نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ "مسٹر ویلیس آگئے ہیں۔" اور پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ "وہ ٹیرس پر ہے۔ چلے جاؤ۔"

میں آگے بڑھا۔ ویلنسکی ٹیرس پر جنگلے کے پاس کھڑا تھا۔ سانڈرا کی آواز سن کر وہ میری طرف گھوما اور مجھے دیکھ کر آگے بڑھا۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی۔ میں ایک تنومند کرخت چہرے اور درشت تاثرات والے آدمی کی توقع کر رہا تھا مگر وہ چھوٹے قد اور قدرے موٹے جسم کا آدمی اپنے انداز سے کوئی کامیاب بزنس مین معلوم ہوتا تھا۔

"تمہارے آنے سے بہت خوشی ہوئی مسٹر ویلیس۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ قدرے ہچکچاتے ہوئے میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "آؤ، اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں۔" اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

ہم بیٹھ گئے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ میرا جائزہ لے رہا ہے۔ اس کی ہلکی نیلی آنکھیں مجھے پرکھنے والے انداز سے دیکھ رہی تھیں۔

"کافی پیو گے؟ ڈرنک کا تو ابھی وقت نہیں ہوا۔"

"جی نہیں، شکریہ۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا چائے؟"

"جی نہیں، شکریہ۔"

"اچھی بات ہے۔" اس نے کندھے اچکائے۔ "تو پھر بات کرتے ہیں۔ میں بھی مصروف آدمی ہوں اور تم بھی۔ ہمیں ایک دوسرے کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔" میں خاموش رہ کر اس کے مزید بولنے کا منتظر رہا۔

"میں بڑی سنجیدگی سے بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے مس سوزی کی موت کا بے حد افسوس ہے۔ بدقسمتی سے یہ حرکت ایک ایسے آدمی نے کی جو میرا ملازم ہے۔ وہ ایسا بے وقوف کند ذہن آدمی ہے جو دولت کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔ جب میں نے اس سے باز پرس کی تو اس نے اعتراف کیا کہ یہ بے رحمانہ حرکت کرنے کے لیے اسے پانچ ہزار ڈالرز دیے گئے تھے۔ اس نے بتایا کہ یہ رقم اسے چینگ اسمڈلے نے دی تھی جو کسی اور کی خواہش پر یہ کام کرانا چاہتا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ فرد کون ہے۔ مزید کریدنے سے معلوم ہوا کہ یہ ذاتی انتقام کا معاملہ تھا۔"

میں خاموشی سے سن رہا تھا۔ میرے تصور میں چینگ کے اندر کا وہ منظر ابھرا جب انجیلا نے مجھے دھمکی دی تھی، میں تمہیں اس کی سزا دوں گی۔ ایسی سزا جسے تم ساری زندگی یاد رکھو۔ تو پھر کیا وہ انجیلا تھی جس نے سوزی کے چہرے پر تیزاب پھینکنے کے لیے چینگ کو پانچ ہزار ڈالرز دیے تھے؟

"مسٹر ویلیس!" ویلنسکی کہہ رہا تھا۔ "تم نے چینگ سے اپنا حساب برابر کرلیا اور میں نے اپنے ملازم کو قرار واقعی سزا دے دی۔ وہ اب ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ میری ایک پوری تنظیم ہے جو ایسے افراد سے تشکیل ہے۔ کوئی ہنگامہ نہیں اور بات ختم۔ جہاں تک چینگ کا تعلق ہے تو اب وہ میری ملازمت میں نہیں ہے اور اگر تمہیں اس سے اطمینان ہوتا ہو تو اسے بھی ماضی کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔ کیا اس سے تمہیں خوشی ہوگی؟"

"تمہارا مطلب ہے کہ تم اپنا انگوٹھا نیچے جھکا دو گے اور چینگ کو مار دیا جائے گا؟" میں نے کہا۔

"تم نے اظہار ذرا سخت الفاظ میں کیا ہے مگر مطلب یہی ہے۔"

"نہیں، اسے زندہ رہنے دو۔"

"تم معاف کرنے والی فطرت رکھتے ہو۔" ویلنسکی نے کہا۔ "اگر کوئی میری گرل فرینڈ کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا جو ان دونوں نے تمہاری گرل فرینڈ کے ساتھ کیا تو میں اسے ہرگز معاف نہیں کرتا۔"

"اسے زندہ رہنے دو۔ میں اس کی زندگی کو جہنم بنا دوں گا۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم ایسا کرسکتے ہو۔"

سانڈرا کافی کی ٹرے لے کر آئی۔ ٹرے میز پر رکھ کر دو پیالی کافی بنائی اور چلی گئی۔ وہ اس وقت اتنی پرکشش نظر آرہی تھی کہ مجھے اسے نہ دیکھنے کے لیے بڑی کوشش کرنا پڑی۔ مجھے احساس ہوا کہ ویلنسکی مجھے گھور رہا ہے۔

"بہت کام کی لڑکی ہے۔" وہ بولا۔ "ایک وقت اس کا باپ میرے لیے کام کرتا تھا۔ پھر اس کا انتقال ہوگیا۔ میں نے سانڈرا کو اپنی سیکریٹری بنا لیا۔ وہ اتنی ہوشیار ثابت ہوئی کہ اب اس کے بغیر کام چلنا مشکل ہے۔"

میں خاموش رہا۔ اس نے کافی کی پیالی میری طرف بڑھائی مگر میں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔

"اور اب مسٹر ویلیس۔" اس کی بات جاری تھی۔ "مجھے امید ہے کہ تم مطمئن ہوگئے ہوگے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ تم مطمئن ہو جاؤ۔ میرے ملازم کا اب وجود نہیں ہے۔ چینگ کا مستقبل میں تمہارے ہاتھ میں چھوڑتا ہوں۔ مجھے اندازہ ہے کہ چینگ کا کلب تباہ کرکے تم نے فوری انتقام لے لیا لیکن اس جیسے حساس شہر میں جب کوئی بم دھماکا ہوتا ہے تو یہاں آنے والے دولت مندوں کو خوف زدہ کردیتا ہے۔ اس لیے میں بم کی کوئی اور واردات نہیں چاہتا۔ میرا بزنس دولت مندوں کے دم سے ہے۔ انہیں اندیشہ ہوا کہ بم کے دھماکے ہوں گے تو وہ کہیں اور چلے جائیں گے اور یہ بات میرے کاروبار کے لیے خراب ہوگی۔ تم ایک ذہین آدمی ہو اس لیے سمجھ سکتے ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ لیکن ممکن ہے، تمہیں مزید مصیبت کھڑی کرنے کا شوق چرائے۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ ایسا مت کرنا۔"

وہ مسکرایا۔ اب مجھے اس آدمی اور اس کی مسکراہٹ سے نفرت ہوتی جارہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی سانپ مسکرا رہا ہو۔

"جیسا کہ شاید تم جانتے ہوگے۔" ویلنسکی کہہ رہا تھا۔ "کہ میں ایک بہت بڑی تنظیم کا حصہ ہوں۔ ایسی تنظیم جو دنیا کے ہر ملک میں کام کرتی ہے۔ اس لیے میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اس شہر میں کوئی اور ہنگامہ کھڑا مت کرنا۔ اگر کرو گے تو بہت پچھتاؤ گے۔ کیا یہ بات سمجھ میں آگئی؟"

"میں نے تمہاری بات سن لی۔" میں کھڑا ہوگیا اور ٹیرس سے چل کر اس بڑے رہائشی کمرے میں آیا۔ سانڈرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اب تک جتنی عورتیں بھی میں نے دیکھی تھیں، اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھیں۔ وہ ایسی عورت نہیں تھی جس سے میں سوزی کی طرح محبت کرسکتا۔ وہ ان سب عورتوں سے مختلف تھی جنہیں میں جانتا تھا۔ اس کی سبز آنکھیں خطرناک...... مجبور کرنے...... مسحور کرنے والی تھیں۔ اس کی ایک ایک حرکت سے ایسی خود اعتمادی کا اظہار ہو رہا تھا جس سے اکثر عورتیں محروم ہوتی ہیں۔ اس نے دروازہ کھولا اور جب میں باہر جانے کے لیے اس کے قریب سے گزرا تو اس نے سرگوشی میں کہا۔

"آج رات گیارہ بجے۔ تھری کریب ریسٹورنٹ۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے یقین نہیں آیا کہ اس نے واقعی وہ کہا تھا جو میں نے سنا۔ میں تصدیق کرنے کے لیے پلٹا مگر وہ دروازہ بند کرچکی تھی۔

☆☆☆

گھر پہنچا تو چھ بج چکے تھے۔ اینڈرسن، تھورسن کی فائل پڑھ رہا تھا۔ میں نے اسے ویلنسکی سے اپنی ملاقات کی تفصیل بتائی۔

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوزی کے معاملے میں مافیا کا ہاتھ نہیں تھا۔" میں نے آخر میں کہا۔ "بلکہ کسی نے چینگ اور منگی کی مدد سے اپنا ذاتی انتقام لیا ہے۔ منگی کسی ایسی جگہ دفن کر دیا گیا ہے جہاں اسے تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ہمیں اس کی فکر نہیں کرنا ہے۔ اب رہ گیا چینگ۔"

"ہاں... چینگ۔"

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہم اس سے ملنے جائیں گے اور معلوم کریں گے کہ اسے کس نے یہ کام کرنے کے لیے کہا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ انجیلا کی حرکت تھی لیکن میں یقینی طور پر جاننا چاہتا ہوں۔ چینگ نے منہ کھولا اور ثابت ہوگیا کہ وہ انجیلا تھی، تب ہم اس کے پیچھے جائیں گے۔''

''ہم چینگ جیسے گوریلے کا منہ کیسے کھلوا سکتے ہیں؟'' اینڈرسن نے پوچھا۔

''کیا تم کہیں سے بلو ٹارچ لا سکتے ہو؟''

''اوہ، ضرور۔'' اینڈرسن ہنسنے لگا۔ ''بہت اچھا خیال ہے۔ اس کی تھوڑی سنکائی کی جائے گی تو سب کچھ اگل دے گا۔''

میں نے اسکاچ کی بوتل سے دو گلاسوں میں وھسکی انڈیلی اور ہم خاموشی سے پینے لگے۔

''ویلنسکی تمہیں کیسا آدمی معلوم ہوا؟'' اینڈرسن نے پوچھا۔

''بہت خطرناک، سانپ کی طرح... ایسا آدمی جس سے بچنا چاہیے۔'' میں نے جواب دیا پھر اسے سانڈرا کے بارے میں بتایا۔ اس نے بڑی حیرت سے سنا۔

''پھر کیا اس سے ملنے جاؤ گے؟'' اس نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تمہیں کچھ معلوم ہے تھری کریب ریسٹورنٹ کہاں ہے؟''

ریسٹورنٹ اور کلبوں کے معاملے میں اینڈرسن کی معلومات بڑی وسیع تھیں۔

''ساحلی علاقے میں واقع ہے۔ بہت گراں ریسٹورنٹ ہے۔ سولی جو کے کلب کے پاس۔ سولی جو کلب تو دیکھا ہوگا؟''

''ہاں دیکھا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم بلو ٹارچ لے کر آؤ۔ میں ذرا چینگ کو فون کرلوں۔''

''امید ہے چوکیدار کے پاس ضرور ہوگی۔'' اینڈرسن نے کہا اور اپارٹمنٹ سے باہر چلا گیا۔

میں نے الماری سے ہتھکڑی نکالی۔ بکس سے اپنا اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور نکالا۔ چیک کیا، وہ بھرا ہوا تھا۔ ریوالور جیب میں رکھ کر فون ڈائریکٹری سے چینگ کا نمبر معلوم کرکے ڈائل کیا۔ کافی دیر تک گھنٹی بجتی رہی پھر وہ آیا۔

''کون ہے؟'' اس کی کرخت آواز ابھری۔

''مسٹر اسمڈلے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں پولیس ہیڈ کوارٹر سے بات کر رہا ہوں۔''

''اب کیا ہے... کیا تم نے اس کمینے کو تلاش کرلیا جس نے میرے کلب میں بم رکھا تھا؟''

''ہم اسی سلسلے میں تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ بس کچھ سوالات۔ اس کے لیے دو سراغ رساں تمہارے گھر بھیجے جارہے ہیں اوکے؟''

''جلدی بھیجنا۔ مجھے ایک گھنٹے بعد باہر جانا ہے۔'' اس نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

اینڈرسن ایک بلو ٹارچ لے کر واپس آیا۔

''چوکیدار کے پاس ہی مل گئی۔'' اس نے بتایا۔ ''بالکل نئی ہے اور خوب کام کرتی ہے۔''

''تب پھر آؤ چلیں۔''

''میں اس گوریلے سے خود نمٹنا چاہتا ہوں۔ کیا تم موقع دو گے؟''

''تم یہ دیکھنے کے لیے بے تاب ہو کہ تمہارا وہ پیتل کا پنچ اس پر کارگر ہوتا ہے یا نہیں؟''

''وہ ضرور کارگر ہوگا۔''

ہم دس منٹ میں ہی گرو و روڈ پہنچ گئے۔ لفٹ سے ٹاپ فلور پہنچے۔ میں ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ اینڈرسن نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کچھ دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ چینگ سامنے کھڑا تھا۔ اس نے بہت تنگ سی جینز پہن رکھی تھی۔ اوپری جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ اس کا جسم کسی پیشہ ور باکسر کی طرح شاندار تھا۔

''تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟'' اس نے پوچھا پھر چونکا۔ ''میں تمہیں جانتا ہوں۔ لعنت ہو تم پر۔ بھاگ جاؤ یہاں سے... اس سے پہلے کہ میں تمہارا چہرہ بگاڑ دوں۔''

اینڈرسن نے بہت آہستہ سے کچھ کہا جسے چینگ سن نہیں سکا اور پھر اس نے وہی کچھ کیا جو کہ اینڈرسن چاہتا تھا کہ کرے۔ اچھی طرح سننے کے لیے اس نے اپنا چہرہ اینڈرسن کی طرف جھکایا اور ایک بہترین ہدف پیش کیا۔ اینڈرسن کا مکا (اس نے انگلیوں میں پیتل کا پنچ پہن رکھا تھا) بجلی کی طرح چکا اور ایک دھماکے کے ساتھ چینگ کے جبڑے پر پڑا۔ چینگ کی آنکھیں اوپر چڑھ گئیں اور وہ کسی ایسے بیل کی طرح نیچے گرا جس کی گردن کلہاڑی سے کاٹ دی گئی ہو۔ ہم دونوں اسے کمرے کے اندر لے گئے۔ میں نے ایک ہتھکڑی اس کے ہاتھوں اور ایک اس کے پیروں میں ڈال دی۔ اینڈرسن نے بیرونی دروازہ اندر سے بند اور مقفل کردیا۔ پھر ہم نے چاروں طرف دیکھا۔ پہلے کبھی وہ رہائشی کمرا آراستہ اور آرام دہ... رہا ہوگا مگر اب اس کی حالت ابتر تھی۔ ہر چیز سے خستگی اور عدم دیکھ بھال ظاہر تھی۔ میں نے دونوں بیڈ روم اور کچن، باتھ روم دیکھے۔ سب کی یہی حالت تھی۔ اپارٹمنٹ میں کوئی اور نہیں تھا۔ ہم پانی کی بالٹی چینگ پر پھینک کر اسے ہوش میں لائے۔ اینڈرسن نے بلو ٹارچ کا آن بٹن دبایا۔ سسکاری کی آواز کے ساتھ اس کے چھوٹے سوراخوں سے نیلا شعلہ نکلنے لگا۔

چینگ نے ایک کراہ کے ساتھ آنکھیں کھولیں۔ اپنا سر جھٹکا۔ میں نے اس کی پسلیوں میں ایک ٹھوکر ماری۔ وہ پھر کراہا اور اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی پیشانی پر پیر رکھ کر فرش پر گرا دیا۔ وہ کسی ایسی جنگلی بلی کی طرح غرایا جو جال میں پھنس کر شکاری پر غراتی ہے۔

''تمہیں سوزی کے چہرے پر تیزاب پھینکنے کے لیے کس نے پانچ ہزار ڈالرز دیے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

میں نے اس کے ہاتھ پشت کی طرف کرکے ہتھکڑی پہنائی تھی۔ اس نے اسے توڑنے کی پوری کوشش کی مگر کچھ نہ بنا۔ وہ اس طرح کی ہتھکڑی تھی کہ کھولنے کی کوشش سے اور کس جاتی تھی۔

''پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔'' وہ بڑبڑایا۔ میں نے اینڈرسن کی طرف دیکھا۔

''ذرا اسے بلو ٹارچ کا مزہ چکھاؤ۔''

''بڑی خوشی سے۔'' اینڈرسن نے کہا اور بلو ٹارچ کا شعلہ چینگ کے ننگے سینے پر تیزی سے پھرایا۔ چینگ بڑے زور سے چیخا۔ لگتا تھا جیسے اس کی جان نکل گئی ہو۔ آنکھوں کی سختی اور نفرت غائب ہوگئی۔ اب ان میں خوف کے تاثرات جھلک رہے تھے۔

''بس مت کرو۔'' وہ گڑگڑایا۔ ''میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ بس یہ دوبارہ مت کرنا۔''

''تو پھر بتاؤ کہ تمہیں کس نے پانچ ہزار ڈالرز دیے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''انجیلا نے۔ اس شعلے کو مجھ سے دور رکھو۔''

''تفصیل سے بتاؤ۔'' میں نے کہا۔ اینڈرسن آگے بڑھا اور بلو ٹارچ کا شعلہ چینگ کے قریب لایا۔

''انجیلا میرے پاس آئی۔'' چینگ نے جلدی سے کہنا شروع کیا۔ ''وہ غصے سے پاگل ہورہی تھی کہ تم نے اسے تیری کی دولت پانے سے روک دیا۔ تیزاب پھینکنے کا خیال بھی اسی کا تھا۔ جب اس نے پانچ ہزار ڈالرز کی رقم پیش کی تو میں نے بولانگی سے بات کی جو ایسے ہر کام کا انتظام کرتا ہے۔ چنانچہ ہم دونوں نے مل کر یہ کام کیا۔ میرا مقصد اسے جان سے مارنا نہیں تھا۔ میں قسم کھاتا ہوں، ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اس کے چہرے کی تھوڑی سی کھال جلا دینا کافی ہوگا۔ مجھے گمان تک نہیں تھا کہ وہ روڈ کی جانب بھاگ کھڑی ہوگی اور ایک ٹرک کے نیچے آجائے گی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''پھر کیا تمہیں رقم مل گئی؟'' میں نے اس کی طرف نفرت سے دیکھا۔

''ہاں، مل گئی۔ جب انجیلا دینے کا وعدہ کرتی ہے تو ضرور پورا کرتی ہے۔ ڈھائی ہزار میں نے لیے، ڈھائی ہزار منگی کو دے دیے۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''معلوم نہیں۔'' چینگ نے بتایا۔ ''کل رات اسے ایک فون کال ملی تھی۔ اس نے کہا مجھے جانا پڑے گا۔ کوئی ضروری کام ہے اور جب سے گیا ہے واپس نہیں آیا ہے۔''

''اس نے بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟''

''میں اس سے سوالات نہیں کرتا۔'' چینگ نے جواب دیا، اس کی نظریں بلو ٹارچ پر لگی تھیں۔ ''اور میں کیا کوئی بھی جس کا دماغ صحیح ہو، اس سے سوال نہیں کرتا۔ مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہے۔''

میں اسے بتا سکتا تھا مگر خاموش رہنا بہتر سمجھا۔

''او کے چینگ، بات آگے بڑھ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب انجیلا پر آؤ۔ وہ تمہیں دس ہزار ڈالرز ماہانہ ادا کر رہی ہے... کر رہی ہے یا نہیں؟''

''مجھے نہیں۔'' چینگ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس کا ماجرا کچھ یوں ہے۔ منگی میرے پاس آتا ہے اور میرے کلب کو ادائیگی کی جگہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ معاوضے کے طور پر وہ پانچ سو ڈالرز فی ہفتہ دیتا ہے۔ چنانچہ میں اسے اجازت دیتا ہوں۔ یہ اپارٹمنٹ اس کا ہے۔ اس نے رہنے کی اجازت دی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں جانتا۔''

''رکو نہیں، بولتے جاؤ۔''

''لوگ میرے کلب آتے ہیں، مجھے لفافے دیتے ہیں۔ انجیلا مجھے ایک چھوٹا پلاسٹک کا بریف کیس دیتی ہے۔ میں ان سب کو ایک تھیلے میں ڈالتا ہوں۔ منگی آتا ہے اور تھیلا لے جاتا ہے۔''

''انجیلا کو بلیک میل کیوں کیا جا رہا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ قسم سے نہیں معلوم۔ یہ کام منگی کا ہے کہ وہ لوگوں کے راز معلوم کرے۔ میں کسی سے کوئی سوال نہیں کرتا اور نہ کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ منگی کو

Digest of Pakistan digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انجیلا کا کوئی راز معلوم ہے۔ کوئی ایسا راز جس کے لیے وہ اتنی بڑی رقم برابر دینے پر مجبور ہے۔ اس کی دماغی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ وہ نفسیاتی مریضہ ہے۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا اور فیصلہ کیا کہ وہ سچ ہی کہہ رہا ہے۔ منگی جیسا سنگ دل اور بے رحم آدمی چنگ جیسے احمق کو کچھ بتانا گوارا بھی نہیں کرے گا۔ میں نے اینڈرسن سے کہا کہ وہ چنگ کی ہتھکڑیاں کھول دے۔ اس نے کھول دیں۔

"میری بات غور سے سنو۔" میں نے چنگ سے کہا۔ "اب اس شہر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں نے منگی کے پاس سے بات کی تھی۔ منگی کا جسم کیڑے کھا رہے ہیں۔ اب تم اسے دوبارہ نہیں دیکھو گے۔ میں بھی تمہیں دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس شہر سے نکلنے کے لیے تمہیں بارہ گھنٹے دیتا ہوں۔ اس کے بعد اگر نظر آئے تو تمہارے دونوں گھٹنے بیکار کر دیے جائیں گے اور تم کبھی نہیں چل سکو گے۔ اس لیے دفع ہو جاؤ۔ سمجھ گئے؟"

"میں کہاں جاؤں؟ میرے پاس کچھ رقم بھی نہیں ہے۔" چنگ گڑگڑایا۔

"میں تم سے دوبارہ نہیں کہوں گا۔ اگر تم بارہ گھنٹے میں شہر سے نہیں گئے تو پھر کبھی اپنے قدموں سے چلنے کے قابل نہیں رہو گے۔" میں اینڈرسن کی طرف گھوما۔ "آؤ چلیں۔ مجھے اس کی صورت سے کراہت ہو رہی ہے۔"

ہم لفٹ سے نیچے اترے۔ سڑک پر آئے اور بارش میں بھیگتے ہوئے اپنی کار کی طرف چل دیے۔

☆☆☆

میں نے تھری کریب ریسٹورنٹ میں قدم رکھا تو ایک ویٹ نامی لڑکی نے میرا استقبال کیا۔

"آپ نے ریزرویشن کرائی ہے سر؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے بلایا گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ مسٹر ویلیس تو نہیں ہیں؟"

"ہوں تو وہی۔"

"مس سانڈرا آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔" لڑکی مسکرائی۔ "میرے ساتھ آئیں۔"

میں لڑکی کے پیچھے چلتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں داخل ہوا جو گاہکوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں سے ایک زینہ طے کر کے اوپر پہنچا۔ لڑکی نے ایک دروازہ کھول کر میری آمد کا اعلان کیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جہاں ایک تنہا میز پر سانڈرا بیٹھی تھی۔ میز پر کھانا تیار تھا۔ اس نے پہلے کھانے کی دعوت دی۔ بتایا کہ وہ اکثر یہیں کھانے آتی ہے۔

"جب کوئی عورت تنہا ہوتی ہے تو کسی ایسی جگہ کھانا مناسب ہوتا ہے جہاں لوگ اسے جانتے ہوں۔" اس نے کہا۔

"مجھے امید نہیں تھی کہ تم اتنی تنہا رہتی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"میرے کھانے کے اوقات غیر معمولی ہیں۔ کبھی کسی وقت، کبھی کسی وقت کھانے کی فرصت ملتی ہے۔ اب بھی ویلنسکی کیسینو چلا گیا ہے تو مجھے کھانے کا وقت ملا ہے۔"

کھانے کے بعد کافی کا دور شروع ہوا۔ سانڈرا غیر معمولی طور پر حسین اور ہر انداز میں ایک سنسنی خیز عورت تھی۔ اس کی کشش، اس کی جاذبیت کسی تارک الدنیا راہب کو بھی بہکا سکتی تھی۔ اسی کے ساتھ اس کی چمک دار سبز آنکھیں خبردار کر رہی تھیں کہ یہ ایک خطرناک عورت بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

"ہاں تو اب بتاؤ تم کیا بات کرنا چاہتی ہو؟" میں نے کافی پیتے ہوئے پوچھا۔

"اس خانہ خراب شہر میں تم پہلے آدمی ہو جس میں مجھے عزم اور حوصلہ نظر آ رہا ہے... اور مجھے ایک باحوصلہ آدمی کی ضرورت ہے۔"

"تمہیں یہ خیال کیسے ہوا کہ میں باحوصلہ ہوں۔"

"ایسا آدمی جو ٹیک گیسٹ جیسے کلب کو بم سے اڑا سکتا ہے اور اس کے تورپلا مالک چنگ کو اتنا خوف زدہ کر سکتا ہے کہ وہ شہر چھوڑ کر بھاگ جائے، اسے حوصلہ مند ہی کہا جائے گا۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ شہر چھوڑ کر چلا گیا ہے؟"

"آدھ گھنٹے پہلے اس نے مجھے فون کیا تھا۔" سانڈرا نے بتایا۔ "وہ ویلنسکی سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی آواز پہچان لی۔ میں نے اس سے کہا کہ ویلنسکی مصروف ہے اور پوچھا کیا کام ہے۔ اس نے بتایا کہ تم نے اس پر تشدد کر کے اگلوا لیا کہ انجیلا نے سوزی پر تیزاب پھینکنے کے لیے اسے پانچ ہزار ڈالرز دیے تھے پھر تم نے اسے دھمکایا کہ وہ شہر چھوڑ کر چلا جائے مگر اس کی جیب خالی تھی اور اس نے پوچھا کہ کیا ویلنسکی اسے کچھ رقم دے سکتا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جہنم میں جاؤ اور ریسیور رکھ دیا۔ پھر میں نے ایک آدمی کو چیک کرنے بھیجا۔ معلوم ہوا کہ چنگ میامی چلا گیا ہے۔"

میں خاموش بیٹھا رہا۔ میرا اندازہ تھا کہ ابھی وہ کچھ اور بھی کہنے والی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں نے ویلنسکی کو کچھ نہیں بتایا کہ ہینک نے انجیلا کے بارے میں کیا کہا تھا۔" سانڈرا کی بات جاری تھی۔ "کیونکہ وہ اس کے نزدیک کافی اہمیت رکھتی ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ تیزاب کی واردات کے پیچھے انجیلا کا ہاتھ تھا تو اسے یقین ہو جائے گا کہ تم اس سے بھی انتقام لو گے اور اس صورت میں تم دس منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔"

"کچھ بھی ہو میں اس سے بدلہ ضرور لوں گا۔" میں نے کہا۔

"اس کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے میں تمہیں کچھ اور بتانا چاہتی ہوں۔"

"مگر کیوں؟"

"میں نے تمہیں بتایا نا کہ مجھے ایک نڈر، حوصلہ مند آدمی کی ضرورت ہے اور اب جبکہ تم مل گئے ہو تو میں نہیں چاہتی کہ اپنا انتقام لینے کی کوشش میں تم ختم ہو جاؤ۔ تم اس تنظیم کو تباہ نہیں کر سکتے۔ میری بات توجہ سے سنو۔ ویلنسکی فلوریڈا میں سب سے بڑا شخص ہے اور فلوریڈا سونے کی کان ہے۔ ہر دولت مند آدمی کچھ راز رکھتا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ہزاروں بلیک میلنگ کی رقم ادا کرتے ہیں۔ بڑے بڑے اسٹورز، کیسینو، چوٹی کے ہوٹل اپنی سلامتی کے لیے رقم دیتے ہیں۔ خود ویلنسکی سب سے مہنگے اسپینش بے ہوٹل میں مفت رہتا ہے۔ ہوٹل اپنے ملازموں سے جھگڑا نہیں چاہتا اور ویلنسکی ایک اشارہ بھی کرے تو تمام اسٹاف باہر نکل جائے گا۔ اس شہر سے ماہانہ آمدنی کم و بیش پندرہ لاکھ ڈالرز ہوتی ہے۔ ویلنسکی کی ذمے داری ہے کہ وہ یہ رقم برقرار رکھے بلکہ اس میں اضافہ کرے۔ اگر وہ یہ ذمے داری پوری کرنے میں ناکام رہے تو تنظیم اسے ہٹا کر کسی اور کو مقرر کر دے گی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شہر میں کوئی گڑبڑ نہیں چاہتا۔ انجیلا سے اسے دس ہزار ڈالرز ماہانہ ملتے ہیں۔ اگر تم اس کے لیے کوئی مشکل کھڑی کرو گے تو ویلنسکی کی آمدنی بس ہزار کے بقدر کم ہو جائے گی۔ مجھے معلوم ہے کہ تنظیم اس کے کام سے غیر مطمئن ہوتی جا رہی ہے۔ اسے پندرہ لاکھ سے کہیں زیادہ آمدنی چاہیے اس لیے ویلنسکی آج کل ایک تنی ہوئی رسی پر چل رہا ہے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ وہ واحد وجہ جس کے باعث ویلنسکی نے ابھی تک تم پر ہاتھ نہیں ڈالا وہ یہ ہے کہ تم یہاں مقبول اور ہردل عزیز ہو۔ بااثر حلقوں میں تمہارے دوست ہیں۔ پولیس سے اچھے تعلقات ہیں اور وہ کسی بھی قسم کی پبلسٹی نہیں چاہتا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟"

"تم مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔ "تم تو ویلنسکی کے لیے کام کرتی ہو اور وہ تمہاری تعریف کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں ابھی اس تکتے پر بھی آتی ہوں۔" سانڈرا کی مسکراہٹ بڑی زہریلی تھی۔ "تمہیں بلانے کا واحد سبب یہ تھا کہ وہ تمہیں فریب دے سکے کہ سوزی کے معاملے میں اسے کس قدر افسوس ہے۔ تم نے اس کی اس بات پر اعتبار کر لیا کہ منگی مر چکا ہے۔ وہ بڑے متاثر کن انداز میں جھوٹ بولتا ہے۔ منگی اس کا دایاں ہاتھ ہے۔ یہ منگی اور اس کے کارکن ہی ہیں جو بلیک میل کرنے کے لیے لوگوں کے راز معلوم کرتے ہیں۔ منگی کے بغیر ویلنسکی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے منگی کو مارنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا تمہارے لیے اپنا بازو کاٹنا۔ چنانچہ منگی زندہ ہے اور اپنا کام کر رہا ہے۔ ہینک ایک کم عقل آدمی ہے اور تنظیم کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جب وہ میامی پہنچے گا تو غائب کر دیا جائے گا۔ منگی غیر مطلوب افراد کو غائب کرنے میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔"

"کیا تم مجھے یہ بتا رہی ہو کہ وہ کمینہ جس نے سوزی پر تیزاب پھینکا تھا، ابھی زندہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" سانڈرا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں یہی کہہ رہی ہوں۔"

"تو میں اسے کہاں تلاش کر سکتا ہوں؟" میں نے بڑھتے ہوئے غصے سے سوال کیا۔

"تم اسے نہیں پا سکتے۔ تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا حلیہ کیا ہے۔"

"وہ چھوٹے قد اور چوڑے کندھے رکھتا ہے۔ سفید جیکٹ اور چوڑے بیجے کا ہیٹ پہنتا ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا؟" سانڈرا کے لہجے میں طنز تھا۔ "وہ اپنا ہیٹ اور جیکٹ اتار دے گا۔ کسی اور رنگ کا جیکٹ پہننے لگے گا۔ اس شہر میں سیکڑوں آدمی چھوٹا قد اور چوڑے کندھے رکھتے ہیں۔ تم اسے کبھی تلاش نہیں کر سکتے تا آنکہ میں تمہاری مدد نہ کروں۔"

"تو تم میری مدد کیوں کرو گی؟" میں نے اسے گھورا۔

"کیونکہ اس نے میرے والد کو قتل کیا ہے۔" سانڈرا کا چہرہ سخت ہو گیا۔

"کیوں قتل کیا تھا؟"

"تاکہ ویلنسکی ان کی جگہ لے سکے۔ میرے والد بڑی کامیابی سے فلوریڈا کا بزنس چلا رہے تھے۔ میں ان کی سیکریٹری تھی۔ ہم ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔" سانڈرا نے کچھ جھکتے ہوئے مجھ سے دوسرا سگریٹ دینے کا اشارہ کیا۔

"تو تم بھی مافیا کی رکن ہو؟" میں نے اسے سگریٹ دیا اور سلگا بھی دیا۔

"بے شک لیکن اب میں اس کی دشمن بھی ہوں۔ جب میرے باپ کا انتقال ہوا تھا تو میں نے ان کی لاش پر انتقام لینے کی قسم کھائی تھی۔ اسی لیے مجھے ایک باہمت آدمی کی ضرورت ہے۔ ایک دشمن کے بجائے دو دشمن زیادہ موثر ہوتے ہیں۔"

"تم ویلنسکی کی سیکریٹری کیسے بنیں؟" میں نے پوچھا۔

"اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں یہ بات جانتی ہوں کہ اس نے میرے والد کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا کیونکہ قتل بڑی چالاکی سے کیا گیا تھا۔ میامی کے کسی ڈرائیور نے انہیں کچل دیا۔ میرے والد میرے لیے ایک خط چھوڑ گئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ویلنسکی ان کی جگہ کے پیچھے پڑا ہے اور انہیں اندیشہ تھا کہ وہ انہیں ہلاک کر دے گا۔ میں تین سال سے زیادہ عرصے تک اپنے والد کی سیکریٹری رہی تھی اس لیے فلوریڈا میں مافیا کی تنظیم کے بارے میں ویلنسکی سے زیادہ معلومات رکھتی تھی۔ جب میں نے کام کرنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے بڑی خوشی سے مجھے ملازم رکھ لیا۔"

"تمہیں تو اس سے نفرت ہونا چاہیے تھی پھر تم نے اس کے ساتھ کام کرنا کیوں پسند کیا؟"

"تاکہ اس کی بے خبری میں وار کر سکوں۔ میں ایک سال سے زیادہ مدت سے موقع کا انتظار کر رہی ہوں۔ میں جانتی تھی کہ میں اکیلی ویلنسکی اور منگی کو شکست نہیں دے سکتی۔ مجھے کسی کی مدد درکار تھی اور اب آخر مجھے ایک کام کا آدمی مل گیا۔ میں تم جیسے آدمی کے تعاون سے اپنے والد کا انتقام لے سکتی ہوں۔ اسی طرح تم سوزی کا بدلہ لے سکتے ہو۔ ہم دونوں کا مقصد ایک ہے۔"

"تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر منگی کو ختم کر دیا جائے تو ویلنسکی بھی اپنے مقام سے گر جائے گا کیونکہ وہ اس کے بغیر آمدنی کا ہدف پورا نہیں کر سکتا؟"

"بے شک کاروبار بند نہیں ہوگا۔ ویلنسکی کو ہٹا کر اس کی جگہ کوئی اور آدمی بھیج دیا جائے گا اور منگی جیسا دوسرا آدمی لوگوں کے راز معلوم کرتا رہے گا۔ تنظیم کو کوئی تو ختم نہیں کر سکتا لیکن ہم دونوں مل کر ویلنسکی اور منگی کو ختم کر سکتے ہیں۔ ایسا ہو گیا تو میں بھی مطمئن ہو جاؤں گی اور تم بھی۔"

میں نے سانڈرا کی باتوں پر غور کیا۔ مافیا کی ایک کارکن کے ساتھ کام کرنا مجھے پسند نہیں تھا لیکن اگر اس کے نتیجے میں مجھے منگی سے بدلہ لینے کا موقع مل جاتا تو مجھے کوئی شکایت نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "تم مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو۔ بتاؤ پہلا قدم کیا ہوگا؟"

"تم دل سے کہہ رہے ہو؟" اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

"ہاں کیوں نہیں... تم مجھ پر بھروسا کر سکتی ہو۔"

"پہلا کام منگی کو تلاش کرنا ہے۔" سانڈرا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہ اپنی رپورٹ فون پر ویلنسکی کو دیتا ہے۔ اب تک ویلنسکی کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہینک اپنی زبان بند نہیں رکھ سکا لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ تم جان گئے ہو کہ منگی زندہ ہے۔ اس طرح منگی بھی بے فکر اور بے پروا ہو جائے گا۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ میں واپس نہیں آئے گا۔ اس نے وہاں ہینک کو محض دکھانے کے لیے رکھا ہوا تھا۔ منگی کوئی دوسرا اپارٹمنٹ لے لے گا۔ ہمیں اسے تلاش کرنا مشکل ہوگا۔"

"تمہارے خیال میں وہ ہرمیس لانچ پر ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔ سانڈرا چونک گئی۔

"تمہیں ہرمیس لانچ کے بارے میں کس نے بتایا؟"

"میرے پاس معلومات کے کئی ذرائع ہیں۔ اس کی فکر مت کرو کہ مجھے کیسے معلوم ہوا۔"

"وہ وہاں نہیں ہوگا۔" سانڈرا نے جواب دیا۔ "لانچ کو صرف رقوم وصول کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ویلنسکی ہر ماہ کی کم تاریخ کو وہاں جاتا ہے۔ اس کے بعد لانچ لے کر میامی چلا جاتا ہے۔ منگی کے لیے لانچ بیکار ہے۔ اسے اپنے کام کے لیے وسیع علاقے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میرے والد نے بتایا تھا۔ پہلے منگی ان کے لیے کام کرتا تھا۔"

"تم مجھے اس کا حلیہ بتا سکتی ہو؟"

"میں نے کبھی اسے نہیں دیکھا۔ صرف فون پر اس کی آواز سنی ہے۔ وہ اطالوی لہجے میں بات کرتا ہے۔"

"اس کی کوئی گرل فرینڈ تو ہوگی؟"

"ہاں۔" سانڈرا نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ایک مرتبہ ویلنسکی اس سے فون پر بات کر رہا تھا تو اس نے پوچھا تھا کہ ڈولی کیسی ہے۔ وہ منگی کی گرل فرینڈ ہو سکتی ہے۔" میرا خیال فوراً ڈولی گلبرٹ کی طرف گیا جو کہ برکرز بلڈنگ میں قیام

Digest Pk
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پذیر تھی۔ اگر وہ منگی کی گرل فرینڈ تھی تو جب میں نے اس سے چیک کے بارے میں پوچھا تھا تو اسے خوف زدہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ ممکن ہے چیک منگی کو دھوکا دے رہا ہو اور اس کے ڈولی سے ناجائز تعلقات ہوں۔ یہ ایسا معاملہ تھا جسے چیک کرنا ضروری تھا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ اب وصولیابی کے لیے کون سی نئی جگہ مقرر کی جائے گی؟“ میں نے پوچھا۔ ”ظاہر ہے بلیک کیسٹ کلب کا وجود تو باقی نہیں رہا۔ لوگوں کو یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ رقم جمع کرانے کہاں جائیں۔“

”مجھے معلوم نہیں مگر میں پتا کرلوں گی۔“

”منگی پہلی تاریخ کو لازمی طور پر جمع شدہ رقوم لینے آئے گا اور اس میں ابھی آٹھ دن باقی ہیں۔ معلوم کرو کہ اب رقوم کہاں جمع کرائی جا رہی ہیں۔ اگر میں منگی کو اس سے قبل تلاش نہیں کرسکا تو پھر اس مقام پر دیکھا جاسکتا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ سانڈرا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں فون کردوں گی۔ اپنا نمبر مجھے دے دو۔“

”نمبر ڈائریکٹری میں لکھا ہے۔ ایک بات اور۔ کیا تمہیں پتا ہے کہ انجیلا کو کس سلسلے میں بلیک میل کیا جارہا ہے؟“

”نہیں، میں نہیں جانتی۔ اس قسم کا تمام ریکارڈ منگی کے پاس ہوتا ہے۔ ویلنسکی کو صرف رقم ملنے سے دلچسپی ہے۔“

”گویا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ ویلنسکی کو ان افراد کے نام یا ان کے راز کی کوئی خبر نہیں ہوتی جس کی بنیاد پر انہیں بلیک میل کیا جارہا ہے؟“

”اسے آخر کیوں دلچسپی ہوگی؟“ سانڈرا نے جواب دیا۔ ”وہ منگی پر مکمل اعتماد کرتا ہے۔ وہ تفصیلات جاننے کی دردسری مول نہیں لیتا۔ وہ منشیات کا ایک بڑا ریکٹ چلا رہا ہے جو اسے مصروف رکھتا ہے۔ بلیک میلنگ کا ریکٹ اس نے منگی کے سپرد کردیا ہے۔“ اس نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ ”اب مجھے جانا چاہیے۔ ویلنسکی جلد ہی واپس آنے والا ہوگا۔ کیا میں تم پر بھروسا کرسکتی ہوں؟“

”ضرور کرسکتی ہو۔“

”جب تم منگی کو تلاش کرلو تو اسے ہلاک مت کرنا۔“ سانڈرا کی سبز آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ ”یہ خوشی کن کام میں اپنے ہاتھ سے کرنا چاہتی ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔

☆☆☆

میں تھری کریب ریسٹورنٹ سے نکلا تو رات کا ایک بجا تھا۔ صبح ہونے سے پہلے کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں گھر چلا گیا۔ اینڈرسن پہلے ہی سونے جاچکا تھا۔ میں بھی بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر سانڈرا کی باتوں پر غور کرتے ہوئے مجھے نیند آگئی۔ صبح دس بجے ناشتا کرتے ہوئے میں نے اینڈرسن کو سانڈرا سے ملاقات کا حال بتایا۔

”تو اب کیا کرنا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں منگی کو تلاش کرنے جارہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس کے بعد انجیلا کو ٹھکانے لگانا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کے ساتھ لگے رہو۔ میں اس کے بارے میں اس سے کہیں زیادہ معلوم کرنا چاہتا ہوں جتنا ابھی معلوم ہے۔ اس پر نظر رکھو۔ معلوم کرو کہ وہ کیا کرتی ہے، کہاں جاتی ہے۔ وہ اپنا سارا وقت کالج میں تو نہیں گزارتی ہوگی۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ کوئی اس سے ملنے آتا ہے یا وہ کسی سے ملنے جاتی ہے۔“

”اچھی بات ہے مگر تم کیا کرنے جارہے ہو؟“

”میں برکرز بلڈنگ کے چوکیدار سے ملنے جاؤں گا۔“ میں نے بتایا۔ ”ممکن ہے منگی، ڈولی کے پاس چھپا ہو۔ وہ جو کچھ بھی کررہا ہو، جہاں بھی ہو، میری ساری توجہ اس پر مرکوز ہے۔ اچھا، میں جارہا ہوں۔ اب رات کو ملاقات ہوگی۔“

میں برکرز بلڈنگ پہنچا۔ اس وقت گیارہ بجے تھے۔ چوکیدار تہ خانے میں مل گیا۔ وہ ایک جھاڑو پکڑے خلا میں گھور رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر چمک آگئی۔

”اوہ... تو تم پھر آگئے۔“ وہ بولا۔ ”کیا تیری مل گیا؟“

”نہیں، اب میں کسی اور کو تلاش کررہا ہوں۔ کیا تم نے کسی چھوٹے قد اور موٹے آدمی کو دیکھا ہے جو سفید جیکٹ اور چوڑے چھجے کا ہیٹ پہنتا ہے؟“

”میں... بہت سے لوگوں کو آتے جاتے دیکھتا ہوں۔“

”مجھے بہت سے لوگوں سے دلچسپی نہیں۔ مجھے تو تم کسی ایسے آدمی کے بارے میں بتاؤ جس کا قد چھوٹا، جسم موٹا ہے اور جو سفید جیکٹ پہنتا ہے۔“

”ممکن ہے میں نے اسے دیکھا ہو۔“ چوکیدار نے بے پروائی سے کہا۔ میں نے اپنی جیب سے دس ڈالر کا نوٹ نکالا۔

”اس سے تمہاری یادداشت کو مدد مل سکتی ہے۔“

اس نے میرے ہاتھ سے دس ڈالر کا نوٹ جھپٹا اور اپنی میلی قمیص کی جیب میں رکھ لیا۔

”ہاں، وہ ڈولی کا یار ہے۔ کبھی کبھی یہاں آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس سے رقم لینے آتا ہے۔ جو لوگ یہاں رہتے ہیں وہ پسند نہیں کرتے کہ میں ان کے بارے میں باتیں کروں۔“

”اگر تم انہیں نہیں بتاؤ گے تو انہیں کچھ معلوم نہیں ہو گا۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ چوکیدار نے اپنا بازو کھجایا۔

”مجھے اس آدمی کا حلیہ بتاؤ۔“

”نہیں جناب! وہ اسے پسند نہیں کرے گا۔ میں اس سے جھگڑا کرنا نہیں چاہتا۔“ وہ بولا۔ میں نے دس ڈالر کا ایک اور نوٹ نکالا۔

”کیا یہ میرے لیے ہے؟“ چوکیدار نوٹ کو گھورنے لگا۔

”ہوسکتا ہے۔ مجھے اس آدمی کے حلیے کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔ اس نے کچھ سوچا پھر اثبات میں سر ہلایا۔

”جیسا کہ تم نے کہا، اس کا قد چھوٹا ہے۔ دیکھنے میں سخت معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اسے دو مرتبہ دیکھا اور اتنا ہی کافی ہے۔ اس کے چہرے سے لگتا ہے کہ کسی نے اس پر بھاری رولر پھیر دیا ہے۔ چپٹی ناک، چپٹی پیشانی، چہرہ ایسا جسے دیکھ کر کوئی بھی ڈر جائے۔ اب تو نوٹ دے دو۔“

”اس کے بال کیسے ہیں... سیاہ یا سنہری؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے معلوم نہیں۔ وہ ان پاگلوں میں سے ہے جو اپنے سر منڈواتے ہیں۔ شاید اسی لیے وہ ہمیشہ ہیٹ اوڑھے رہتا ہے۔ اس کا سر کسی انڈے کی طرح چکنا ہے۔ حد یہ کہ اپنی بھویں بھی شیو کرتا ہے۔“

”وہ یہاں کتنے کتنے وقفے سے آتا ہے؟“

”معلوم نہیں، میں ہمیشہ تو لابی میں نہیں ہوتا ہوں کہ اسے دیکھ سکوں۔“ چوکیدار کی نظریں بدستور نوٹ پر جمی تھیں۔ ”وہ کل رات یہاں آیا تھا اور کم سے کم میں نے اسے واپس جاتے نہیں دیکھا۔ ممکن ہے وہ اب بھی اپنی داشتہ کے پاس ہو۔“

”او کے۔“ میں نے اسے نوٹ دے دیا۔ ”پھر ملاقات ہوگی۔“

میں زینہ طے کرکے ڈولی گلبرٹ کے اپارٹمنٹ تک گیا۔ دروازے کے ناب سے ایک تختی لٹک رہی تھی جس پر لکھا تھا۔ ”پریشان مت کرو۔“ میں نے دروازے کے پاس آکر چابی کے سوراخ سے کان لگا دیے۔ ایک مرد اور ایک عورت کی آوازیں کانوں میں آئیں۔ آوازیں واضح نہیں تھیں جس کا مطلب تھا کہ وہ دونوں بیڈ روم میں تھے۔ میں بلڈنگ سے نکل کر سڑک پر کھڑی اپنی کار کے پاس آیا اور اندر بیٹھ گیا۔ اپنے آپ کو ایک طویل انتظار کے لیے تیار کیا۔ کوئی دوسرا کام نہیں تھا اور انتظار کرنے کی مجھے عادت تھی۔

مجھے دو طویل گھنٹوں تک انتظار کرنا پڑا۔ میری گھڑی میں ایک بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے کہ میں نے ڈولی کو ایک ناٹے قد کے موٹے آدمی کے ساتھ بلڈنگ سے باہر نکلتے دیکھا۔ مگر میری نظریں ڈولی پر نہیں، اس آدمی پر تھیں۔ اس نے گہرے رنگ کی اسپورٹس کیپ سر پر جمارکھی تھی۔ سیاہ اور سفید رنگ کا جیکٹ پہنے ہوا تھا۔ اس کا بغیر بالوں کا چہرہ خوف زدہ کرنے والا تھا۔ چوڑے کندھے، چھوٹی مگر موٹی ٹانگیں، چپٹا ماتھا اور ناک۔ وہ کسی گوریلے کی طرح نظر آرہا تھا۔ مجھے کوئی شبہ نہیں رہا کہ یہی منگی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ وہ سوزی کی موت کا ذمے دار ہے، دل چاہ رہا تھا کہ اسے گولی ماردوں مگر میں نے ضبط کیا۔ وہ ڈولی کے ساتھ چند قدم چلا پھر گہری سبز کیڈی کار کے پاس رک گیا۔ چابی سے کار کا مقفل دروازہ کھولا۔ اندر بیٹھا۔ ڈولی دوسری طرف سے جاکر کار میں بیٹھ گئی۔ میں نے اپنی کار کا انجن اسٹارٹ کیا۔ جب وہ چلا تو میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ وہ اوشن بلیوارڈ سے گزر کر ایک سائڈ اسٹریٹ میں مڑ گیا اور ایک اطالوی ریسٹورنٹ کے سامنے کار روک لی۔ ریسٹورنٹ کے دربان نے جلدی سے آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ منگی باہر نکلا تو اسے سیلوٹ کیا۔ پھر ڈولی اور منگی ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ میں آہستہ رفتار کے ساتھ قریب سے گزر گیا۔ کار کھڑی کی اور واپس لوٹا۔ ایک سینڈوچ بار نظر آیا تو اس میں گھس گیا۔ بار کے ایک گوشے سے ریسٹورنٹ صاف نظر آرہا تھا۔

میں نے دو گوشت کے سینڈوچ کھائے پھر کافی کا آرڈر دیا۔ ایک گھنٹے اور کافی کی تین پیالیوں کے بعد میں نے ڈولی کو ریسٹورنٹ سے باہر آتے اور ایک طرف جاتے دیکھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ واپس برکرز بلڈنگ جارہی ہے۔ میں اپنا بل ادا کرکے باہر آگیا۔ کیڈی کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے اس کی رجسٹریشن پلیٹ کا نمبر نوٹ

digestpk.blogspot.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا۔ میں اپنی کار میں آکر بیٹھ گیا اور کار کے عقبی آئینے میں ریسٹورنٹ کو دیکھتے ہوئے انتظار کرنے لگا۔ آدھ گھنٹے کے بعد منگی باہر نکلا۔ اس کے ساتھ ایک طویل قامت دبلا پتلا آدمی بھی تھا جس نے دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس کے لمبے بال کندھوں تک آرہے تھے۔ سیاہ ہیٹ نے چہرے کا ایک حصہ چھپا رکھا تھا۔ دونوں آدمی کیڈی میں بیٹھ گئے۔ منگی نے اسٹیئرنگ سنبھالا۔ کار اسٹارٹ کی۔ وہ میرے قریب سے گزر گیا۔ پھر میں نے بھی اپنی کار اس کے تعاقب میں ڈال دی۔ یہ سڑک آگے جاکر سی ویو ایونیو سے مل جاتی تھی جہاں اس وقت ٹریفک کا ہجوم تھا۔ مجھے سڑک پر مڑنے کا موقع نہیں ملا اور منگی کی کار جلد ہی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ میں نیپچون ٹیورن کی طرف چل دیا۔ البرنی اپنی مخصوص جگہ بیٹھا بیئر پی رہا تھا۔ میں نے کار اس کے قریب جاکر روک دی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا۔ میں کار سے اترا۔

"یہ مختصر ملاقات ہے البرنی۔" میں نے کہا اور بیس ڈالر کا نوٹ اسے پکڑا دیا۔ "تم ایک لمبے دبلے پتلے آدمی کو جانتے ہو۔ سر کے بال کالے اور لمبے... کالا ہیٹ پہنتا ہے اور دھوپ کا چشمہ لگاتا ہے۔ وہ کون ہے؟"

"زہر ایک دم زہر۔" البرنی چونکا۔ "اس سے دور رہنا مسٹر ویلیس! اس کا نام سول ہرماس ہے۔ وہ ویلنسکی کی لانچ چلاتا ہے۔"

"کہاں ملے گا؟"

"تم میری ہلاکت کا سامان کر رہے ہو۔" البرنی بڑبڑایا۔ "وہ سی وی ایونیو کے بنگلے کا مالک ہے۔ جب لانچ پر نہیں ہوتا تو بنگلے میں رہتا ہے۔"

"شکریہ البرنی۔" میں نے کہا، کار میں بیٹھا اور سی ویو ایونیو کی جانب روانہ ہوگیا۔ پُرہجوم ٹریفک میں راستہ بناتے ہوئے کافی دیر میں ایونیو پہنچا۔ مطلوبہ بنگلہ بہت دور اور سمندر کے کنارے تنہا جگہ پر بنا ہوا تھا۔ یہ بنگلے سے زیادہ رینچ ہاؤس معلوم ہوتا تھا۔ کافی بڑا تھا۔ کم سے کم پانچ بیڈ روم ضرور ہوں گے۔ تنہا مقام پر ہونے کے باوجود اس وقت اس جگہ لڑکے اور لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور جب ہجوم کچھ کم ہوا تو بنگلے کے پاس سے گزرا۔ گیٹ کے پاس دو آدمی یونیفارم پہنے کھڑے تھے۔ ایک پولیس ڈاگ بھی ان کے ساتھ تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ منگی ضرور اس جگہ چھپا ہوا ہے۔ میں کچھ آگے جاکر رک گیا۔ میں اس کے باہر نکلنے تک انتظار کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر انتظار کیا پھر وہاں سے چل کر ایک فون بوتھ تک گیا۔ اندر جاکر سانڈرا کا نمبر ڈائل کیا۔ کچھ دیر کے بعد اس کی آواز ابھری۔

"کون ہے؟"

"کیا تم بات کرسکتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں مگر جلدی اور مختصر۔ وہ ٹیرس پر موجود ہے۔"

"اچھا تو ہم کہیں مل سکتے ہیں؟"

"چھ بجے شام۔ تھری کریب ریسٹورنٹ میں۔" سانڈرا نے جواب دیا پھر اچانک سخت لہجے میں بولی۔ "مجھے افسوس ہے تم نے رانگ نمبر ڈائل کیا ہے۔" میں سمجھ گیا کہ ویلنسکی کمرے میں آگیا ہوگا۔

میں واپس کار میں آبیٹھا۔ پھر کچھ سوچا اور پولیس ہیڈ کوارٹرز چل دیا۔ لیپسکی اپنے آفس میں مل گیا۔

"ہیلو۔" میں نے کہا اور ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "بہت مصروف ہو؟"

"کل تم آدھی رات کے قریب کہاں تھے؟" اس نے مجھے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"اگر تم واقعی جاننا چاہتے ہو تو میں ایک گرل فرینڈ کے ساتھ تھا۔"

"کون گرل فرینڈ... کیا نام ہے اس کا؟"

"بیکار باتیں مت کرو۔" میں نے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ مجھ سے اس قسم کا سوال نہیں پوچھ سکتے۔ آخر تم یہ کیوں جاننا چاہتے ہو کہ میں کہاں تھا؟"

"ابھی ابھی رپورٹ ملی ہے کہ میامی پولیس نے سمندر سے ہینک اسنڈے کی لاش برآمد کی ہے۔ کسی نے اس کے سر میں گولی مار کر اسے ہلاک کردیا۔"

اطمینان کی ایک لہر میرے جسم میں اتر گئی۔ ایک ختم ہوا، دو باقی ہیں... انجیلا اور منگی۔

"حیرت ہے، یہ کام کس نے کیا ہوگا؟" میں نے تعجب ظاہر کیا۔

"سوائے تمہارے کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ ہے نا؟"

"بالکل درست، بہرحال اس بن مانس کے مرنے سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ میں کچھ معلوم کرنے آیا تھا۔ پہلی بات یہ کہ تم نے تیزاب کی واردات کے سلسلے میں کوئی اور بات معلوم کی؟"

"نہیں۔" لیپسکی دوسری طرف دیکھنے لگا۔ "مجھے افسوس ہے ویلیس کہ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ تم بھی جانتے ہو۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔"

"سول ہرماس کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟"

"تمہارا مطلب ہے ویلنسکی کی لانچ کا کیپٹن؟"

"ہاں۔"

"پولیس کے پاس اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہے؟"

"میں تیزاب کی واردات بھولنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "سوزی میری ہونے والی بیوی تھی۔ ابھی میں معلومات جمع کر رہا ہوں۔ جب میرے ہاتھ کوئی ٹھوس ثبوت آجائے گا، میں تمہارے پاس آؤں گا۔"

"ہاں، ہمیں کوئی ثبوت فراہم کردو پھر ہم مجرم کو چھوڑنے والے نہیں۔"

"ہرماس کے متعلق کیا جانتے ہو؟"

"بڑے ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ حفاظت کے لیے گارڈز رکھتا ہے۔ ہمارے پاس اس کے خلاف کچھ نہیں ہے۔"

"اگلا سوال... ہولا منگی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ لیپسکی چونک گیا۔

"اس ذلیل کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"مجھے یقین ہے کہ تیزاب اسی نے پھینکا تھا۔ جو حلیہ معلوم ہوا ہے، اس سے مطابقت رکھتا ہے۔ اسی نے ہینک کو اپنے اپارٹمنٹ میں رہنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ تیزاب کی واردات میں دونوں ملوث ہیں۔"

"کوئی ثبوت ہے؟" لیپسکی نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ابھی تو نہیں مگر جلد ہی مل جائے گا۔ پھر میں اسے تمہارے حوالے کردوں گا۔"

"دیکھو ویلیس! تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم کس مصیبت کو دعوت دے رہے ہو۔" لیپسکی سنجیدگی سے بولا۔ "منگی بہت خطرناک آدمی ہے۔ مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے۔ ممکن ہے تمہارا اندازہ درست ہو کہ یہ حرکت منگی نے کی تھی۔ یہ اسی کا طریقہ کار ہے مگر وہ بہت چالاک ہے۔ تم جرم ثابت نہیں کرسکتے۔ تم اس بات کو بھول کیوں نہیں جاتے۔ ہینک مرچکا ہے۔ تمہارا حساب کسی نہ کسی حد تک برابر ہوگیا۔ اب اپنی سلامتی کے لیے اس جھگڑے سے الگ ہوجاؤ۔"

"تم جانتے ہو کہ اس شہر میں سیکڑوں افراد کو بلیک میل کیا جارہا ہے لیکن شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ ان سے ہر ماہ تقریباً پندرہ لاکھ ڈالرز وصول کیے جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ لیپسکی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"بلیک میلنگ کے ریکٹ کے بارے میں ہمیں پتا ہے مگر اتنی بڑی رقم... تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میرے اپنے ذرائع ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ مجھے خبریں دیتے ہیں اور پولیس سے بڑھ کر ہیں۔ اب میری بات سنو۔ بلیک میلنگ کے شکار ہر ماہ کی پہلی کو ادائیگی کرتے ہیں۔ بڑے لوگ اپنی رقم ہینک کو دیتے تھے اور چھوٹے موٹے شکار ویلنسکی کی لانچ پر جاتے ہیں۔ رات کے تقریباً تین بجے۔ ان کی رقم وہاں وصول کی جاتی ہے۔ اس وقت ساحلی علاقہ بالکل سنسان ہوتا ہے۔ پولیس کے دو کانسٹیبل ڈیوٹی پر ہوتے ہیں مگر وہ مافیا کے تنخواہ دار ہیں۔ ان سے چھٹکارا پاکر دو ہوشیار آفیسر ڈیوٹی پر متعین کرو جنہیں ہر شخص سے پوچھ گچھ کا اختیار حاصل ہو۔ خاص طور سے ان سے جو لانچ پر جاتے ہیں۔ اس سے تمہیں بہت کچھ معلوم ہوسکتا ہے۔"

"ہینک کا کلب تو اب موجود نہیں تو اس کے حصے کا کام کون کرتا ہے؟"

"وصولیابی کی نئی جگہ مقرر کردی گئی ہے۔ جیسے ہی مجھے معلوم ہوا کہ وہ کہاں ہے، تمہیں خبر کردوں گا۔"

"مجھے چیف سے بات کرنا پڑے گی۔" لیپسکی نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"میں یہی چاہتا ہوں۔ ذرا کچھ سرگرمی دکھاؤ۔ پہلی تاریخ میں ابھی سات دن باقی ہیں۔" میں کھڑا ہوگیا۔

"منگی سے تعرض مت کرنا۔" لیپسکی نے کہا۔ "تم اس سے نہیں نمٹ سکتے۔ ہمارے لیے بھی اس سے نجات پانا مشکل ہے۔ اس شہر میں ایسے کئی بڑے لوگ ہیں جو اپنا بھانڈا پھوٹنے کے مقابلے میں رقم دے کر بھانڈا پھوڑنے والے کا منہ بند رکھنا پسند کرتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنا۔"

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے میں خود نہیں جانتا۔ ایک بات تو بتاؤ، تم لوگ یہ بلیک میلنگ ریکٹ ختم کرنے کے لیے کچھ کر رہے ہو یا نہیں؟"

"ایک منظم بلیک میلنگ ریکٹ کو ختم کرنا انتہائی دشوار ہوتا ہے۔" لیپسکی نے جواب دیا۔ "ہم جانتے ہیں کہ ویلنسکی یہ کام کرتا ہے لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں تین چار افراد کی ضرورت ہے جنہیں بلیک میل کیا گیا ہو اور وہ ہمیں اس کی رپورٹ کریں۔ صرف اسی وقت ہم کوئی ٹھوس کارروائی کرسکتے ہیں۔ فرض کرو کہ ہم خوش قسمت ثابت ہوں۔ فرض کرو، تین چار اشخاص اعتراف کرلیں کہ ان کی زندگی میں کوئی ایسی بات ہے جس کی وجہ سے انہیں بلیک میل کیا گیا، تب ہی ہم کسی مجرم پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ مگر وہ ایسا

Digest of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کریں گے نہیں کیونکہ پھر اس شہر میں ان کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ ان کی مثال پینگ کی لاش کی طرح ہوگی جسے سمندر سے نکالا گیا ہے۔“

”گویا تم کچھ نہیں کر رہے؟“

”تقریباً ایسا ہی سمجھو۔ ہم کچھ نہیں کر رہے ہیں۔“

”اچھا، کم سے کم ساحلِ سمندر کے ان دو کانسٹیبلوں کو تو ہٹا دو۔ ممکن ہے اس طرح تم بلیک میلنگ کرنے والوں کو اَپ سیٹ کر سکو۔“

”ٹھیک ہے، میں چیف سے بات کروں گا۔“ لپسکی نے وعدہ کیا۔

”اچھا پھر ملاقات ہوگی۔“ میں نے کہا اور ہیڈ کوارٹر سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

میرے پاس اتنا وقت تھا کہ گھر جا سکوں۔ اینڈرسن موجود نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ انجیلا کی نگرانی کر رہا ہوگا۔ میں نے کچھ آرام کیا پھر غسل کر کے لباس بدلا اور تھری کریب ریسٹورنٹ روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچا تو چھ بجنے میں تین منٹ تھے۔ ہیڈ ویٹر ولی نے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا اور بتایا کہ سانڈرا میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں سیڑھیاں طے کر کے اوپر گیا۔ دروازے پر دستک دی اور اندر داخل ہو گیا۔ سانڈرا میز پر بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔

”ہیلو ویلیس! یہ ملاقات مختصر رہے گی۔ ویلنسکی سات بجے واپس آجائے گا۔“ اس نے بتایا۔

میں اس کے بالمقابل ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت بھی مجھے اس کی جاذبیت اور جنسی کشش کا پورا احساس تھا۔ وہ اپنے آسمانی رنگ کے لباس میں، اپنی سبز آنکھوں کے ساتھ... بڑی سحر انگیز نظر آرہی تھی۔

”میں منگی کو دیکھ چکا ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”اور میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں چھپا بیٹھا ہے۔“

اس بات کا فوری ردِعمل ہوا۔ چمکتی آنکھوں کے ساتھ وہ آگے کی جانب جھک گئی۔ ”تم نے اسے دیکھا ہے... کیسے؟“

مختصر طور پر میں نے اسے وہ تمام باتیں بتائیں جو چوکیدار سے معلوم ہوئی تھیں۔ پھر یہ کہ میں نے کس طرح ڈولی کو ایک اسی حلیے کے آدمی کے ساتھ جاتے دیکھا۔ کس طرح ان کا اطالوی ریسٹورنٹ تک تعاقب کیا۔ کس طرح ڈولی کے جانے کے بعد وہ آدمی جو یقیناً منگی تھا، ایک اور آدمی کے ساتھ باہر نکلا۔ میں نے سانڈرا کو بتایا کہ یہ آدمی سول برماس تھا۔ دونوں سی ویو ایونیو کی طرف روانہ ہوئے مگر ٹریفک کے ہجوم میں مجھ سے گم ہو گئے۔

”ہاں۔“ سانڈرا نے سر ہلایا۔ ”وہ وہاں رینچ ہاؤس گیا ہوگا۔ ویلنسکی نے وہ عمارت میرے والد کے مشورے سے بنوائی تھی۔ اس میں حفاظت کا مکمل انتظام ہے۔ اگر منگی وہاں چھپا ہے تو اس تک پہنچنے کا کوئی امکان نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ تب ہم انتظار کریں گے۔“ میں نے کہا۔ ”کبھی نہ کبھی تو وہ باہر نکلے گا، تب اسے دیکھ لیں گے۔“

”مہینے کی آخری تاریخ کو وہ ضرور نکلے گا۔ پھر ہم اسے نہیں چھوڑیں گے۔“ سانڈرا کے ہونٹوں پر ایسی زہریلی مسکراہٹ تھی جو آج تک میں نے کسی عورت کے ہونٹوں پر نہیں دیکھی تھی۔

”تم نے اسے نہیں دیکھا، میں نے دیکھا ہے۔ خیر، جب بھی وہ باہر آئے، تمہارا کیا مشورہ ہے... ہم کیا کریں؟“

”ہم اسے پکڑ لیں گے۔ میں اسے زندہ پکڑنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں وہ سسک سسک کر مرے۔“

”منگی کو پکڑنا ایسا ہی ہوگا جیسے کسی چیتے کو پکڑنا۔“

”طریقے سوچے جا سکتے ہیں۔“ سانڈرا اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں کچھ نہ کچھ سوچ لوں گی۔ ویلنسکی تین دن کے لیے نیویارک جانے والا ہے۔ ہم اب جمعرات کو ملیں گے۔“ جمعرات مہینے کا آخری دن تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے مسکراتے ہوئے میرے شانے پر تھپکی دی اور چلی گئی۔ میں کچھ دیر بیٹھا سوچتا رہا پھر اٹھ کر اپنی کار کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

رات کے دس بجے کے بعد میں وھسکی پیتے ہوئے کچھ اہم باتوں پر غور کر رہا تھا کہ اینڈرسن آگیا۔ بارش پھر شروع ہو گئی تھی اور موسلا دھار ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ وہ تھکا ہوا آیا ہوگا، اس کے لیے ایک گلاس وھسکی بنا دوں مگر اس نے آتے ہی نعرہ لگایا کہ وہ بھوکا ہے۔

”بیٹھ جاؤ۔ وھسکی پیو۔ ہمیں بہت سی باتیں کرنا ہیں۔“ میں نے کہا۔

”یہ تمہارا خیال ہے۔ میں بھوک سے مر رہا ہوں۔ آٹھ گھنٹے تک کار میں بیٹھا رہا ہوں۔ ایک ہاٹ ڈاگ کے علاوہ کوئی دوسری چیز حلق سے نہیں اتری۔ جب تک میں کھانا نہ کھالوں کوئی بات نہیں کر سکتا۔“

اور مجھے ایسا ہی کرنا پڑا۔ جب تک اینڈرسن نے پیٹ

بھر کر کھانا نہیں کھا لیا، زبان نہیں کھولی۔

”مجھے واقعی بہت زور کی بھوک لگی تھی۔“ وہ بولا۔

”تو اب پیٹ بھر لیا نا۔“ میں نے کہا۔ ”اب بتاؤ، انجیلا کی نگرانی کے سلسلے میں کیا ہوا؟“

”رپورٹ کرنے کے لیے بہت کچھ ہے۔“ اینڈرسن نے جواب دیا۔ ”میں صبح گیارہ بجے سے انجیلا کے کاٹیج کی نگرانی کر رہا تھا۔ کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ دوپہر میں حنا اسمڈلے خریداری کی باسکٹ لیے گھر سے نکلی اور کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔ دس منٹ بعد انجیلا نمودار ہوئی۔ اس وقت کافی بارش ہو رہی تھی۔ اس نے ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی، چشمہ لگایا ہوا تھا۔ وہ باغ میں چہل قدمی کرنے لگی۔ بہت جلد بری طرح بھیگ گئی۔ میرے چھپنے کی جگہ بہت محفوظ تھی۔ نظر آئے بغیر بہت کچھ دیکھ سکتا تھا۔ وہ پنجرے میں بند کسی جنگلی بلی کی طرح بپھری ہوئی ٹہل رہی تھی۔ اپنے آپ سے باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی رک کر اپنی بند مٹھیوں سے اپنا سر پیٹنے لگتی تھی۔ دو تین مرتبہ ہوا میں گھونسے لہرائے اور پھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس کی حرکات ایسی تھیں جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ پھر وہ دھماکے سے دروازہ بند کرتے ہوئے کاٹیج میں چلی گئی۔

”میں کار میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد حنا اسمڈلے بازار سے واپس آئی۔ اس کی باسکٹ بھری ہوئی تھی۔ پھر اگلے دو گھنٹے تک کچھ نہیں ہوا اور تب ہنگامے شروع ہو گئے۔ میں نے کاٹیج سے ہسٹریائی چیخیں بلند ہوتے سنیں۔ ان چیخوں نے مجھے پریشان کر دیا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ میں بھاگ کر کاٹیج پہنچا۔ رہائشی کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور کیا بتاؤں کیسا منظر تھا۔ حنا ایک گوشے میں کھڑی تھی اور انجیلا آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا چاقو تھا لیکن حنا پُرسکون کھڑی تھی اور کچھ کہہ رہی تھی، تب اچانک انجیلا چیخی۔ ’نکل جاؤ یہاں سے کالی چڑیل۔ مجھے ٹیری چاہیے۔‘ مجھے یہ سب کچھ کسی خوفناک فلم کا منظر لگ رہا تھا۔ ایک طرف وہ دیوانی لڑکی ہاتھ میں چاقو بلند کیے حنا کی طرف بڑھ رہی تھی، دوسری جانب حنا پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگی تھی۔ میں بیرونی دروازے کی طرف بھاگا اور گھنٹی کا بٹن دبایا۔ انجیلا جو چیخ کر کہہ رہی تھی، مجھے ٹیری چاہیے... مجھے ٹیری چاہیے، ایک دم خاموش ہو گئی۔ میں بٹن دبائے رہا۔ چند منٹ کے بعد دروازہ کھلا۔ حنا نے مجھے گھور کر دیکھا۔

”معاف کرنا۔“ میں بولا۔ ”میں ریڈرز ڈائجسٹ کی طرف سے آیا ہوں اور...“ مجھے مزید بولنے کا موقع نہیں ملا۔ حنا نے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے چند منٹ انتظار کیا پھر ایک بار پھر رہائشی کمرے کی کھڑکی سے جھانکا۔ انجیلا ایک کرسی پر بیٹھی اپنا سر پیٹ رہی تھی۔ چاقو فرش پر گرا ہوا تھا۔ حنا نے اسے اٹھایا اور کچن میں چلی گئی۔ چند لمحے بعد وہ باہر آئی اور انجیلا کو پکڑ لیا۔ انجیلا کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ انجیلا شاید بے ہوش ہو گئی۔ حنا اسے اٹھا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں اپنی کار میں جا کر بیٹھ گیا۔ انتظار کرتا رہا لیکن پھر کچھ نہیں ہوا۔ یہ ہے میری رپورٹ۔ انجیلا ایک پاگل لڑکی ہے۔ اسے کہیں بند کر کے رکھنا چاہیے۔“

”وہ ٹیری کا نام لے کر چیختی رہی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”جوش اسمڈلے نے مجھے بتایا تھا کہ جب ٹیری گھر چھوڑ کر گیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انجیلا کی زندگی سے تمام اجالے چلے گئے ہوں۔ ٹیری کے ساتھ کیا ہوا؟ اب وہ کہاں ہے؟ مجھے شروع سے ہی احساس ہو رہا تھا کہ ٹیری ہی اس معمے کی چابی ہے۔“

”چلو مان لیا۔ اب کیا کریں؟“ اینڈرسن نے پوچھا۔

”میں مسز تھورسن سے بات کرنے جا رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”صرف وہی انجیلا کو پاگل خانے میں داخل کرنے کے سرٹیفکیٹ پر دستخط کر سکتی ہے... اور اس معاملے میں دو افراد صحیح معلومات دے سکتے ہیں۔ ایک جوش دوسری اس کی بیوی حنا۔ مجھے افسوس ہے اینڈرسن مگر تمہیں واپس جا کر کاٹیج کی نگرانی کرنا پڑے گی۔ میں تھورسن کے بنگلے پر جا رہا ہوں۔ قسمت نے ساتھ دیا تو مسز تھورسن سے بات کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے جیسا تم کہو۔“ اینڈرسن بولا۔ ”آؤ چلیں... مگر میں کب تک کاٹیج کی نگرانی کروں... کیا تمام رات؟“

”معلوم کرو کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ میں مسز تھورسن سے بات کر کے تم سے آملوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جب تک میں نہ آؤں، وہیں رہنا۔“

ہم اپنی اپنی کار میں روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنی کار تھورسن کے بنگلے کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر روک دی۔ اینڈرسن اس تنگ سڑک پر بڑھتا چلا گیا جو کاٹیج کی طرف جاتی تھی۔ میں کار سے باہر نکلا اور بارش میں بھیگتا ہوا گیٹ کی طرف چلا۔ میں نے دیکھا کہ جوش کے کمرے کے علاوہ پورے بنگلے میں تاریکی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ مسز تھورسن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مقبول عام ٹی وی سیریلز اور شاہکار ناولوں کی تخلیق کار

عمیرہ احمد

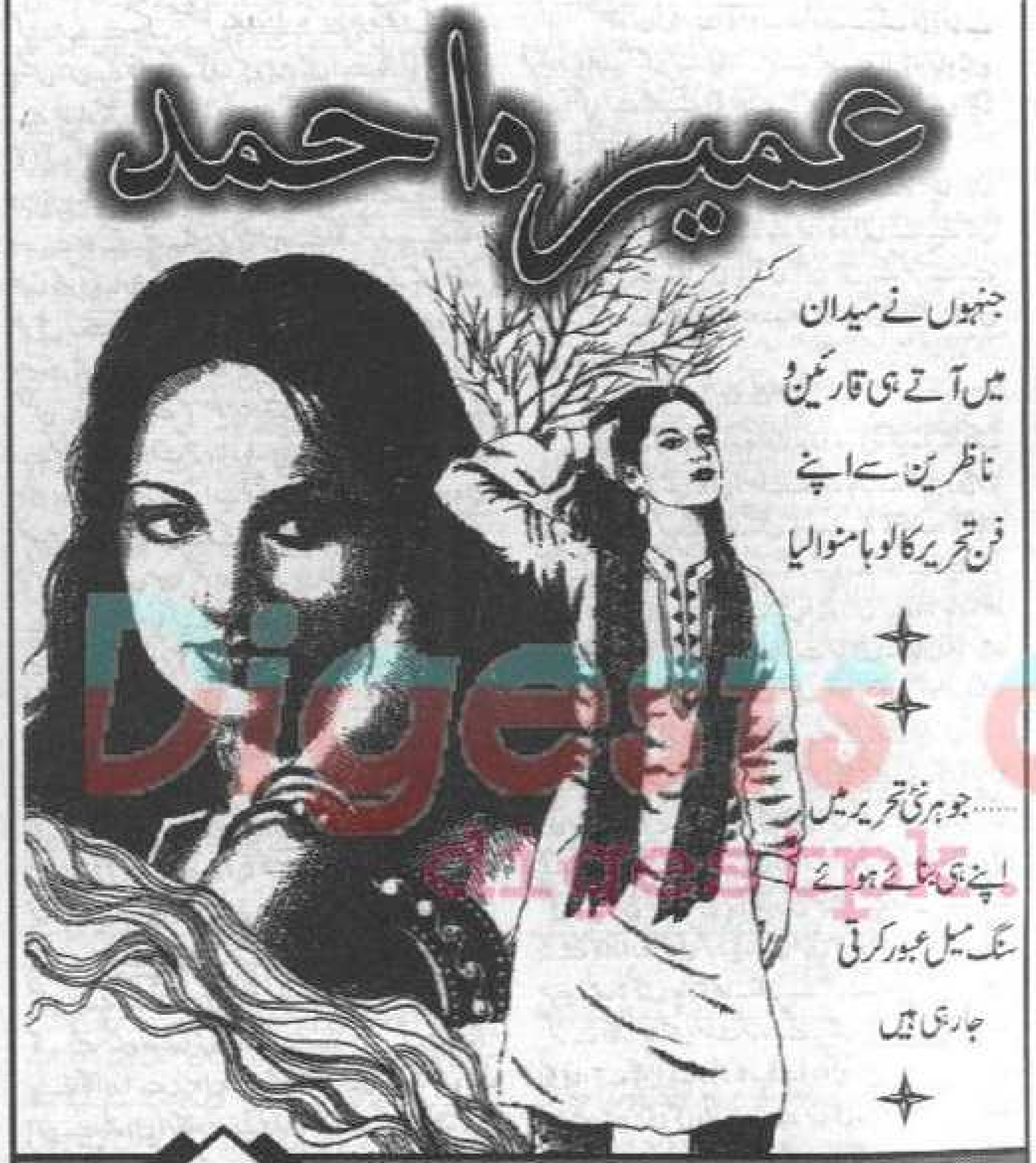

جنہوں نے میدان میں آتے ہی قارئین و ناظرین سے اپنے فن تحریر کا لوہا منوا لیا

...... جو ہر نئی تحریر میں اپنے ہی بنائے ہوئے سنگ میل عبور کرتی جا رہی ہیں

عمیرہ احمد کے قلم سے نکلی ہوئی، دلوں کی گہرائیوں کو چھو لینے والی،

ایک نئی اور تازہ سلسلے وار کہانی

ماہنامہ پاکیزہ میں اگست 2011ء سے شروع ہو رہی ہے

یا تو گھر میں نہیں ہے یا پھر سونے چلی گئی ہے۔ میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جوش سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے گھنٹی کی زنجیر کھینچی۔ چوتھی کوشش کے بعد جوش نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے بتایا کہ مسز تھورسن گھر میں نہیں ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں ایک بار پھر اس سے بات کرنا چاہتا ہوں اور اسے ایک طرف ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ جوش دروازہ بند کر کے مجبوراً میرے پیچھے چلا۔ میں اس کے کمرے میں پہنچا۔ وہسکی کی ایک خالی اور دوسری نصف بوتل دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ ضرورت سے زیادہ شراب پیتا رہا ہے۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جوش نے اپنی کرسی سنبھالی اور میری طرف دیکھا۔

''تم نے چینگ کے بارے میں تو سن لیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں مسٹر ویلیس۔'' جوش نے افسردگی سے کہا۔ ''میں اسے برابر منع کرتا رہا، خبردار کرتا رہا لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ میرا مذاق اڑاتا رہا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اب وہ آرام سے ہو۔''

''تم نے مجھے بتایا تھا کہ تیری اور انجیلا میں بڑی محبت تھی۔ مجھے بتاؤ وہ کتنی محبت کرتے تھے؟''

''میں سمجھا نہیں۔''

''ذرا سوچو وہ آپس میں کتنی محبت کرتے تھے۔''

''انجیلا اس کی پرستش کرتی تھی۔ جب وہ موسیقی کے کمرے میں پیانو بجاتا تھا تو انجیلا کمرے کے باہر بیٹھ کر بڑی محویت سے سنتی تھی۔ اتنی محبت تھی ان میں۔'' جوش نے وہسکی کا ایک گھونٹ پیا۔ ''جب تیری گھر سے چلا گیا تو انجیلا جیسے اپنے حواس کھو بیٹھی۔ اسے قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا۔ صرف میری بیوی ہی اسے سنبھال سکتی تھی۔''

''میرا خیال ہے کہ اس کے باپ کا رویہ تیری کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس نے تیری کو گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو انجیلا نے اپنی بہکی ہوئی ذہنی کیفیت میں فیصلہ کیا کہ اگر اس کے والد کا انتقال ہو جائے تو تیری واپس آ جائے گا۔ کیا تم میرے اس خیال سے متفق ہو؟''

''مجھے کیا معلوم کہ انجیلا کی ذہنی کیفیت کیا تھی۔ وہ کیا سوچتی تھی۔'' جوش نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ انجیلا نے دانستہ اپنے والد سے جھگڑا کیا۔ اتنا جھگڑا کہ اس کے والد کو غصے کی وجہ سے ہارٹ اٹیک ہو جائے اور پھر اسے اس طرح دھکا دیا کہ اس کا سر میز سے ٹکرا گیا۔'' میں نے کہا۔ جوش خاموش بیٹھا رہا۔

''تم نے سنا نہیں کہ میں نے کیا کہا؟'' میں پھر بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ انجیلا نے اپنے والد کو مار ڈالا تا کہ اس کا بھائی گھر واپس آ جائے۔ میرا خیال ہے کسی نے یہ واقعہ ہوتے دیکھا اور افشائے راز کی دھمکی دے کر اسے بلیک میل کرنے لگا اور یوں انجیلا چینگ کے ذریعے اسے رقم دینے پر مجبور ہو گئی۔''

''تم غلط سوچ رہے ہو مسٹر ویلیس۔'' جوش نے ایک گہری سانس لی۔ ''انجیلا اور اس کے باپ میں جھگڑا ہوا تھا اور بہت ہوا تھا لیکن تھورسن کو جب دل کا دورہ پڑا تو انجیلا اس سے پہلے ہی چلی گئی تھی۔ صرف میں نے دیکھا تھا کہ کیا ہوا اور کیا نہیں۔ میں نے اس کی غصے بھری آوازیں سنیں۔ لیکن جب میں کمرے میں گیا تو تھورسن اکیلا تھا اور بڑی گھبراہٹ میں اپنی میز کی دراز سے دوا کی گولیاں نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ گولیاں جنہیں وہ دل کا دورہ پڑنے پر کھاتا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور میں نے گولیاں تلاش کر لیں۔'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے گولیاں دراز سے نکال لیں اور الگ ہٹ گیا۔ وہ غش کھا کر گرا۔ اس کا سر میز سے ٹکرا گیا۔ میں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا اور باہر چلا گیا۔ پھر جب میں دوبارہ کمرے میں گیا تو میں نے اسے مردہ پایا۔ اس طرح میں نے اسے ہلاک کر دیا۔''

''کیا تم جانتے ہو کہ کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''تم تھورسن کو مارنے کا اعتراف کر رہے ہو؟''

''ہاں۔'' جوش نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں، میں نے اسے مار دیا کیونکہ میں اسے مرتا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔''

''لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟'' میں نے پوچھا۔ وہ دیر تک خلا میں دیکھتا رہا پھر بولا۔

''اس کا تعلق ماضی سے ہے۔ میں نے مسٹر اور مسز تھورسن کی تیس سال تک خدمت کی ہے۔ جب ان کی شادی تھورسن سے ہوئی تھی تو میں ان کے ساتھ آیا تھا۔ میں بہت اچھا بٹلر تھا۔ مسز تھورسن بھی مجھ سے بہت خوش تھے۔ میری مصیبتوں کا آغاز میرے بیٹے کی پیدائش سے ہوا۔ چینگ ہمیشہ کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا ہوتا رہتا تھا۔ میں نے تھورسن سے کہا کہ وہ چینگ کو باغ کی دیکھ بھال کے لیے ملازم رکھ لیں۔ وہ راضی ہو گئے۔ اسے معمولی تنخواہ پر نوکر رکھ لیا۔ کچھ دن تک چینگ نے اپنا کام دلچسپی سے کیا اور اچھی طرح کیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سدھر جائے گا مگر پھر انجیلا نے اس میں

Digests of Pakistan
digestpk.blogspot.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دلچسپی لینا شروع کر دی۔ تب اس کی عمر تیرہ سال تھی اور جینک چھبیس سال کا تھا۔ ان کا تعلق جائز حد سے نکل گیا۔ یہ بات مسٹر اور مسز تھورسن کو معلوم ہو گئی۔ جینک کو مار پیٹ کر نکال دیا گیا۔ تب سے جینک مسلسل چھوٹے بڑے جرم کرنے لگا۔ پولیس اس کے پیچھے لگ گئی۔ کسی جرم میں اسے پکڑ لیا گیا اور اسے چھ ماہ جیل میں گزارنا پڑے۔" جوش نے رک کر وہسکی کا ایک گھونٹ بھرا۔ "اور پھر میرے اور میری بیوی کے درمیان جھگڑے شروع ہو گئے۔ یہ جھگڑے ہمیشہ جینک کی وجہ سے ہوتے تھے۔ میں پریشان رہنے لگا۔ شراب پینے لگا۔ تب پھر ایک دن تھورسن نے مجھے بلایا اور کہا کہ میں ایک طویل مدت سے ان کی خدمت کر رہا ہوں اس لیے وہ اپنی وصیت میں پانچ ہزار ڈالرز میرے نام لکھ رہے ہیں۔ یہ رقم ممکن ہے تمہیں بہت کم معلوم ہو لیکن میرے لیے کسی خزانے سے کم نہیں تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ جینک کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا رہا۔ میری شراب نوشی بڑھتی گئی۔ پھر ایک دن تھورسن نے مجھے شراب کے نشے میں دیکھ لیا۔ اس نے مجھے نوٹس دیا کہ میں مہینا ختم ہونے پر چلا جاؤں، مجھے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی وصیت سے میرا نام کاٹ دیں گے۔ یہ میرے لیے ایک بڑا شاک اور بڑا نقصان تھا۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا، تھورسن بہت سخت مزاج آدمی تھے۔ اس خوب صورت اور آرام دہ گھر سے نکلنا میرے لیے بہت مشکل اور تکلیف دہ تھا۔ پھر جینک مجھ سے ملنے آیا اور مجھے بتایا کہ اگر اسے پانچ ہزار ڈالرز مل جائیں تو وہ اپنا کلب کھول سکتا ہے۔ اس نے مجھ سے یہ رقم مانگی۔ میں نے جواب دیا کہ اتنی بڑی رقم دینا میرے بس سے باہر ہے۔ تب اس نے کہا اچھا ٹھیک ہے، تم نہیں دے سکتے تو میں کوئی بینک لوٹ کر یہ رقم حاصل کر لوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے بینک لوٹنے کی کوشش کی تو پکڑا جائے گا اور اسے برسوں جیل میں کاٹنا ہوں گے۔ میں نے اس سے کچھ دن انتظار کرنے کو کہا۔ اس فکر کے باعث میری شراب نوشی بڑھ گئی۔ میں نے سوچا کہ تھورسن مر جائے تو میں نہ صرف اپنی ملازمت پر برقرار رہوں گا بلکہ مجھے وصیت کے مطابق پانچ ہزار ڈالرز بھی مل جائیں گے اور میں یہ رقم جینک کو دے سکوں گا۔ مسز تھورسن مجھے کبھی نہیں نکالیں گی۔ چنانچہ جب انجیلا اور تھورسن کا جھگڑا ہوا تو گویا میرے نزدیک یہ ایک خوش قسمت اتفاق تھا۔ تھورسن مر گیا۔ میں اپنی ملازمت پر بحال رہا اور مجھے پانچ ہزار ڈالرز بھی مل گئے۔ مگر میں نے جو کچھ کیا، وہ کوئی اچھا کام نہیں تھا۔ جینک مر گیا اور اب میری ایک ہی خواہش ہے کہ مجھے بھی موت آجائے۔"

میں کھڑا ہو گیا۔ میں اب مزید کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خستہ حالت دیکھ کر مجھے رحم آنے لگا۔

"تھورسن کی موت کا سبب عدالت نے قدرتی اسباب قرار دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "تم نے مجھ سے جو کچھ کہا، میں اسے ابھی سے بھولنے لگا ہوں۔ اچھا جوش! اب میں چلتا ہوں۔ آئندہ شاید تم سے ملاقات نہ ہو۔"

وہ ہاتھ میں اسکاچ وہسکی کا گلاس تھامے بیٹھا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے جو کچھ کہا، وہ اس کے نشے میں ڈوبے ذہن تک پہنچا بھی یا نہیں لیکن اس کے کمرے سے باہر جاتے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی خواہش جلد ہی پوری ہو جائے گی۔

☆☆☆

میں نے کار کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے میں جوش اسمڈ لے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایک محبت کرنے والا شفیق باپ اپنے ناخلف، ناہنجار بیٹے کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہے۔ پھر میں نے کندھے اچکاتے ہوئے انجن اسٹارٹ کیا۔ اب میں اینڈرسن سے ملنا چاہتا تھا تاکہ معلوم کر سکوں کہ کالج کے حالات کیا ہیں۔ وہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اچانک میں نے ایک آواز سنی۔ آواز ایک ایمبولینس کے سائرن کی تھی جو لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد ایک ایمبولینس جس کے پیچھے ایک کار آ رہی تھی، میرے قریب سے گزرتی ہوئی اس تنگ سڑک پر گھوم گئی جو کالج تک جاتی تھی۔ کار میں دو آدمیوں کی جھلک دکھائی دی تھی۔ یہ سوچ کر کہ کالج پر اینڈرسن موجود ہے، میں نے آگے بڑھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں اپنی موجودگی سے حالات کو مزید الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا اور انتظار کرنے لگا۔ چالیس منٹ گزر گئے۔ میں انتظار سے اکتانے لگا تھا، تب پھر ایک رولز کار جسے ڈرائیور چلا رہا تھا اور پیچھے مسز تھورسن بیٹھی تھی، قریب سے گزری۔ رولز کار بھی آگے بڑھ کر اس سڑک پر گھوم گئی۔ میں نے پھر اس معاملے سے الگ رہنے کا فیصلہ کیا۔ ایک اور سگریٹ سلگا کر مزید انتظار کرنے لگا۔ آدھ گھنٹا اور گزر گیا، تب میں نے ایمبولینس کو واپس آتے دیکھا۔ وہ شہر کی طرف چلی گئی۔ اس کے پیچھے اب بھی وہی کار تھی جس میں دو آدمی بیٹھے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ڈاکٹر تھے۔ بیس منٹ بعد رولز کار نمودار ہوئی اور تھورسن کے بنگلے کی طرف چلی گئی۔ اب میں نے کار آگے بڑھائی اور کالج کی طرف چل دیا۔ میں گاہے بگاہے اپنی ہیڈ

لائٹس چمکا رہا تھا تاکہ اینڈرسن جان لے کہ میں آ رہا ہوں۔ کالج کے گیٹ پر میں نے کار روک لی۔ اینڈرسن لپک کر میری جانب آیا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

"ہاں بتاؤ کیا واقعات ہوئے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے رہائشی کمرے کی کھڑکی سے سارا حال دیکھا۔" اس نے کہا۔ "میں بہت صحیح وقت پر پہنچا تھا۔ حنا اسمڈ لے خاموش بیٹھی تھی۔ مجھے اس پر رحم آنے لگا۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ان حالات میں کیا کرے۔ کچھ دیر کے بعد میں نے کمرے کا دروازہ کھلتے اور انجیلا کو اندر آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بار پھر چاقو نظر آ رہا تھا۔ وہ حنا کی طرف بڑھنے لگی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے۔ اس کے چہرے پر بڑے دہشت ناک تاثرات تھے۔ میں نے آج تک کسی کو ایسی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ میرے جسم میں سرد لہری اتر گئی۔ میں کھڑکی توڑ کر حنا کو خبردار کرنا چاہتا تھا مگر شاید اس نے خطرے کی بُو سونگھ لی تھی۔ اس کی فوری حرکات بڑی موثر تھیں۔ جیسے ہی انجیلا قریب آئی، حنا کھڑی ہو گئی۔ پلک جھپکتے میں اس نے انجیلا سے چاقو چھین لیا اور اس کے منہ پر اتنی زور سے ہاتھ مارا کہ انجیلا دیوار سے ٹکرائی اور فرش پر گر گئی۔ حنا نے اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈالا اور بیڈ روم میں جا کر میری نظروں سے چھپ گئی۔ وہ تقریباً دس منٹ۔۔۔ بیڈ روم میں رہی اور پھر رہائشی کمرے میں واپس آ گئی۔ فون کا ریسیور اٹھایا اور کوئی نمبر ڈائل کیا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ کسی کو مدد کے لیے بلا رہی ہے جس کی اس وقت اسے ضرورت بھی تھی۔ پھر انجیلا نے ایک بار پھر چیخنا شروع کر دیا۔ وہ میری کا نام لے کر چیخ رہی تھی۔ حنا کے فون کے جواب میں بیس منٹ بعد ایک ایمبولینس آئی۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں نے اسے آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟"

"وہ انجیلا کو ایک اسٹریچر پر باہر لائے اور ایمبولینس میں ڈال کر چلے گئے۔" اینڈرسن نے بتایا۔ "اس کے بعد مسز تھورسن نمودار ہوئیں۔ انہوں نے ڈاکٹروں سے بات کی۔ پھر ڈاکٹر بھی چلے گئے۔ جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو حنا اسمڈ لے ایک جانب دیوار کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ مسز تھورسن نے اس سے کچھ کہنا شروع کیا۔ میں الفاظ نہیں سن سکا لیکن حنا کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ مسز تھورسن جو کچھ کہہ رہی ہے، وہ کوئی خوش گوار بات نہیں ہے پھر اس نے اپنا بیگ کھولا۔ پانچ سو ڈالر کے دو نوٹ نکالے اور حنا کی طرف پھینک دیے۔ یہ ہے کُل رپورٹ۔ میرا اندازہ ہے کہ مسز تھورسن نے حنا کو برطرف کر کے اسے گھر سے چلے جانے کو کہا ہے۔"

"ٹھیک ہے اینڈرسن۔" میں نے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو۔ میں ذرا حنا سے بات کر لوں۔ میرے خیال میں اس سے بات کرنے کے لیے یہ موزوں ترین وقت ہے۔"

میں کار سے اترا۔ بارش رک گئی تھی اس لیے میں نے اپنی برساتی اتار کر کار کی پچھلی سیٹ پر رکھ دی۔ آگے بڑھ کر بیرونی دروازے پر لگی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا اور لابی سے گزر کر رہائشی کمرے میں آیا۔ حنا ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ "تم۔۔۔ کیا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔ اس کے لہجے سے غصہ یا ناراضی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ میں بیٹھ گیا۔

"تمہیں مسز تھورسن نے ملازمت سے الگ کر دیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اور میں بہت خوش ہوں۔ میں تھورسن لوگوں سے بھر پائی۔ اب میں اپنے قبیلے میں واپس چلی جاؤں گی۔ بیس سال میں پہلی مرتبہ اپنے آپ کو آزاد محسوس کر رہی ہوں کہ جو چاہوں کروں۔"

"تم خوش ہو تو میں بھی خوش ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن جانے سے پہلے کیا تم تھورسن لوگوں کے بارے میں میرے چند سوالات کا جواب دینا پسند کرو گی؟ میں جاننا چاہتا ہوں کہ انجیلا کو کس وجہ سے بلیک میل کیا جا رہا تھا۔۔۔ کیا تم جانتی ہو؟"

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ جانے سے پہلے کسی سے بات کرنا چاہیے۔" حنا نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اپنے لوگوں میں واپس جانے سے پہلے میں اپنے ذہن سے یہ بوجھ اتارنا چاہتی ہوں۔ میرے چار بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ وہ سب مجھے خوش آمدید کہیں گے۔ میرا تعلق بہت بڑے قبیلے سے ہے۔ اگر انجیلا درمیان میں نہ ہوتی تو میں برسوں پہلے یہاں سے چلی جاتی۔ میں انجیلا کے پیدا ہونے کے وقت سے اس کی پرورش اور دیکھ بھال کر رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ وہ کسی حد تک پاگل ہے۔ میں نے اس کی بہت مدد کی ہے۔ انجیلا مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس کی ماں نے کبھی اس کے لیے کچھ نہیں کیا۔ انجیلا اپنے بھائی کی پرستش کرتی تھی۔ بچپن اور لڑکپن تک ان کا آپس میں بہت میل ملاپ رہا لیکن جب میری بڑا ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ میری، انجیلا سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیزار رہنے لگا ہے۔ وہ بھی اسے اکیلا نہ چھوڑتی، ہر وقت اس کے ساتھ لگی رہنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے منع بھی کیا مگر وہ نہیں مانی۔ پھر ٹیری نے پیانو بجانا شروع کر دیا۔ انجیلا سے پیچھا چھڑانے کے لیے وہ خود کو موسیقی کے کمرے میں بند کر لیتا تھا مگر انجیلا کمرے کے باہر بیٹھی اسے پیانو بجاتے سنتی رہتی تھی۔ وہ اس کے پیانو کی دیوانی تھی۔ تب پھر ایک دن ٹیری اور اس کے باپ میں جھگڑا ہوا۔ ٹیری گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے جاتے ہوئے انجیلا کو خدا حافظ بھی نہیں کہا۔ انجیلا کے لیے یہ ایک گہرا صدمہ تھا۔ وہ اور زیادہ پاگل ہو گئی لیکن میں کسی نہ کسی طرح اسے کنٹرول کرتی تھی۔ تب پھر مسٹر تھورسن کا اچانک انتقال ہو گیا۔ وہ اس کے لیے ٹرسٹ کی آمدنی اور یہ کاٹیج چھوڑ گئے اور انجیلا فوراً ہی کاٹیج میں منتقل ہو گئی۔ وہ اپنی ماں سے نفرت کرتی تھی۔ وہ دن بھر کرسی پر بیٹھی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ میں نے غلطی کی۔ مجھے مسز تھورسن سے کہنا چاہیے تھا کہ انجیلا کو کسی ڈاکٹر کو دکھائیں لیکن میں بھی مسز تھورسن کو پسند نہیں کرتی تھی اور مجھے امید تھی کہ میں انجیلا کو اس موڈ سے باہر نکال لوں گی۔ چنانچہ میں کوشش کرتی رہی کہ اسے باغبانی میں لگا دوں یا گھر کے کام کاج میں حصہ لینے پر آمادہ کر لوں لیکن اس نے کسی بات میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ یہ صورت حال ایک ہفتے تک چلتی رہی۔ میں کسی ڈاکٹر کو دکھانے پر غور کر رہی تھی کہ ایک آدمی انجیلا سے ملنے آیا۔ اس نے گھنٹی بھی نہیں بجائی، سیدھا گھر میں چلا آیا۔ میں کچن میں رات کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ وہ آدمی اسی جگہ آ کر بیٹھ گیا جہاں تم بیٹھے ہو۔ اس کا سر بالکل گنجا تھا اور چہرہ کسی شیطان کی طرح تھا۔ میں کچن سے باہر آ رہی تھی کہ میں نے اسے کہتے سنا کہ وہ جانتا ہے ٹیری کہاں ہے۔ میں رک کر سننے لگی۔ انجیلا یہ سن کر جیسے ایک دم زندہ سی ہو گئی۔ اس نے پوچھا کہ ٹیری کہاں ہے۔ اس آدمی نے بتایا کہ ٹیری نہیں چاہتا کہ کسی کو اس کے قیام کی جگہ معلوم ہو۔ اس نے پیانو بجانے میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ اس آدمی نے یہ بھی بتایا کہ ٹیری اس کی حفاظت میں ہے۔ اس نے اپنی بہن کو اپنا پیار بھیجا ہے۔ پھر اس شخص نے کہا کہ وہ کسی کی حفاظت مفت میں نہیں کرتا۔ اس لیے انجیلا کو ہر ماہ دس ہزار ڈالرز دینا پڑیں گے۔ وہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو بلیک کیسٹ کلب جائے اور وہاں جو آدمی اس سے رابطہ کرے، رقم اس کے حوالے کر دے۔ اس نے کہا کہ جب تک انجیلا رقم دیتی رہے گی، وہ ٹیری کی حفاظت کرتا رہے گا۔ اگر نہیں دے گی تو کوئی شخص ہتھوڑے سے ٹیری کے ہاتھ توڑ دے گا اور وہ

کبھی پیانو نہیں بجا سکے گا۔'' حنا کہتے کہتے رکی، چہرے سے پسینا خشک کیا، گہری سانس لی پھر بولی۔

''یہ دس مہینے پہلے کی بات ہے۔ انجیلا نے رقم دینے کا وعدہ کر لیا۔ اس شیطان صفت آدمی نے انجیلا کو بلیک کیسٹ کلب کا پتا بتایا۔ اس نے کہا کہ وہ رقم لے کر کلب میں جائے۔ وہاں اسے ایک پرانا دوست ملے گا۔ یہ پرانا دوست میرا اپنا بیٹا تھا۔ کاش وہ بد قماش پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔ میں نے انجیلا کو سمجھانے کی کوشش کی مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ آدمی فریبی ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں کہ ٹیری کہاں ہے لیکن انجیلا کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کے لیے یہ تصور نا قابل برداشت تھا کہ ٹیری کے ہاتھ ہتھوڑے مار کر توڑ دیے جائیں۔ چنانچہ وہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو بینک جاتی رقم نکالتی اور ہینک کو دے آتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رقم دے کر اسے ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کی حالت سنبھل جاتی تھی۔ میں اس سلسلے میں کچھ کرنے سے مجبور تھی اس لیے بس اس کی دیکھ بھال ہی کرتی رہی۔ کچھ مدت کے بعد وہ گنجا آدمی پھر آیا۔ میں نے کچن میں اس کی باتیں سنیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر انجیلا اسے ایک لاکھ ڈالرز دے دے تو وہ اس کی اور ٹیری کی ملاقات کا انتظام کر دے گا۔ اس کے بعد تم آئے اور اسے بتایا کہ تم ٹیری کو تلاش کر رہے ہو کیونکہ کسی نے اپنی وصیت میں اس کے لیے ایک لاکھ ڈالرز چھوڑے ہیں۔ ٹیری کو صرف اتنا کرنا ہے کہ بینک جا کر رقم وصول کر لے۔ انجیلا کو اس رقم کی شدید ضرورت تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ ایک لاکھ ڈالرز دے کر وہ ٹیری سے مل سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ بینک سے رقم وصول کرنے کے لیے کسی آدمی کو نقلی ٹیری بنا کر پیش کر دے۔ اس نے ہینک سے ایک آدمی فراہم کرنے کے لیے کہا جس نے کسی کو تلاش کر لیا۔ اس کے بعد تم جانتے ہی ہو کہ کیا واقعہ پیش آیا۔ جب انجیلا بینک سے واپس آئی تو سخت غصے میں تھی۔ اس کی دیوانگی عود کر آئی تھی۔ میں اس سے بچنے کے لیے کچن میں بند ہو گئی۔ وہ بار بار چیخ کر یہی کہہ رہی تھی کہ اس چڑیل کی اولاد کو سبق سکھا کر رہے گی۔ اس کی کوئی نہ کوئی گرل فرینڈ ضرور ہوگی۔ میں ہینک سے کہہ کر اس کا چہرہ بگاڑ دوں گی، تب اس کمینے کو معلوم ہوگا۔ اس کے بعد وہ اپنی کار میں چلی گئی اور تین چار گھنٹے تک واپس نہیں آئی۔ جب آئی تو کافی پُرسکون تھی۔ بولی میں نے اس حرامزادے کا مزاج ٹھکانے لگا دیا ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے پھر دوسرے دن میں نے اخبارات میں تیزاب پھینکنے کی واردات کے بارے میں پڑھا۔ مجھے بے حد افسوس ہے مگر انجیلا اپنے ہوش

میں نہیں تھی۔''

''اب انجیلا کا کیا ہوگا... اسے کہاں لے جایا گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اسے کسی پاگل خانے میں رکھا جائے گا۔'' حنا نے بڑی افسردگی سے جواب دیا۔ ''وہ لوگ اسے ذہنی امراض کا اسپتال کہہ رہے تھے۔ میں نے ان دو ڈاکٹروں اور مسز تھورسن کی گفتگو سنی ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ اب انجیلا دماغی طور پر کبھی صحت یاب نہیں ہو سکے گی۔ اس کے لیے صرف اتنا ہی کیا جا سکتا ہے کہ دواؤں کے زیرِ اثر نہیں بند کر کے رکھا جائے۔ مسز تھورسن نے کہا کہ ٹھیک ہے، وہ جو مناسب سمجھیں کریں۔ انجیلا کی اب وہی کیفیت ہے جیسے وہ مر چکی ہو۔''

میں اب مزید کچھ سننا یا جاننا نہیں چاہتا تھا۔ میں کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

''اگر میں تمہاری مدد کے لیے کچھ کر سکتا ہوں تو ضرور بتاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''باہر میری کار کھڑی ہے۔ جہاں کہو گی میں تمہیں وہاں چھوڑ دوں گا۔''

''مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔'' حنا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''چلے جاؤ، میں خود ہی اپنے قبیلے پہنچ جاؤں گی۔''

میں کاٹیج سے باہر نکلا۔ ہینک مر چکا تھا۔ انجیلا کو زندگی بھر کے لیے پاگل خانے بھیج دیا گیا تھا۔ دو ذہنی سزا کو پہنچ گئے تھے۔ ایک باقی تھا، ہولا مینگی۔ مجھے احساس تھا کہ جب تک یہ گنجا اپنے انجام کو نہ پہنچ جائے، مجھے سکون نہیں مل سکتا۔ اس کے بعد شاید میرے جذبۂ انتقام کو تسکین مل جاتی۔ یہ احمقانہ توقع ہی تھی۔ کیا کوئی بھی انتقام سوزی کی زندگی واپس دے سکتا تھا؟ میں اینڈرسن کے پاس پہنچا۔

''اب ہم گھر چلیں گے۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''وہاں بات کریں گے۔''

ہم دونوں اپنی اپنی کار میں بیٹھے اور گھر پہنچ گئے۔ اینڈرسن نے کافی بنائی۔ میں نے اسے انجیلا، ٹیری اور مینگی کے بارے میں بتایا مگر جوش کا ذکر نہیں کیا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا چنانچہ میں نے اپنا ذہن اور اپنا منہ ہمیشہ کے لیے بند کر لیا۔

''میں کل سانڈرا سے ملوں گا۔'' میں نے آخر میں کہا۔ ''اب مجھے صرف مینگی کو ٹھکانے لگانے سے دلچسپی ہے۔ میں سونے جا رہا ہوں۔ تم بھی آرام کرو۔''

مگر خواب آور دوا کی تین گولیاں کھائے بغیر مجھے نیند نہیں آئی۔

☆☆☆

کیا آپ
لبوب مقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مقوی اعصاب ٹیلیفون کرکے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

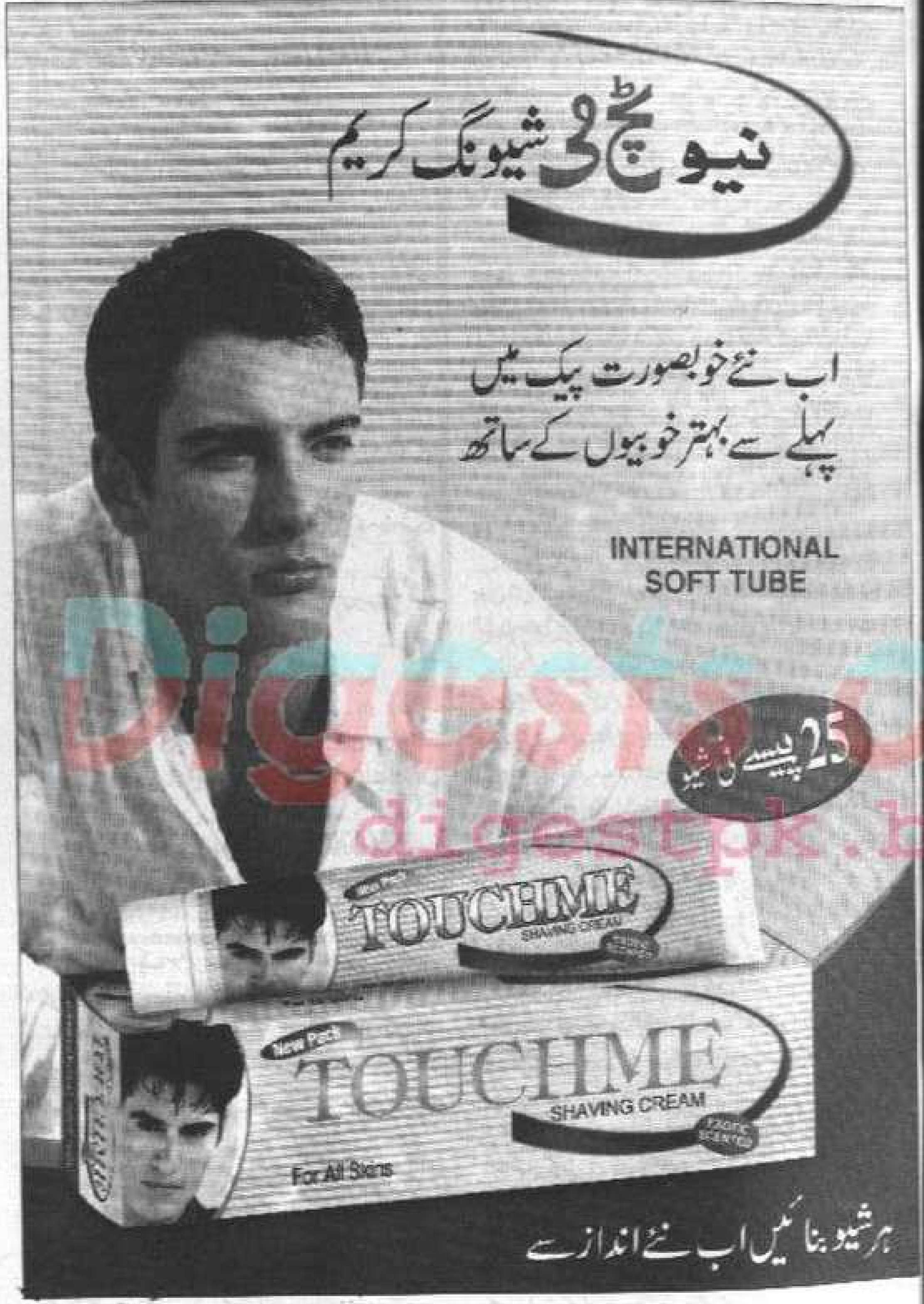

صبح کو میں اور اینڈرسن ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس وقت سوا گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ فون نیپچون تیورن کے مالک سام کا تھا۔

"کیا بات ہے سام؟" میں نے پوچھا۔

"البرنی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے بہت ضروری کام ہے۔"

"وہ ہے کہاں؟"

"یہاں ناشتا کر رہا ہے، کہتا ہے میں انتظار کروں گا۔"

"میں ابھی بیس منٹ میں آرہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"فون کرنے کا شکریہ۔" میں نے ریسیور رکھ کر اینڈرسن کو بتایا۔

"تم یہیں رہنا، میں اس سے مل کر آتا ہوں۔"

مگر اس نے بھی ساتھ چلنے پر اصرار کیا چنانچہ ہم دونوں نیپچون تیورن پہنچے۔ میں نے اینڈرسن کو کار میں چھوڑا اور خود کار سے اتر کر تیورن میں داخل ہوا۔ البرنی اپنی پسندیدہ میز پر ایک گوشے میں بیٹھا تھا۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے ناشتے کے لیے پوچھا، میں نے بتایا کہ ناشتا کرکے آیا ہوں۔ میں نے پوچھا کیا اس کے لیے بیئر منگواؤں۔

"میں بیئر سے کبھی انکار نہیں کرتا۔" البرنی نے کہا اور سام کو اشارہ کیا۔ سام جلدی سے ایک بیئر اور ساسیج لے کر آیا۔ البرنی نے بیئر کا نصف گلاس خالی کردیا اور ایک ساتھ تین ساسیج منہ میں ٹھونس کر چباتے ہوئے بولا۔

"مسٹر ویلیس! میں ایسا آدمی ہوں کہ اپنے کان زمین سے لگائے رکھتا ہوں۔ میں سوالات نہیں کرتا، بس سنتا رہتا ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ تمہیں ٹیری زینگر کی تلاش ہے چنانچہ میں سن گن لیتا رہا۔ تمہیں اب بھی اس سے دلچسپی ہے؟"

"ہاں، ضرور ہے۔" میں نے جواب دیا۔ البرنی نے تین اور ساسیج منہ میں بھر لیں۔

"تمہیں چک سولسکی سے بات کرنا چاہیے۔" اس نے کہا۔ "مافیا کے آنے سے پہلے وہ ناجائز منشیات کا دھندا کرتا تھا۔ جو کچھ میں نے سنا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیری اس کا اچھا دوست تھا۔ آج کل سولسکی کو رقم کی ضرورت ہے۔ اگر تم اس کے سامنے کچھ ڈالرز رکھو تو وہ تمہیں بتادے گا کہ ٹیری کے ساتھ کیا ہوا اور وہ کہاں گیا۔ سولسکی نمبر 10 کلیم ایلی، ٹاپ فلور پر رہتا ہے۔"

"شکریہ البرنی۔" میں نے جیب سے بٹوا نکالا مگر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہم دوست ہیں مسٹر ویلیس اور میں دوستوں سے معاوضہ نہیں لیتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے بٹوا واپس رکھ لیا۔

دوبارہ شکریہ ادا کرکے میں اینڈرسن کے پاس آیا۔ میں نے اسے البرنی سے سنی ہوئی خبر بتائی۔

"چلو دیکھتے ہیں یہ آدمی گھر پر ہے یا نہیں۔" میں نے آخر میں کہا۔

"کلیم ایلی۔" اینڈرسن نے دُہرایا۔ "یہ تو ساحلی علاقے کے بالکل آخر میں ہے اور منہدم بستی ہے۔ اگر اب بھی کوئی وہاں رہتا ہے تو مجھے حیرت ہوگی۔ جو دو چار عمارتیں رہ گئی ہیں، وہ بھی جلد گرائی جانے والی ہیں۔"

"تمہیں یہ معلوم؟"

"البرنی ہی ایسا آدمی نہیں ہے جو اپنے کان زمین سے لگائے رکھتا ہے۔" اینڈرسن مسکرانے لگا۔ "مگر باتوں میں وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔۔۔ آؤ چلیں۔"

اینڈرسن سیاحوں کے ہجوم کے درمیان سست رفتار سے کار چلاتے ہوئے جلد ہی مطلوبہ جگہ پہنچ گیا۔ اس نے بتایا کہ کلیم ایلی پاس ہی ہے اس لیے باقی راستہ پیدل چلنا مناسب ہوگا۔ ہم کار سے اترے۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ رک گیا۔ کلیم ایلی سامنے ہی تھی۔ آس پاس کی تمام بلڈنگیں گر چکی تھیں۔ جو تین چار عمارتیں رہ گئی تھیں، وہ بھی خستہ حال اور ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ نمبر 10 بلڈنگ کا حال بھی بہتر نہیں تھا۔

"یہاں بھلا کون رہتا ہوگا۔" میں نے کہا۔ ٹوٹے دروازے سے ہم اندر داخل ہوئے، سامنے زینہ تھا جس کی سیڑھیاں عمارت سے مختلف نہیں تھیں۔ اینڈرسن نے مجھے احتیاط سے چڑھنے کی تاکید کی۔ وہ دروازے پر رک گیا۔ میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میں ٹاپ فلور پر پہنچا۔ سامنے ایک کمرا تھا جس کا دروازہ کھلا تھا۔ میں آگے بڑھا۔ کمرے میں ہر طرف گندگی کے ڈھیر تھے۔ ایک پلنگ پر کوئی لیٹا تھا، بہت ہی گندے کپڑے پہنے۔ نحیف و نزار۔ اس کی بڑھی ہوئی داڑھی نے تقریباً تمام چہرہ چھپا رکھا تھا۔ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچا نظر آرہا تھا۔ عمر پینتیس چالیس کے درمیان لگتی تھی۔ جسم سے ایسی بدبو آرہی تھی جیسے برسوں سے نہ نہایا ہو۔ بظاہر وہ سو رہا تھا۔ میں نے اس کا کندھا ہلایا۔ "اے سولسکی!" میں نے آواز دی۔

اس نے آنکھیں کھول کر مجھے گھورا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم کون ہو؟" اس نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

"ایک ایسا آدمی جو رقم رکھتا ہے اور خرچ کرنے سے گریز نہیں کرتا۔" میں نے جواب دیا اور سو سو ڈالر کے دو نوٹ نکالے۔

"تمہیں اس رقم سے کوئی دلچسپی ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے یوں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا جیسے میں نے دنیا بھر کا سونا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے سامنے رکھ دیا ہو۔ پھر وہ اپنے الجھے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔

''مجھے رقم کی شدید ضرورت ہے۔'' اس نے کہا۔

''مجھے کچھ معلومات درکار ہیں۔''

''کیسی معلومات؟''

''تمہارا حال بہت خراب معلوم ہوتا ہے۔ کیا تم میری بات سمجھ کر اس کا جواب دینے کے قابل ہو؟''

''میں بہت زیادہ سوتا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''سونے کے علاوہ میرے پاس کوئی اور کام نہیں رہ گیا ہے۔ اور جب میں سوتا ہوں تو خیال ہوتا ہے، اب نہیں جاگوں گا لیکن جاگ جاتا ہوں۔ آنکھ کھلتی ہے تو خود کو اس تباہ حال کمرے میں پاتا ہوں۔ اتنی ہمت نہیں کہ سمندر میں ڈوب جاؤں۔ اس ہفتے کے آخر میں وہ اس عمارت کو بھی گرانے آ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا پھر میں کہاں جاؤں گا؟ میں اپنی زندگی کے خاتمے تک آ پہنچا ہوں مگر زندگی کم بخت ختم ہی نہیں ہوتی۔''

''میں تم سے کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں جس کا معاوضہ دو سو ڈالرز دوں گا۔''

''کیا جاننا چاہتے ہو؟ تمہارا تعلق پولیس سے تو نہیں ہے؟''

''نہیں، مجھے نیری زینگر کی تلاش ہے۔''

''کیوں؟'' سولسکی نے پوچھا۔

''یہ معلوم کرنا تمہارا کام نہیں۔ میں تمہیں دو سو ڈالرز دینے پر آمادہ ہوں بشرطیکہ تم بتا سکو کہ نیری کہاں ہے اور میں اس سے کہاں مل سکتا ہوں۔''

''فرض کرو میں بتا دوں اور تم مجھے انگوٹھا دکھا کر چلے جاؤ تب؟'' اس نے کہا۔ میں نے ایک نوٹ اس کی طرف پھینک دیا۔

''باقی ایک سو میرے سوال کا جواب دینے کے بعد۔'' میں نے کہا۔ اس نے نوٹ اٹھا لیا۔

''جانتے ہو، میں نے تین دن سے کھانا نہیں کھایا ہے۔''

''میرے سوال کا جواب دینے کے بعد جتنا کھانا چاہو کھا سکتے ہو۔''

سولسکی نے بتایا کہ نیری سے اس کی ملاقات ڈیڈ اینڈ کلب میں ہوئی تھی۔ وہ دونوں جلد ہی دوست بن گئے کیونکہ وہ خود بھی نشے کا عادی تھا اور اس نے اندازہ لگا لیا کہ نیری بھی نشہ کرتا ہے۔ سولسکی منشیات کا بزنس کرنا چاہتا تھا۔ اسے منشیات مل سکتی تھیں مگر اسے فروخت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے نیری سے بات کی اور نیری نے فروخت کرنے میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ اس نے سہ پہر کے اوقات میں کام کرنا شروع کر دیا اور جلد ہی بڑی کامیابی حاصل کر لی۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں میں... جو اس کے پیانو بجانے کے گرویدہ تھے... اس کے بہت سے جاننے والے تھے جو منشیات خریدنے لگے۔ دونوں کا کاروبار خوب چلنے لگا۔ سولسکی ایک بوڑھے چینی سے منشیات حاصل کرتا تھا اور نیری اسے فروخت کرتا تھا۔

''ہم دونوں دولت کما رہے تھے۔'' سولسکی نے کہا۔ ''میں نے ایک اچھا سا گھر لے لیا۔ آرام سے رہنا لگا۔ مجھے عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نیری کے پاس بھی ایک اچھا اپارٹمنٹ تھا جہاں وہ لیزا کے ساتھ رہتا تھا مگر عین اس وقت جب ہم سمجھ رہے تھے کہ ہمارا کاروبار جم گیا ہے، ایک بڑی مصیبت سے دوچار ہو گئے۔ ہمیشہ کی طرح میں پیر کو منشیات لینے گیا تو وہاں ہولا منگی کو بیٹھے پایا۔ تم منگی کو جانتے ہو؟''

''ہاں جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مگر تم رکو نہیں کہتے جاؤ۔''

''اس شیطان کو دیکھ کر میں ڈر گیا۔ میں خود بھی نشہ کرتا ہوں اس لیے بہت بزدل ہوں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اب تمہارا دھندا ختم ہو گیا۔ اپنے دوست سے بھی کہہ دینا کہ فروخت کرنا بند کر دے۔ میں اتنا خوف زدہ تھا کہ اگر وہ کہتا کہ میرے قدم چومو تو میں یہ بھی کر لیتا۔ میں جانتا تھا کہ نیری لیزا کے ساتھ ہے۔ میں نے اسے فون کیا اور منگی نے جو کہا تھا اسے بتا دیا۔ اس نے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں مگر اب ہمیں ایک ساتھ رہنا چاہیے۔ وہ اپنا سامان لے کر میرے گھر آ گیا۔ ہم نے مل کر دل کھولے ہو گیا۔ منشیات کی سپلائی بند ہو گئی۔ میرے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ گھر کا کرایہ دے سکتا۔ جب ہم دونوں کی جیبیں خالی ہو گئیں تو نیری نے کہا ہمیں دوسرا سپلائر تلاش کرنا چاہیے۔ اسے منگی کی پروا نہیں تھی مگر میں کام شروع کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ میں نے نیری کو بھی سمجھایا مگر وہ بہت ضدی تھا۔ اس نے ایک نہ سنی۔ اس نے کہا کہ پچاس سے زیادہ لڑکے لڑکیاں اس کے گاہک ہیں۔ وہ سب اپنی خوراک کے لیے بے چین ہیں۔ وہ ضرور انہیں نشہ فراہم کرے گا۔ اس نے ہی انہیں نشے کی عادت ڈالی ہے، اب وہ پریشان ہیں تو وہ انہیں اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ پھر اس نے کہیں نہ کہیں سے منشیات حاصل کر کے ان لڑکے لڑکیوں کے ہاتھ بیچ دی۔ میں جانتا تھا کہ اب کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔ میرا نئے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے جو نفع کمایا، میں نے اس میں سے کچھ نہیں لیا۔ میں اتنا بزدل تھا کہ بس اپنے کمرے میں بیٹھا خوف سے کانپتا رہا۔

یہ صورتِ حال ایک ہفتے چلی پھر مصیبت آ گئی۔ میں جانتا تھا کہ ضرور آئے گی۔ نیری مجھے اپنی کامیابی کی داستان سنا رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور منگی دو غنڈوں کے ساتھ اندر آیا۔ پھر جو ہوا تھا، بڑی تیزی سے ہو گیا۔ کیا ہوا، مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔ میں فرش پر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے پڑا تھا۔ کمرے میں شور ہو رہا تھا۔ مارنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نیری بُری طرح چیخ رہا تھا اور یوں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ پھر منگی نے مجھے ٹھوکر ماری۔ اس نے کہا کہ چونکہ میں نے اس کے کہے پر عمل کیا تھا، اس لیے وہ مجھے نہیں مارے گا۔ میں یہ سب کچھ بھول جاؤں۔ میں خوش قسمت ہوں کہ وہ مجھے زندہ چھوڑ رہا ہے۔ پھر وہ چلا گیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو نیری کی لاش بھی غائب تھی۔ میں نے خبردار کر دیا تھا کہ منگی جیسے گوریلوں سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرنا چاہیے مگر وہ نہیں مانا اور اپنی ضد کا انجام دیکھ لیا۔ تم جاننا چاہتے ہو کہ نیری کہاں ہے؟ میرا اندازہ ہے کہ اس کی پچکی لاش کو سیمنٹ کا کوٹ پہنا کر سمندر کی تہ میں پھینک دیا گیا ہے۔ میں کیا کر سکتا تھا؟ بالکل خالی ہاتھ تھا، اپنا گھر چھوڑ کر اس تباہ حال عمارت میں آ گیا۔ یہاں رہنے کا کوئی کرایہ نہیں اور اب میں موت کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔''

میرے دل میں اس ذلیل آدمی کے لیے ہمدردی کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ ایسا بے ضمیر انسان جو کم عمر لڑکے لڑکیوں کے ہاتھ ہیروئن بیچ کر انہیں نشے کا عادی بناتا ہے وہ ہر اس سزا کا مستحق ہے جو اسے دی جائے۔ میں نے دوسرا نوٹ بھی سولسکی کی جانب پھینکا اور بلڈنگ سے باہر نکل گیا۔ اینڈرسن میرا منتظر تھا۔ اپنی کار کی طرف جاتے ہوئے میں نے اسے وہ باتیں بتائیں جو سولسکی سے معلوم ہوئی تھیں۔

''تو اب نیری کا معاملہ بھی ختم ہو گیا۔'' اینڈرسن نے کہا۔ ''تھورسن لوگوں نے بہت اچھے بچے پیدا کیے تھے۔''

''ایسا ہوتا ہے۔'' میں نے کار کا دروازہ کھولا۔ ''خود تھورسن بھی تو اچھے والدین نہیں تھے۔'' ہم کار میں بیٹھ گئے۔

''او کے۔'' اینڈرسن بولا۔ ''چینک مر گیا۔ انجیلا کو پاگل خانے بھیج دیا گیا۔ نیری شاید سمندر کی تہ میں ہے۔ اس طرح اب صرف منگی باقی رہ جاتا ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

''ہاں، اب تک ہمیں کوئی خاص مزاحمت پیش نہیں آئی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر منگی کوئی آسان شکار نہیں ہے۔ دو گھنٹے بعد مس سانڈرا سے ملنے جاؤں گا۔ معلوم کروں گا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ آج کی رات ہنگامہ خیز ہو گی۔''

میں نے کار اسٹارٹ کی اور گھر کی جانب موڑ دی۔

☆☆☆

بڑی پارٹی

تاج محمد، آنسو اتنے کنجوس تھے کہ ان کے قریبی دوست انہیں مکھی چوس تک کہنے سے باز نہیں آتے تھے۔

ایک روز ''رنڈوے کی فریاد'' لکھتے لکھتے ان کا دل چاہا کہ ایک کیلا کھائیں۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ دل کو اس بیہودہ خیال سے باز رکھیں مگر بڑا اکائیاں دل تھا۔ اڑ گیا کہ کیلا کھاؤں گا اور ابھی کھاؤں گا ورنہ دھڑکنا چھوڑ دوں گا۔

ناچار تاج محمد آنسو ادھوری نظم چھوڑ کر اٹھے، بازار گئے اور پھل فروش کی گود میں 5 پیسے کا سکہ پھینک کر بولے۔ ''یار ذرا جلدی سے ایک اچھا سا کیلا تو دینا۔ دیکھو، کچا نہ ہو۔''

پھل فروش نے حیرت کی ایک نظر تاج محمد آنسو پر ڈالی۔ دوسری پانچ پیسے کے سکے پر۔ سمجھ گیا کہ یہ حضرت کیلا لیے بغیر نہیں ٹلیں گے اور پانچ کی جگہ چھ پیسے بھی نہیں دیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جائیں۔ عقل اور احتیاط کا تقاضا ہے کہ دکانداری خراب نہ کی جائے۔

تب اس نے ایک بڑا سا کیلا اٹھایا اور ان کی طرف بڑھا کر بولا۔ ''یہ لیجیے سرکار! کیلا حاضر ہے۔'' پھر مسکرایا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ حضور والا کے ہاں کوئی بڑی پارٹی ہونے والی ہے۔ جس کی خاطر آپ اتنی زوردار خریداری کرتے پھر رہے ہیں۔''

تاج محمد آنسو چپ رہے۔ تاج محمد آنسو ہنس دیے۔ تاج محمد آنسو گھر کو کھسک لیے۔ حضور تھا کھانا کیلا!

طاہر محمود مجاہد۔ منڈی بہاء الدین

تھری کریب ریسٹورنٹ کی ہیڈ ویٹر نے حسبِ معمول مسکرا کر میرا استقبال کیا اور بتایا کہ سانڈرا میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچا، دروازے پر دستک دی اور اندر داخل ہو گیا۔ سانڈرا اپنی میز پر بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے وہسکی اور گلاس رکھے تھے۔ اس نے اٹھ کر مجھے خوش آمدید کہا اور شراب پیش کی مگر میں نے انکار کر دیا کہ ابھی نہیں بعد میں۔ وہ حسبِ معمول بڑی سنسنی خیز نظر آ رہی تھی۔

''کیا خبر لائے؟'' اس نے پوچھا۔

''اس ماہ وینلسکی کی آمدنی دس ہزار ڈالر کم ہو جائے

digestpk.blogspot.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گی۔" میں نے جواب دیا۔ سانڈرا چونکی۔

"وہ کس طرح؟" اس نے پوچھا اور میں نے اسے انجیلا تھورسن کے بارے میں بتایا۔

"ظاہر ہے اب انجیلا رقم نہیں دے سکتی۔" میں نے آخر میں کہا۔ "اور وہ پلنسکی پاگل خانے میں بند ایک عورت کو دھمکی نہیں دے سکتا۔"

"یہ اسے ٹھکانے لگانے کے لیے کافی ہے۔" سانڈرا نے ہلکا تبسم لگایا۔ "تنظیم اس کی جگہ کسی اور کو بھیجے گی۔"

"مجھے پلنسکی کے انجام سے کوئی دلچسپی نہیں، صرف منگی کی فکر ہے۔"

"ٹھیک کہا۔ میں نے اسے چیک کیا ہے۔ وہ ایسا چوہا ہے جو اپنی حفاظت کرنا جانتا ہے۔ میں اسے سسکا سسکا کر مارنا چاہتی تھی لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ممکن نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہر وقت باڈی گارڈز رہتے ہیں۔ اسے جہنم رسید کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ میرے پاس ایک آٹومیٹک گن ہے۔ میں اس کے جسم میں بیسیوں سوراخ کر سکتی ہوں۔"

"یہ سیدھا سیدھا خودکشی کرنا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اس کے باڈی گارڈز تمہیں بچ کر نہیں جانے دیں گے۔ میں مانتا ہوں کہ تم اسے چھلنی کر سکتی ہو مگر خود بھی ماری جاؤ گی۔"

"نہیں مسٹر ویلیس۔" سانڈرا کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ "وہ مجھے ہاتھ لگانے کی بھی ہمت نہیں کر سکتے۔ مافیا کا ہر آدمی مجھے جانتا ہے یا اس نے میرے بارے میں سنا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میں پلنسکی کا دایاں ہاتھ ہوں۔ پلنسکی نیویارک گیا ہے۔ کل رات واپس آئے گا۔ جب وہ سنے گا کہ میں نے منگی کو ہلاک کر دیا ہے تو میری موت کا حکم دے دے گا لیکن تب تک میں اس کی دسترس سے بہت دور جا چکی ہوں گی۔ میں پہلے ہی پلاننگ کر چکی ہوں۔ منگی کو ختم کرتے ہی میں چل پڑوں گی۔ ایسی جگہ گم ہو جاؤں گی کہ تنظیم مجھے تلاش نہیں کر سکے گی۔ میری فکر مت کرو، میں اپنی حفاظت بہت اچھی طرح کر سکتی ہوں۔" اور اس وقت اس کے انداز و تاثرات دیکھتے ہوئے مجھے یقین تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہی ہے۔

"تم نے کہا تھا۔" سانڈرا نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "منگی سے بدلہ چکانا چاہتے ہو۔ تم نے اسے دیکھا ہے؟ میں نے نہیں۔ میں کسی غلط آدمی کو نشانہ نہیں بنانا چاہتی۔ تم صرف اتنا کرنا کہ اسے اشارے سے مجھے دکھا دینا۔ باقی کام میں کرلوں گی۔"

میں ایک لمحے کے لیے ہچکچایا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو قتل کے جرم میں شریک سمجھا جاؤں گا۔ تب مجھے سوزی کا خیال آیا۔ منگی وہی شیطان تھا جس نے اس کے چہرے پر تیزاب پھینکا تھا۔ اس شیطان کو ہلاک ہونا ہی چاہیے تھا۔

"ٹھیک ہے سانڈرا! میں یہ کام کر دوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"وصولیابی کی نئی جگہ فوچانگ کا ریسٹورنٹ ہے۔" سانڈرا نے بتایا۔ "منگی صبح تین بجے رقم وصول کرنے وہاں آئے گا۔ میں اپنی کار میں ہوں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم بھی وہاں آؤ۔ ہم دو بجے وہاں پہنچ جائیں گے۔ ہمیں انتظار ضرور کرنا پڑے گا مگر یہ ضروری ہے۔ کیونکہ ممکن ہے، وہ پہلے آجائے۔ تم اشارے سے اسے دکھا دینا پھر میں سنبھال لوں گی۔"

"میں وہاں آجاؤں گا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میری صرف اتنا چاہوں گا کہ تم نے جو کچھ سوچا ہے وہ ٹھیک ہو۔"

"میری سوچ ہمیشہ درست ہوتی ہے۔" سانڈرا نے کہا۔ "اب تم سے رات دو بجے ملاقات ہوگی۔ میں مرسیڈیز کار میں ہوں گی ریسٹورنٹ کے قریب۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہے، مجھے اشارے سے بتا دو کہ منگی کون ہوں۔"

اینڈرسن انتظار کر رہا تھا۔ میں کار میں بیٹھا اور اس سے پوچھا کہ فوچانگ ریسٹورنٹ کے بارے میں کیا جانتا ہے۔ "یہ ریسٹورنٹ ساحلی علاقے میں مشرقی سمت میں واقع ہے۔" اس نے بتایا۔ "اس کا آغاز اچھا ہوا تھا مگر پھر فوچانگ جس کی عمر نوّے برس ہو چکی ہے، معاملات پر اپنی گرفت قائم نہیں رکھ سکا۔ مگر تم وہاں کیوں جا رہے ہو؟"

"وہ اس ادائیگی کی جگہ ہی ہے۔" میں نے کہا اور پھر اسے اپنی اور سانڈرا کی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ "سانڈرا نے طے کیا ہے کہ ہم رات دو بجے وہاں جائیں گے۔ ریسٹورنٹ کے جس قدر قریب کار پارک کر سکتے ہیں، کریں گے۔ سانڈرا وہاں مرسیڈیز کار میں آئے گی۔ جب منگی آئے گا تو میں سانڈرا کو اشارے سے اسے دکھاؤں گا اور وہ اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دے گی۔ تم الگ رہنا۔ اگر حملہ کارگر ہوا تو سانڈرا کے جانے کے بعد ہم بھی گھر لوٹ جائیں گے لیکن کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم سانڈرا کی مدد کریں گے۔"

"اگر وہ منگی کو قتل کر کے بھاگنے میں کامیاب ہو جائے تو کیا تمہارے خیال میں ہم کرگل کے پاس جا کر اپنی ملازمت شروع کر سکیں گے؟" اینڈرسن نے کہا۔ "میرا مطلب ہے اس کے بعد تمہیں اطمینان ہو جائے گا کہ تم نے سوزی کا بدلہ لے لیا؟"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اگر مجھے یقین ہو جائے کہ منگی مر چکا ہے تو ہم اپنا کام پھر شروع کر دیں گے۔"

"ٹھیک ہے، آؤ پہلے کھانا کھالیں۔" وہ بولا۔

ہم نے ریسٹورنٹ جا کر کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں محو تھے۔ کھانے کے بعد اینڈرسن نے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں یہ ترکیب کامیاب ہوگی؟"

"سانڈرا بہت خاص قسم کی عورت ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں کامیابی کے بارے میں پُرامید ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور وہ ماری گئی تو میں اس کا کام ختم کر دوں گا۔ وہ کہتی ہے کہ منگی کے باڈی گارڈز اس سے الجھنے کی ہمت نہیں کریں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے لیکن یہ بنیادی طور پر میرا اور اس کا معاملہ ہے۔ تم اب بھی پیچھے ہٹ سکتے ہو۔ یہ تمہاری ذاتی جنگ نہیں ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" اینڈرسن نے جواب دیا۔ "چلو گھر چلیں۔ ابھی تین گھنٹے باقی ہیں۔ میں ایک جھپکی تو لے ہی سکتا ہوں۔"

ہم ساحلی علاقے سے واپس چلے تو میں نے دو نوجوان اور سخت نظر آنے والے کانسٹیبلوں کو ڈیوٹی دیتے دیکھا۔ اس کا مطلب تھا کہ پیسکی ان رشوت خور کانسٹیبلوں کا تبادلہ کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ دونوں پلنسکی کی سرگرمیوں میں رکاوٹ ڈال سکتے تھے۔ جب ہم گھر پہنچے تو اینڈرسن فوراً سونے چلا گیا۔ میں نے ایک گھنٹا اپنے اور اینڈرسن کے ریوالوروں کو صاف کرنے اور تیل دینے میں صرف کیا۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔ پونے دو بجے اینڈرسن کو اٹھایا۔ اس کا ریوالور اس کے حوالے کیا اور ہم ساحلی علاقے کی طرف چل دیے۔ اینڈرسن مجھے راستہ بتاتا رہا۔

"یہ تمہارے داہنی جانب فوچانگ ریسٹورنٹ ہے۔" اچانک اس نے کہا۔

ریسٹورنٹ کی عمارت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے کبھی اچھے دن بھی دیکھے ہیں لیکن اب اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ بظاہر کوئی سرگرمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ صدر دروازے پر تیز روشنی ہو رہی تھی۔ شاید اس امید میں کہ کچھ گاہکوں کو متوجہ کر سکے۔ رات کے اس حصے میں پارکنگ آسان تھی۔ میں نے ریسٹورنٹ سے بیس گز کے فاصلے پر کار روک لی۔

"ممکن ہے ہمیں زیادہ انتظار کرنا پڑے۔" میں نے انجن بند کرتے ہوئے کہا۔

"اور ہم اس کام میں بہت ماہر ہیں۔" اینڈرسن نے جواب دیا۔

ہمارے دیکھتے دیکھتے تاریکی سے کچھ سائے میں لپٹے افراد نمودار ہوئے اور دروازے سے اندر جانے لگے... ہر قسم کے افراد مگر زیادہ تر کیوبا کے رہنے والے... کچھ چینی اور چند سفید فام۔ وہ اندر جاتے اور منٹوں میں باہر آجاتے اور پھر تاریکی میں گم ہو جاتے۔ یہ سب بلیک میلنگ کے شکار تھے اور وہ مسلسل آ رہے تھے۔ دو بج کر چند منٹ پر ایک چھوٹی مرسیڈیز کار آئی۔

"لو سانڈرا آگئی۔" میں نے کہا۔ "تم یہاں ٹھہرو، میں اس کے پاس جاتا ہوں۔ اگر ضرورت پڑے گی تو ہم اس کی مدد کریں گے۔"

"اگر گولیاں چلیں۔" اینڈرسن نے کہا۔ "تو کیا ہم مارنے کے لیے فائر کریں گے؟"

"اگر نہیں کریں گے تو خود مارے جائیں گے۔" میں نے جواب دیا۔ "اس شیطان کو ختم ہونا ہی چاہیے۔"

میں مرسیڈیز کار کے پاس گیا۔ سانڈرا اسٹیئرنگ سنبھالے بیٹھی تھی۔ یہاں نیم تاریکی تھی اور وہ صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں کار کا دروازہ کھول کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"ہیلو ویلیس!" اس نے کہا۔ "میں دیکھ رہی ہوں کہ لوگ رقم ادا کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔"

"کیا تمہاری ترکیب کامیاب ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"ضرور ہوگی۔" سانڈرا کے لہجے سے ارادے کی مضبوطی نمایاں تھی۔ "آرام سے بیٹھو، ہمیں انتظار کرنا ہے۔"

ہم آدھے گھنٹے تک خاموش بیٹھے رہے۔ لوگ آتے جاتے رہے۔ سانڈرا جیسے پتھر کی بنی ساکت بیٹھی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ بات کرنا نہیں چاہتی۔ میں گاہے بگاہے اپنے ریوالور کو چھو رہا تھا۔ میں نے اب تک کسی کو جان سے نہیں مارا تھا لیکن آج مرنے مارنے پر تیار تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ سانڈرا ناکام رہی تو میں منگی کو ختم کر دوں گا۔

"وہ آ رہے ہیں۔" اچانک سانڈرا سرگوشی میں بولی۔

ایک بڑی کیڈی لاک کار ریسٹورنٹ کے سامنے آکر رکی۔ چار آدمی باہر نکلے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ ان کے بعد منگی کار سے اترا۔ باڈی گارڈ لمبے تڑنگے آدمی تھے۔ منگی ان کے سامنے بونا لگ رہا تھا۔

"یہ منگی ہے۔" میں نے سانڈرا سے کہا۔ "وہ پستہ قد آدمی۔"

"شکریہ ویلیس۔" سانڈرا کار سے اتری اور زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کیا۔ آواز سن کر منگی کے گارڈز اس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دریچۂ عشق

مختار آزاد

عشق کھیل نہیں لیکن کچھ لوگ اسے کھیل ہی سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی ایک شخص کا فسانہ... عشق کرنا جس کی فطرت تھی۔ وہ عشق کا شوق پورا کرتے کرتے اچانک ایک خونی واقعے کا چشم دید گواہ بن گیا اور پھر قاتل کو انجام تک پہنچانے کا عزم اس کا مقصد بن گیا۔

محبوبہ کی تلاش میں سرگرداں نوجوان کی بدحواسی...... وہ افتاد کا شکار ہو گیا

فرانسسکو ادھیڑ عمر کا غیر شادی شدہ مرد تھا۔ وہ خاصا دل پھینک واقع ہوا تھا۔ خوبصورت عورتوں کو تاڑنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اپنی عادتوں کے باعث وہ ایک مرتبہ پھر بیروزگار تھا اور ان ایام بیروزگاری میں وقت گزاری کا واحد مشغلہ اِدھر اُدھر تا کا جھانکی کرنا تھا۔

اُس دن بھی وہ پوری تن دہی سے اپنے کام میں مصروف تھا، جب اُس نے پہلی بار اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ سامنے والے اپارٹمنٹس کے سامنے ٹیکسی سے اُتری اور چند لمحوں میں ہی اندر چلی گئی۔ پہلی ہی نظر میں فرانسسکو اسے دل دے بیٹھا۔ خیر، یہ تو اس کی عادت ہی تھی لیکن حقیقت میں اس کی جگہ کوئی اور ہوتا، تب بھی وہ پہلی ہی نظر میں اس کے حسن کا اسیر ہو جاتا۔ گوری رنگت، دراز قد، لمبے سیاہ بال، دلکش چال...

طرف دیکھنے لگے۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سانڈرا ان کی طرف بڑھتی گئی اور قریب پہنچ کر بولی۔

”منگی۔“ اس کی آواز بلند اور صاف تھی۔ ”میں سانڈرا ہوں اور تمہارے لیے ویلنسکی کا ایک خاص پیغام لائی ہوں۔“

کیا مظاہرہ تھا۔ کوئی ہچکچاہٹ نہیں... اور ظاہری کیفیت؟ میں نے کسی عورت کو اتنا دل فریب نہیں دیکھا تھا جیسی اس وقت وہ نظر آ رہی تھی۔ چاروں گارڈز نے اپنے ریوالور نیچے کر لیے اور حیرت سے اسے گھورنے لگے۔ میں بھی کار سے باہر آ گیا۔ اینڈرسن بھی اتر آیا تھا۔ گارڈز کچھ پیچھے ہٹ گئے اور صدر دروازے کی تیز روشنی میں منگی اکیلا کھڑا رہ گیا۔

”تو تم سانڈرا ہو۔“ اس نے کہا۔ ”اب ویلنسکی کو کیا تکلیف ہے؟“

”اس نے تمہارے لیے ایک خاص پیغام بھیجا ہے۔“

”او کے بے بی! پیغام کیا ہے؟“

سانڈرا کے ہاتھ میں ایک بڑا بیگ تھا۔ منگی اس سے چھ فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

”میں نے اسے یہاں رکھا ہے۔“ سانڈرا نے کہا اور بیگ کی زپ کھولی۔ اس کی حرکات اتنی پُراعتماد اور پھرتیلی تھیں کہ منگی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے للچائی نظروں سے دیکھ ہی رہا تھا کہ سانڈرا نے ریوالور نکالا اور یکدم فائر کرنا شروع کر دیے۔ چار گولیوں نے منگی کا پیٹ پھاڑ کر رکھ دیا۔ چاروں گارڈز بس بے حس و حرکت کھڑے رہ گئے۔ میرا ریوالور بھی تیار تھا کہ ضرورت پڑے تو شوٹنگ شروع کر دے مگر صورت حال سانڈرا کے کنٹرول میں تھی۔

”او کے ساتھیو!“ سانڈرا گارڈز سے مخاطب ہوئی۔ ”ویلنسکی اسے منظر سے ہٹانا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ پولیس آئے، لاش کو ٹھکانے لگا دو۔“

”جو حکم مس سانڈرا۔“ ایک گارڈ نے جواب دیا۔

سانڈرا نے خون میں ڈوبی منگی کی لاش پر ایک نظر ڈالی اور پھر اطمینان سے اپنی کار کی طرف چل دی۔ میں نے مرسیڈیز کار کا دروازہ کھولا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”تم نے دیکھا میری سوچ ہمیشہ درست ثابت ہوتی ہے۔“ اس نے مجھ سے کہا۔ ”اب تم جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔ اب ہمارا حساب برابر ہو گیا۔ ہو گیا نا؟“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی۔

”یہ میری تم سے آخری ملاقات ہے۔“ وہ بولی۔

”خدا حافظ سانڈرا۔ سانیا کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔“

”اور میری ٹانگیں بہت لمبی ہیں۔“ سانڈرا مسکرائی۔

”اچھا، خدا حافظ۔“ کار تیزی سے آگے بڑھی۔

کافی فاصلے سے پولیس سائرن کی آوازیں آ رہی تھیں۔

چاروں گارڈز نے منگی کی لاش اٹھائی اور کیڈی لاک کی ڈکی میں ڈال دی۔ میں اپنی کار کی طرف لپکا۔ اینڈرسن ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے بیٹھا تھا۔ جیسے ہی میں اندر بیٹھا، اس نے کار آگے بڑھا دی۔ ایک تاریک اسٹریٹ سے گزر کر ہم جلد ہی ہائی وے پر آ گئے۔ اینڈرسن نے رفتار کچھ کم کی اور گھر کی طرف چل دیا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ انجیلا، ہونگ اور اب منگی۔ سب کو ٹھکانے لگا دیا گیا تھا۔ حساب برابر کرنے کے لیے اب کچھ اور نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ سوزی کی یاد برسوں تک میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ وہ جو بھی زندگی سے بھرپور تھی، مر چکی تھی۔ میں کچھ بھی کروں، اسے واپس نہیں لا سکتا تھا اور نہ کوئی دوسری عورت اس کی جگہ لے سکتی تھی۔

جب ہم گھر پہنچ گئے تو اینڈرسن نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

”کیا عورت ہے۔ اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں کام کیا۔ آؤ اب آرام کریں۔“

”ہاں، کام ختم ہو چکا ہے۔ شکریہ اینڈرسن۔“

”اس وقت پانچ بجے ہیں۔“ اینڈرسن نے اپنی رسٹ واچ دیکھی۔ ”صبح اٹھ کر اچھا سا ناشتا کر کے کرش سے ملنے جائیں گے اور اپنی جگہ کام کرنے لگیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ اس نے کچھ دیر میری طرف دیکھ کر کہا۔

”تمہیں سب کچھ فراموش کرنا ہو گا۔ کوئی اپنے ماضی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا۔ مستقبل کی اہمیت ہوتی ہے۔ کل ایک نیا دن ہو گا۔ جاؤ، اب سو جاؤ۔“

اپنے کمرے کے ڈبل بیڈ پر لیٹے ہوئے میں نے گزرے دنوں پر نگاہ ڈالی۔ ہونگ مر چکا تھا۔ انجیلا پاگل خانے میں بند کر دی گئی تھی۔ منگی بھی ہلاک کر دیا گیا تھا۔ میں نے قریبی تکیے پر ہاتھ پھیرا جہاں کبھی سوزی کا خوب صورت سر رکھا ہوتا تھا۔ میں سو نہیں سکا۔ پردوں کے پیچھے ابھرنے والے سورج کو دیکھتا رہا۔ چمکیلی دھوپ رفتہ رفتہ کمرے میں اجالا کرتی جا رہی تھی۔ اینڈرسن نے سچ ہی کہا تھا، میں اپنے ماضی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ کل ایک نیا دن ہو گا۔

ذہن میں اس خیال کے ساتھ... اپنا ہاتھ برابر کے خالی تکیے پر رکھے ہوئے معلوم نہیں کب آخرکار مجھے نیند آ گئی۔

●●●

Digests of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سڈول جسم اور خوبصورت آنکھیں۔۔۔ ایک لمحے میں ہی وہ سب کچھ دیکھ چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے بہت دنوں کے بعد اتنا متوازن حُسن دیکھا ہے۔

بظاہر وہ حسینہ کسی نوخیز دوشیزہ کی طرح لگ رہی تھی لیکن یقین سے یہ کہنا مشکل تھا کہ آیا وہ اب بھی عمر کے اس دور میں ہے جہاں وہ لڑکی کہلائے جانے کی حق دار تھی یا پھر وہ عورت کہلانے کی عمر میں داخل ہو چکی ہے۔ اگر ایسا تھا تو پھر داد دینی چاہیے کہ ظاہری حُسن میں وہ کسی طور بھی کمسن لڑکی سے کم نظر نہیں آتی تھی۔ جب وہ ٹیکسی سے اتری تو پہلی بار فرانسسکو کی نظر اس پر پڑی اور جب تک وہ اندر نہ چلی گئی، جب تک وہ اسے بدستور پلکیں جھپکائے بغیر تکتا رہا۔

جس بے نیازی سے وہ حسینہ ٹیکسی سے اتر کر عمارت کے اندر داخل ہوئی تھی، اس کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں لگتا تھا کہ وہ جانتی ہوگی کہ اس وقت کئی مردوں کی نظروں کے تیر اس کا نشانہ تاک رہے ہیں۔ فرانسسکو اس کے حُسن کا تو شکار ہو ہی چکا تھا۔ اس کی ادائے بے نیازی پر وہ دل تھام کر رہ گیا۔ اس کے دماغ میں تخیل کا طوفان موجیں مار رہا تھا۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں اس حسینہ کے ساتھ دلفریب شام میں ساحلِ سمندر پر تنہا چہل قدمی کر رہا تھا۔ شہر کے سب سے بڑے ریستوران میں ڈنر کرنے والا تھا۔ اس کے بعد وہ نائٹ کلب جاتا اور پھر صبح ہونے تک اسے اپنی باہوں میں لیے ناچتا رہتا۔۔۔ حسیناؤں کے ساتھ وقت گزارنے کے خواب وہ ہمیشہ کھلی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اس اجنبی حسینہ کے عشق میں بُری طرح گرفتار ہو چکا تھا لیکن اس بار وہ سوچ رہا تھا کہ سیدھا اپنے کمرے میں جائے اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں موند لے اور اس حسینہ کے بارے میں سوچتے سوچتے نیند کی وادی میں اتر جائے۔

فرانسسکو جس اپارٹمنٹ میں رہتا تھا، وہ اس بلڈنگ کے عین مقابل واقع تھا جس کے سامنے وہ حسینہ ٹیکسی سے اتر کر اندر داخل ہوئی تھی۔ اُن دونوں عمارتوں کے درمیان صرف ایک سڑک حائل تھی۔ اگرچہ فرانسسکو نے اسے صرف چند لمحے ہی دیکھا تھا مگر جس بُری طرح وہ اس کے یک طرفہ عشق میں مبتلا ہوا، وہ بخار جلدی اترنے والا نظر نہیں آتا تھا۔ پہلی نظر کے عشق کو ایک دن گزر چکا تھا۔ فرانسسکو کی لاکھ کوششوں کے باوجود وہ حسینہ دوبارہ نظر نہیں آئی۔ وہ بنا کسی کام کے خواہ مخواہ اُس عمارت کے سامنے سے کئی بار گزرا۔ گھنٹوں اپنی عمارت کے نیچے بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگا کر اُس عمارت کو تکتا رہا مگر وہ نظر نہ آئی۔ فرانسسکو اس بُری طرح اس کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا کہ یہ بات بھی بھول گیا کہ اسے نوکری تلاش کرنی ہے۔ اگر نوکری نہ ملی تو مالک مکان اسے اس فلیٹ سے لات مار کر نکال دے گا جس کے نیم تاریک کمرے کی واحد کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر وہ گزشتہ رات گھنٹوں اس عمارت کو گھورتا رہا ہے جس میں وہ لڑکی داخل تو ہوئی تھی لیکن پھر اس کے بعد اُسے اس کی ایک جھلک بھی دیکھنے کو نہ ملی۔ وہ دو دن تک اسی کشمکش میں مبتلا رہا لیکن وہ عورت تو جیسے اس اپارٹمنٹس میں جا کر کہیں غائب ہو گئی تھی۔ یہ بات اسے بہت پریشان کیے ہوئے تھی۔

تیسرے دن شام کا وقت تھا۔ سورج غروب ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ موسم خاصا خوش گوار تھا۔ فرانسسکو اپنے اپارٹمنٹس کے نیچے بجلی کے کھمبے سے پیٹھ ٹکائے سامنے والی رہائشی عمارت کو گھور رہا تھا۔ اتنے میں ایک ٹیکسی اس اپارٹمنٹس کے سامنے والے پارکنگ ایریا میں آ کر رکی۔ فرانسسکو نے ٹیکسی کی آمد کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اس کی نظریں تو اس عمارت کے اس حصے پر جمی ہوئی تھیں جہاں عمارت کا مرکزی دروازہ تھا۔ اسے توقع تھی اور نہ ہی اس کے وہم و گمان میں یہ بات تھی کہ یہ ٹیکسی اس کے انتظار کا ثمر بھی ہو سکتی ہے۔ اچانک اس کے دل کی مراد بر آئی۔ وہی نازک اندام حسینہ پہلے جیسی شان بے نیازی اور ادائے دلبرانہ سے چلتی ہوئی باہر نکلی۔ اس کو دیکھتے ہی فرانسسکو کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس حسینہ نے جینز کا اسکرٹ اور سرخ رنگ کی چھوٹی سی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی کھلی ہوئی سیاہ زلفیں ہوا کے آوارہ جھونکوں کے باعث ادھر اُدھر لہرا رہی تھیں۔ وہ انداز بے نیازی سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ٹیکسی تک پہنچی اور پھر پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد ٹیکسی کہاں گئی؟ اس کا پتا نہ تو فرانسسکو کو تھا اور نہ ہی انہیں جو اس کی طرح نظریں گڑائے حسن کے اس شاہکار سے اپنی پیاسی نظروں کی تشنگی بجھانے کی کوششوں میں مصروف تھے لیکن شاید اُن کے دلوں کا وہ حال نہ ہوگا جو فرانسسکو کے دل کا تھا۔

فرانسسکو اس عورت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، حتیٰ کہ اسے تو اس کا نام بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ بالکل لاعلم تھا کہ یہ عورت کہاں سے آتی ہے اور کہاں جاتی ہے؟ وہ اس اپارٹمنٹس میں رہتی ہے یا وہاں کسی سے ملنے آتی ہے؟ اگر وہ یہیں رہتی ہے تو کب سے رہتی ہے؟ فرانسسکو نے اسے پہلی بار یہیں پر دیکھا تھا اس لیے اسے یقین تھا کہ اگر وہ عورت یہیں رہتی ہے تو ہفتہ دس دن پہلے ہی یہاں منتقل ہوئی ہوگی ورنہ اس سے پہلے تو وہ اس علاقے میں بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ اس اپارٹمنٹس میں جتنی عورتیں رہتی تھیں، وہ ان میں سے کسی کو ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا البتہ ان سب سے اس کی یک طرفہ شناسائی ضرور تھی۔

فرانسسکو بدستور اس اجنبی حسینہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اسی اپارٹمنٹس میں رہتی ہے تو کس فلور پر اور کس نمبر کے اپارٹمنٹ میں رہتی ہوگی؟ اگر وہ یہاں کسی سے ملنے کے لیے آتی ہے تو وہ شخص کون ہے؟ یہ بات ذہن میں آتے ہی اسے ایسا لگا کہ کسی نے اس کے دل پر زوردار گھونسا رسید کر دیا ہو۔ اچانک اس کے دل میں اُس شخص کے خلاف جذبۂ رقابت جاگ اٹھا جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا لیکن اس عورت کا اگر اس سے کوئی تعلق تھا تو بس یہی وجہ اس جذبۂ رقابت کے لیے کافی تھی۔

فرانسسکو رات گئے تک آوارہ گردی کرتا اور دن چڑھے تک سوتا رہتا تھا۔ بیروزگاری کے ایام میں ویسے بھی وہ صبح سویرے اٹھ کر کیا تیر مار لیتا اس لیے بے فکری سے سویا رہتا۔ کئی دن گزر چکے تھے لیکن اس اجنبی حسینہ سے اس کے یک طرفہ عشق کا بخار کم ہونے کے بجائے برابر بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

جب فرانسسکو نے اس اجنبی حسینہ کو پہلی بار دیکھا تھا، اس بات کو تقریباً ایک ہفتہ ہو چلا تھا۔ اس دوران ہوا یہ کہ فرانسسکو کے جذبۂ عشق نے کام کر دکھایا۔ اس نے پتا چلا لیا تھا کہ وہ عورت روزانہ شام کو سورج غروب ہونے سے پہلے ایک مخصوص وقت پر اپارٹمنٹس سے باہر نکلتی ہے۔ اس کے باہر آنے سے پہلے ہی دروازے پر ٹیکسی آ کر کھڑی ہو جاتی۔ باہر نکلتے ہی وہ ٹیکسی میں بیٹھتی اور پھر یہ جا وہ جا۔۔۔ وہ شام کو ہی باہر کیوں نکلتی تھی؟ اس سوال کا جواب لاکھ سوچنے کے باوجود فرانسسکو کو نہیں مل سکا تھا۔ دو بار تو ایسا بھی ہوا کہ وہ رات کے بارہ، ایک بجے تک اپنے کمرے کی کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر اس عمارت کو گھورتا رہا۔۔۔ صرف یہ جاننے کے لیے کہ وہ واپس کب آتی ہے مگر یہ کوشش بے سود رہی۔ اس کے بعد فرانسسکو نے اس بات پر لعنت بھیجی کہ وہ واپس کب لوٹتی ہے البتہ وہ اس بات پر ہی بہت خوش تھا کہ وہ شام کو اپنے مخصوص وقت پر تو باہر نکل کر اسے درشن کروا دیتی ہے۔

اسی دوران میں فرانسسکو کو ایک مقامی بینک میں کلرک کی نوکری مل گئی۔ وہ اس نوکری کے ملنے پر بہت ہی خوش تھا۔ اس۔۔۔ خوشی کی وجہ نوکری کا ملنا نہیں بلکہ اس اپارٹمنٹ میں رہنے کے لیے کرایہ ادا کرنے کی سبیل ہو جانا تھا۔ جب سے اس نے اس حسینہ کو دیکھا تھا تب سے اسے اپنا نیم تاریک، چھوٹا سا اور نہایت گندا کمرا بھی کسی عالی شان محل کے شاندار۔۔۔ شاہی کمرے سے زیادہ اچھا لگنے لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو وہ اس کمرے کی کھڑکی سے سامنے والے اپارٹمنٹس پر نظر رکھ سکتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ جب وہ شام کو نیچے کھڑا ہو کر اس حسینہ کی آمد کا انتظار کرتا تو لذتِ دیدار میں غرق اس سے کوئی یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ وہ یہاں کئی گھنٹوں سے کیوں کھڑا ہوا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جس عمارت میں وہ رہتا تھا، اس کے سامنے کھڑا ہونے سے تو کوئی بھی اسے نہیں روک سکتا تھا۔ نئی ملازمت میں اسے سب سے اچھی جو بات لگی، وہ چھٹی کا وقت تھا۔ دفتر سے فارغ ہونے کے بعد گھر پہنچ کر اس کے پاس اتنا وقت ہوتا تھا کہ وہ اجنبی حسینہ کے باہر آنے سے کافی پہلے اپنے مخصوص کھمبے تک پہنچ جاتا تھا۔ وہ کھمبے سے پیٹھ ٹکا کر سکون سے اپنی اجنبی محبوبہ کا انتظار کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔ اگر اس ملازمت میں دفتر سے چھٹی کا وقت ایسا ہوتا جو اسے اجنبی محبوبہ کے دیدار سے روکتا تو وہ کبھی یہ نوکری نہ کرتا۔۔۔ مگر وہ خوش تھا کہ اس کی ملازمت کا مسئلہ بھی حل ہو گیا اور محبوبہ کے دیدار میں بھی کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ دیدار بازی کی عادت میں اس قدر مگن ہو چکا تھا کہ اس سے آگے بات بڑھانے کا خیال بھی اسے نہ آیا۔ اس نے یہ سوچا ہی نہیں کہ کب تک وہ یوں اپنا یک طرفہ عشق اسی شد و مد سے جاری رکھ سکتا ہے۔

فرانسسکو کے یک طرفہ عشق کو لگ بھگ دو ہفتے گزر چکے تھے۔ اس دوران یہ بات طے ہو چکی تھی کہ اجنبی حسینہ کے گھر سے نکلنے کا وقت وہی ہے، جب وہ اس کا کھڑے ہو کر انتظار کرتا تھا۔ ایک دن اس نے ہمت کی اور اس اپارٹمنٹس کے سامنے والی سروس روڈ پر پہنچ گیا جہاں سے وہ باہر نکلتی تھی۔

جیسے ہی وہ لڑکی باہر آئی، اس نے اپنی جگہ سے چلنا شروع کر دیا اور اس کے برابر سے گزرتے ہوئے نہایت عامیانہ سا فقرہ اس کی جانب اچھال دیا۔ ”کب تک یونہی قتل کرتی پھرو گی؟“ لڑکی نے فقرہ سن لیا۔ اس نے ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر فرانسسکو کی جانب دیکھا اور پھر ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی اور پھر۔۔۔ ٹیکسی چلی گئی۔

بظاہر تو یہ عام سی بات تھی لیکن فرانسسکو کے لیے اس اجنبی حسینہ کی یہ ہلکی سی مسکراہٹ اُس کی کئی ہفتوں کی محنت کا ثمر تھی۔ اس کی ہمت بڑھی۔ وہ خود پر بہت ہی نازاں تھا۔ وہ اپنے تخیل میں اسے سفید عروسی لباس پہنا ہوا دیکھ رہا تھا اور خود کو اس کا ہاتھ پکڑ کے چرچ میں پادری کے سامنے ایجاب و قبول کرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

Digest urdu
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس رات جب وہ سویا تو وہ حسینہ کی ہلکی سی مسکراہٹ کے سحر میں گرفتار تھا۔ وہ رات بھر اسی کے سپنے دیکھتا رہا۔ وہ خود کو یقین دلا چکا تھا کہ یہ لڑکی اس کا گھر بسانے کے لیے ہی اس دنیا میں آئی ہے۔ وہ اپنے اندر اتنا حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لے اور اس کی انگلی میں اپنے نام کی انگوٹھی پہنا دے۔

رات سپنے دیکھتے ہوئے گزر گئی۔ گزری شام میں اجنبی حسینہ کی مسکراہٹ کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ رات بھر سہانے سپنے دیکھنے کی وجہ سے گھڑی کا الارم بھی نہ سن سکا۔ دوسرے دن وہ خاصی دیر سے سو کر اٹھا۔ گھڑی دیکھی تو گیارہ بجنے والے تھے۔ دفتر جانے کا وقت گزر چکا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کیا۔ میلے کپڑے دھوئے۔ گھر کی صفائی ستھرائی کی اور پھر کافی تیار کی۔ کافی کا مگ ہاتھ میں تھام کر وہ کھڑکی کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت دوپہر کے دو بجنے والے تھے۔ اس نے بے دھیانی میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانا شروع کر دیں۔ اچانک سامنے والی عمارت کے دروازے پر ٹیکسی آ کر رکی۔ فرانسسکو چونک گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اجنبی حسینہ ٹیکسی سے نکل کر عمارت کے اندر جا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر فرانسسکو جھوم گیا۔ ”چھٹی کا دن غارت ہونے سے بچ گیا۔“ اس نے زیرِ لب کہا۔ لڑکی کب کی اندر جا چکی تھی مگر فرانسسکو اب بھی ہاتھ میں کافی کا مگ تھامے عمارت کو گھورے جا رہا تھا۔ وہ بدستور خوشی کے اس لمحے کو محسوس کیے جا رہا تھا جو کچھ دیر پہلے آیا اور ہوا کے آوارہ جھونکے کی طرح اسے چھوتے ہوئے گزر گیا۔

کافی دیر تک وہ کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر اس عمارت کو تکتا رہا۔ ابھی وہ اپنی جگہ سے اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک عجیب بات ہوئی جس سے فرانسسکو کا رُواں رُواں خوشی کے مارے جھوم اٹھا۔ اچانک اس کی کھڑکی کے عین سامنے والے اپارٹمنٹ کی کھڑکی کھلی۔ پردہ اٹھا اور اس کھلی کھڑکی میں اجنبی حسینہ کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے کھڑکی کھولنے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھا اور پلٹ کر کھڑکی کے عین سامنے رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ اس انداز سے بیٹھی تھی کہ اس کا مکمل سراپا فرانسسکو کی تشنہ نگاہوں کے سامنے تھا۔

”اوہ... تو یہ ہے محترمہ کا فلیٹ۔“ فرانسسکو بڑبڑایا اور دل ہی دل میں یہ اندازہ لگانے لگا کہ اس اپارٹمنٹ کا نمبر کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ اُس دن جمعہ تھا۔ دوسرے روز ہفتہ تھا اور فرانسسکو کی چھٹی تھی اس لیے وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ وہ کل بھی اس وقت کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر یہ دیکھنے کی کوشش کرے گا کہ کیا وہ یہ کھڑکی ایک بار پھر کھولتی ہے یا نہیں۔

ہفتے کا دن تھا اور صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس دن عام تعطیل ہوتی ہے۔ لوگ دیر تک سوتے ہیں مگر فرانسسکو کی آنکھوں سے تو نیند کل سے ہی روٹھی ہوئی تھی۔ وہ صبح ہونے کے انتظار میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا اور پھر جیسے ہی آنکھ کھلی، جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کیا اور کھڑکی کے سامنے کرسی رکھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں بار بار سامنے والی کھڑکی کی طرف اٹھ رہی تھیں مگر کھڑکی بند تھی۔ اس دوران میں وہ کافی کے تین کپ پی گیا۔ کئی سگریٹ پھونک ڈالے مگر انتظار ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ کھڑکی بدستور بند تھی۔

اسی دوران دوپہر کے دو بج گئے اور پھر اچانک حسبِ سابق ایک ٹیکسی سامنے والے اپارٹمنٹس کے دروازے پر آ کر رکی۔ ٹیکسی دیکھتے ہی اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ سانس تیز ہو گئی۔ خون کی گردش بڑھ گئی۔ پہلے کی طرح ایک بار پھر وہی اجنبی حسینہ شانِ بے نیازی اور ادائے دلبرانہ سے ...... ٹیکسی سے باہر نکلی اور تیز ہوا میں بید کی شاخ کی طرح لچکتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اس کا سراپا فرانسسکو کے دل پر قیامت ڈھا گیا۔ اسے انتظار تھا کہ کیا کل کی طرح آج بھی اس کے اپارٹمنٹ کی کھڑکی کھلتی ہے۔ اگرچہ اسے اندر گئے ہوئے ابھی چند لمحے ہی گزرے ہوں گے مگر فرانسسکو کے اوپر تو ایک ایک لمحہ، ایک ایک صدی کی طرح گزر رہا تھا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا کہ کھڑکی اب تک کیوں نہیں کھلی اور پھر اچانک...... کل گزشتہ روز کی طرح کھڑکی کھلی۔ اجنبی حسینہ کا چہرہ نظر آیا اور پھر وہ پلٹ کر سامنے والے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ کل کی طرح اس روز بھی تقریباً کھلی کھڑکی کا یہ نظارہ گھنٹا بھر جاری رہا۔ اس کے بعد وہ اٹھی اور کھڑکی بند کر دی۔ فرانسسکو کے لیے اب نیچے کھڑے ہو کر اس حسینہ کو گھورنا بہت ہی گھٹیا درجے کا کام لگنے لگا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کے عشق کی پیاس کھڑکی کے راستے سیراب ہونے لگی تھی۔

دوسرے دن اتوار تھا۔ اُس دن بھی حسبِ سابق ہوا۔ دو بجے کے قریب اجنبی حسینہ ٹیکسی سے پہنچی۔ اپنے مخصوص انداز سے باہر نکلی اور پہلے کی طرح چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے اور کمر لچکاتے ہوئے، اردگرد سے بے نیاز اپنی دھن میں آگے بڑھتے ہوئے عمارت کے اندر داخل ہو گئی۔ اس کے کچھ دیر کے بعد کھڑکی کھلی۔ اس نے سر تھوڑا سا باہر نکال کر اِدھر اُدھر جھانکا اور پھر پلٹ کر سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گئی۔ لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد کھڑکی بند ہوئی۔ کھڑکی کے بند ہونے کے ساتھ ہی فرانسسکو کا دل بھی ڈوبتا چلا گیا۔

اگلے روز بھی وہی سب کچھ ہوا۔ بس ایک تبدیلی ہوئی۔ اس سے پہلے فرانسسکو کو علم نہیں تھا کہ وہ لڑکی اس اپارٹمنٹ سے شام کو باہر نکلتی ہے یا پھر وہ شام کو یہاں سے واپس جاتی ہے۔ گزشتہ تین دن میں اس نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ وہ لڑکی یہاں نہیں رہتی بلکہ دوپہر کو آتی ہے اور شام کو واپس چلی جاتی ہے۔ بس... اسی لمحے فرانسسکو کو اپنی ملازمت سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ اسے لگا کہ اگر یہ ملازمت بیچ میں نہ ہوتی تو وہ کب کا یہ راز جان چکا ہوتا۔ اسے خود پر بھی افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اب تک یہ کیوں سمجھتا رہا کہ وہ شام کو اپارٹمنٹ سے نکل کر کہیں جاتی ہے اور پھر رات دیر گئے لوٹتی ہے۔ اسے اپنی بے وقوفی پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ اسی غلط فہمی کی وجہ سے اس نے کئی بار رات کو دیر تک جاگ کر اس حسینہ کی واپسی کا انتظار کیا تھا۔

فرانسسکو نے اس ساری صورتِ حال کا ذمے دار اپنی اس ہی ملازمت کو قرار دیا اور پھر اسی رات اس نے اپنا استعفا ای میل کے ذریعے بینک منیجر کو بھجوا دیا۔ ای میل بھیجنے کے بعد وہ خوش تھا کہ کم از کم اب اپنی محبوبہ کے تفصیلی دیدار کے بیچ کوئی چیز...... آڑے نہیں آئے گی۔

اگرچہ فرانسسکو نہایت ہی دل پھینک واقع ہوا تھا لیکن اس میں صبر بہت تھا۔ اس کی یہی خوبی تھی کہ وہ عمرِ اعتدال بھی یونہی گزر جانے کے باوجود نہایت استقامت سے اپنے یک طرفہ عشق پر نازاں تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ حسینہ اس کی بیوی بننے کے لیے ہی خدا نے تخلیق کی ہے۔ اس لیے وہ نہایت صبر سے اس لمحے کا انتظار کر رہا تھا، جب وہ اسے مانگے تو وہ اپنا آپ اسے تھما دینے سے انکار نہ کر سکے۔

اسی طرح مزید چند دن گزر گئے۔

اس دوران میں فرانسسکو نے اس اپارٹمنٹ کی کھلی کھڑکی سے اجنبی حسینہ کے معمولات کا خاطر خواہ علم حاصل کر لیا تھا۔ وہ ہمیشہ ٹیکسی سے دوپہر دو بجے کے قریب یہاں پہنچتی اور اپارٹمنٹ کا رخ کرتی۔ کھڑکی کھولتی اور پھر سامنے والے صوفے پر بیٹھ جاتی۔ اس دوران یا تو وہ کچھ کاغذات پڑھتی رہتی یا ایک دو بار موبائل فون پر کسی سے بات کرتی یا پھر اپنے ہینڈ بیگ سے شیشہ اور دیگر سامان نکال کر میک اپ ٹھیک کرتی رہتی۔ فرانسسکو نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ وہ حسینہ کمرے میں تنہا نہیں ہوتی تھی بلکہ بڑی عمر کا کوئی دوسرا مرد بھی وہاں ہوتا تھا، جو کبھی کبھار اس لڑکی کے سامنے کھڑا ہو کر باتیں کرتا تھا۔ فرانسسکو نے کبھی اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ وہ آدمی جب اُس کے سامنے کھڑا ہو کر بات کرتا۔ تو کھلی ہوئی کھڑکی میں سے صرف اس کی پشت نظر آتی تھی۔ ویسے بھی اس اپارٹمنٹ کی کھڑکی اتنی بڑی نہیں تھی کہ سارا کمرا نگاہوں میں سما سکتا۔ اگرچہ اس آدمی کو فرانسسکو نے صرف پیچھے سے دیکھا تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ شخص بڑی عمر کا ہی ہوگا۔ اس نے اپنے دل سے اس خیال کو بھی رد کر دیا تھا کہ اس لڑکی سے اس مرد کے کسی قسم کے ناشائستہ مراسم ہو سکتے ہیں۔ فرانسسکو کا خیال تھا اس شخص کی عمر اتنی زیادہ تھی کہ یہ لڑکی اس کی بیٹی کی عمر کی ہوگی۔ اس نے اپنے دل میں یہ رائے بھی قائم کر لی تھی کہ وہ شخص یقیناً اس لڑکی کا کوئی رشتے دار یا اس کا سرپرست ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس مرد یا اس لڑکی کو کوئی ایسے حالات درپیش ہوں جس کی وجہ سے یہاں روز آنا اس کی مجبوری ہو۔ اس نے اپنے دل میں یہ رائے بھی قائم کر لی تھی کہ وہ شخص ممکنہ طور پر کوئی پروفیسر بھی ہو سکتا ہے اور اس کی محبوبہ اس سے پڑھائی میں مدد لینے کے لیے آتی ہوگی... بہرحال، حقیقت جو کچھ بھی ہو، فرانسسکو کے دل میں جو نامعلوم جذبۂ رقابت اس یک طرفہ عشق کے ابتدائی ایام میں بیدار ہو چکا تھا، وہ کب کا دم توڑ چکا تھا۔ ایک حقیقت اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ اپنی دل پھینک عادت کے باوجود یہ پہلا موقع تھا کہ فرانسسکو کسی لڑکی کو اپنی بیوی بنانے کے بارے میں اتنی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔

کئی دن گزر چکے تھے۔ اب فرانسسکو نے نیچے جا کر نظارہ کرنے کی عادت چھوڑ دی تھی۔ وہ بیروزگار بھی تھا مگر خوش تھا کہ وہ اپنے کمرے کے اندر بیٹھے بیٹھے محبوبہ کا دیدار کر لیتا تھا۔ اس کے دل میں اس حسینہ کو حاصل کرنے کی خواہش نہایت شدت سے مچل رہی تھی۔ اس یک طرفہ عشق میں اُس پر جنونی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔

اُس رات فرانسسکو کو ہلکا سا بخار ہو گیا اور پھر پوری رات وہ نہایت تیز بخار میں مبتلا رہا۔ اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ دوسرا دن بھی بخار میں گزر گیا مگر سہ پہر ہوتے ہوتے بخار اتر گیا۔ اس کے کافی دیر بعد اس میں اتنی ہمت آئی کہ وہ اٹھ کر منہ ہاتھ دھو سکے اور کچھ کھا پی سکے۔ وہ اپنی ساری ہمت مجتمع کر کے اٹھا۔ برش کیا، منہ ہاتھ دھویا اور ہلکا پھلکا ناشتا کر کے کھلی کھڑکی کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ محبوبہ کا دیدار نصیب ہوگا مگر

digest.pk blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاید اس کی خوش قسمتی تھی کہ دید اور تول گیا لیکن اس نے جو کچھ دیکھا، وہ اس کے اوسان خطا کر گیا۔

جیسے ہی فرانسسکو کی نظر سامنے پڑی، اسے سامنے والے اپارٹمنٹ کی کھڑکی کھلی ہوئی نظر آئی۔ رات ہو چکی تھی۔ چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ایسے میں کھلی ہوئی کھڑکی سے کمرے کا جو اندرونی منظر دکھائی دے رہا تھا، وہ نہایت ہوش رُبا تھا۔ کمرے میں تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ حسینہ نہایت مختصر لباس میں تھی اور دونوں بانہیں پھیلا کر تنہا رقص کیے جا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس پر بے خودی چھائی ہوئی ہے اور اسے رقص کرتے ہوئے دنیا و مافیہا کی کوئی فکر نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ جس قسم کے لباس میں ملبوس تھی، وہ کبھی بھی کھلی کھڑکی کے سامنے اس طرح رقص نہیں کرتی۔

"کیا وہ جان گئی ہے کہ اس کھلی کھڑکی سے کوئی اسے دیکھتا ہے؟" فرانسسکو نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر مسکرا دیا۔ "اگر ایسا ہے تو پھر شاید یہ میرے لیے پیغام ہے۔ اسے بھی میری ضرورت ہے۔" وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔ "میں اسے مایوس نہیں ہونے دوں گا۔" اس خیال سے فرانسسکو کا دل اچھلنے لگا۔ کچھ دیر پہلے جس نقاہت نے اسے بُری طرح اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا، وہ ٹوٹ چکی تھی۔

وہ حسینہ کے فسوں خیز رقص کے نظارے میں کھویا ہوا تھا۔ وہ بدستور محوِ رقص تھی لیکن اچانک کمرے کی روشنیاں بجھ گئیں۔ وہاں مکمل اندھیرا چھا گیا۔ یہ دیکھ کر اس کا دل دہل گیا۔ "نہ جانے کیا ہوا؟" اس کا دل انجانے خوف سے لرز اٹھا۔

کچھ دیر تک کمرا بدستور تاریکی میں ڈوبا رہا اور پھر جب کمرا ایک بار پھر روشن ہوا تو نظارہ ختم ہو چکا تھا۔ منظر بدل گیا تھا۔ اب وہاں نہ تو لڑکی موجود تھی اور نہ ہی روشنی تیز تھی۔ اس وقت کمرے میں جو روشنی تھی، وہ اتنی کم تھی کہ کوئی بھی شے صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک سایہ آگے بڑھا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کے پٹ بند کر دیے۔ 'یہ تو کوئی مرد لگتا ہے۔' اس نے کھڑکی بند کرنے والے کے متعلق سوچا۔ واقعی وہ کوئی مرد تھا مگر یہ مرد کون تھا...؟ یہ بات وہ نہیں جانتا تھا۔ 'شاید یہ مرد وہی ہو سکتا ہے جسے پشت کی طرف سے میں نے کئی بار دیکھا ہے۔' فرانسسکو نے سوچا۔ 'اگر یہ وہی مرد ہے تو پھر نازیبا لباس اور تیز روشنی میں وہ لڑکی اس کے سامنے تنہا رقص کیوں کر رہی تھی؟' یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ بدستور اس سوال کا جواب جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ 'ویسے اگر یہ شخص اس کا محبوب ہے تو پھر وہ رقص کے وقت اسے بانہوں میں کیوں نہیں تھامے ہوئے تھا؟' فرانسسکو کے ذہن میں سوالات اور دل میں تشویش تھی۔ کچھ دیر پہلے جس رقص کو وہ اپنے لیے لڑکی کا خاص پیغام سمجھ رہا تھا، اب وہی بات اس کے دل میں پھانس کی طرح چبھی چلی جا رہی تھی۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ نقاہت ایک بار پھر اسے اپنی گرفت میں لے رہی تھی۔ وہ پریشان ذہن، افسردہ دل اور شکستہ قدموں سے اٹھا اور بستر پر جا کر ڈھیر ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ زمان و مکاں سے بے خبر سویا ہوا تھا۔

دوسرے دن جب وہ صبح سو کر اٹھا تو اس کی طبیعت کافی بہتر تھی۔ ناشتے کے بعد وہ کافی کا مگ لے کر کھڑکی کے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ گزشتہ رات پیش آنے والے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ اگرچہ وہ اجنبی حسینہ کو اَن گنت بار دیکھ چکا تھا مگر اب تک اس کے خدوخال کو قریب سے جی بھر کے نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس کے دل میں خواہش مچل رہی تھی کہ وہ اپنی محبوبہ کو نہایت قریب سے دیکھے۔ دوسری بات جو اس کے ذہن میں کھلبلی مچا رہی تھی وہ یہ کہ اسے اس اپارٹمنٹ کے اندر کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہیے... لیکن کیسے؟ اس بات پر عمل کرنے کا کوئی طریقہ اسے سوجھ نہیں رہا تھا۔ اس کے دل میں کئی خیالات آئے۔ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو ان میں سے کسی ایک پر فوراً عمل کر ڈالتا لیکن فرانسسکو فطرتاً بزدلی کی حد تک شریف آدمی تھا۔ اس لیے ہر ایسے ویسے خیال کو خود ہی رد کرتا رہا۔ آخر کار اس کے دماغ میں ایک محفوظ خیال آیا۔ یہ سب سے اچھا اور عمدہ طریقہ ہے۔ اس نے سوچا اور فوراً عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ تیار ہو کر گھر سے باہر جا رہا تھا۔

اگر کوئی اور حالات ہوتے تو وہ ایسا نہیں کرتا لیکن مسئلہ اس کی محبوبہ اور اس لڑکی کا تھا جسے وہ دل و جان سے اپنی بیوی بنانے کا خواہش مند تھا۔ اس لیے بیروزگاری کے باوجود اس نے اپنے منصوبے پر کامیابی سے عمل کرنے کے لیے کچھ رقم خرچ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے کچھ رقم پس انداز کر رکھی تھی۔ گھر سے نکل کر وہ بینک گیا۔ رقم نکلوائی اور شہر میں الیکٹرونکس کی سب سے بڑی مارکیٹ کی طرف چل دیا۔

کافی ڈھونڈنے کے بعد آخر کار اسے اپنی پسند کی شے مل ہی گئی۔ وہ کم قیمت لیکن عمدہ ڈیجیٹل کیمرے کی خریداری کے لیے آیا تھا۔ اس کی جیب زیادہ بھاری نہیں تھی لہٰذا اسے اپنی ضرورت کے مطابق کیمرے کی تلاش میں کافی دیر لگ گئی۔

فرانسسکو ایک ایسا کیمرا خریدنا چاہتا تھا جس کا زوم

لینس بہت اچھا ہوتا کہ وہ اپنے گھر کی کھڑکی میں بیٹھ کر نہ صرف اس حسینہ کی چند اچھی اچھی تصویریں اتار سکے بلکہ زوم لینس کی مدد سے یہ بھی دیکھنے کی کوشش کرے کہ وہ کمرا اندر سے کیسا ہے، وہاں کیا کیا چیزیں موجود ہیں۔ وہ لڑکی جو کاغذات پڑھتی ہے، وہ کس قسم کے ہیں۔ ساتھ ہی وہ اس مرد کو بھی دیکھنے کی کوشش کرتا جسے اس نے اکثر وہاں دیکھا تھا۔ وہ تسلی کرنا چاہتا تھا کہ آیا وہ آدمی اس عمر کا ہے کہ اسے وہ اجنبی حسینہ اپنا بوائے فرینڈ بنا سکتی ہو۔ اس کے دل میں اس اجنبی کے خلاف ایک بار پھر وہ جذبۂ رقابت بیدار ہو چکا تھا جو کئی روز پہلے از خود ختم ہو چکا تھا مگر اس دن جب اس نے لڑکی کو معیوب لباس میں اس مرد کی موجودگی میں خود سپردگی کے عالم میں رقصاں دیکھا تھا، ایک بار پھر رشک اور انتقام، دونوں انگڑائی لے کر اس کے دل میں زندہ ہو چکے تھے۔

فرانسسکو کیمرا تو خرید کر لے آیا تھا لیکن رات گئے تک، متعدد کوششوں کے باوجود وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ گھر کی کھڑکی بدستور بند تھی۔ جب رات کے دو بج گئے تو وہ مایوس ہو گیا اور جا کر سو گیا۔

جب سے اس نے نوکری چھوڑی تھی، تب سے اس کے لیے ہر دن چھٹی کا دن تھا لیکن اس روز واقعی چھٹی کا دن تھا۔ ہفتے کا دن تھا۔ دوپہر کے قریب جب وہ کھڑکی پر آیا، نیچے سڑک پر رش بھی نہ ہونے کے برابر تھا اور سامنے والے اپارٹمنٹس کی پسندیدہ کھڑکی بھی بند تھی۔ بند کھڑکی دیکھ کر اس پر افسردگی چھا گئی۔

ہفتے کا پورا دن وہ بار بار اپنی کھڑکی میں آ کر سامنے کی طرف دیکھتا رہا لیکن کھڑکی بدستور بند تھی۔ آخر شام آئی اور پھر رات کی سیاہی چھا گئی۔ وہ ایک بار پھر اپنی کھڑکی میں آیا لیکن وہ بدستور بند تھی۔ رات ہو چکی تھی۔ اس کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے تھے۔ وہ کھانا تیار کرنے کے لیے کچن میں چلا آیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر جب وہ ایک بار پھر کھڑکی کی طرف آیا تو خوشی سے جھوم اٹھا۔ مطلوبہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور کمرا تیز روشنی میں نہایا ہوا تھا مگر خلافِ توقع وہاں کوئی بھی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔

فرانسسکو فوراً میز کی طرف لپکا اور کیمرا اٹھا کر آن کیا اور کھڑکی کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ کیمرے کا زوم لینس واقعی اچھا تھا لیکن اتنا عمدہ بھی نہیں کہ وہ اتنے فاصلے سے ہر شے کو اس کی اصل حالت میں دکھا سکے مگر پھر بھی وہ غنیمت تھا۔ کھلی آنکھوں کی نسبت وہ کیمرے کی آنکھ سے کمرے کے اندر زیادہ بہتر انداز میں تاک جھانک سکتا تھا۔

رم جھم رم جھم بادلوں کے اوٹ تلے

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

جولائی 2011ء
کے دلکش شمارے
پر ایک نظر

انجانے پہلو
آخری صفحات کی زینت...... ہردلعزیز قلم کار
ایچ اقبال کا تحفۂ خاص...... دشوار رہ گزر
دلگداز جذبات اور رشتوں کی آزمائش پر مشتمل ایک خوبصورت معاشرتی کہانی کا دوسرا اور مکمل حصہ

بعد از خرابی
ابتدائی صفحات پر مغل بادشاہ **اورنگ زیب** کے حالاتِ زندگی...... **ڈاکٹر ساجد امجد** کے قلم سے ایک اور شاہکار

حضرت یرمیاہ
بت پرستی کے اندھیروں میں گم بنی اسرائیل کی سرکشی اور انبیا کی جہدِ مسلسل کا احوال

سینہ زوری
ایک دلفریب حسینہ کے مکر و فریب...... اور **مرزا امجد بیگ** کی ذہانت کے درمیان دلچسپ معرکہ

اس کے علاوہ
واپسی، اناڑی، محفلِ شعر و سخن، آپ کے خط

ضیا تسنیم بلگرامی، منظر امام، رخ صغیر ادیب
مزید کاشف زبیر، سرور کے خان اور تنویر ریاض
کے دلکش شاہکار آپ کے منتظر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بارے میں سوچے جا رہا تھا۔ کئی گھنٹے تک وہ غور کرتا رہا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ پولیس بے قصور ہے۔ اصل میں اس سے ہی غلطی ہوئی جس کا فائدہ قاتل کو پہنچا۔ کافی دیر بعد اس نے اپنی پوری قوت مجتمع کی اور پولیس اسٹیشن فون کر کے کل شام والی واردات کے بارے میں استفسار کیا مگر پولیس افسر نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ کل شام اس طرح کی کوئی واردات سرے سے ہوئی ہی نہیں ہے۔ اب مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ فون رکھتے ہوئے اس نے سوچا اور گھبرا کر بستر پر بیٹھ گیا۔

کافی دیر تک وہ گہری نگاہوں سے اس سارے واقعے کی ویڈیو فلم دیکھتا رہا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ جس مرد نے گولی چلائی تھی، اگر وہ اس کو ایک بار دیکھ لے تو ضرور پہچان لے گا۔ کافی دیر کی مغزماری کے بعد آخر اس نے خود ہی ملزم کو تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسرے دن اس نے اس اپارٹمنٹ کا نمبر بھی معلوم کر لیا جس میں یہ واردات ہوئی تھی۔ جب وہ اس اپارٹمنٹ پر پہنچا تو وہ بند تھا۔ اس نے کئی بار ڈور بیل بھی بجائی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے سارا دن مختلف جگہوں سے اس عمارت پر نظر بھی رکھی لیکن ایسا کوئی شخص نظر نہیں آیا جس پر اسے ذرا سا بھی شک گزرتا کہ وہ اس اپارٹمنٹ میں جا رہا ہے یا یہ وہی قاتل ہے۔ شام ڈھلے وہ گھر لوٹا اور کھڑکی کھول کر بدستور عمارت کی نگرانی کرتا رہا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ رات کے تین بج چکے تھے۔ وہ بدستور کھڑکی کے سامنے بیٹھا ہوا نگرانی کر رہا تھا مگر کھڑکی بدستور بند تھی۔ اسے ایسی کوئی بھی نشانی نہیں ملی جس سے شک کیا جا سکے کہ اندر کوئی ہے۔ وہ بہت ہی تھک چکا تھا۔ سارے دن کی بھاگ دوڑ کا نتیجہ صفر نکلا لیکن اس کے باوجود وہ مایوس نہیں ہوا تھا۔

دوسرے دن پھر اس نے عمارت کی نگرانی شروع کر دی۔ اس بار اس کے ہاتھوں میں ایک دوربین تھی۔ دوپہر کے قریب ایک شخص عمارت کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر کے اترا۔ فرانسسکو نے فوراً اس پر دوربین جمائی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ پہلی ہی نظر میں اس شخص کو پہچان چکا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے لڑکی پر گولی چلائی تھی۔ گاڑی لاک کر کے وہ عمارت کے اندر چلا گیا۔

فرانسسکو تیزی سے باہر نکلا۔ نیچے جا کر سب سے پہلے اس نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا اور مرکزی دروازے پر نظریں جما کر انتظار کرنے لگا کہ جب وہ شخص باہر نکلے گا تو اس کا پیچھا کرتے ہوئے اس کے ٹھکانے کا پتا لگائے گا۔ اسے یقین تھا کہ اس شخص کا تعلق مجرموں کے کسی گروہ سے ہوگا، ورنہ وہ اتنی صفائی سے تمام شواہد اور لاش کو غائب نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ اس اپارٹمنٹ میں نہیں رہتا ہے بلکہ اس نے یہ جگہ خاص مقاصد کے لیے رکھ چھوڑی ہے۔ فرانسسکو مطمئن تھا کہ وہ اب قاتل کو انجام تک ضرور پہنچا سکے گا۔ اس کے پاس ویڈیو فلم کی صورت میں واردات کا ایک اہم ثبوت موجود تھا جس میں وہ لڑکی پر گولی چلا رہا ہے اور جب وہ لڑکی گولی کھا کر نیچے گرتی ہے تو اس وقت اس شخص کا چہرہ اس ویڈیو میں صاف نظر آ رہا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ شخص باہر نکلا۔ گاڑی میں بیٹھ کر جیسے ہی وہ آگے بڑھا، فرانسسکو نے بھی لپک کر ایک ٹیکسی پکڑی۔ "اس گاڑی کا پیچھا کرو۔" اس نے ڈرائیور کو تقریباً چلاتے ہوئے ہدایت کی۔ "خیال رکھنا کہ اسے شک نہ ہو کہ ہم پیچھا کر رہے ہیں۔ یہ ایک خطرناک قاتل ہے۔" قاتل کا لفظ سن کر ٹیکسی ڈرائیور کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہو گئے۔

تقریباً بیس منٹ کے بعد وہ شخص شہر کے مضافاتی علاقے میں داخل ہوا اور ایک فارم ہاؤس کے اندر چلا گیا۔ جس انداز سے وہ اندر گیا تھا، اس سے فرانسسکو کو یقین ہو گیا کہ وہ اس کا ہی گھر ہے۔

"پریسنٹ پولیس اسٹیشن چلو۔" فرانسسکو نے اس گھر کا پتا نوٹ کرنے کے بعد ٹیکسی ڈرائیور کو حکم دیا۔ اب وہ اس پولیس اسٹیشن جا رہے تھے جہاں سب سے پہلے اس واردات کی اطلاع دی گئی تھی۔

"دیکھیے، میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ ایسی کوئی واردات نہیں ہوئی ہے۔" کچھ دیر بعد وہ پولیس اسٹیشن میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنی ویڈیو فلم کی مدد سے ڈیوٹی افسر کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایسا ہوا ہے مگر وہ مان ہی نہیں رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ یہ ویڈیو اور جسے ملزم ٹھہرا رہے ہیں، اس کا پتا ہمیں دے دیجیے۔ ہم تفتیش کرتے ہیں۔ جو بھی پیش رفت ہوئی، آپ کو آگاہ کر دیں گے۔" کافی دیر کی بحث کے بعد آخر ڈیوٹی افسر نے ہتھیار ڈال دیے اور اس نے مسکراتے ہوئے سب چیزیں اس کے حوالے کیں اور گھر چلا آیا۔ وہ خوش تھا کہ آخر اس نے اپنی محبوبہ کے قاتل کا نہ صرف پتا چلا لیا ہے بلکہ اس چالاک مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے پولیس کو قائل بھی کر لیا ہے۔ "بڑا ہی چالاک مجرم ہے۔ کمبخت نے ایسے واردات کی ہے کہ پولیس بھی ماننے کو تیار نہ تھی۔" پولیس اسٹیشن سے باہر نکل کر اس نے اپنے سر پر ہاتھ

پھیرتے ہوئے خود کلامی کی۔ اب وہ خود کو زیادہ پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ وہ اس حسینہ کی جان تو نہ بچا سکا لیکن اس بات پر خوش تھا کہ اس کی ہی کوششوں سے اُس کا قاتل اپنے منطقی انجام تک پہنچے گا۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ فرانسسکو لیٹا ہوا نئی ملازمت کے معاملے پر غور کر رہا تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ "ہیلو۔" اس نے فون اٹھایا۔

"میں پریسنٹ پولیس اسٹیشن سے ڈیوٹی افسر ہارڈی بول رہا ہوں۔ کیا آپ مسٹر فرانسسکو بات کر رہے ہیں؟"

"جی ہاں... فرمایئے۔"

"کل صبح دس بجے آپ پولیس اسٹیشن پہنچ جائیں۔ ہم ملزم تک پہنچ گئے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ آپ بھی یہ مسئلہ حل ہوتے ہوئے دیکھ لیں۔"

"بہت اچھا... مجھے نیویارک پولیس سے ایسی مستعدی کی ہی امید تھی۔" فرانسسکو نے افسر کو مکھن لگانے کی کوشش کی۔

"تو پھر کل صبح دس بجے ملتے ہیں... بائے۔"

یہ خبر فرانسسکو کے لیے کامیابی کا اعلان تھا۔ "میری محبوبہ! میں نے تمہاری موت کا بدلہ لے لیا۔ خدا تمہاری روح کو سکون عطا کرے۔" فرانسسکو نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ مرحومہ محبوبہ کا خیال آتے ہی اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ ظالم شخص نے اس کا گھر بسنے سے پہلے ہی اجاڑ دیا تھا۔ فرانسسکو نے دل ہی دل میں ایک بار پھر اس قاتل پر لعن طعن کی۔ اسے کوسنے دیے اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

دوسری صبح وہ طے شدہ وقت سے پہلے ہی پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ ڈیوٹی افسر ہارڈی موجود تھا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرا دیا اور رسمی کلمات کے بعد اسے برابر والے کمرے میں انتظار کرنے کے لیے کہا۔ فرانسسکو کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ یہ کمرا اندر سے کسی تفتیشی مرکز جیسا لگ رہا تھا۔ اسے یہاں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی لیکن نہ تو ہارڈی ادھر آیا اور نہ ہی کسی دوسرے پولیس والے نے آ کر کوئی اطلاع دی۔

فرانسسکو دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے کیا ہوا ہے۔ انہوں نے ملزم کو گرفتار کر لیا ہے یا ابھی صرف اسے مشتبہ قرار دے کر پوچھ گچھ ہی کر رہے ہیں؟ پتا نہیں کہ پولیس نے اس کی محبوبہ کی لاش بھی دریافت کی ہے یا ملزم اب تک پولیس کو چکمہ ہی دے رہا ہے؟ ویسے بھی جب تک لاش نہیں ملتی، پولیس اس ویڈیو کی بنیاد پر تو اسے قاتل قرار نہیں دلوا سکتی... اس کا ذہن مختلف سوالوں میں الجھا ہوا تھا۔ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ پولیس والے اسے انتظار میں بٹھا کر کیوں بھول گئے ہیں؟ وہ جلد سے جلد حقیقت جان لینا چاہتا تھا لیکن یہاں تو سرے سے کسی کا پتا ہی نہیں تھا۔

کافی دیر ہو گئی۔ آخر ہارڈی کمرے میں داخل ہوا۔ "معذرت چاہتا ہوں۔ ذرا دیر ہو گئی۔ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟" اس نے اندر داخل ہوتے ہی فرانسسکو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں... ایسی کوئی خاص نہیں۔" اسی دوران میں فرانسسکو کی نظر کمرے کے داخلی دروازے پر پڑی۔ وہ قاتل ایک عورت کے ساتھ اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ دراز قد، ستواں بدن، سنہری بال اور گوری رنگت والی جوان عورت تھی۔ اس نے دھوپ کا بڑا سا چشمہ بھی لگایا ہوا تھا۔

"یہی ہے وہ شخص... میں نے اسے پہچان لیا۔ اسی نے میری محبوبہ کو قتل کیا ہے۔ پکڑ لو اسے۔" اس اجنبی کو دیکھتے ہی فرانسسکو آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ چلا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پُرنم ہو چکی تھیں لیکن ہارڈی، وہ شخص اور عورت، تینوں خاموش اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی نظریں فرانسسکو پر گڑی ہوئی تھیں۔

"تم نے اسے پہچان لیا... یہ وہی قاتل ہے؟" ہارڈی آگے بڑھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں... یہی وہ شخص ہے۔ میں نے اسے اچھی طرح پہچان لیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہارڈی کے شانے پر سر رکھ کر ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔

"تمہارے بیان کے مطابق اگر یہ شخص قاتل ہے تو پھر مقتولہ کو بھی اس کے پاس ہی ہونا چاہیے۔" ہارڈی نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں... پوچھو اس سے۔ اس نے میری محبوبہ کی لاش کہاں چھپائی ہے؟" فرانسسکو نے ہارڈی کے شانے سے سر اٹھایا اور رومال نکال کر اپنی آنکھیں صاف کرنے لگا۔

"اگر یہ شخص قاتل ہے تو پھر لاش بھی اس کے پاس ہی ہے۔" ہارڈی کی بات سن کر فرانسسکو نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ وہ اس کی بات سمجھ نہیں سکا تھا۔

"یہ رہی مقتولہ۔" ہارڈی نے اُس عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ چونک گیا۔

"مگر کیسے؟ یہ تو زندہ ہے۔ اسے تو میں نے خود گولی کھا کر فرش پر گرتے ہوئے دیکھا تھا۔" فرانسسکو نے یہ سن کر حیرت سے کہا۔

"وہ ایسے..." یہ کہتے ہوئے عورت نے ہاتھ بڑھا کر

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سنہری بالوں کی وگ اتاری اور سر کو جھٹکا دیا تو سیاہ زلفیں اس کے شانوں پر پھیل گئیں۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنا چشمہ اتار لیا۔ اب جو اس کے سامنے کھڑی تھی، اسے دیکھ کر تو فرانسسکو کے ہوش اڑ گئے۔ یہ وہی اجنبی حسینہ تھی جس کی یاد میں کچھ دیر پہلے تک وہ آنسو بہا رہا تھا۔

"مگر یہ سب کیا ہے؟" فرانسسکو نے ہکلاتے ہوئے ہارڈی سے پوچھا۔

"تم انہیں پہچانتے ہو؟"

"ہاں۔" اس نے مرے مرے لہجے میں جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے کہ انہیں تم نے اور بھی دیکھا ہے، اس اپارٹمنٹ کے سوا؟"

"جی نہیں۔" فرانسسکو نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی تو قوتِ گویائی ہی سلب ہو چکی تھی۔

"یہ نیویارک کی معروف ٹی وی اداکارہ سوزی ہیں۔ جس اپارٹمنٹ میں تم نے ان کا قتل ہوتے دیکھا، وہاں دراصل جرم ویز پر ایک ڈرامے کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ وہ سین اس ڈرامے کا آخری منظر تھا۔ ٹی وی چینل نے شوٹنگ کے لیے وہ اپارٹمنٹ کرائے پر لے رکھا تھا۔" ہارڈی نے ساری کہانی بیان کی اور فرانسسکو بے چارہ سر جھکائے، نظریں زمین پر گڑائے چپ سنتا رہا۔ وہ شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔ "جسے تم نے قاتل سمجھا، وہ اس ڈرامے کا ایک کردار ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے بات مکمل کی۔

سوزی بھی مسکرا رہی تھی۔ نیویارک میں ٹی وی شائقین بالخصوص مرد اس کے دیوانے تھے۔ لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کو ترستے تھے۔ جوان لڑکے لڑکیاں جہاں اسے دیکھتے آٹوگراف لینے چلے آتے تھے مگر یہ شخص... سوزی عجیب سی صورتِ حال کا شکار تھی۔ "تم ٹی وی نہیں دیکھتے...؟" کچھ دیر بعد اس نے کچھ سوچتے ہوئے فرانسسکو سے سوال کیا۔

"میں بہت غریب آدمی ہوں۔ میرے پاس ٹی وی نہیں ہے۔"

"جبھی تو..." وہ مسکرا دی۔ "اسی لیے تم نے مجھے نہیں پہچانا۔"

"مجھے معاف کر دیں۔" فرانسسکو نے بدستور نظریں نیچی کیے ہوئے کہا۔

"جاؤ معاف کیا۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"میں اب جا سکتا ہوں؟" اس نے سر اوپر اٹھایا اور ہارڈی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بالکل... آپ جا سکتے ہیں۔" ہارڈی کی اجازت ملتے ہی وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔

"ٹھہرو فرانسسکو۔" اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے باہر نکلتا، سوزی نے عقب سے اسے پکارا۔ وہ پلٹا تو سوزی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب آ گئی۔

"یہ مت سمجھنا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں تمہاری ساری شرارتیں جانتی ہوں۔"

"پلیز... مجھے معاف کر دیں۔ میں بہت شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔" وہ بدستور اپنی حرکتوں پر نادم نظر آ رہا تھا۔

"میری شوٹنگ وہاں پر ختم ہو چکی ہے لیکن میں آج شام سات بجے وہاں آؤں گی۔ تمہارے اپارٹمنٹس کے نیچے۔ اسی جگہ کے ساتھ کھڑے ہو کر میرا انتظار کرنا۔"

"کیا...؟" حیرت کے مارے فرانسسکو کا منہ کھلا رہ گیا۔

"مجھے ہارڈی نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ آج تک جس نے بھی میرے قریب ہونے کی کوشش کی، وہ میری شہرت سے آگاہ تھا۔ تم پہلے شخص ہو جس نے صرف مجھے چاہا ہے۔" سوزی نہایت ہی لگاوٹ سے کہے چلی جا رہی تھی۔ "میں تم جیسے پیار کرنے والے شخص کو کھونا نہیں چاہتی۔" فرانسسکو ہونقوں کی طرح منہ کھولے اس کی باتیں سنے جا رہا تھا۔

"اب میں جاؤں؟" سوزی خاموش ہوئی تو اس نے شپٹائے لہجے میں اجازت طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جاؤ... شام کو ملتے ہیں۔ کیک ووڈ ریستوران پر ہم ساتھ ڈنر کریں گے۔" سوزی کی بات مکمل ہوتے ہی وہ کمرے سے ایسے نکلا کہ اگر مزید ایک لمحہ بھی وہاں ٹھہرا رہا تو شاید اس کے جسم سے جان ہی نہ نکل جائے۔

☆☆☆

قاتل اور مقتولہ کی دریافت کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اس دن ہفتے کی شام تھی۔ ہارڈی پولیس اسٹیشن سے نکل کر سینٹ مائیکل چرچ جا رہا تھا۔ اسے شادی میں شرکت کرنی تھی۔ "کافی دیر ہو گئی۔" اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ جس وقت وہ چرچ پہنچا تو دولہا، دلہن پھولوں سے سجی اپنی کار میں بیٹھنے ہی والے تھے۔ نوبیاہتا جوڑے نے ہارڈی کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور کار کے اندر بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے گاڑی چل دی۔

دلہن سوزی اور دولہا فرانسسکو نیویارک کی بھیڑ بھاڑ سے دور مضافات میں واقع اپنے فارم ہاؤس پر جا رہے تھے ایک نئی زندگی کے آغاز کے لیے۔

●●●

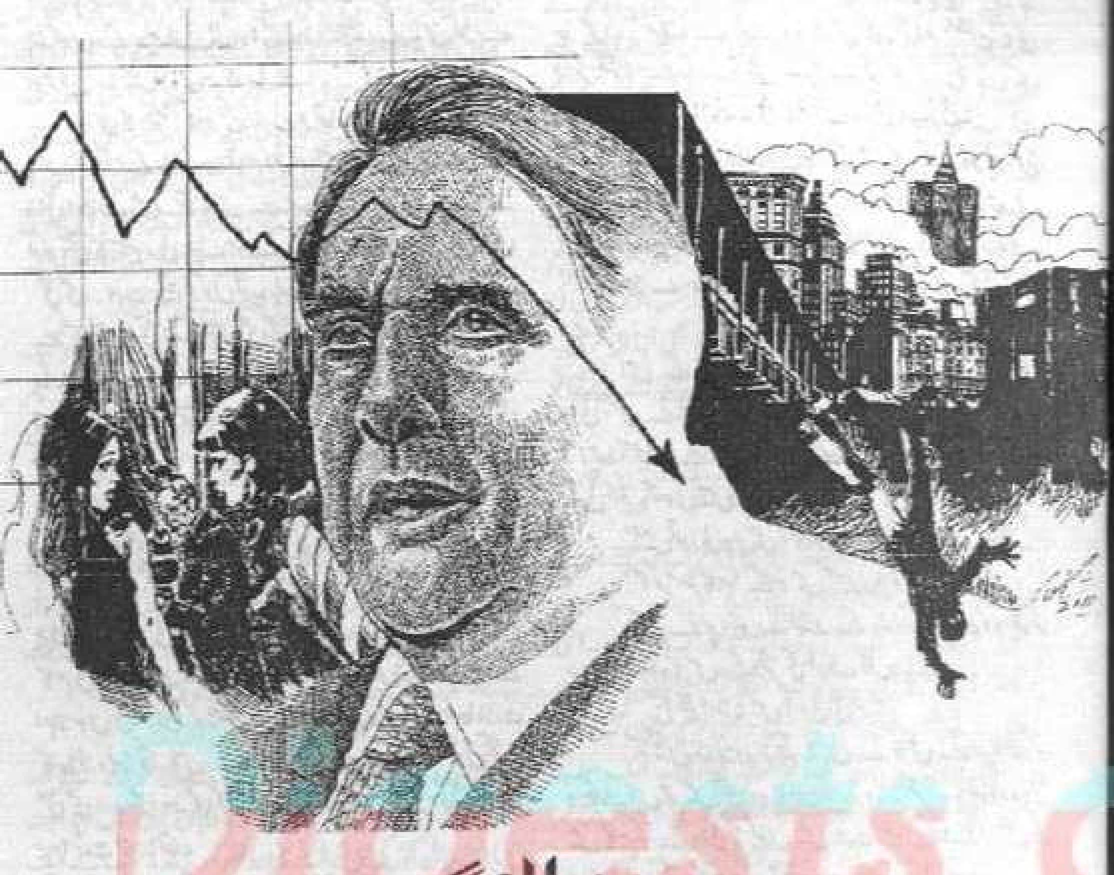

چھلانگ

بابر نعیم

چھلانگ کتنی ہی اونچی، لمبی یا نیچی ہو، کرتبی کو آخرکار زمین پر ہی ٹکنا ہوتا ہے، نظربندی کے وہ زمانے گئے کہ کرتب دکھانے والا فضا میں اچھلا اور غائب ہو گیا، پھر چند منٹ بعد کسی سمت سے ٹہلتا ہوا تماشائیوں میں آ گیا... مگر وہ معاملہ کچھ ایسا ہی تھا... ایک کھڑکی توڑ تماشے نے سب کو حیران و پریشان کر دیا۔ اکیسویں صدی کا کوئی ذہن اسے آسیبی واقعہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا اور جب کڑیاں ملنے لگیں تو سچ خود سامنے آ گیا...

ایک چالاک اور مکار مجرم کی خودغرضی کی تحیر انگیز روداد

دن کا آغاز معمول کے مطابق ہوا تھا، مک لوڈ اپنے اپارٹمنٹ سے دفتر جانے کے لیے نکلا جو زیادہ دور نہیں تھا۔ اس لیے وہ عام طور پر صبح کے اوقات میں پیدل ہی چلا جاتا تھا۔ ابھی وہ کئی بلاک کے فاصلے پر تھا لیکن اسے جیو پیٹر انٹرنیشنل اینڈ برادرز کارپوریشن کی نچلی منزل پر لگی ہوئی شیشے کی کھڑکیاں صاف نظر آ رہی تھیں لیکن دسویں منزل کے بعد دھند نے پوری عمارت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان تک پانی کی موٹی چادر تان دی گئی ہو۔ گزشتہ دو روز سے ہونے والی برف باری تو ختم ہو چکی تھی لیکن گہری دھند کی وجہ سے سڑکوں پر پھسلن تھی اس لیے وہ بڑی احتیاط سے

Digests of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چل رہا تھا۔ بالآخر وہ اپنے دفتر کی عمارت میں داخل ہو گیا اور چند لمحوں کے لیے لابی میں واقع نیوز اسٹینڈ کے پاس کھڑے ہو کر اپنی سانسیں درست کرنے لگا۔

اس کا دفتر اکیسویں منزل پر تھا۔ اس فلور پر کمپنی کے نائب صدر کے علاوہ وہ تمام افراد بیٹھتے تھے جو بلی کام کے ذاتی اسٹاف میں تھے یا اس سے بہت زیادہ قریب تھے۔ میک لو کو کمپنی کا سیکیورٹی چیف ہونے کی وجہ سے اس فلور پر جگہ دی گئی تھی۔ بہت سے لوگوں کو یہ بات پسند نہیں آئی لیکن ان میں سے کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کمپنی کے صدر بلی کام کے سامنے کچھ بول سکتا۔ یہ عہدہ سنبھالنے کے پہلے روز ہی اس پر قاتلانہ حملہ ہو گیا تھا جب وہ لابی کے راستے اپنے دفتر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے بعد سے بلی کام نے عمارت کے عقب میں واقع پرائیویٹ لفٹ استعمال کرنا شروع کر دی اور میک لو کو بھی اکیسویں منزل پر کمرا دے دیا گیا۔

کبھی کبھی اسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ کمپنی کا سیکیورٹی چیف نہیں بلکہ بلی کام کا ذاتی محافظ ہے۔ اس کے فرائض میں کام کی پرائیویٹ لفٹ کو درست حالت میں رکھنا، کمپنی کے اجلاسوں کی نگرانی کرنا اور پورے دفتر کے سیکیورٹی معاملات کا جائزہ لینا تھا۔ اس کے عوض اسے کمپنی سے ایک معقول تنخواہ ملتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ سر جھکائے اس ڈیوٹی کو ہنسی خوشی برداشت کر رہا تھا۔

جب وہ اکیسویں منزل پر پہنچا تو مارگریٹ مسن پہلے سے اپنی نشست پر موجود تھی۔ اس نے ایک ادا سے میک کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "کیسے ہو؟"

اس مسکراہٹ کا مطلب وہی سمجھتا تھا۔ اس نے بھی جواب میں اسی گرم جوشی کا اظہار کیا اور بولا۔ "صبح بخیر مارگریٹ! کیا مسٹر بلی موجود ہیں؟"

"وہ ابھی نہیں پہنچے۔ شاید تمہیں معلوم ہو کہ وہ پٹس برگ گئے ہوئے ہیں اور ان کا جہاز کسی وقت بھی پہنچنے والا ہے۔"

میک نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بجے ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہونے والی تھی اور اس میں صرف بیس منٹ رہ گئے تھے۔ اس نے مارگریٹ سے پوچھا۔ "ان کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟"

مارگریٹ تھوڑا سا آگے کی طرف جھکی اور رازدارانہ انداز میں بولی۔ "مسٹر کام نے جہاز سے جیسن گرین کو فون کیا تھا۔ انہوں نے کمپنی کے انضمام کے بارے میں بات چیت مکمل کر لی ہے اور اس کا اعلان وہ میٹنگ میں کریں گے۔"

"اس خبر سے ان کے کچھ قریبی دوست شاید افسردہ ہو جائیں۔" میک نے کہا۔ وہ ناکس اور سام ہملٹن نامی ڈائریکٹرز کے بارے میں سوچ رہا تھا جو شروع سے ہی انضمام کے خلاف تھے۔ بلی کام کے جانے سے چوبیس گھنٹے پہلے لگ رہا تھا کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن بلی کام کے ہنگامی دورے کے بعد صورت حال تبدیل ہو گئی۔ میک نے ایک بار پھر گھڑی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "آج میرے ساتھ لنچ کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

اس کے چہرے پر وہی دل فریب مسکراہٹ نمودار ہوئی جس نے نہ جانے کتنے لوگوں کا سکون غارت کر دیا تھا۔ "اچھا آئیڈیا ہے۔ تمہارے ساتھ ڈرنک کرتے ہوئے مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔"

"میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"اگر مسٹر کام آ گئے تو میں تمہیں بلا لوں گی۔"

میک نے پرائیویٹ لفٹ کے بند دروازے کو دیکھ کر سر ہلایا پھر وہ ناکس کے دفتر کی طرف چل دیا۔

"صبح بخیر مسٹر ناکس! کوئی نئی خبر؟"

پینتیس سالہ دراز قد ناکس نے فائل سے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس عمر میں بھی وہ جوان اور تروتازہ نظر آ رہا تھا، وہ دفتر میں کام کرنے والی لڑکیوں میں بہت مقبول تھا۔ اگر اس کی بیوی اور پانچ بچے نہ ہوتے تو وہ اور زیادہ مقبول ہوتا۔

"موسم دیکھ رہے ہو؟" اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں دھند کی دبیز چادر نظر آ رہی تھی۔ "ہر سال سردیوں میں فلوریڈا جانے کے بارے میں سوچتا ہوں لیکن ہر مرتبہ بیوی کے حاملہ ہو جانے کی وجہ سے مجھے رکنا پڑ جاتا ہے۔"

جیسن گرین بھی ہاتھ میں کاغذوں کا پلندہ لے کر آ گیا اور کہنے لگا۔ "بلی کام کسی بھی لمحے آ سکتا ہے۔ اس نے مجھے فون کر کے انضمام کے بارے میں بتا دیا تھا۔"

ناکس پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "میں یہ بات سن چکا ہوں۔"

"جیسے ہی یہ خبر باہر آئی جیوپیٹر کے حصص میں دس پوائنٹس کا اضافہ ہو جائے گا۔"

میک ان دونوں کے درمیان بڑھتے ہوئے کھنچاؤ کو محسوس کر سکتا تھا۔ ان میں سے ایک کے لہجے میں تلخی تھی جبکہ دوسرا خوش ہو رہا تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ دھند کی وجہ سے قریب کی عمارتیں بھی نظر نہیں آ رہی تھیں پھر

اسے اپنے عقب میں ایک تیسری آواز سنائی دی۔ وہ مڑے بغیر ہی جان گیا کہ یہ آواز بلی کام کی پرسنل سیکریٹری شرے ٹیگ کی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میٹنگ کا وقت ہو گیا ہے۔ تم لوگ تیار ہو؟"

شرے جوان اور خوش شکل تھی اور مارگریٹ کے مقابلے میں زیادہ پُرکشش نظر آتی تھی لیکن بلی کام کی سیکریٹری ہونے کی وجہ سے کوئی اس کے قریب نہیں آتا تھا۔ وہ کسی کام سے ہال میں آتی تو سرگوشیاں تھم جاتیں اور سب لوگ اس کی جانب شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتے۔ وہ لنچ بھی تنہا ہی کرتی۔ اگر ایک دو لوگوں نے بھی اس سے ڈیٹ پر چلنے کے لیے کہا تو انہیں منہ کی کھانا پڑی۔

"ہم تو تیار ہیں۔" جیسن گرین نے کہا۔ "کیا مسٹر بلی کام آ گئے؟"

اس نے اپنا سر ہلایا اور گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "انہیں اب تک آ جانا چاہیے تھا۔"

میک ان لوگوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر باہر آ گیا۔ اسی وقت سام ہملٹن اس کے قریب سے گزرا اور رک کر اسے لطیفہ سنانے لگا۔ بظاہر وہ انضمام کی خبر سن کر پریشان نہیں لگ رہا تھا کیونکہ اس نے بھی مخالفت کی تھی۔ میک سب ڈائریکٹرز... میں اسے ہی پسند کرتا تھا کیونکہ پچاس سال کی عمر میں اس کے سینے میں ایک نوجوان جیسا دل دھڑکتا تھا۔

میک واپس مارگریٹ کے پاس آیا اور بولا۔ "کوئی خبر؟"

"مسٹر کام کا کوئی پتا نہیں۔ انہیں اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ دس بجنے ہی والے ہیں۔"

میک نے ایک نظر بلی کام کے دفتر کے بند دروازے پر ڈالی اور اس کے برابر میں واقع ڈائریکٹرز روم میں داخل ہو گیا۔ اس کے وسط میں ایک بڑی سی میز رکھی تھی جس کے گرد آٹھ کرسیاں سجا دی گئی تھیں۔ بہت سے لوگوں کو اعتراض تھا کہ یہ کانفرنس روم جیوپیٹر اسٹیل کے شایانِ شان نہیں لیکن بلی کام نے کبھی اس کی پروا نہیں کی ویسے بھی وہ فضول خرچی کا عادی نہ تھا۔

میک نے ایک کھڑکی کھولنے کی کوشش کی لیکن برف باری اور دھند کی وجہ سے وہ جام ہو چکی تھی۔ جب تک باہر سے اس کی صفائی نہ کی جاتی، اس کا کھلنا ممکن نہیں تھا۔ میک دوبارہ مارگریٹ کے پاس چلا گیا، وہ میٹنگ کی تیاری کر رہی تھی۔ میک، بلی کام کے دفتر کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ یہ بھی رقبے میں برابر والے کمرے جتنا ہی تھا اور اسی کی طرح

سادہ البتہ وسط میں پڑی ہوئی میز دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کوئی معروف شخص بیٹھتا ہے۔ دیوار کے بائیں جانب کمپنی کے بانی کی بڑی سی تصویر آویزاں تھی جس کے رنگ پھیکے پڑ چکے تھے جبکہ دائیں جانب کمپنی کے سابق صدر اور موجودہ ڈائریکٹر اسرائیل بلیک کی تصویر لگی ہوئی تھی لیکن وہ میٹنگ میں نہیں آتا تھا۔ یہاں بیٹھ کر بلی کام اپنی وسیع سلطنت پر حکمرانی کرتا تھا اور اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ کسی بھی شخص کی معاشی تباہی کا سبب بن سکتا تھا۔

اچانک ہی میک کسی شخص کی آواز سن کر چوکنا ہو گیا۔ اس نے مارگریٹ کو کہتے ہوئے سنا۔ "کیا بات ہے؟" پھر اسے ڈائریکٹرز روم کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ تیزی سے باہر کی جانب لپکا لیکن اس وقت تک دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ "کیا وہ آ گئے؟"

مارگریٹ کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اندر سے کسی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ ان دونوں نے اس آواز کو واضح طور پر سنا۔ مارگریٹ کے ہاتھ سے سگریٹ گر گیا جسے وہ جلانے ہی والی تھی۔

"بلی۔" وہ زور سے چلائی۔ "نہیں بلی۔"

وہ دونوں تیزی سے دروازے کی طرف لپکے اور ڈائریکٹرز روم میں داخل ہو گئے۔ وہاں کوئی نہیں تھا البتہ سامنے والی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میک نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "لگتا ہے کہ اس نے چھلانگ لگا دی۔"

کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے سے کمرے میں بھی دھند داخل ہو گئی۔ وہ تیزی سے کھڑکی کی جانب گئے اور باہر جھانکنے کی کوشش کی لیکن انہیں کچھ نظر نہیں آیا۔

"بلی نے چھلانگ لگا دی۔" مارگریٹ ہذیانی انداز میں بولی جیسے وہ حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہو۔ "اس نے اپنے آپ کو مار ڈالا۔"

میک نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے میں ناکس کھڑا ہوا تھا اور اس کے عقب میں گرین، ہملٹن اور شرے نظر آ رہے تھے۔ "بلی کام نے ابھی ابھی اس کھڑکی سے چھلانگ لگائی ہے۔" میک نے انہیں بتایا۔

"نہیں۔" مارگریٹ چیختے ہوئے بولی۔ "نہیں... نہیں... نہیں۔" اس کے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ فرش کی جانب لڑھکی اور بے ہوش ہو گئی۔

"اس کا خیال رکھو۔" میک دوسروں کی طرف دیکھ کر چلایا۔ "میں نیچے جا رہا ہوں۔"

digestpk.blogspot.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ناکس، لڑکی کو اٹھانے کے لیے جھکا۔ سام ہملٹن ٹیلی فون کی جانب لپکا۔ شرے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا جبکہ جیسن گرین ایک کونے میں کھڑا رو رہا تھا۔

ہال وے میں پہنچ کر میک نے بلی کام کی پرائیویٹ لفٹ کا بٹن دبایا اور اس میں سوار ہوکر نیچے آیا۔ اس کا خیال تھا کہ سڑک پر مجمع لگ گیا ہوگا اور سائرن بجاتی ایمبولینس وہاں پہنچ گئی ہوگی لیکن نیچے ایسا کوئی منظر نہیں تھا۔ ٹریفک معمول کے مطابق چل رہا تھا اور راہ گیر فٹ پاتھ پر رواں دواں تھے۔ قریب ہی ایک پولیس والا ٹریفک کنٹرول کررہا تھا۔

میک کو وہاں کوئی لاش نظر نہیں آئی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا پولیس والے کے پاس گیا اور بولا۔ ”ایک شخص نے ابھی ابھی جیوپیٹر اسٹیل کی عمارت سے چھلانگ لگائی ہے۔ تم نے اسے دیکھا ہے؟“

پولیس والے نے حیران ہوتے ہوئے اسے دیکھا اور بولا۔ ”چھلانگ لگائی ہے۔ کہاں سے؟“

”اس عمارت کی اکیسویں منزل سے۔“ وہ اپنی عمارت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

وہ دونوں ہی اوپر کی جانب دیکھنے لگے جہاں ابھی تک گہری دھند چھائی ہوئی تھی اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ پولیس والے نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”میں یہاں ایک گھنٹے سے کھڑا ہوں اور میں نے کسی کو اوپر سے چھلانگ لگاتے نہیں دیکھا۔“

”لیکن ....“ میک بدستور دھند کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے خود اسے چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا ہے.... اگر وہ نیچے نہیں گرا تو کہاں چلا گیا؟“

وہ واپس اکیسویں منزل پر آیا تو دیکھا کہ سبھی لوگ صدمے اور الجھن کا شکار تھے۔ سام ہملٹن ٹیلی فون پر اپنے بروکر سے جیوپیٹر کے حصص کے بارے میں دریافت کررہا تھا۔ میک کو دیکھتے ہی بولا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ اس خبر کے پھیلتے ہی ہمارے حصص کی قیمت گر جائے گی۔ کیونکہ بلی کے مرنے کے بعد انضمام کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

میک نے سگریٹ سلگایا اور بولا۔ ”بلی کام نے چھلانگ تو لگائی ہے لیکن وہ نیچے نہیں گرا بلکہ اکیسویں منزل اور سڑک کے درمیان کہیں غائب ہوگیا ہے۔“

”کیا؟“

ناکس بھی مارگریٹ میسن کو سہارا دیے ان کے پاس آگیا اور بولا۔ ”یہ تھوڑی دیر میں ٹھیک ہوجائے گی۔ صدمے کا اثر ہے۔“

میک نے مارگریٹ کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ ”ہمیں سچ سچ بتاؤ کہ کیا ہوا تھا؟“

”اچھا۔“ وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہملٹن اور شرے اس کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے اور جیسن گرین ایک پولیس آفیسر کے ساتھ اندر داخل ہورہا تھا۔

میک نے مارگریٹ کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ ”جب میں ڈائریکٹرز روم سے نکل کر بلی کے دفتر میں گیا تو تم اس وقت اپنی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ پھر کیا ہوا؟“

”مسٹر بلی کام اندر آئے اور میری میز کے پاس سے کچھ بڑبڑاتے ہوئے گزرے جو میری سمجھ میں نہیں آیا اور میں نے ان سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ وہ مجھے کچھ پریشان لگ رہے تھے اور کوئی جواب دیے بغیر ڈائریکٹرز روم میں چلے گئے۔ انہوں نے دروازہ بند کیا ہی تھا کہ تم باہر آگئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تم بھی جانتے ہو۔“

میک نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ”ہاں لیکن اس کا جسم زمین پر نہیں گرا۔ اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگائی اور کہیں اڑ گیا۔“

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ شرے نے ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہنے کے بعد ہملٹن کو پکڑا دیا۔ اس نے فون سننے کے بعد کہا۔ ”بلی کے مرنے کی خبر اسٹاک مارکیٹ میں پہنچ گئی ہے اور ہمارے حصص تیزی سے گر رہے ہیں۔ اب تک تین پوائنٹس کی کمی ہوچکی ہے۔“

کچھ دیر بعد ہی ایک سراغ رساں بھی پہنچ گیا۔ اس نے پولیس آفیسر کے ہمراہ جائے وقوع کا معائنہ کیا اور اس کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

”مسٹر میک! تم کمپنی کے سیکیورٹی انچارج ہو؟“

”ہاں۔“

”یہ کیوں ضروری سمجھا گیا کہ تم بھی ڈائریکٹرز میٹنگ میں موجود رہو؟“

”کچھ عرصہ قبل ایک شخص نے مسٹر بلی کام پر حملہ کیا تھا۔ اس واقعے کے بعد وہ کافی محتاط ہوگئے تھے۔“

”کیا تم اس شخص کا نام جانتے ہو؟“

”ہاں۔ میرا خیال ہے کہ کچھ اسی سے ملتا جلتا نام تھا لیکن یہ نہیں معلوم کہ اب وہ کہاں ہے۔“

”عام طور پر ان میٹنگز میں کتنے لوگ شریک ہوتے تھے۔ میں نے وہاں آٹھ کرسیاں دیکھی ہیں۔“

”بلی کام، تینوں نائب صدر یعنی گرین، ناکس اور

ہملٹن، مس شرے اور مس مارگریٹ، ساتویں کرسی میری ہے اور آٹھویں کرسی مسٹر بلیک کے لیے مخصوص ہے جو کبھی میٹنگ میں نہیں آتے۔“

”کیا مسٹر کام اور مسٹر بلیک کے درمیان کوئی ناراضی تھی؟“

”تھوڑی بہت۔“ میک نے جواب دیا۔ ”کیا تم ہم سے کوئی راز اگلوانا چاہ رہے ہو؟“

سراغ رساں نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”مجھے تو پوری کہانی ہی ایک معما لگ رہی ہے۔“

اس نے تقریباً ایک گھنٹہ پولیس کے ساتھ گزارا۔ اس دوران میں وہ کئی بار اوپر نیچے گئے۔ ان کی واپسی تقریباً دوپہر کے وقت ہوئی۔ ان کے جانے کے بعد میک، مارگریٹ کے پاس آیا۔ وہ اس طرح لاتعلقی کے انداز میں بیٹھی ہوئی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

”لنچ کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”میرا خیال ہے کہ ایک مارٹینی کا گلاس تمہارے اعصاب کو سکون دے سکتا ہے۔“

”اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہاری پیشکش کا شکریہ لیکن تم دفتر سے باہر نہیں جاسکتے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک ٹائپ شدہ خط میک کو پکڑا دیا جس پر ناکس کے دستخط تھے اور اس سے کہا گیا تھا کہ وہ دوپہر کے وقت دفتر میں موجود رہے۔

”لگتا ہے کہ وہ مجھ سے مزید کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ تم میرا انتظار کرو۔ ان سے مل کر ابھی آتا ہوں۔“

وہ ناکس کے کمرے میں گیا اور اسے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ وہاں ہملٹن اور گرین پہلے سے موجود تھے۔ وہ بھی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے یوں لگا کہ وہی سب کی توجہ کا مرکز ہے۔

”اب بتاؤ، تمہارے خیال میں وہ کہاں ہوسکتا ہے؟“ ناکس نے اس پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مرچکا ہے۔“ گرین نے کہا۔

”شاید۔“ میک نے اس کی تردید نہیں کی۔ ”لیکن لاش کہاں گئی؟“

ہملٹن نے دونوں ہاتھوں کو بے چینی کے عالم میں رگڑا اور کہنے لگا۔ ”یہی تو ہمیں معلوم کرنا ہے۔ میرا فون ایک گھنٹے سے مسلسل بج رہا ہے۔ بروکرز جاننے کے لیے بے چین ہیں کہ پس برگ میں کیا ہوا؟“

”میرا خیال ہے کہ انضمام کے باقی رہنے یا ختم ہونے کا تعلق بلی کام کی ذات سے ہے۔“ میک نے کہا۔

”ہاں، اگر وہ مرچکا ہے تو یہ انضمام بھی نہیں ہوسکے گا۔“

جیسن گرین نے غمناک آواز میں کہا۔ ”بلی کام ایک عظیم شخص تھا اور میں آخری آدمی ہوں گا جو انضمام کے ختم ہونے کی کوشش کرے گا جس کے لیے اس نے اتنی محنت کی تھی لیکن وہ مرچکا ہے اور صرف ایک ہی جگہ اس کی لاش جاسکتی ہے۔“

”کہاں؟“ ناکس نے بے تابی سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ وہ کسی ٹرک پر گرا ہے جو اس وقت یہاں سے گزر رہا ہوگا۔“

ہملٹن کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ تائید کرتے ہوئے بولا۔ ”یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔“

میک نے جھجکتے ہوئے اپنا سر ہلایا اور بولا۔ ”پولیس کے ذہن میں بھی سب سے پہلے یہی خیال آیا تھا۔ ہم نے اس پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ یہ عمارت سڑک سے کافی ہٹ کر ہے اور ایسا نہیں ہوسکتا کہ اتنی اونچائی سے گرنے والا شخص سیدھا سڑک پر جائے۔ ویسے بھی اس طرف کی سڑک کی مرمت کے لیے بند ہے اور وہاں ہر وقت ایک پولیس والا ڈیوٹی پر رہتا ہے۔ بلی کام، سڑک یا فٹ پاتھ پر بھی نہیں اور نہ ہی وہاں سے کوئی ٹرک یا کار گزری ہے۔“

ناکس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ نیچے نہیں گرا تو کیا اوپر چلا گیا؟“

”ممکن ہے کہ اس نے چھلانگ ہی نہ لگائی ہو اور یہ محض مارگریٹ کے ذہن کی اختراع ہو۔“

میک کو اس کے الفاظ سن کر حیرت ہوئی۔ کیا وہ یہ اس لیے کہہ رہا تھا کہ مارگریٹ نے اس کے کچھ لطیفوں پر اعتراض کیا تھا۔ وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ”تم بھول رہے ہو کہ میں بھی اس وقت وہاں موجود تھا اور جب کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی تو میں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ دنیا کی بہترین ایکٹریس بھی اس طرح کے مصنوعی تاثرات نہیں دے سکتی۔ میں نے اسے اندر جاتے ہوئے دیکھا یا زیادہ صحیح ہوگا کہ میں نے اس کے اندر جانے کے بعد دروازہ بند ہوتے دیکھا۔ ظاہر ہے کہ وہ خود بخود تو بند نہیں ہوسکتا۔“

”اور جب اگلے لمحے تم دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں کوئی نہیں تھا۔“ ناکس نے کہا۔ ”اس لیے بلی

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے کھڑکی سے ضرور چھلانگ لگائی ہوگی۔ ہمیں حقیقت کا سامنا کرنا چاہیے۔ وہ میز کے نیچے تو نہیں چھپ سکتا۔"

"اگر وہ نیچے نہیں گیا تو وہ کسی رسی کے ذریعے چھت پر یا کسی دوسری کھڑکی میں چلا گیا ہوگا۔" ہملٹن نے کہا۔

"وہ ایک بڑی کمپنی کا صدر ہے کوئی شعبدے باز نہیں۔" میک نے جل کر کہا۔ "تم یہ بات کیوں بھول رہے ہو کہ باہر سے کوئی بھی کھڑکی نہیں کھولی جا سکتی اور چھت تک اتنا فاصلہ ہے کہ کسی رسی کے ذریعے وہاں تک پہنچنا ممکن نہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر اس کا چھلانگ لگانے کا ارادہ نہیں تھا تو اسے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"وہ اوپر نیچے اطراف میں کہیں نہیں گیا اور نہ ہی کمرے میں ہے۔ اس سے کیا بات ثابت ہوتی ہے؟" جیسن گرین تیز لہجے میں بولا۔

میک سوچ رہا تھا کہ وہ ان لوگوں کو اپنا خیال بتائے یا فی الحال خاموش رہے لیکن وہ بولے بغیر نہ رہ سکا۔ "فرض کرو اس نے چھلانگ لگائی ہو اور راستے میں کہیں اٹک گیا ہو۔ کسی درخت، کھمبے یا تار پر اور ابھی تک وہیں لٹکا ہوا ہو۔ دھند کی وجہ سے تو قریب کی چیزیں بھی نظر نہیں آ رہیں۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ اس کے راستے میں ایسی کوئی چیز آئی ہوگی۔ وہ خلا میں معلق نہیں ہو سکتا۔"

"اس کا بھی پتا چل جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد سورج کی حرارت سے دھند چھٹ جائے گی اور سب کچھ صاف نظر آنے لگے گا۔"

وہ کھڑکی سے باہر کا منظر نہیں دیکھ سکتے تھے اس لیے لفٹ کے ذریعے نیچے سڑک پر آ گئے۔ ان کے آتے ہی دھند چھٹنے لگی اور آسمان بالکل صاف ہو گیا۔ وہ سڑک پر کھڑے عمارت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کے سوا انہیں وہاں کچھ نظر نہیں آیا۔ کوئی شخص خلا میں معلق نہیں تھا۔ وہاں کوئی درخت، کھمبا، تار، شیشے صاف کرنے والی مشین کچھ بھی نہیں تھا۔

ناکس نے گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں لنچ کر لینا چاہیے۔ ممکن ہے کہ پیٹ بھرنے کے بعد ہم زیادہ بہتر انداز میں سوچ سکیں۔"

وہ سب اپنے اپنے راستے پر چل پڑے۔ میک اکیسویں منزل پر واپس آیا۔ مارگریٹ اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھی بلکہ شرے کے ساتھ بلی کام کے دفتر میں گھٹنوں کے بل جھکی کھڑکی کی دیوار پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میک نے پوچھا۔

"ہم نے سوچا کہ تھوڑی سی سراغ رسانی کر لیں۔" مارگریٹ بولی۔ "یہ شرے کا آئیڈیا تھا۔ اسی نے بتایا کہ مسٹر بلی کام اکثر کہا کرتے تھے کہ دونوں کمروں کے درمیان ایک راستہ ہونا چاہیے۔ اس کا خیال تھا کہ شاید لکڑی کی دیوار میں اس طرح کا کوئی خفیہ راستہ ہو۔"

"مجھے سسپنس میں مبتلا مت کرو۔" میک نے کہا۔ "تم نے ایسی کوئی چیز دریافت کی؟"

"نہیں، ہم نے دیوار کے دونوں طرف دیکھ لیا۔" مارگریٹ بولی۔

"اب اس طرح کے خفیہ راستوں کا رواج نہیں۔ اسے بھول جاؤ۔ چلو لنچ کرتے ہیں۔"

شرے فنگ اپنے اسکرٹ کی شکنیں درست کرتے ہوئے بولی۔ "تم دونوں جاؤ۔ ممکن ہے کہ میرا ساتھ تمہیں گوارا نہ ہو۔"

اس سے پہلے کہ وہ دونوں کچھ کہتے، شرے وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میک نے اطمینان کا سانس لیا۔ دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی شرے سے ڈرتا تھا اور اس کی موجودگی میں مارگریٹ سے کوئی بات نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ مارگریٹ کو لے کر نیچے چلا آیا اور انہیں سڑک کے پار ریستوران میں ایک خالی کیبن مل گیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں وہ اکثر چھٹی کے بعد آیا کرتے تھے لیکن اب کچھ دنوں سے یہ سلسلہ رک گیا تھا۔ اسے خزاں کی وہ شام ابھی اچھی طرح یاد تھی جب مارگریٹ سے اس کی ملاقات بڑے عجیب حالات میں ہوئی تھی۔ وہ اپنی شام گزارنے ایسٹ ریور کے ایک چھوٹے سے ریستوران میں گیا تو وہاں مارگریٹ بھی موجود تھی اور عقبی بوتھ میں اپنے شرابی ساتھی سے عزت بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میک اس کی آواز سن کر بوتھ میں چلا گیا اور ایک ہی گھونسا مار کر اس شخص کو بے ہوش کر دیا۔ اس واقعے کے بعد وہ دونوں ڈرنک کرنے کے لیے ایک ساتھ آنے لگے اور کبھی کبھی تو میک کو یہ محسوس ہونے لگتا کہ وہ بھی مارگریٹ کی زندگی میں آنے والے مردوں کی صف میں شامل ہو گیا ہے۔ لیکن اس کی یہ خوش فہمی جلد ہی دور ہو گئی۔ آہستہ آہستہ مارگریٹ نے اس کے ساتھ شام میں بار جانا بند کر دیا اور ان کی ملاقاتیں لنچ تک ہی محدود ہو کر رہ گئیں۔ میک کو یہ اندازہ لگانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ مارگریٹ نے اپنی خلوتوں کے لیے کوئی ساتھی تلاش کر لیا ہے۔

لنچ کے بعد مارٹینی کا دور چلا۔ مارگریٹ پہلا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ "یہ بہت ہی ہولناک واقعہ تھا۔"

"میں جانتا ہوں کہ معاملہ مزید بگڑ سکتا ہے۔ ڈر ہے کہ کہیں وہ اچانک ہی نمودار نہ ہو جائے۔"

"زندہ یا مردہ؟"

"کاش میں یہ جان سکتا۔"

مارگریٹ نے ایک سگریٹ سلگایا اور بولی۔ "کیا اس کے لیے تمہیں موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے؟"

"میں اس کا ذاتی باڈی گارڈ نہیں بلکہ کمپنی کا سیکیورٹی چیف ہوں۔ نہ ہی کوئی سراغ رساں ہوں جو انگلیوں کے نشانات یا دوسرے شواہد کی بنا پر کوئی رائے قائم کر سکوں۔ میں صرف لوگوں کے بارے میں جانتا ہوں۔"

"جیوپیٹر میں کام کرنے والے لوگوں کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟"

"تمہارے سوا میں کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" وہ اپنا گلاس ختم کرتے ہوئے بولا۔ "ہملٹن، ناکس، گرین اور دوسرے لوگوں کے صرف نام اور چہرے پہچانتا ہوں۔ میں نے کبھی ان کے ساتھ بیٹھ کر کبھی ڈرنک بھی نہیں کی۔ ان کے ساتھ میٹنگ میں بیٹھنا بھی مجھے بہت بور لگتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس واقعے کا ذمے دار مجھے ٹھہرانے کی کوشش کرے گا تو اسے نئے سیکیورٹی چیف کی تلاش شروع کر دینی چاہیے۔"

مارگریٹ کا گلاس بھی خالی ہو چکا تھا۔ اس نے بیرے کو بلا کر مزید ڈرنک کا آرڈر دیا۔ ابھی تک اس کے چہرے کا تناؤ ختم نہیں ہوا تھا۔ شاید اسی لیے اسے مزید شراب کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔

"شاید میں بھی تمہارے ساتھ ہی یہ جاب چھوڑ دوں۔"

"ہم لوگوں کو کافی دنوں بعد اس طرح بیٹھ کر باتیں کرنے کا موقع ملا ہے۔" میک اس کی جانب پُرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"

اس نے ہلکے سے اپنے کندھے اچکائے اور بولی۔ "سب ٹھیک ہے۔"

"نیا بوائے فرینڈ کیسا ہے؟"

مارگریٹ تھوڑی سی حیران ہوئی۔ شاید سوچ رہی ہوگی کہ میک کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میک نے دوسرا سوال کیا۔ "کیا تم اس سے محبت کرتی ہو؟"

میک کا خیال تھا کہ اس کا جواب نفی میں ہوگا لیکن خلافِ توقع اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ مایوس ہو گیا اور موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "جب بلی کام تمہاری میز کے پاس سے گزرا تو کیا وہ....."

اچانک ہی سڑک پر سے ایک زوردار چیخ کی آواز سنائی دی اور اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میک کھڑا ہو کر دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ ایک ویٹر تیزی سے باہر نکلا تاکہ واقعے کے بارے میں جان سکے۔

"یہ کیسی آواز تھی؟" مارگریٹ نے پوچھا۔

"میں کچھ نہیں جانتا لیکن لگتا ہے کہ مجمع اکٹھا ہو رہا ہے۔ آؤ دیکھتے ہیں۔"

وہ بڑی مشکلوں سے راستہ بنا کر وہاں تک پہنچے۔ میک کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ اسے کیا دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ بلی کام ہی تھا۔ اس کی لاش بری طرح مسخ ہو چکی تھی اور وہ اپنے جسم سے بہت چھوٹا نظر آ رہا تھا۔ ایک پولیس والا کہیں سے کمبل لے کر آیا اور لاش پر ڈال دیا۔ میک نے ہملٹن کو بھیڑ میں سے راستہ بناتے اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس نے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

"بلی۔" میک نے اسے بتایا۔ "یہ بلی کام ہے؟"

ہملٹن نے ایک نظر کمبل پر ڈالی اور پھر گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "اسے کھڑکی سے کودے ہوئے تین گھنٹے اور پینتالیس منٹ ہو چکے ہیں۔ اس نے نیچے آنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی؟"

☆☆☆

ناکس کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا اور شرے فنگ ایک کونے میں سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا تھا۔ بلی کی لاش دریافت ہو چکی تھی اور اس کے بعد ہونے والے ردعمل کا انتظار تھا۔ وہ جانتے تھے کہ آنے والے حالات مزید خرابی کی طرف جائیں گے۔ ہملٹن کمرے میں داخل ہوا تو جیسن گرین اسے دیکھتے ہی بولا۔ "مارکیٹ تو بند ہو چکی ہے لیکن شاید تمہیں کچھ دیر فون کے پاس بیٹھنا پڑے۔"

ہملٹن اس موقع پر بھی مسکرانا نہیں بھولا۔ "فی الحال ہمارے لیے جیوپیٹر کے حصص کی قیمت سب سے اہم ہے۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس کی قیمت میں مزید تیرہ پوائنٹس کی کمی ہو گئی ہے اور بروکرز نے اس کی خرید و فروخت روک دی ہے۔"

ناکس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور بولا۔ "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ ہم سب کو پُرسکون ہو کر ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے۔ پولیس کیا کہتی ہے میک؟"

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ملی کی موت اونچائی پر سے گرنے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔"

"لیکن وہ تقریباً چار گھنٹے تک کہاں رہا؟" گرین نے سوال کیا۔ "کیا وہ کھڑکی سے باہر لٹکا ہوا تھا اور ہمیں نظر نہیں آیا۔"

شرے فیگ نے بھی ہمت کی اور اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے بولی۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس وقت وہ کمرے سے باہر آ گیا ہو اور اس نے بعد میں چھلانگ لگائی ہو۔"

میک لو نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ "انتہائی احمقانہ خیال ہے۔ تمہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس بلڈنگ کی کھڑکیاں اس موسم میں نہیں کھولی جا سکتیں۔ کوئی اور کھڑکی ٹوٹی ہوئی نہیں پائی گئی اور جس کا شیشہ توڑا گیا تھا وہاں بھی کارڈ بورڈ لگا دیا گیا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ اس نے چھت پر سے چھلانگ لگائی ہو؟" کسی نے خیال ظاہر کیا۔

"ہم دیکھ چکے ہیں۔ وہاں کسی کے قدموں کے نشانات نہیں پائے گئے۔"

"کیا کسی نے اسے گرتے ہوئے دیکھا؟"

"نہیں۔ جب تک وہ زمین پر نہیں آ گیا۔"

وہ سب میک کو دیکھ رہے تھے۔ پھر گرین نے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں کیا ہوا ہوگا؟"

"میں کچھ نہیں جانتا سوائے اس کے کہ ملی کام چار گھنٹے تک خلا میں معلق نہیں رہ سکتا۔ وہ چھت یا کسی دوسری کھڑکی سے بھی نہیں گرا جس کا مطلب ہے کہ وہ صرف ڈائریکٹرز روم کی کھڑکی سے ہی چھلانگ لگا سکتا تھا۔"

"لیکن وہاں تو کارڈ بورڈ..."

"وہ کسی نے بعد میں لگایا ہے اور اس کا مطلب ہے..."

"اس کا مطلب ہے کہ ملی کو قتل کیا گیا ہے۔" ناکس گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ "اور اس نے خودکشی نہیں کی۔"

میک نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اسے جس نے بھی قتل کیا ہے وہ اسی فلور پر اور شاید اسی کمرے میں ہے۔"

☆☆☆

رات کا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا۔ پولیس واپس جا چکی تھی اور اب فون کے ذریعے پیٹس برگ اور پانچ دوسرے شہروں میں جہاں جیوپیٹر کی ملیں تھیں، سوالات کیے جا رہے تھے لیکن ابھی تک کوئی بات واضح نہیں تھی۔ عمارت کی دوسری منزلوں میں کام کرنے والا عملہ چھٹی کے بعد گھر جا چکا تھا لیکن اکیسویں منزل پر زندگی رواں دواں تھی۔

"ٹھیک ہے۔" ناکس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔

"ہم پیر کی صبح ڈائریکٹرز کی میٹنگ بلا لیتے ہیں تاکہ نئے صدر کا انتخاب کیا جا سکے۔ اس طرح مارکیٹ میں ہماری ساکھ بحال ہو سکے گی اور یہ بھی پتا چل جائے گا کہ ہمارا کتنا نقصان ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم مجوزہ انضمام کے بارے میں بھی ایک بیان جاری کر دیں گے۔ میرا خیال ہے کہ فی الحال یہ ایک مردہ ایشو ہے۔"

سام ہملٹن نے تائید میں سر ہلایا اور جیسن گرین نے جھجکتے ہوئے اس کی تصدیق کی۔ شرے نے اپنے پیڈ پر سے نظریں ہٹائیں اور بولی۔ "اسرائیل بلیک کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا مسٹر کام کی موت کے بعد وہ دوبارہ میٹنگ میں آنا شروع کر دے گا؟"

جیسن گرین نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "اسے آنا چاہیے۔ وہ ہمارے ساتھ کام کر سکتا ہے۔ میں نے کبھی اس کے بارے میں غلط رائے قائم نہیں کی۔"

اس طرح کی باتوں میں آدھی رات ہو گئی۔ میک نے سوچا کہ اب اسے معذرت کر کے اٹھ جانا چاہیے۔ باہر مارگریٹ اپنی سیٹ پر بیٹھی کاغذات سمیٹ رہی تھی۔ میک اسے دیکھ کر حیران رہ گیا اور بولا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم گھر جا چکی ہو گی۔"

"اس لیے نہیں گئی کہ شاید تمہیں میری ضرورت پڑ جائے..."

"یہ لوگ تو شاید ساری رات بیٹھے رہیں گے۔ کیوں نہ ایک ڈرنک ہو جائے۔"

"مجھے اب گھر جانا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔ اس وقت تمہارا تنہا جانا مناسب نہیں۔"

مارگریٹ کے چہرے پر خوب صورت مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ ایک ادا سے بولی۔ "بہت بہت شکریہ۔ تم جیسے آدمی کے ساتھ گھر جانے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

وہ دونوں لفٹ کے ذریعے نیچے آئے۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ اس لیے میک نے زیرِ زمین ٹرین سے سفر کرنے کے بجائے ٹیکسی سے جانا مناسب سمجھا۔ راستے میں اس نے

ایک بار پھر مارگریٹ سے پوچھا۔ "کیا تم اس بارے میں مجھے کچھ بتانا پسند کرو گی؟"

"تم کیا پوچھنا چاہ رہے ہو؟"

"اصل حقیقت کیا ہے۔" میک نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "میں کچھ کچھ معاملے کی تہ تک پہنچ گیا ہوں لیکن تمہاری زبان سے تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔"

"میں نہیں سمجھی کہ تم کیا جاننا چاہتے ہو؟" مارگریٹ کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ یہ کہہ کر وقتی طور پر خاموش ہو گیا لیکن کچھ دیر بعد جب ٹیکسی ایک سگنل پر رکی تو وہ بولا۔ "تم جانتی ہو کہ یہ ایک قتل ہے۔ اسے بچوں کا کھیل یا رومانی داستان مت سمجھو۔"

"کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہر ایک سے نہیں کی جا سکتیں۔" مارگریٹ نے بے بسی سے کہا۔ "معاف کرنا۔ میرا گھر آ گیا ہے مجھے یہیں کونے پر اتار دو۔"

وہ دونوں ٹیکسی سے باہر آ گئے۔ میک نے کرایہ ادا کرنے کے بعد کہا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے بھی تمہارے ساتھ ہی چلنا چاہیے۔"

"معاف کرنا میک۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔"

"تم جانتی ہو کہ میں یہیں رہ کر اس کا انتظار کروں۔"

مارگریٹ نے ایک گہری سانس لی اور اس کے ساتھ اپنے تین کمروں کے مختصر سے اپارٹمنٹ میں آ گئی۔ میک اس سے پہلے بھی ایک بار یہاں آ چکا تھا۔ مارگریٹ نے اپنا برساتی کوٹ اتارا اور بولی۔ "تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"مجھے معلوم ہے کہ وہ آج رات یہاں آئے گا۔ وہ پہلے بھی آتا رہا ہے۔"

"تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟" مارگریٹ کچھ پریشان ہوتے ہوئے بولی۔

"بہت سی باتیں اس جانب اشارہ کرتی ہیں۔ مثلاً لفٹ کو ہی لے لو۔"

"یہ لفٹ بیچ میں کہاں سے آ گئی؟"

"ملی کام کی مبینہ آمد اور خودکشی کے فوراً بعد میں اس کی پرائیویٹ لفٹ دیکھنے گیا تھا لیکن وہ اکیسویں منزل پر نہیں تھی جبکہ اسے وہاں ہونا چاہیے تھا کیونکہ ملی کبھی کوئی دوسری لفٹ استعمال نہیں کرتا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اکیسویں منزل پر آیا ہی نہیں۔"

مارگریٹ اپنی کرسی پر منجمد ہو کر رہ گئی۔ اس کا سر ایک جانب کو جھک گیا جیسے وہ کچھ سننے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر ہمت کر کے بولی۔ "اس سے تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ تم نے تو آج دوپہر ہی مجھے بتایا تھا کہ تم ان لوگوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔"

"میں اب بھی اس بات پر قائم ہوں لیکن تم میرے لیے بہت اہم ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ کیا کر رہا ہے اور میں تمہیں روکنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ تم بری طرح پھنس جاؤ۔"

"تمہی نے کہا تھا کہ مجھ پر یقین رکھتے ہو اور ان لوگوں کو بتایا تھا کہ جب میں ملی کا نام لے کر چلائی تو وہ ایکٹنگ نہیں تھی۔"

میک نے لمحہ بھر کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اسے لگا جیسے اس نے کوئی آواز سنی ہو۔ وہ بولا۔ "میں نے تم پر یقین کر لیا تھا لیکن لفٹ دیکھنے کے بعد بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ تم کبھی بھی مسٹر کام کو ملی نہیں کہتی تھیں اور ان ہیجانی لمحات میں بھی تمہیں مسٹر کام ہی کہنا چاہیے تھا کیونکہ وہ اس وقت تک کمپنی کا صدر تھا۔ جب میں نے ان دونوں باتوں کو یکجا کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ جو شخص ڈائریکٹرز روم میں گیا، وہ ملی کام نہیں تھا۔"

دروازے پر ہلکی سی آواز آئی جیسے کوئی چابی سے اسے کھول رہا ہو۔ مارگریٹ کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔ "نہیں، نہیں۔"

"یقیناً یہی قاتل ہے۔" میک اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"ملی۔" وہ چلائی۔ "ملی! بھاگ جاؤ۔ تمہیں پھنسایا جا رہا ہے۔"

میک اس سے پہلے ہی دروازہ کھول چکا تھا۔ اسے اپنے سامنے ڈرے سہمے ناکس کو دیکھ کر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

اس کھیل کا انجام انتہائی غیر متوقع انداز میں ہوا۔ ناکس نے جو کھیل شروع کیا تھا، اس کا نتیجہ صرف سولہ گھنٹے بعد ہی سامنے آ گیا۔ اس نے جیوپیٹر بلڈنگ میں نام نہاد خودکشی کا جو ڈراما کیا تھا، اس میں ناکس کی موت کا عنصر شامل نہیں تھا جو مارگریٹ کے باتھ روم سے چھلانگ لگانے کی صورت میں واقع ہوئی تھی۔

دوسری صبح صرف دو گھنٹے کی نیند لینے کے بعد میک ایک بار پھر دفتر میں موجود تھا اور لوگوں کو تمام واقعات سے آگاہ کر رہا تھا۔ "مجھے اس سے ہمدردی ہے۔ وہ بری طرح مارگریٹ کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا تمام سرمایہ

Digests of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شیئر مارکیٹ میں جھونک دیا تھا کیونکہ اسے امید تھی کہ انضمام نہیں ہو سکے گا اور کمپنی کے حصص کی قیمت تیزی سے گرے گی۔ اس طرح وہ زیادہ سے زیادہ حصص خرید کر کمپنی کا صدر بن سکتا تھا لیکن جب بلی نے اسے فون کر کے بتایا کہ اس کی بات چیت کامیاب رہی ہے تو ناکس کو اپنا سرمایہ ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ ایک گھنٹے تک حساب کتاب کرتا رہا اور جب اسے لگا کہ وہ بالکل قلاش ہو جائے گا تو وہ خودکشی کے ارادے سے ڈائریکٹرز روم میں چلا گیا۔"

"کیوں؟ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے بھی چھلانگ لگا سکتا تھا؟"

"کیونکہ اس طرف کھڑکیوں کے شیشے صاف کرنے والی مشین کھڑی ہوئی تھی اور وہ اپنے راستے میں کوئی رکاوٹ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی بلی کام کا قد چھوٹا ہے اور کھڑکی فرش سے کافی اونچائی پر ہے۔ اس لیے اس کے لیے وہاں سے چھلانگ لگانا ممکن نہیں۔ ناکس، مارگریٹ کی میز کے سامنے کچھ الوداعی کلمات کہتا ہوا گزرا۔ اس نے ایک کرسی کے ذریعے کھڑکی کا شیشہ توڑا اور چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہو گیا۔"

"پھر اس نے چھلانگ کیوں نہیں لگائی؟"

"کیونکہ اس نے مارگریٹ کی آواز سن لی تھی جو اس کا نام لے کر چلا رہی تھی۔ بلی کام کا نام سنتے ہی اس کے ذہن میں اچانک ہی ایک بات آئی۔ وہ واپس پلٹا اور دروازے کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہی ہم لوگ کمرے میں داخل ہوئے، وہ چپکے سے باہر نکل گیا اور دلیز پر کھڑا ہو کر ہمیں دیکھنے لگا۔ میں نے اس جانب بالکل دھیان نہیں دیا کیونکہ میں تو بلی کام کو تلاش کر رہا تھا البتہ مارگریٹ اسے زندہ دیکھ کر بے ہوش ہو گئی۔"

"لیکن وہ تو کہہ رہی تھی کہ اس نے بلی کام کو دفتر میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔"

"اس وقت تک اس نے بلی کام کا نام نہیں لیا تھا۔ یاد کرو جب وہ بے ہوش ہوئی اور ناکس اسے اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اس نے تنہائی میں مارگریٹ کو اپنا منصوبہ سمجھایا اور کہا کہ اس کی رقم اسی صورت محفوظ رہ سکتی ہے جب چند گھنٹوں کے لیے ہی سہی، لوگ بلی کام کو مردہ سمجھ لیں۔ مارگریٹ اس کی باتوں میں آگئی کیونکہ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ اس نے بھی ہمارے خیال کی تصدیق کر دی کہ چھلانگ لگانے والا شخص بلی کام تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چند گھنٹوں بعد اسے قتل کر دیا جائے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس کی خودکشی کی خبر پھیلتے ہی حصص کے دام گر گئے تھے۔" سام ہملٹن نے کہا۔

"لیکن اس حد تک نہیں جتنا وہ چاہتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بلی کام کے آنے کے بعد حصص کی قیمتیں پھر چڑھ جائیں گی اور وہ تباہ ہو جائے گا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے پہلے سے بلی کام کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا لیکن بعد میں اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ ہم سب لوگ لنچ کے لیے چلے گئے لیکن وہ دفتر میں ہی بیٹھا بلی کام کا انتظار کرتا رہا کیونکہ جانتا تھا کہ وہ پہنچنے ہی والا ہے۔ جیسے ہی وہ پرائیویٹ لفٹ سے برآمد ہوا۔ ناکس اسے دھکیلتا ہوا ٹوٹی ہوئی کھڑکی تک لے گیا اور اسے اٹھا کر باہر پھینک دیا پھر وہاں اس نے کارڈ بورڈ لگوا دیا۔"

"بلی کام کی موت کے بعد حصص کی قیمت مزید گر گئی۔" ہملٹن نے کہا۔

"لیکن مارگریٹ اسے بلی کہہ کر کیوں پکار رہی تھی؟" شرے نے پوچھا۔

"اس کا پورا نام ولیم ٹی ناکس ہے۔ شاید وہ اسے پیار سے دل کہتی ہو اور تنہائی میں اسے بلی کہنا شروع کر دیا ہو کیونکہ وہ بھی اپنے محبوب کو بلی کام کی جگہ دیکھنا چاہتی تھی۔"

"اب مارگریٹ کہاں ہے؟" کسی نے پوچھا۔

"پولیس ابھی تک اس سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ میں اسی کے پاس جا رہا ہوں۔ اس وقت اسے ہماری مدد کی ضرورت ہے۔"

وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ ہملٹن بول پڑا۔ "کیا وجہ تھی کہ بلی کام دس بجے کی میٹنگ میں شرکت کے لیے نہیں آسکا۔ وہ اس دوران کہاں غائب رہا اور ناکس کو اس کے آنے کا کیسے پتا چلا؟"

"کیونکہ بلی کام نے اسے فون کیا تھا۔"

"فون کیا تھا؟ کہاں سے؟" ہملٹن نے پوچھا۔

میک نے کھڑکی کی جانب دیکھا جہاں سے آسمان بالکل صاف نظر آرہا تھا اور بولا۔ "اس نے اپنے ذاتی جہاز سے فون کیا تھا کہ وہ گزشتہ تین گھنٹے سے شہر کے گرد چکر لگا رہا تھا لیکن گہری دھند کی وجہ سے اس کا جہاز لینڈ نہ کر سکا۔"

اس کے بعد وہ تیزی سے اٹھا اور مارگریٹ سے ملنے چل دیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ بھی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ کمپنی کی ملازمت چھوڑ رہا ہے۔ کیا وہ اپنے کہنے کے مطابق اس کا ساتھ دے گی۔

چال باز

سیرینا راز

وہ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے مگر دوستی ان میں قدرِ مشترک تھی۔ ایک کا کام جرم کی آبیاری تو دوسرا اس کی بیخ کنی پر مامور تھا... دونوں اپنی اپنی جگہ راسخ العقیدہ تھے۔ اچانک وقت نے کروٹ لی اور انہیں ایک دوراہے پر لا کھڑا کر دیا۔

ایک فرض شناس پولیس افسر کا قصہ جو اپنے دوست کو جرم کی دلدل سے نکالنا چاہتا تھا

صبح کے ساڑھے چھ بج رہے تھے جب لیو پیلسن کی ڈور بیل بجی۔ اس نے بوجھل آنکھوں کے ساتھ دروازہ کھولا۔ اس کے پپوٹے سوجے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ ڈور بیل بجنے سے بے وقت آنکھ کھلنے کے باعث اس کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں صاف نظر آرہی تھیں۔ وہ خاصا دولت مند شخص تھا۔ اس وقت بھی اس نے نہایت مہنگا گاؤن پہن رکھا تھا۔ وہ اس لیے بھی بیزار نظر آرہا تھا کہ اس کے سونے کے معمولات دوسرے لوگوں سے قطعی مختلف تھے۔ وہ تقریباً رات بھر جاگتا رہتا اور صبح کے چار، ساڑھے چار بجے سونے کے لیے لیٹتا تھا۔ اس لیے اتنی صبح جب ڈور بیل کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تو اسے بہت غصہ آیا۔ اسے سوئے ہوئے ابھی گھنٹا بھر ہی ہوا تھا۔ لیو نے دروازہ کھولا تو سامنے اس کے

digestpk.blogspot.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لڑکپن کا دوست کھڑا ہوا تھا۔ لیو کو اس کی موجودگی کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ یہ ڈینی میلے تھا۔ برسوں پہلے جب وہ لڑکپن کے دور سے گزر رہے تھے، اُس وقت شکاگو میں بدمعاشی، لوٹ مار اور غنڈا گردی میں ڈینی، لیو کا ساتھی تھا۔

اُن دنوں لیو نوعمر غنڈوں پر مشتمل ایک گروہ چلاتا تھا۔ یہ ویسٹ اینڈ کے علاقے میں وارداتیں کرتے تھے۔ انہوں نے یہاں کے دور ہاٹی اور تجارتی بلاک کو اپنی وارداتوں کے لیے منتخب کر رکھا تھا اور پرانے زمانے کے بدمعاشوں کی طرح وہاں چھوٹی موٹی وارداتیں کرکے گزر بسر کرتے تھے۔ لیو کے اس گروہ کا نعرہ تھا۔ "تیز رفتاری سے جیو، جلدی مرو اور سپاہی کی طرح چاق و چوبند نظر آؤ۔"

یہ پانچ لڑکوں کا گروہ تھا جس کی سربراہی لیو کرتا تھا۔ ان میں سے دو لڑکے ایک قرض دینے والی کمپنی کے دفتر میں ڈکیتی کرتے ہوئے گولیوں کا نشانہ بنے۔ تیسرے کو ایک تیرہ سالہ ہسپانوی لڑکی کے بھائی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس نے لڑکی کے ساتھ زبردستی کی تھی۔ بدلے میں اُسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

پانچ بدمعاشوں پر مشتمل اس گروہ کے تین لڑکے مارے گئے، باقی دو اِدھر اُدھر ہو گئے۔ ان میں ایک ڈینی اور دوسرا لیو تھا۔ بعد میں لیو نے شکاگو میں کپڑوں کے ایک بڑے اسٹور میں...... ملازمت کر لی۔ یہ اسٹور شکاگو کی ایک بہت بڑی اور منظم جرائم پیشہ فیملی کی ملکیت تھا۔ یہاں شروع شروع میں تو اس نے دیانت داری سے کام کیا مگر جب وہ سارے رنگ ڈھنگ بھانپ گیا تو اس نے پر پرزے نکالنا شروع کیے۔ جرم کا چسکا تو تھا۔ جلد ہی اس نے دھونس دھمکی، مار پیٹ اور گولی سے بھی کام لینا شروع کر دیا۔ اس کے بعد وہ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اپنی ان مجرمانہ صلاحیتوں کے باعث اس نے بہت جلد جرم کی دنیا میں اپنی پہچان بنا لی تھی۔

دوسری جانب گروہ ٹوٹ جانے کے بعد ڈینی بہت پریشان تھا۔ کچھ عرصہ اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد وہ نیوی میں بھرتی ہو گیا۔ بہادر تو وہ تھا ہی۔ اسی اوصاف کی بنا پر اس نے نیوی میں کئی بار بہادری کے جوہر دکھائے جس کے نتیجے میں اسے دو تمغے بھی ملے۔ چار سال کے بعد ڈینی کا دل نیوی کی ملازمت سے بھر گیا۔ اس نے رضاکارانہ ریٹائرمنٹ لی اور واپس شکاگو چلا آیا۔ یہاں اسے پولیس میں بھرتی ہونے کا موقع ملا۔ پولیس کی ملازمت میں بھی اس نے بہادری کے جوہر دکھائے۔ اس نے کئی جرائم پیشہ گروہوں کا خاتمہ کیا۔ منشیات کے خلاف مہم میں اس نے نہایت جی داری سے حصہ لیا اور اپنی انہی صلاحیتوں کی بنا پر جونیئر افسر سے ترقی کرتے کرتے لیفٹیننٹ ہو گیا۔

شکاگو میں رہنے کی وجہ سے لیو اور ڈینی مہینے میں کم از کم ایک بار ضرور ملتے تھے۔ لیو بدستور جرائم کی دنیا سے تعلق رکھتا تھا لیکن اب وہ باعزت بدمعاش تھا۔ بظاہر وہ کاروباری شخص تھا لیکن اس کی آڑ میں جرم کے دھندے جاری تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب اس کا شمار شکاگو کے معززین میں ہونے لگا تھا۔ اس کی وجہ مافیا سے اس کا تعلق تھا۔ وہ دونوں مہینے میں کم سے کم دو تین بار ضرور ملتے تھے۔ کبھی کبھار کسی اچھے سے ریستوران میں بیٹھ کر لنچ یا ڈنر کر لیتے تھے، لیکن اُس دن جب لیو نے دروازہ کھولنے پر ڈینی میلے کو اپنے سامنے پایا تو وہ گھبرا گیا۔ اس وقت اس کی آمد ہرگز بے وجہ نہیں ہو سکتی۔ لیو کے مجرمانہ ذہن نے فوراً سوچا۔ وہ کم از کم ڈیڑھ دو ماہ بعد آج پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"خیریت...... کیا ہوا؟ تم اس وقت یہاں...؟" لیو نے تشویش سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اس کا مجرمانہ ذہن تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ڈینی کی اس بے وقت آمد کا مطلب ہے کہ کچھ گڑبڑ ہو چکی ہے اور اس کا تعلق بہرصورت مجھ سے ہی ہے۔

"کیتھی..." ڈینی نے کہنا شروع کیا۔ "وہ اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے۔"

"کیا...؟" لیو نے حیرت سے کہا۔ یہ سنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ کچھ دیر پہلے ہی اسے پانچ دیگر ساتھیوں کے ساتھ پولیس نے تحویل میں لیا ہے۔"

"کیا الزام ہے اس پر؟"

"نشے کی حالت میں گاڑی چلانے، حادثے اور منشیات رکھنے کا الزام ہے مگر ابھی کچھ کہنا فضول ہے۔ اسے تھوڑی ہی دیر پہلے گرفتار کیا گیا ہے۔ اتنی جلد تفصیلی رپورٹ تیار نہیں ہو سکتی۔ جب تک رپورٹ نہ ملے، تب تک کچھ نہیں کہا جا سکتا، ماسوائے اس کی گرفتاری کے۔" وہ پُرسکون لہجے میں اسے بیٹی کی گرفتاری سے متعلق بتا رہا تھا۔

"جینی... جینی!" اچانک لیو نے اپنی بیوی کو پکارا۔

"کیا ہوا؟" کچھ دیر بعد جینی آنکھیں ملتی ہوئی آئی اور دروازے پر ڈینی کو دیکھ کر پریشانی کے عالم میں شوہر کی طرف تکنے لگی۔ ڈینی اس وقت پولیس کی وردی میں تھا۔ جینی اسے پہچانتی بھی تھی۔ اتنی صبح اسے اپنے دروازے پر دیکھ کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ پریشان ہو گئی تھی۔

"ذرا جلدی سے جا کر دیکھو، کیتھی اپنے بستر پر ہے؟" لیو نے کہا۔ یہ سنتے ہی وہ الٹے قدموں واپس چلی گئی۔

کیتھی کا پورا نام کیتھرین ایلن تھا۔ یہ لیو کی بڑی بیٹی تھی۔ پچھلے ہفتے ہی اس نے اپنی اٹھارویں سالگرہ منائی تھی۔ اس کی چھوٹی بیٹی باربرا ابھی پندرہ سال کی تھی۔

"نہیں... کیتھی کا بستر خالی پڑا ہوا ہے۔" کچھ دیر بعد جینی نے آکر بتایا تو لیو کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ جینی کے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔

"ڈینی پلیز! کسی طرح اسے پولیس کی تحویل سے نکالو ورنہ میری بڑی بدنامی ہوگی۔ پلیز...... کچھ کرو۔"

"فی الوقت تو کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ میں ہیڈ کوارٹر جا رہا ہوں۔ جیسے ہی کچھ پتا چلتا ہے تو تمہیں بتاتا ہوں۔ ویسے بے فکر رہو۔ وہ میرے لیے بھی بیٹیوں کی طرح ہے۔ جو کچھ کر سکا، تمہارے کہے بنا کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

ڈیڑھ گھنٹے بعد ڈینی پولیس ہیڈ کوارٹر میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت وہ شکاگو میں ایف بی آئی کے اسپیشل ایجنٹ سر فریڈ سے فون پر بات کر رہا تھا۔ "تم نے اسے کیسا پایا؟" فریڈ نے سوال کیا۔

"بیٹی کی گرفتاری کا سن کر وہ پریشان تو ہو گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ چین سے نہیں بیٹھا ہوگا۔ اس وقت بھی وہ فون پر وکیل سے ہی بات کر رہا ہوگا تاکہ وہ ضمانت کا انتظام کر سکے۔" ڈینی نے جواب دیا۔

"اور اس کی بیوی؟" فریڈ نے پھر سوال کیا۔

"جب اسے پتا چلا کہ اس کی بیٹی پولیس کی تحویل میں ہے اور اس پر کچھ الزامات لگائے گئے ہیں تو اس بے چاری کے اوسان ہی خطا ہو گئے تھے۔"

"لیو کو کیا بتایا کہ تم اس کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہو؟" فریڈ نے ایک بار پھر سوال کیا۔

"سر لیو سے کہہ آیا تھا کہ ابھی صورتِ حال کا جائزہ لے رہا ہوں، اس کے بعد ہی کچھ بتا سکوں گا۔" ڈینی نے کہنا شروع کیا۔ "فی الحال میں نے کیتھی کو دیگر ملزموں سے علیحدہ کرکے رکھنے کا کہہ دیا ہے۔ خیر... ساری صورتِ حال واضح ہو جانے کے بعد ہی میں لیو سے رابطہ کروں گا۔" ڈینی نے فریڈ کو تفصیل سے آگاہ کیا۔ "ویسے بھی ابھی اتنی جلدی اس سے ایک بار پھر رابطہ کرنا مناسب نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم آج لنچ پر ملتے ہیں۔ وہیں دیکھتے ہیں کہ اب آگے کیا کچھ کرنا ہے۔"

"اوکے۔" ڈینی نے جواب دیا اور فون رکھ دیا۔

دوسری طرف ڈینی کے جانے کے بعد سے لیو بدستور پریشان تھا۔ وہ بار بار اپنے وکیل مچل برٹین کا فون ملا رہا تھا لیکن دوسری طرف سے کوئی فون ہی نہیں اٹھا رہا تھا۔ آخر کافی دیر بعد برٹین نے فون اٹھایا اور نیند بھرے لہجے میں "ہیلو" کہا تو وہ وکیل پر برس پڑا۔

"کیا ہوا ہے؟" برٹین بھی اس کی غصیلی آواز سے خوف زدہ ہو گیا۔ جواب میں لیو نے اسے اپنی بیٹی کے حوالے سے پیش آنے والا سارا ماجرا تفصیل سے سنا دیا۔

"پولیس کے الزامات کی کاپی ہے تمہارے پاس؟ مجھے وہ چاہیے۔" پوری بات سننے کے بعد برٹین نے سوال کیا۔

"میرے پاس نہیں ہے اور نہ ہی میں کاپی تمہیں لے کر دوں گا۔ تم خود یہ پولیس سے لو۔" لیو نے چلّاتے ہوئے کہا۔ "مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم کتنی دیر میں اسے حوالات سے باہر نکال سکتے ہو؟ مجھے اپنی بیٹی جلد از جلد وہاں سے باہر اور اپنے گھر کے اندر چاہیے...... سمجھے؟"

"اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں ہر بات سے لاعلم ہوں۔ مجھے معلوم ہی نہیں کہ اس پر کیا کیا الزامات لگائے گئے ہیں۔ میں کیسے ہامی بھر لوں کہ ضمانت ہو جائے گی؟" وکیل نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے تھوڑا وقت دو تاکہ میں دیکھوں کہ معاملہ کیا ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔" وکیل کی بات سن کر وہ اور غصے میں آگیا۔ "میں دوپہر تک اپنی بیٹی کو ہر حالت میں باہر دیکھنا چاہتا ہوں۔" لیو نے حکم دیا اور فون پٹخ دیا۔

اس کے بعد اس نے اپنے دفتر کے منیجر ہیری لیوائز کو فون کیا۔ یہ شخص صبح ہی صبح دفتر پہنچ جاتا تھا۔ لیو نے اس کو کیتھی کی ضمانت کے لیے ضروری دستاویزات کی تیاری کے لیے فون کیا تھا۔ ہیری اس طرح کے معاملات میں بہت ہوشیار تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ کسی بھی طرح دوپہر تک اس کی ضمانت ہو جائے۔ تم ضروری دستاویزات تیار کر لو۔"

"بے فکر رہیں۔ سب ہو جائے گا لیکن اگر یہ پتا چل جائے کہ الزامات کی نوعیت کیا ہے تو مجھے ذرا آسانی ہو جائے گی۔" ہیری نے لیو کی بات سن کر ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"فی الوقت تو میں تمہیں تفصیل سے کچھ نہیں بتا سکتا کیونکہ اس بارے میں مجھے خود کچھ زیادہ علم نہیں ہے۔ ابھی

تحقیقات ہو رہی ہیں۔ پولیس کو جیسے ہی مزید تفصیلات ملتی ہیں، وہ مجھے بتا دیں گے۔"

"پولیس آپ کو اپنی تفتیش کے بارے میں کیوں بتائے گی؟ کیا وہ آپ کا تنخواہ دار آدمی ہے؟" لیو کے آخری جملے پر ہیری چونکا اور پھر سنبھل کر کہنے لگا۔

"نہیں نہیں... وہ میرا ایک پرانا دوست ہے۔ خوش قسمتی سے اس وقت وہ ہیڈ کوارٹرز میں تعینات ہے۔ اسی نے مجھے اس گرفتاری کے حوالے سے خبر دی ہے۔" لیو نے بتانا شروع کیا۔ "وہ تفتیش میں تو شامل نہیں لیکن پرانی دوستی کی بنا پر وہ میری مدد کر رہا ہے مگر وہ ہے بالکل کھرا بندہ۔ مدد بھی کرے گا تو صرف جائز حد تک۔" لیو نے اس کی تشویش کو بھانپ لیا تھا، اسی لیے مطمئن کرنے کے لیے کہا۔

لیو کی کمپنی بظاہر تو قانونی کاروبار کرتی تھی لیکن درپردہ ان کی سرگرمیاں غیر قانونی تھیں۔ انہوں نے پولیس کے کئی بدعنوان افسران کو بھی اپنے ساتھ ملایا ہوا تھا اور غیر قانونی کاموں میں مدد دینے پر انہیں باقاعدہ ماہانہ بنیادوں پر پرکشش رقم ادا کی جاتی تھی۔ لیو کی آنکھیں اب بھی بوجھل تھیں۔ اوپر سے وہ صبح ہی صبح جس مصیبت میں پڑ گیا تھا، اس سے اس کا پارا اور چڑھا ہوا تھا۔ اب جو ہیری نے اشارہ دیا تو اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے فون بند کرنے کے فوراً بعد اپنی ٹیلی فون ڈائریکٹری نکالی اور ایک پولیس کیپٹن کا نمبر ملانے لگا۔ یہ افسر اس کی کمپنی سے خفیہ طور پر رقم وصول کیا کرتا تھا۔ بددیانت آدمی تھا، اس لیے لیو کو اس کام میں اس سے مدد لینے کا خیال آیا۔

"ہاں... لیو بول رہا ہوں۔"

"کیا حال ہیں؟" کیپٹن جان نفت نے جواب دیا۔

"سب ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر لیو اسے تفصیل بتانے لگا۔

"ہاں ہاں... میں سمجھ گیا۔ یہ آپ کی بڑی بیٹی کیتھرین ہے۔ کتنی بڑی ہے وہ؟" جان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"سترہ سال..." لیو نے کہا اور ایک دم گڑبڑا گیا۔ "پچھلے ہفتے اس نے اپنی سالگرہ منائی ہے۔ اب وہ اٹھارویں سال میں ہے۔" اس نے اپنی بات مکمل کی۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ قانونی طور پر وہ بالغ ہے۔" کیپٹن جان نے دل میں سوچا۔ "ٹھیک ہے۔ میں تھوڑی دیر میں آپ کو فون کر کے ساری حقیقت بتاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گا۔"

یہ کہہ کر کیپٹن جان نے فون بند کر دیا۔ لیو اب کچھ پرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس وقت وہ لیونگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ جینی کچن میں کافی بنا رہی تھی۔ وہ بھی اس واقعے سے بہت پریشان تھی۔ تقریباً بیس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی۔

"ہیلو۔" لیو نے لپک کر فون اٹھایا اور بے تابی سے کہا۔

"جان بول رہا ہوں۔"

"کیا خبر ہے؟"

"بڑی مشکل ہو گئی ہے۔ اس کے پاس سے بڑی مقدار میں نشہ آور اشیا ملی ہیں۔ اوپر سے وہ اٹھارویں سال میں ہے اس لیے اسے بالغوں میں شمار کیا جا رہا ہے۔ اس پر سب سے زیادہ سنگین الزام منشیات کا ہے۔"

"تم کیا کر سکتے ہو؟"

"اس معاملے میں، میں بالکل بے بس ہوں۔ منشیات کی وجہ سے فیڈرل ڈرگس ایجنسی ملوث ہو سکتی ہے۔ یہاں میرے پاس کوئی اختیار نہیں کہ کچھ مدد کر سکوں۔" جان کے لہجے سے شرمندگی صاف جھلک رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" لیو نے مختصر سا جواب دے کر فون پٹخ دیا۔ اسے اب صرف ڈیفی سے ہی مدد کی امید تھی۔

☆☆☆

ڈیفی نے ایک بار پھر کمپیوٹر پر نظر دوڑائی۔ وہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ کیتھی کی گرفتاری کے حوالے سے کوئی نئی اطلاع موصول ہوئی ہے لیکن وہاں کوئی نئی بات موجود نہیں تھی۔ ویسے بھی یہ صبح کا وقت تھا۔ ہیڈ کوارٹرز کو اپنے تمام پیچیدہ پولیس ڈسٹرکٹ سے اطلاعات خاصی دیر سے ملنا شروع ہوتی تھیں۔ ڈیفی نے گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہائے گریسی۔" وہ اپنے کمرے سے نکل کر کمپیوٹر پروسیسنگ روم میں پہنچا۔ وہ اس وقت سر جھکائے اپنے کمپیوٹر پر مصروف تھی۔ گریسی چالیس برس کی دلکش خاتون تھی۔ اس کا چہرہ میک اپ سے عاری رہتا تھا۔ شاید اسے بھی دوسروں کی طرح یہ احساس تھا کہ اس کی دلکشی کو میک اپ کی ضرورت نہیں۔

"ہائے ڈیفی۔" گریسی نے بدستور کمپیوٹر مانیٹر پر نظریں گڑائے ہوئے جواب دیا۔ اس کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر چل رہی تھیں۔

"اب تک شادی شدہ ہو یا..." ڈیفی نے مسکرا کر کہا اور کرسی گھسیٹ کر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"ہاں ہوں تو سہی مگر جلد ہی طلاق ہونے والی ہے، اس تیسرے سے۔" گریسی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی نظریں مانیٹر پر جمی ہوئی تھیں۔

"نمبر چار کے متعلق کیا خیال ہے؟" ڈیفی نے مسکرا کر کہا۔ گریسی کے بارے میں مشہور تھا کہ اسے شادیاں کرنے کا شوق نہیں بلکہ جنون ہے۔ اسی لیے ڈیفی نے مسکرا کر یہ بات کہی تھی۔ ویسے وہ گریسی سے خاصا بے تکلف تھا۔

"صرف چار نمبر ہی کیوں؟ اس سے آگے بھی نمبر ہوتے ہیں۔" یہ سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "ویسے ابھی نمبر چار کے متعلق کچھ سوچا نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ تم ہی ہو۔ ویسے تم بھی تو سدا بہار غیر شادی شدہ ہو تو پھر تمہارے اوپر نمبر چار کا لیبل کیوں نہ لگایا جائے۔" گریسی خاصی ہنس مکھ عورت تھی۔ اس نے بھی شوخ نگاہوں سے ڈیفی کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ کچھ گڑبڑا گیا۔

"آئیڈیا برا نہیں۔" ڈیفی نے ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے کہا۔ "چلو جب نمبر تین سے فارغ ہو جاؤ تو بتانا۔ اس وقت تو میں ایک کام سے تمہارے پاس آیا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے گریسی کے پاس رکھا ہوا رائٹنگ پیڈ اٹھایا۔ اس پر کیتھی کا مکمل نام اور ولدیت لکھ کر اس کی طرف کھسکا دیا۔ "مجھے اس کے بارے میں وہ تمام تر معلومات چاہئیں جو پولیس ریکارڈ میں موجود ہیں۔"

"اوکے... کیا کوئی خاص کیس ہے؟" گریسی نے مانیٹر پر سے نظریں اٹھائیں اور رائٹنگ پیڈ کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ہاں۔" ڈیفی نے مختصر سا جواب دیا۔ اتنی دیر میں گریسی وہ نام کمپیوٹر میں فیڈ کرنے لگی۔

"بہت تھوڑی سی معلومات ہیں۔" چند لمحوں کے بعد گریسی نے نگاہیں اٹھا کر ڈیفی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "یہ چند سطروں پر مشتمل ہی معلومات ملی ہیں۔" اس دوران میں گریسی نے پرنٹ نکال لیا تھا۔ ڈیفی نے پرنٹ لے کر دیکھنا شروع کیا۔ یہ وہی معلومات تھیں جو آج علی الصباح اس نے پولیس ریکارڈ میں دیکھی تھیں۔

"خدا کا شکر ہے کیتھی کے خلاف پولیس میں مزید کچھ ریکارڈ موجود نہیں۔" ڈیفی نے دل ہی دل میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے کیتھی کے متعلق پولیس ریکارڈ میں جو کچھ موجود ہے، یہ وہی ہے جو اس کے ڈویژن نے فیڈ کیا ہے۔" یہ سوچ کر اس نے سکون کی سانس لی۔

"شکریہ گریسی۔"

"کوئی بات نہیں۔"

"ملتے ہیں اس ایک ایگزیکٹو پر۔"

"یقیناً..." گریسی نے مسکرا کر کہا اور ایک بار پھر اپنے

ماہنامہ سرگزشت

شمارہ جولائی 2011ء کی جھلک

فخرِ اندلس
اسلامی دنیا کی ایک قابلِ فخر و قابلِ تقلید شخصیت کا زندگی نامہ

اٹک ریلوئے برج
اپنا وطن لازوال اس کا ہر گوشہ
بے مثال معلومات بھری تحریر

جل پری
سمندر کی انسان نما مخلوق کی روداد

میں کون ہوں
ایک دل دکھا دینے والی سچ بیانی

اور اس کے علاوہ
بھی بہت ساری سچ بیانیاں،
سچے واقعات اور دلچسپ تحریریں
وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں
بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں،
آپ یقیناً گرویدہ ہو جائیں گے۔

خاص شمارہ... ہر شمارہ، خاص شمارہ... ہر شمارہ، خاص شمارہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کام میں منہمک ہوگئی۔ ڈینی وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ وہ کیتی کیس کے حوالے سے ہی سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد دو پولیس سراغ رساں ڈینی کے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ دونوں کیتی کیس کی تفتیش پر مامور کیے گئے تھے۔ ڈینی کو ان دونوں کی واپسی کا انتظار تھا۔

”ابتدائی تفتیش مکمل ہوگئی ہے۔“ سراغ رساں آئیوری نے ڈینی کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی نوٹ بک کھولی اور ساری کہانی بیان کرنے لگا۔ ”ویگن میں کل چھ افراد سوار تھے۔ تین لڑکے اور تین لڑکیاں۔ عینی شاہدین کے مطابق ویگن تیز رفتاری سے لہراتے ہوئے جارہی تھی کہ اچانک ان کے دیکھتے ہی دیکھتے مشی گن ایونیو پر چھ سو بلاک کے سامنے الٹ گئی۔ ویگن کو کیتھرین ایلین جیلسن نامی لڑکی چلا رہی تھی۔ یہ ویگن جینی جیلسن کے نام پر رجسٹرڈ ہے۔ گاڑی میں موجود تمام لوگ ٹین ایجر ہیں اور حادثے کے وقت سب کے سب نشے میں تھے۔ گاڑی کی درمیانی سیٹ سے ایک لکڑی کا ڈبا بھی ملا ہے جس میں کئی درجن نشہ آور گولیاں ہیں۔ ساتھ ہی بیئر وغیرہ کی بھی کچھ خالی اور کچھ بھری ہوئی بوتلیں گاڑی میں موجود تھیں۔ گاڑی میں موجود چھ کے چھ افراد حراست میں ہیں۔ زخمیوں میں سے ایک لڑکی کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ حادثے کے فوراً بعد بے ہوش ہوگئی تھی اور اب تک بے ہوش ہی ہے۔ اسے ایمبولینس کے ذریعے اسپتال بھیج دیا گیا ہے۔ اس کا نام اینی ہے۔ عمر سترہ سال [illegible]“ آئیوری نے بتا کر ساری تفصیل ڈینی کے گوش گزار کی اور گہری سانس لے کر کہنے لگا۔ ”میں ابھی جا کر یہ ساری تفصیلات ٹائپ کر کے آن لائن کر دیتا ہوں۔“

”بہت خوب!“ ڈینی نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ رپورٹ جلد چاہیے۔“

”بہت بہتر۔“ آئیوری نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ہاں سنو۔“ ڈینی نے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ویسے زخمی لڑکی کو کس اسپتال میں بھجوایا ہے؟“

”کین سٹری اسپتال کی ایمرجنسی میں ہے وہ۔“

”اور باقی لوگ؟“ ڈینی نے استفسار کیا۔

”باقی جیل بھیج دیے گئے ہیں ماسوائے کیتی کے۔ وہ اٹھارہ برس کی ہے۔ اسے بالغوں والے حوالات میں رکھا گیا ہے یہیں سینٹر پر مگر علیحدہ کمرے میں ہے وہ۔“

”گولیاں؟“

”ریکارڈ میں اندراج کرنے کے بعد اسے سراغ رساں اسمتھ کے حوالے کر دیا گیا ہے۔“ آئیوری نے کھڑے کھڑے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔ کوئی نئی اطلاع ملے تو مجھے بتانا۔“ ڈینی نے دونوں افسروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تم جا سکتے ہو۔“ ان دونوں کے جانے کے بعد ڈینی، لیو جیلسن کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔

”کیتی کیس کی ابتدائی رپورٹ مل گئی ہے۔ اس کی ویگن الٹ گئی تھی تاہم وہ خود خیریت سے ہے اور اس کے دوسرے دوست بھی۔“ ڈینی نے اسے بتانا شروع کیا۔ ”ویگن سے بڑی تعداد میں ایسی گولیاں ملی ہیں جن کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ نشہ آور ہیں۔ کیا کیتی نشہ آور دوائیں استعمال کرتی ہے؟“

”بالکل نہیں۔“ لیو نے فوراً جواب دیا۔ ”ویسے وہ کس قسم کی نشہ آور دوا ہے؟“

”مجھے جو رپورٹ ملی ہے، اس کے مطابق دیکھنے میں تو وہ عام سی گولیاں اور کیپسول ہیں لیکن اس وجہ سے شبہ کیا جا رہا ہے کہ ان پر کوئی عبارت درج نہیں۔“ ڈینی نے کہا۔ ”ویسے بھی جتنی بڑی مقدار میں وہ گولیاں ویگن میں موجود تھیں، انہیں دیکھ کر نہیں لگتا کہ ان لوگوں نے ڈاکٹر کے نسخے پر انہیں کسی میڈیکل اسٹور سے خریدا ہوگا۔ اتنی بڑی مقدار میں دوا ڈاکٹری نسخے پر نہیں مل سکتی۔ بس اسی وجہ سے شک ہو رہا ہے کہ وہ نشہ آور ہیں جسے کسی منشیات فروش سے خریدا گیا ہوگا۔“

”تم جانتے ہو کیتی اس وقت کہاں ہے؟“ لیو نے سوال کیا۔

”ابھی تو پولیس سینٹر کے حوالات میں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ کچھ ہی دیر میں اسے کرمنل کورٹ منتقل کر دیا جائے گا۔“ ڈینی نے جواب دیا۔ ”ویسے تم فکر نہ کرو۔ میں اس کیس پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ یہ بتاؤ تم اینی کو جانتے ہو؟“

”ہاں۔“ لیو نے فوراً جواب دیا۔ ”وہ کیتی کی دوست ہے۔ کیا ہوا اسے... وہ بھی اس کے ساتھ تھی کیا؟“

”بالکل ٹھیک کہا۔ وہ بھی ویگن میں موجود تھی۔“ ڈینی نے کہنا شروع کیا۔ ”حادثے کے فوراً بعد وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ پولیس نے اسے اسپتال بھجوا دیا ہے۔ ابھی تک اطلاعات مجھے ملی ہیں، ان کے مطابق وہ بدستور بے ہوش ہے۔ ڈاکٹرز اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”ڈاکٹرز کیا کہہ رہے ہیں؟“ لیو نے بے چینی سے سوال کیا۔

”وہ کہتے ہیں کہ جب تک اسے ہوش نہیں آجاتا، تب تک وہ بدستور خطرے میں ہے۔ اسے دماغ پر چوٹ آئی ہے۔“

”کس اسپتال میں ہے وہ؟“ لیو نے پوچھا۔

”یہ مجھے پتا نہیں۔“ ڈینی نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا۔ ”میں ابھی کنٹرول روم گیا تھا، وہاں یہ بات سنی ہے۔ ویسے تمہارے لیے ایک مشورہ ہے۔“

”وہ کیا؟“ لیو نے فوراً پوچھا۔

”تم یا جینی کسی بھی صورت میں اینی کے والدین سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کرنا... سمجھے؟“

”ٹھیک ہے مگر یہ بتاؤ کہ کیتی کو تو ابھی کسی نے نہیں پہچانا کہ وہ کس کی بیٹی ہے؟“ شکاگو میں لیو کا شمار اہم اور معروف شخصیات میں ہوتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر کیتی کو کسی نے پہچان لیا تو پھر اخبارات اور ٹی وی میں اس کے خلاف اسکینڈل بن جائے گا۔ وہ کسی بھی صورت میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی کیتی کو اس کی بیٹی کی حیثیت سے پہچانے۔ اسی لیے اس نے ڈینی سے یہ سوال کیا۔

”ابھی تک تو اسے کسی نے نہیں پہچانا تاہم معاملہ کورٹ میں جائے گا۔ ویسے بھی اسے ریمانڈ کے لیے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا، تب ہو سکتا ہے کہ کوئی...“ اس نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ڈینی... پلیز کوشش کرو کہ کوئی اسے میری بیٹی کی حیثیت سے نہ پہچانے۔ ورنہ میری بڑی بدنامی ہوگی۔“ لیو نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

”میں تو اپنی پوری کوشش کر رہا ہوں کہ تم پر کوئی حرف نہ آئے اور کیتی بھی بچ جائے مگر قانون بھی تو کوئی چیز ہے۔“ لیو جانتا تھا کہ ڈینی لڑکپن میں ضرور برا لڑکا تھا مگر اب وہ پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔

”ویسے اس بارے میں تم جو کچھ کر سکتے ہو وہ تو کرو۔“

”میں اپنی بھرپور کوشش کر رہا ہوں اور اس بات کے لیے تمہیں مزید کچھ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ ڈینی نے جواب دیا۔

”تمہارا شکریہ... مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ لیو اچھا آدمی نہیں تھا لیکن معاملہ بیٹی اور اس کی اپنی شہرت کا تھا۔ ڈینی اس کے لڑکپن کا دوست تھا۔ اس کی بات میں خلوص پوشیدہ تھا۔ یہ سن کر لیو کو حوصلہ ملا۔ ”تم اچھے دوست ہو۔“

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر) 0301-2454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹھیک ہے۔ کوئی نئی بات پتا چلتی ہے تو بتاتا ہوں... بائے۔" ڈینی نے فون رکھ دیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کچھ سوچنے لگا۔

☆☆☆

دوپہر کا ایک بجا تھا۔ ایف بی آئی ایجنٹ فریڈ اور ڈینی ایک ریستوران میں بیٹھے ہوئے لنچ کر رہے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں نشہ آور ادویات سے ابتدا کرنی ہوگی، اس کے بعد ہی آگے بڑھا جا سکتا ہے۔" فریڈ نے ڈینی کی بات سن کر سوچتے ہوئے کہا۔

"ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی میں کوئی تمہارا قریبی دوست ہے؟" ڈینی نے یہ سن کر پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ وہاں میرا دوست لیون ہیلٹ ہے نا۔ تم بھی تو اسے جانتے ہو۔" فریڈ نے فوراً کہا۔

"وہ ہماری مدد کرنے پر تیار ہو جائے گا؟"

"یہ تو کہنے والے پر منحصر ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ چاہے تو پچھلی تاریخوں میں کینی کی ایک فائل تیار کر سکتا ہے جس میں اسے مشتبہ قرار دیا گیا ہو۔ اس طرح وہ فیڈرل اتھارٹی کے وارنٹ جاری کرو اکر ویگن سے برآمد ہونے والی منشیات اپنی تحویل میں لے سکتا ہے۔" فریڈ نے کہا۔

"ایسا ہو تو پھر معاملہ نمٹانا آسان ہو جائے گا۔" ڈینی نے اُمید بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"تم یہ بتا سکتے ہو کہ کینی کو عدالت کے سامنے کب پیش کیا جائے گا؟"

"اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"وہ اس لیے کہ جب کینی کو عدالت میں پیش کیا جائے تو وہاں پراسیکیوٹر موجود ہو جو فیڈرل وارنٹ کی وجہ سے کیس کو فیڈرل ڈپارٹمنٹ کے حوالے کرنے کی استدعا کر سکے۔"

"اوہ... ہاں۔" ڈینی نے چونکتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو مجھے علم نہیں لیکن میں پتا کر سکتا ہوں... ویسے تمہارا کیا خیال ہے، ہم ٹھیک ہی کر رہے ہیں نا؟"

"مجھے کچھ زیادہ غلط نہیں لگ رہا۔" فریڈ نے جواب دیا اور کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔ ڈینی بھی مطمئن نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

ڈینی نے ان دونوں افسران کو تلاش کر لیا تھا جنہوں نے کینی کی ویگن سے منشیات برآمد کی تھی اور وہ دونوں اس وقت ڈینی کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک رالف اور دوسرا گیرون تھا۔

"اس کیس میں تمہاری اتنی زیادہ دلچسپی کیوں ہے... اُن سے کوئی تعلق ہے تمہارا؟" ڈینی نے جب ان سے کینی کیس کے بارے میں دریافت کیا تو رالف نے بنا تمہید باندھے چھوٹتے ہی سوال کر دیا۔

"اس لیے کہ لڑکی کا باپ میرے لڑکپن کا دوست ہے۔" لیو ویلسن شکاگو کی معروف شخصیت تھا۔ یہ بات کہتے ہوئے ڈینی کو یقین تھا کہ یہ دونوں نہ صرف کینی کی شناخت جانتے ہیں بلکہ وہ اس کے باپ سے، اس کے تعلق کے بارے میں بھی جانتے ہیں... جیسے کہ محکمے کے کئی بڑے افسران بھی اس بات سے باخبر ہیں۔ "میں پرانی دوستی کی خاطر اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں لیکن ڈپارٹمنٹ کی ساکھ کو داؤ پر لگا کر نہیں۔" اس نے وضاحت کی تاکہ ان دونوں پولیس افسران کے دل میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔

"تم اس بدمعاشوں کے بدمعاش پر اتنا زیادہ بھروسا کرتے ہو کہ اس کی خاطر سب کچھ کرنے پر تیار ہو گئے ہو؟ جانتے ہو کہ وہ مافیا کا آدمی ہے؟"

"جانتا ہوں مگر اس سے پہلے وہ میرا دوست تھا اور اب بھی دوست ہے اور وہ اس کی بیٹی ہے۔ بس... اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔" ڈینی نے گیرون کا سوال سن کر پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

"تو آپ یہ سب کچھ صرف دوستی کے نام پر ہی کر رہے ہیں؟" رالف نے پھر سوال کر ڈالا۔

"صرف دوستی ہی نہیں، اس میں ڈپارٹمنٹ کا مفاد بھی پوشیدہ ہے۔"

"وہ کیسے؟" ڈینی کی بات سن کر رالف کو جھٹکا لگا۔ یہ کہتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ مافیا کے اتنے بڑے آدمی کی مدد کر کے پولیس کو کس قسم کا فائدہ مل سکتا ہے؟ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"ہم سب لیو کی حیثیت سے اچھی طرح آگاہ ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کی تنظیم کتنی مضبوط ہے۔ اس وقت شکاگو میں کئی چھوٹی بڑی جرائم پیشہ تنظیمیں ایسی ہیں کہ جو کہ ہمارے لیے دردِ سری کا سبب بن جاتی ہیں۔ لیو کی مدد سے ہم ایسی تنظیموں میں اپنے لوگ داخل کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہمیں ان پر نظر رکھنے میں مدد مل سکتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ جگ سے گلاس میں پانی انڈیلنے لگا۔ وہ ان دونوں کو سوچنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ پانی پینے کے بعد اس نے دونوں پر نظر ڈالی۔ وہ خاموش تھے۔ "میں چاہوں تو تمہارے ڈپارٹمنٹ کے اعلیٰ افسران سے بات کر سکتا ہوں لیکن اس صورت میں جو

کامیابی ملے گی، اس کا کریڈٹ تم دونوں کو نہیں، اسے جائے گا... سوچ لو اچھی طرح۔"

"لیکن ہم کیسے ایسی رپورٹ کو تبدیل کر سکتے ہیں جو پہلے ہی مکمل کر کے جمع کی جا چکی ہے؟" رالف نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"بالکل درست۔" ڈینی نے کہا۔ "تم کیسے یہ بات جان سکتے ہو کہ اب اس رپورٹ کو کون کون پڑھ چکا ہے۔ البتہ ایک بات طے ہے کہ جو کچھ تم مجھے دو گے، یہ راز صرف ہمارے ہی درمیان رہے گا۔" اس نے رالف کی ہچکچاہٹ کو محسوس کر لیا تھا اس لیے اس نے ان دونوں کی ہمت بندھانے کے لیے اپنی طرف سے بھرپور یقین دہانی کروائی۔

"ہم جو کچھ معلومات تمہیں دیں گے، اسے پڑھنے کے بعد تم اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ضائع کر دو گے؟" رالف اب ڈینی کی بات مان رہا تھا لیکن وہ مزید یقین دہانی چاہتا تھا تاکہ اس غیر قانونی حرکت کی وجہ سے اس کی نوکری پر کوئی آنچ نہ آئے۔

"مجھے منظور ہے۔"

دونوں سراغ رساں پولیس افسر ڈینی کو لے کر آڈیو ویڈیو سیکشن میں پہنچے۔ وہ حادثے کے حوالے سے تحویل میں لیے گئے ملزمان کے بیانات کی ریکارڈنگ اسے سنانا چاہتے تھے۔

"یہ سب نشہ آور دوائیں مختلف میڈیکل اسٹور سے چراتے تھے۔" گیرون نے بیانات کی ریکارڈنگ سنوانے کے بعد ڈینی سے کہا۔

"بظاہر تو یہی لگتا ہے۔" ڈینی نے کہا اور پوچھا۔ "گولیاں اور کیپسول کا کیا بنا؟"

"کچھ نمونے ٹیسٹ کے لیے لیبارٹری بھجوا دیے گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، جیسے ہی رپورٹ ملے مجھے فوراً اس کے بارے میں بتانا۔"

"ایسا ہی ہوگا لیکن ہمارا نام نہیں آنا چاہیے۔" رالف نے ایک بار پھر اس بات کی تصدیق چاہی کہ ان کا نام راز ہی میں رہے گا۔

"فکر مت کرو۔ کسی کو کانوں کان پتا نہیں چلے گا۔" ڈینی نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

☆☆☆

"ہیلو۔"

"کیا مسٹر لیو ویلسن بات کر رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔" لیو اس وقت گھر پر تھا اور نہایت بے چینی سے اس... پر غور کر رہا تھا کہ کس طرح کینی کو اس چکر سے نکالے؟ اس دوران میں فون کی گھنٹی بجی۔ یہ فون نہایت خاص کاموں کے لیے مخصوص تھا اس لیے لیو کو یقین تھا کہ کوئی بہت اہم شخص ہوگا۔ کچھ دیر بعد مافیا کا ایک اہم سربراہ لیو سے محوِ گفتگو تھا۔ کسی لحاظ سے یہ شخص لیو کا بھی باس تھا۔

"گڈ مارننگ لیو۔" یہ فرینک تھا۔ مافیا کے ان چھ بڑوں میں سے ایک جو شکاگو میں جرائم کی دنیا کے کرتا دھرتا تھے۔ "میرے علم میں آیا ہے کہ تم کسی پریشانی سے دوچار ہو گئے ہو؟"

"جی ہاں باس۔"

"کتنا سیریس معاملہ ہے؟"

"ابھی تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیا کروں ان بچوں کی ذرا سی شرارت نے معاملہ گڑبڑ کر دیا۔ اب کیس پولیس کے ہاتھ میں ہے۔ اب تک ان کی تفتیش ہو رہی ہے۔" لیو نے جواب دیا۔

"اگر معاملہ سنجیدہ نوعیت کا ہے تو ہم اپنے وکیل کو فون کر سکتے ہیں تاکہ ان کی ضمانت کا انتظام ہو سکے۔" فرینک نے پیشکش کی۔

"دو تو سب ٹھیک ہے باس مگر یہ معاملہ ابھی اتنا سنجیدہ نہیں لگ رہا کہ اتنے بڑے پیمانے پر کوششیں کی جائیں۔ ویسے میں اپنے طور پر ہاتھ پاؤں چلا رہا ہوں تاکہ یہ معاملہ بخیر نمٹ جائے۔" لیو نے مؤدبانہ لہجے میں باس کی پیشکش کا جواب دیا۔

"میری اطلاع کے مطابق کوئی پولیس والا تمہاری مدد کر رہا ہے؟"

"یہ درست ہے۔ وہ میرے لڑکپن کا دوست ہے۔ اسی ناتے وہ میری مدد کر رہا ہے۔ لیفٹیننٹ ہے وہ پولیس ڈپارٹمنٹ میں۔" لیو نے باس کو وضاحت پیش کی۔

"تمہیں اگر اس پر اعتماد ہے تو پھر ٹھیک ہے۔" فرینک نے یہ سن کر کہنا شروع کیا۔ "ویسے جس وقت بھی تمہیں ہماری مدد کی ضرورت ہو، فوراً فون کر دینا۔ جو کچھ ممکن ہوگا، وہ ہم کریں گے۔"

"ایسا ہی کروں گا۔" لیو کے اس جواب کے ساتھ ہی دوسری طرف سے لائن منقطع کر دی گئی۔

☆☆☆

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آڈیو ویڈیو سیکشن سے واپسی کے بعد ڈینی کافی دیر تک اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔ وہ بار بار کمپیوٹر پر یہی چیک کر رہا تھا کہ کینی کیس کے حوالے سے کوئی نئی معلومات تو پولیس نیٹ ورک پر نہیں آئی ہیں۔ کافی دیر تک تلاش کرنے کے باوجود اسے بار بار صرف وہی معلومات ملتی رہیں جو اس حادثے کے حوالے سے صبح ہی صبح پولیس آن لائن نیٹ ورک پر جاری کی گئی تھیں۔ ابھی تک یہ رپورٹ بھی نہیں ملی تھی کہ جو نشہ آور گولیاں ویگن سے برآمد ہوئی تھیں، ان کی نوعیت کیا ہے۔

”ہائے ایڈی۔“ کافی دیر گزرنے کے بعد ڈینی کو کچھ خیال آیا اور اس نے اپنے ایک ساتھی کو فون کیا۔

”ہائے... کہو کیسے فون کیا؟“

”کیا ہمارے ڈپارٹمنٹ کے فرانزک یونٹ کی رپورٹ آن لائن کی جاتی ہے؟“ ڈینی نے سوال کیا۔

”نہیں... فرانزک لیبارٹری رپورٹ صرف دستاویزات کی صورت میں جاری ہوتی ہیں اور انہیں متعلقہ فائل کے ساتھ منسلک کر دیا جاتا ہے۔“

”اوکے... شکریہ۔“ یہ کہہ کر ڈینی نے فون بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد ڈینی فرانزک لیبارٹری میں موجود تھا۔ اس نے ویگن سے ملنے والی نشہ آور گولیوں کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ ان کا تجزیہ ابھی جاری ہے۔ ممکن ہے کہ حتمی رپورٹ تیار ہونے میں مزید کچھ گھنٹے لگ جائیں۔ یہ سن کر وہ واپس چلا آیا۔

فرانزک لیبارٹری پولیس سینٹرل ہیڈکوارٹر سے کئی کلومیٹر کے فاصلے پر تھی اور ڈینی یہاں اپنی ذاتی کار میں آیا تھا۔ لیبارٹری سے نکل کر وہ پارکنگ میں پہنچا۔ اب وہ سینٹنری اسپتال کی طرف جا رہا تھا جہاں پولیس وارڈ کے انتہائی نگہداشت یونٹ میں بے ہوش ایمی کا علاج کیا جا رہا تھا۔

”اب مریضہ کا کیا حال ہے؟“ کچھ دیر بعد ڈینی وارڈ میں موجود نرس سے ایمی کی حالت کے بارے میں سوال کر رہا تھا۔ وہ سامنے والے بیڈ پر بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے منہ میں آکسیجن کی نلکی اور ہاتھ میں گلوکوز ڈرپ لگی ہوئی تھی۔

”جب تک اسے ہوش نہیں آجاتا، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگرچہ اس کے سر پر بند چوٹ لگی ہے تاہم ہم نے اس کے معدے کی بھی صفائی کی ہے۔ مواد کو لیبارٹری بھجوا دیا گیا ہے تاکہ پتا چل سکے کہ حادثے سے پہلے یہ کیا کچھ کھا پی چکی تھی۔“ نرس نے فائل دیکھتے ہوئے تفصیل سے بتانا شروع کیا۔ وہ ڈینی کو جانتی تھی۔ اس لیے مکمل تعاون کر رہی تھی۔

”لیبارٹری رپورٹ کب تک مل سکے گی؟“ ڈینی نے نرس سے سوال کیا۔

”ممکن ہے شام تک۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”ویسے کیا خیال ہے، اسے کب تک ہوش آسکتا ہے؟“

”شاید اگلے دو تین گھنٹے میں ہوش آجائے۔“ نرس نے کہنا شروع کیا۔ ”شبہ ہے کہ حادثے کے وقت لڑکی کسی نشہ آور شے کے زیر اثر تھی ورنہ اس کے دماغ کے جو ٹیسٹ لیے گئے ہیں، ان کی رپورٹوں کے مطابق بظاہر چوٹ اتنی سنگین نوعیت کی نہیں کہ زخمی پر طویل بے ہوشی طاری رہے۔“

”بہت بہتر۔“ یہ کہہ کر ڈینی ڈیوٹی پر موجود پولیس افسر کی طرف بڑھا۔ ”اسے جیسے ہی ہوش آجائے ڈپارٹمنٹ کو فون کر دینا تاکہ اس کا بیان لیا جا سکے۔“

”بہتر۔“ پولیس افسر نے جواب دیا تو ڈینی واپس چل دیا۔

تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا منصوبہ لگ بھگ مکمل تھا۔ بس فریڈ کو دکھا کر اس کی منظوری لینا باقی تھا۔ ویسے بھی پولیس نے زیر حراست ملزمان کو آج عدالت کے روبرو پیش کر کے ریمانڈ لینے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اس کی وجہ صرف ایمی تھی اور وہ بدستور بے ہوش تھی۔ اس کے بیان کے بغیر پولیس ملزمان کو عدالت میں پیش کرتی تو مجسٹریٹ کی جھاڑ پھٹکار سننے کو ملتی۔ ویسے بھی یہ واقعہ آج صبح ہی پیش آیا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے تک ملزمان کو اپنی تحویل میں رکھنے کے مجاز تھے۔ اس لیے ڈینی نے سکھ کا سانس لیا کہ منصوبے پر عمل کرنے کے لیے اس کے پاس کل صبح تک کا وقت ہے۔

”ہیلو...“ ڈینی نے فون ملایا۔ دوسری طرف فریڈ لائن پر تھا۔

”کیا رپورٹ ہے؟“ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

”کل صبح کینی اور اس کے ساتھیوں کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جانے والا ہے۔“

”اوہ... یہ تو اچھی خبر ہے۔“ فریڈ نے کہا۔ ”میرے پاس بھی تمہارے لیے اچھی خبر ہے، وہ یہ کہ لیون تیار ہو گیا ہے۔ اس نے پچھلی تاریخوں میں کینی کی ایک فائل تیار کر لی ہے جس کی بنیاد پر اسے کینی کو فیڈرل ڈپارٹمنٹ کی تحویل میں لینے کے لیے وارنٹ مل جائے گا۔“

”بہت خوب... اب میرا کام بہت آسان ہو سکتا ہے۔“

”ہو نہیں سکتا بلکہ ہو گیا ہے۔“ فریڈ نے اس کی بات سنتے ہی کہا۔ ”کل جب کینی کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا، تب لیون اسے وفاقی حکومت کے جرائم سے متعلق قانون کا حوالہ پیش کر کے اسے اپنی تحویل میں لے لے گا۔ ویسے اس بے ہوش لڑکی کا کیا بنا؟“

”وہ ہوش میں آگئی ہے۔“ ڈینی نے بتانا شروع کیا۔ ”کچھ دیر پہلے میں نے اسپتال فون کیا تھا۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ وہ دو چار گھنٹوں میں بیان دینے کے قابل ہو جائے گی۔ ویسے اس کی چوٹ اتنی زیادہ مہلک نہیں تھی۔ اصل بات یہی تھی کہ وہ نشہ آور گولیوں کی وجہ سے غفلت میں تھی۔“

”چلو، یہ بھی اچھا ہی ہوا۔“ فریڈ نے یہ سن کر کہا۔ ”تم لیو سے ملے؟ اس نے کوئی فون کیا تھا؟“

”نہیں... میں نے اسے فون کرنے سے منع کر دیا تھا۔“

”ٹھیک ہے تو اب تم اس سے رابطہ کر کے یہ تو بتاؤ کہ اس کی بیٹی کے لیے کیا کچھ کر رہے ہو۔“

”ہاں۔“ ڈینی نے کہنا شروع کیا۔ ”میں یہاں سے تقریباً فارغ ہی ہو چکا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ گھر جانے سے پہلے لیو کی طرف جاؤں اور اسے بتا دوں کہ فی الحال کچھ نہیں ہو سکتا۔ البتہ کل جب انہیں عدالت میں پیش کیا جائے گا، اس کے بعد ہی کچھ کرنا ممکن ہو سکتا ہے۔“

شام کے سائے ڈھل چکے تھے۔ سورج غروب ہو گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ لیو صبح سے ہی بیٹی کی رہائی کی کوششوں میں مصروف تھا لیکن اب تک کوئی نتیجہ نہیں نکل پایا تھا۔ اس وقت بھی وہ گھر میں بیٹھا ہوا اسی ادھیڑبن میں مصروف تھا کہ کس طرح کینی کو اس ساری صورت حال سے باہر نکالے۔ صبح سے شام ہو چکی تھی لیکن اس کی رہائی کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ اتنے میں ڈور بیل بجی۔ لیو فوراً اٹھا اور دروازہ کھولا۔ سامنے ڈینی کھڑا تھا۔

”اندر آؤ۔“ لیو نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اسے دیکھ کر لیو کے چہرے پر امید کی کرن روشن ہوگئی تھی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ اس کی بیٹی کے ساتھ اب تک کیا ہوا ہے۔ وہ صرف بیٹی کے لیے ہی نہیں بلکہ خود اپنے بارے میں بھی فکرمند تھا کہ کہیں کینی کے چکر میں اس کے خلاف کوئی کارروائی شروع نہ ہو جائے۔ صبح جب اسے اس واقعے کا پتا چلا تھا تو اس وقت وہ خاصا پرامید تھا کہ بہت جلد اس مسئلے کو حل کر لے گا لیکن دوپہر کے بعد سے اس پر مایوسی طاری ہو چکی تھی۔

”بتاؤ... کیا ہوا؟“ ڈینی کے بیٹھتے ہی لیو نے سوال کیا۔

”سب ٹھیک ہے، بس ذرا سی دیر ہو گئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ لیو کے چہرے پر پریشانی دکھائی دینے لگی۔

”ایمی بے ہوش تھی۔ اس لیے انہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکا۔ اب وہ ہوش میں آگئی ہے۔ رات کو اس کا بیان لے لیا جائے گا اور پھر کل صبح انہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد ہی ضمانت ممکن ہو سکے گی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ کینی آج رات حوالات میں ہی گزارے گی؟“

”ایسا ہی ہے لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں نے اسے علیحدہ کمرے میں تو پہلے ہی منتقل کروا دیا تھا۔ اس کے کھانے پینے اور آرام کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے۔“ ڈینی نے لیو کی پریشانی بھانپ لی تھی اس لیے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”مگر...“

”مگر کیا؟“ ڈینی نے لیو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میرا اس کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم مجھ سے شکایت مت کرو۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہ قانون کی خلاف ورزی ہے مگر تمہاری دوستی کے باعث میں ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں کہ اسے کوئی پریشانی نہ ہو۔ بس... آج کی رات کی تو بات ہے۔ تم ضمانت کے کاغذات کے ساتھ کوئی آدمی بھجوا دینا۔ جب انہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا، اس وقت تمہارا وکیل ضمانت کے کاغذات جمع کروا دے۔ ضمانت ہو جائے گی۔“

”تمہیں یقین ہے کہ کل ہی ضمانت ہو جائے گی؟“ لیو نے ڈینی کی بات سن کر تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مطمئن نہیں ہوا ہے۔

”بظاہر تو یہی لگتا ہے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”خیر... مجھے اجازت دو۔ کل رات سے جاگ رہا ہوں۔ اب گھر جا کر آرام کروں گا۔“ ڈینی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”دیکھنا بھولنا مت۔ کل صبح عدالت پہنچ جانا۔“ لیو نے دروازے پر ڈینی کو بائے کہا اور جب وہ تھوڑا سا آگے بڑھا تو اس نے اونچی آواز میں تاکید کی۔

”بے فکر رہو، پہنچ جاؤں گا... بائے۔“ ڈینی پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk
digestpk.blogspot.com

دوسری صبح ملزمان کو دو مختلف مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ دو لڑکیوں اور تین لڑکوں کو بچوں کی عدالت میں پیش کیا گیا لیکن کیتی چونکہ اٹھارویں سال میں تھی، اس لیے اسے دوسرے مجسٹریٹ کے سامنے لے جایا گیا۔ لیو کا وکیل بریٹن بھی عدالت میں موجود تھا اور لیو کا منیجر ضمانت کے کاغذات تیار کر کے عدالت میں پہنچا ہوا تھا۔ باقی پانچ کو تو ریمانڈ پر بچوں کے لیے بنائی گئی جیل میں بھجوا دیا گیا البتہ کیتی کے ساتھ صورت حال مختلف تھی۔

کیتی کو عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ اس وقت سرکاری وکیل اس پر لگائے گئے الزامات بیان کر رہا تھا، جب فیڈرل پراسیکیوٹر نے مداخلت کی اور عدالت کو بتایا کہ ملزمہ پر نشہ آور ادویات بڑی مقدار میں رکھنے کا الزام ہے۔ جس گاڑی سے یہ ادویات ملی ہیں، وہ گاڑی اس کی ماں کے نام پر رجسٹرڈ ہے اور حادثے کے وقت گاڑی بھی وہی چلا رہی تھی۔ اس لیے یہ قوی امکان ہے کہ وہ ادویات بھی اس کی ملکیت ہے۔ چونکہ اب معاملہ نشہ آور ادویات کا ہے تو لہٰذا ملزمہ کو تفتیش کے لیے فیڈرل ڈپارٹمنٹ کی تحویل میں دیا جائے اور اس لحاظ سے اس کا مقدمہ بھی وفاقی امریکی حکومت کے قوانین کے تحت ہی چلایا جا سکتا ہے۔ عدالت نے دلائل سے اتفاق کیا۔ اس وقت کمرائے عدالت میں فیڈرل ڈرگس ایجنسی کے پولیس افسر اور ذمے دار بھی موجود تھے۔ عدالت کی اجازت سے انہوں نے کیتی کو اپنی تحویل میں لیا اور اسے ساتھ لے کر وہاں سے نامعلوم مقام کی طرف چلے گئے۔ بریٹن، لیو کا منیجر اور خود ڈینی منہ دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

"معاملہ بہت بگڑ چکا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔" دن کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ ڈینی، لیو کے گھر میں بیٹھا ہوا اسے ساری صورت حال سے آگاہ کر رہا تھا۔ اس سے پہلے بریٹن نے بھی اسی طرح کی رائے کا اظہار کیا تھا۔ کل صبح لیو جس معاملے کو اتنا آسان سمجھ رہا تھا، وہ اب مزید پیچیدہ ہو چکا تھا۔

"اب کیا کریں؟" لیو نے ڈینی کی بات سن کر ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا دماغ بالکل ماؤف ہو چکا ہے۔ جینی بھی لیونگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار تھے۔

"کل رات تک دوا کی لیبارٹری ٹیسٹ رپورٹ نہیں آئی تھی۔ کل رات تک تو میں بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ معاملہ زیادہ گمبھیر نہیں مگر جب آج عدالت میں پہنچا تو پتا چلا کہ لیبارٹری رپورٹ میں صاف صاف لکھا ہے کہ یہ گولیاں نشہ آور تھیں اور وفاقی قوانین کے تحت اتنی بڑی مقدار میں اس طرح کی گولیوں کا کسی کے قبضے سے برآمد ہونا سنگین جرم ہے، جس کی تفتیش صرف فیڈرل ڈرگس ایجنسی ہی کرنے کی مجاز ہے۔" ڈینی کے لہجے سے ناامیدی صاف جھلک رہی تھی۔

"نہ جانے اس لڑکی کو یہ گولیاں کہاں سے مل گئی تھیں؟" لیو نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا۔

"معاملہ اب یہ نہیں ہے کہ کہاں سے مل گئی تھیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ کیتی کی تحویل میں تھیں اور اب اسے اس الزام کا سامنا ہے۔ یہ ایک سنگین جرم ہے۔" ڈینی نے وضاحت کی اور لیو کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ لیو بے حد پریشان نظر آ رہا تھا۔

"ڈینی پلیز... اسے بچانے کی کوشش کرو۔" کافی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے نہایت ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم نہیں جانتے کہ اس معاملے سے میں بالکل تباہ ہو سکتا ہوں۔ پلیز! کچھ کرو۔ مجھے اس مسئلے سے نکالو ورنہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔"

"اب میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔" ڈینی نے شرمندہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "میں اسٹیٹ پولیس ڈپارٹمنٹ میں ہوں اور کیتی کا معاملہ فیڈرل ڈپارٹمنٹ میں چلا گیا ہے۔ وہاں میں بالکل بے بس ہوں۔"

"تم پولیس میں ہو، کچھ تو کر سکتے ہو۔ سوچو... پلیز اس مسئلے کا حل نکالو۔" لیو نے بے بسی سے کہا۔ ڈینی خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ جینی خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سادہ سی گھریلو عورت تھی۔ اسے لیو کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن بیٹی کے معاملے پر وہ نہایت پریشان تھی۔

"ڈینی پلیز... کچھ کرو۔ ابھی وہ بچی ہے۔ ناسمجھ ہے۔" جینی نے پہلی بار مداخلت کی۔ ڈینی نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر نگاہیں نیچی کر کے کچھ سوچنے لگا۔ کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی۔

"ایک کام ہو سکتا ہے۔" کافی دیر بعد ڈینی نے سر اٹھایا اور سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟" لیو اور جینی نے بیک وقت نہایت بے تابی سے پوچھا۔

"میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے۔"

"بتاؤ۔" لیو نے بے قراری سے کہا۔

"ابھی نہیں..." ڈینی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں جا رہا ہوں اور کم از کم دو تین گھنٹوں کے بعد آ کر تمہیں بتاؤں گا۔"

"مگر وہ آئیڈیا..."

"کہا نا کہ واپس آ کر بتاتا ہوں۔" ڈینی نے لیو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو میں جا کر دیکھتا ہوں کہ کیا یہ آئیڈیا کارگر بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

☆☆☆

دوپہر کے پونے دو بج رہے تھے۔ ڈینی اور فریڈ لنچ کر رہے تھے۔ دونوں کی گفتگو کا محور کیتی کیس تھا۔

"تمہارے خیال میں لیو مان جائے گا؟" فریڈ نے سوال کیا۔

"جو حالات ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے اس کے پاس کوئی دوسرا حل تو ہے نہیں۔ اس لیے ماننا ہی پڑے گا۔" ڈینی کا لہجہ پُرعزم تھا۔

"ویسے بڑی مشکل صورت حال ہے۔"

"تمہاری بات میں وزن ہے لیکن اب تک جو کچھ ہو چکا ہے، اس میں لیو کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اگر اس کو اپنی زندگی اور خاندان عزیز ہے تو پھر اسے یہ بات ماننا ہی ہوگی ورنہ پھر وہ جانے اور اس کا کام۔" ڈینی نے دو ٹوک لہجے میں کہا اور کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔ اس وقت وہ دونوں چائنا ٹاؤن کے ایک چینی ریستوران میں بیٹھے ہوئے فرائیڈ رائس کے مزے لے رہے تھے۔ یہ ڈینی کی پسندیدہ ڈش تھی۔ جس انہماک اور خاموشی سے وہ اسے منہ میں ٹھونس رہا تھا، اسے دیکھتے ہوئے فریڈ نے مزید کچھ کہے بغیر اس کی تقلید شروع کر دی۔ دونوں مزے لے لے کر کھانا کھانے میں مشغول ہو گئے۔

شام کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ ڈینی ریستوران سے سیدھا لیو کے گھر چلا آیا اور اب لگ بھگ آدھ گھنٹے سے اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے بتائے ہوئے راستے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے مگر لیو نہیں مان رہا تھا۔ جینی اس سے متفق تھی لیکن لیو کسی صورت میں ہامی بھرنے پر تیار نہیں تھا۔

"دیکھو لو... اس وقت آگے گڑھا، پیچھے کھائی والا معاملہ ہے۔ اب اگر ان دونوں سے بچنا ہے تو میری بات مان لو ورنہ جو دل میں آئے، وہ کرو۔" ڈینی کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

"میں بڑی مشکل صورت حال میں پھنس چکا ہوں۔ کیا اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں نکل سکتی؟" لیو نے ڈینی کی بات سن کر سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس تو یہی ایک حل تھا۔ اب اگر تمہارے پاس اس سے بہتر آپشن ہے تو بتاؤ... ورنہ..." ڈینی نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور ردعمل کا انتظار کرنے لگا۔ لیو خاموش تھا۔

"ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔" کافی دیر کے بعد لیو نے کمرے میں چھائی ہوئی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ یہ سنتے ہی ڈینی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ جینی بھی پُرسکون نظر آنے لگی۔

شام کے سوا چھ بج رہے تھے جب سیاہ شیشوں والی ایک جیپ لیو کے دروازے پر آ کر رکی۔ کچھ دیر بعد ڈینی اور لیو اس گاڑی میں بیٹھ کر فیڈرل ڈرگس ایجنسی کے شکاگو ہیڈکوارٹر کی طرف جا رہے تھے۔

☆☆☆

شکاگو پولیس کافی عرصے سے منشیات فروشوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن انہیں اس معاملے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں مل پائی تھی جس کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ چھوٹے چھوٹے منشیات فروشوں کو گرفتار کرنے کے بجائے بڑی مچھلیوں کو گرفت میں لایا جائے تاکہ مسئلے کو جڑ سے ختم کیا جا سکے۔ لیو شکاگو کی زیرِ زمین دنیا کا ایک بڑا نام تھا اور اس کاروبار کو چلانے والے مافیا کے چیف کنٹرولر میں سے ایک فرینک کا دستِ راست بھی۔ اس لیے جب کیتی کیس سامنے آیا تو فیڈرل ڈرگس ایجنسی نے اس معاملے سے فائدہ اٹھایا۔ کیتی ان کی تحویل میں تھی اور اب ڈینی کی مدد سے لیو نے اپنی بچی کو بچانے کے لیے تمام راز افشا کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ اس کے نتیجے میں ایک معاہدہ طے پا گیا جس کی رو سے نہ صرف کیتی کو رہا کر دیا جاتا تھا بلکہ لیو اور اس کی فیملی کو فوراً ایف بی آئی کی تحویل میں لے کر محفوظ مقام پر منتقل کر دیا جاتا اور لیو کے بیان کردہ رازوں پر کی گئی کامیاب کارروائی کے بعد انہیں امریکا کے کسی بھی حصے میں نئے نام سے زندگی گزارنے کی آزادی مل جاتی۔ یوں وہ مافیا کی پہنچ سے بھی دور ہو جاتے اور یہ خاندان بھی ہمیشہ کے لیے مافیا کی پہنچ سے دور ہو جاتا۔

تحریری معاہدہ طے پا جانے کے بعد لیو نے تمام تر رازوں سے پردہ اٹھا دیا۔ نہایت اہم ثبوت بھی فراہم کر دیے۔ کئی گھنٹے تک یہ بریفنگ جاری رہی۔ جس وقت لیو انکشافات کر رہا تھا، ڈینی بھی اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سے مسکراہٹ تھی۔

اسی رات لیو اور اس کی فیملی کو محفوظ مقام پر منتقل کر دیا

urdudigest.blogspot.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی تم سُدھرتے۔“

ڈینی نے مسکراتے ہوئے کہا تو لیو کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا۔ ”کیا...؟“ اس نے حیرت سے کہا۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

”جی ہاں... یہ سب ڈراما تھا۔“

”واقعی؟“ لیو نے ڈینی کی بات سُن کر کہا۔

”سو فیصد... کیتھی بہت پیاری بچی ہے۔ ہم نے سب ڈراما رچایا تھا۔ کیتھی نے میرا ساتھ دیا اور بس!“

”کیا تمہارا پولیس ڈپارٹمنٹ بھی؟“ لیو نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں... انہیں کچھ نہیں پتا تھا۔ ہم نے جو کچھ کیا، حقیقی انداز میں کیا۔ البتہ ایف بی آئی ایجنٹ فریڈ کو پہلے ہی سب کچھ معلوم تھا۔ اس نے ہی میرے منصوبے کی منظوری دی تھی۔“

”لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟“ لیو نے بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”پاپا... مجھے سب پتا ہے کہ آپ کیا کام کرتے تھے۔ مجھے نفرت ہے اس زہر سے جو انسان کی رگوں میں اتارا جا رہا ہے۔ کچھ دن پہلے ہمارے ہائی اسکول میں منشیات کی لعنت پر سیمینار ہوا تھا، تب سے مجھے آپ کے کام سے نفرت ہو گئی تھی۔ اسی لیے میں نے ڈینی انکل کی مدد کی۔“

”اوہ میرے خدا!“ لیو نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ ”لیکن ڈینی... تمہارا منشیات سے کیا کام؟“

”تم اُن چند لوگوں میں سے ہو جو اب یہ بات جان جائیں گے کہ میرا تعلق انسدادِ منشیات کے یونٹ سے ہے۔ بظاہر میں ایک عام پولیس افسر ہوں لیکن اس کام کے لیے مجھے خاص تربیت فراہم کی گئی ہے۔ میں نے ہی شکاگو میں منشیات کے خلاف اس کارروائی کا منصوبہ تیار کیا تھا۔“ ڈینی بتا رہا تھا۔ ”ویسے کیتھی میری مدد نہ کرتی تو میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔“ اس نے کیتھی کی طرف دیکھا۔ ”نئی زندگی مبارک ہو۔ جہاز روانہ ہونے والا ہے۔ میرا ساتھ یہیں تک تھا۔“ ڈینی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیو کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ ”میں تمہیں بھلا نہیں سکوں گا۔“ وہ ڈینی کے گلے لگ گیا۔

”اور میں بھی...“

گیا اور اگلے ہی روز شکاگو میں ایف بی آئی نے تیس وارنٹ گرفتاری جاری کیے۔ تمام لوگوں کو چند گھنٹوں کے اندر گرفتار کرلیا گیا۔ گرفتار ہونے والوں میں لیو کا باس فریک بھی شامل تھا جس نے بعد میں دورانِ تفتیش منشیات فروشی کے علاوہ نو اہم افراد کے قتل کا بھی اعتراف کرلیا۔ لیو کے اعترافات کی روشنی میں کی گئی کارروائی کے دوران دوٹن اعلیٰ معیار کی ہیروئن بھی برآمد کی گئی۔ یہ ہیروئن افغانستان سے اسمگل کر کے امریکا لائی گئی تھی۔ چند روز پہلے ہی اسے شکاگو پہنچایا گیا تھا۔ اس کامیاب کارروائی سے انسدادِ منشیات کے امریکی ادارے میں تہلکہ مچ گیا۔

اگلے تین دن تک لیو اور اس کی فیملی کو ایف بی آئی کی پناہ گاہ میں رکھا گیا اور پھر چوتھی رات انہیں سخت حفاظتی انتظامات میں ائرپورٹ پہنچا دیا گیا۔ نئے نام سے ان کے تمام کاغذات، ڈرائیونگ لائسنس اور دیگر شناختی دستاویزات پہلے ہی تیار کی جاچکی تھیں جنہیں ان کے حوالے کردیا گیا۔ جب لیو اپنے خاندان کے ساتھ ائرپورٹ پہنچا تو اسے وی آئی پی لاؤنج میں لے جایا گیا۔ وہ خاصا فکر مند تھا۔ جینی بھی پریشان لگ رہی تھی۔

”کیتھی کہاں ہے؟ یہ لوگ ہمیں کیتھی سے ملنے کیوں نہیں دے رہے؟“ لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے لیو نے پریشانی کے عالم میں ڈینی سے سوال کیا۔

”مل جائے گی۔ کمرے میں تو چلو۔“

لیو، جینی اور ان کی چھوٹی بیٹی بار برا جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوئے، وہاں پہلے سے ہی کیتھی بیٹھی ہوئی تھی اور ان کی منتظر تھی۔ لیو نے لپک کر بیٹی کو گلے سے لگایا۔ جینی کی آنکھ سے بھی آنسو بہنے لگے۔

کچھ دیر بعد ڈینی کے سوا کمرے میں کوئی اور غیر شخص موجود نہیں تھا۔

”مجھے تمہاری بہت یاد آئے گی۔“ ڈینی نے لیو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے بھی۔“ لیو نے کہا۔ یہ لوگ نئی شناخت کے ساتھ کس علاقے میں بسنے کے لیے جا رہے تھے، ڈینی اس بات سے قطعی لاعلم تھا۔

”ویسے مجھے خوشی ہے کہ میں اب ایک عام آدمی کی زندگی جی سکوں گا۔“ لیو نے ڈینی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”اس مدد کے لیے شکریہ۔“

”میرا نہیں، اپنی بیٹی کا شکریہ ادا کرو۔ اگر کیتھی میرا ساتھ نہ دیتی تو آج نہ تو یہ منشیات فروش پکڑے جاتے اور نہ

Digests of Pakistan
digestpk.blogspot.com

معجزہ

تنویر ریاض

کچھ لوگ کہیں بھی ملازمت کرتے ہیں... وہ تواتر سے جاری وساری رہتی ہے... جبکہ کچھ لوگوں کے ساتھ ہمیشہ الٹ ہوتا ہے... وہ کامیابی کے قریب پہنچ کر بھی خالی ہاتھ ہی رہ جاتے ہیں... ایک ایسی ہی لڑکی کا ماجرائے دگرگوں... وہ جہاں بھی ملازمت کرتی، وہاں کسی نہ کسی کا قتل ہوجاتا...

عادات کو سنوارنے اور نکھارنے کی کوشش میں معروف ادارے کی دلچسپ سرگرمیاں

سام نہیں چاہتا تھا کہ میں یہ ملازمت کروں۔ میں اس مخالفت کی وجہ سمجھ رہی تھی لیکن میری اپنی بھی کچھ مجبوریاں تھیں جس کی وجہ سے میں یہ نوکری فوری طور پر شروع کرنا چاہ رہی تھی۔ ان دنوں سام کی آمدنی حیرت انگیز طور پر گھٹ گئی تھی جس کی وجہ سے روزمرہ کے اخراجات پورے ہونے مشکل ہو رہے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ مکان کا تھا۔ اگر اس کی قسط بروقت ادا نہ ہوئی تو ہم سر چھپانے کے ٹھکانے سے بھی محروم ہوسکتے تھے۔ میں اسے قائل کرنا چاہ رہی تھی لیکن وہ ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا۔

”تم کوئی دوسری ملازمت کیوں نہیں ڈھونڈ لیتیں؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانتی ہو کہ بحالی کے مرکز میں کیسے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، وہ سب کسی نہ کسی نشے کے عادی ہوتے ہیں اور یہ لوگ کسی وقت بھی خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"یہ تمہارا خیال ہے۔ ضروری نہیں کہ وہاں آنے والا ہر شخص کسی نشے کا عادی ہو۔ ایسے لوگوں کے اور بھی کچھ مسائل ہو سکتے ہیں اور انہیں وہاں اسی لیے بھیجا جاتا ہے کہ وہ ان مسائل سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔ جہاں تک دوسری ملازمت ڈھونڈنے کا تعلق ہے تو اس میں کئی ماہ لگ سکتے ہیں۔ بڑی مشکل سے ایجنسی نے میرے لیے یہ ملازمت تلاش کی ہے۔"

"تمہارا کہنا بجا ہے لیکن جن لوگوں کو کوئی لت لگ جائے وہ عجیب و غریب حرکتیں کرتے ہیں جو خطرناک بھی ہو سکتی ہیں۔ آج کا اخبار ہی دیکھ لو۔" اس نے جرائم کا صفحہ کھولتے ہوئے کہا۔ "جواری لاکھوں ڈالرز لے کر فرار ہو گیا۔ پولیس اسے لاس ویگاس میں تلاش کر رہی ہے۔ دوسری خبر منشیات فروش کے قتل کے بارے میں ہے جس نے اپنے باس سے غداری کی تھی۔ تیسری خبر ہے شراب خانے پر حملہ، دو افراد زخمی۔"

"اوہ خدایا! ایسی خبریں سنا کر مجھے وحشت زدہ مت کرو۔" میں اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے بولی۔ "اس مرکز میں شرابی، جواری یا منشیات کے عادی لوگ نہیں آتے۔ ایجنسی والوں نے مجھے سب بتا دیا ہے۔"

"واقعی۔" سام حیرت سے بولا۔ "پھر وہاں آنے والے کس قسم کی عادتوں میں مبتلا ہوتے ہیں؟"

"انہوں نے اس بارے میں کوئی تفصیل نہیں بتائی لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ معمولی نوعیت کے مسائل میں مبتلا ہوتے ہوں گے۔ ویسے بھی میرا ان سے کچھ زیادہ واسطہ نہیں ہو گا کیونکہ میں تو دفتر میں بیٹھ کر ٹائپ کروں گی اور فائلیں بناؤں گی اس لیے مجھے ان لوگوں سے کوئی خطرہ نہیں۔"

☆☆☆

بحالی کا مرکز دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ وہ بہت ہی خوب صورت جگہ تھی اور دیکھنے میں کسی ریزورٹ کا منظر پیش کر رہی تھی۔ کشادہ لابی، خوب صورت عقبی لان جس کے وسط میں فوارہ نصب تھا، دیواروں پر خوب صورت پینٹنگز آویزاں تھیں اور جگہ جگہ رنگ برنگے پھولوں سے سجے پودے رکھے ہوئے تھے۔ ڈائریکٹر نے میرا خوش دلی سے استقبال کیا اور کہا کہ میں اسے صرف فریڈ کہہ کر بلاؤں۔

"ہم سب اپنے نام کا پہلا لفظ ہی استعمال کرتے ہیں۔ چاہے وہ مہمان ہوں یا ہمارا عملہ۔ اس طرح مہمان اپنے آپ کو خاص سمجھنے لگتے ہیں۔"

وہ اس مرکز میں علاج کے لیے آنے والوں کو مریض کے بجائے مہمان کہہ کر پکار رہا تھا۔ اسی طرح مجھے اس مرکز کا نام بھی بالکل منفرد اور عجیب سا لگا۔ کوکون سینٹر، یعنی ریشم کے کیڑے کا خول۔ اس کی وضاحت پیش کرتے ہوئے فریڈ نے کہا۔ "بالکل، یہ ان لوگوں کے لیے ایک محفوظ جگہ ہے جو اپنی زندگی میں خوش گوار تبدیلی لانے کے خواہش مند ہیں۔ اس کے لیے ہم نے چھ مرحلوں پر مشتمل پروگرام ترتیب دیا ہے۔"

"ایسا کیوں ہے... جبکہ دوسرے مراکز میں تو یہ پروگرام بارہ مرحلوں پر مشتمل ہوتا ہے۔"

"ہم نے اس میں کچھ ترامیم کی ہیں۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "ہمارے مہمان فوری نتائج چاہتے ہیں اس لیے ہم نے اس میں سے وہ چیزیں حذف کر دی ہیں جو غیر ضروری سمجھی گئیں۔ اس طرح ہمارا پروگرام زیادہ مؤثر اور جامع ہو گیا ہے۔"

اس نے ایک کتابچہ اور موٹا سا فولڈر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس کتابچے کو پڑھ کر تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ یہاں کس طرح کام ہوتا ہے اور اس فولڈر میں ان تمام مہمانوں کی فائلیں ہیں جو تمہارے گروپ میں شامل ہیں۔"

"میرا گروپ؟" میں الجھتے ہوئے بولی۔ "کیا سیکریٹری کو بھی تھراپی گروپ میں حصہ لینا ہوتا ہے؟"

"اوہ، تم یہاں سیکریٹری نہیں بلکہ عارضی معالج کے طور پر کام کرو گی۔ کیا تمہیں ایجنسی والوں نے نہیں بتایا تھا؟ ویسے بھی تم نے کمیونیکیشن میں ماسٹرز کر رکھا ہے۔"

"ماسٹرز نہیں پی ایچ ڈی۔" میں نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں نے اپنے سی وی میں اس کا تذکرہ نہیں کیا کیونکہ بہت سے لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو سیکریٹری کے طور پر رکھنا پسند نہیں کرتے لیکن مجھے نفسیات کے بارے میں زیادہ علم نہیں اور نہ ہی میں نے پہلے کبھی معالج کے طور پر کام کیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم یہ کام بخوبی کر لو گی۔ تمہیں صرف ان کی مدد کرنی ہے اور تمہارے پس منظر کو دیکھتے ہوئے امید ہے کہ تم انہیں سنبھال لو گی۔ ویسے بھی یہ ایک ہنگامی صورت حال ہے کیونکہ کل ہی مجھے ایک معالج کو نکالنا پڑا۔ وہ ایک مہمان کو کوئی ممنوعہ چیز دے رہا تھا۔"

"منشیات یا شراب؟" میں نے پریشان ہوتے ہوئے

پوچھا۔

"نہیں، ہمارے مہمانوں کو منشیات سے کوئی دلچسپی نہیں اور شراب بھی ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے کیونکہ انہیں روزانہ رات کے کھانے پر وائن پیش کی جاتی ہے۔ ہمارا وہ مہمان ویڈیو گیم کا عادی تھا اور اسے دو ہفتے کے لیے یہاں بھیجا گیا تھا۔ اس معالج نے اسے ایک پورٹیبل پلے اسٹیشن پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ ذرا سوچو اگر وہ اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا تو ہمارے مرکز کی کتنی بدنامی ہوتی۔"

میں مسکرا دی۔ ویڈیو گیم کا عادی ہونا کوئی نقصان دہ بات نہیں تھی لیکن اس کی زیادتی خطرناک ہو سکتی تھی شاید اسی لیے اسے علاج کی غرض سے یہاں بھیجا گیا ہو گا۔ میں نے فریڈ کی پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"واقعی یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ عملے کا کوئی فرد ہی قانون کی خلاف ورزی کرے۔"

"اس نے ہمارے بھروسے کا خون کیا جبکہ ہمارے کام میں بھروسے کو ہی مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ ہم تو اپنے مہمانوں پر بھی بھروسا کرتے ہیں۔ مثلاً دوسرے مراکز کے برعکس ہم اپنے مہمانوں کی آمد پر ان کے سامان کی تلاشی نہیں لیتے البتہ انہیں دوستانہ طریقے سے بتا دیتے ہیں کہ ان کے سامان میں کیا چیز ہونی چاہیے اور کیا نہیں۔ ایسی صورت میں وہ خود ہی ممنوعہ چیزیں ہمارے حوالے کر دیتے ہیں لیکن اس واقعے کے بعد میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان سب کے کمروں کی تلاشی لوں چنانچہ اس مرکز کی تاریخ میں پہلی بار گزشتہ شب مجھے یہ ناخوشگوار فریضہ سرانجام دینا پڑا۔ مجھے یقین ہے کہ بہت سے مہمانوں کو اس سے پریشانی ہوئی ہو گی۔ ہو سکے تو تم انہیں صبح کے سیشن میں اس پر بات کرنے کا موقع دینا۔"

"اتنی جلدی؟" میں نے فولڈر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ابھی میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا۔ "تمہارے پاس ابھی ایک گھنٹہ ہے۔ اس گروپ میں جتنے مہمان ہیں، انہیں آئے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا جبکہ ایک آج آنے والا ہے۔ ہم ایک ہفتے بعد مستقل گروپ بناتے ہیں۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ایک گروپ میں ملتے جلتے عادی افراد کو رکھا جائے لیکن فی الحال اس گروپ میں ملے جلے لوگ ہوں گے۔ سہ پہر تک تمہارے پاس دو گروپ اور ہوں گے۔ میں تمہیں ان کی فائلیں بھی دے دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "مجھے تم پر پورا اعتماد ہے۔ میں دس بجے آؤں گا اور ان مہمانوں سے تمہارا تعارف کروا دوں گا۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے جلدی جلدی فائلیں دیکھنا شروع کیں۔ میں کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔ دس بجنے میں تین منٹ پہلے فریڈ آ گیا اور مجھے اپنے ساتھ ایک بڑے سے کمرے میں لے گیا جس کی دیواروں پر ہلکا سبز رنگ کیا گیا تھا۔ وہاں سبز رنگ ہی کی ایک کاؤچ بھی تھی جس پر دو عدد سبز رنگ کے تکیے رکھے ہوئے تھے۔ رنگ برنگی آرام دہ کرسیاں اور ایک کافی ٹیبل بھی رکھی ہوئی تھی۔ کمرے کے پچھلے حصے میں ایک ریفریجریٹر، ایک مائیکرو ویو اور کتابوں کا شیلف بھی تھا۔ گویا وہاں گھر جیسی تمام سہولتیں مہیا کی گئی تھیں۔

"یہ کمرا ہمارے پہلے ہفتے کے مہمانوں کے لیے مخصوص ہے۔" فریڈ نے مجھے بتایا۔ "یہاں وہ مرکز کے معمولات کو سمجھنے کے دوران میں کام کے ساتھ ساتھ آرام بھی کر سکتے ہیں۔ تمہارے مہمان آنے والے ہی ہوں گے جبکہ ایک نیا مہمان بھی آ چکا ہے۔ میں اسے دس منٹ میں لے کر آتا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتی، وہ جا چکا تھا اور میں ڈر رہی تھی کہ اس کام کے لیے میرے پاس مطلوبہ قابلیت نہیں ہے۔ اگر کوئی غلط بات کہہ دی تو اس کا بھیانک نتیجہ نکل سکتا ہے۔ ممکن ہے کوئی مہمان پاگل ہو جائے یا خودکشی کر لے لیکن اب میرے پاس ان باتوں کے سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ میرا پہلا مہمان کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی اور سر کے بال آہستہ آہستہ غائب ہو رہے تھے۔ اس نے مجھے دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

میں نے پیشہ ورانہ انداز میں اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا اور بولی۔ "ہیلو! میرا نام لی ہے۔"

اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور وہ شرماتے ہوئے بولا۔ "کیا تم مجھے اپنے نام کے معنی بتانا پسند کرو گی؟"

یہ ٹیلیکس تھا۔ اس کی فائل کو سرسری انداز میں پڑھنے کے بعد اس کے بارے میں جو معلومات ملیں، ان کے مطابق وہ اندیشوں میں گھرے رہنے کا عادی تھا اور چھوٹے چھوٹے معاملات میں الجھ کر رہ جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ سوالیہ انداز میں گفتگو کرتا۔ وہ دس سال پہلے مشہور ٹی وی شو جیوپارڈی، میں بھاری انعامی رقم جیت چکا تھا جس سے اس نے ایک منافع بخش آن لائن انویسٹمنٹ کمپنی قائم کی۔ شروع میں اس کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بزنس بہت کامیاب رہا لیکن جلد ہی اچھے دن رخصت ہو گئے کیونکہ وہ لوگوں سے عام انداز میں گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت جلد اس کے سوالوں سے تنگ آ جاتے تھے۔

''تم سے مل کر خوشی ہوئی فیلیکس۔'' میں نے گرم جوشی سے کہا۔ ''کیا تم بیٹھنا پسند کرو گے؟''

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ تھوڑا سا مسکرایا اور ریفریجریٹر کی جانب چل دیا۔ وہاں سے اس نے نیلے رنگ کا تھرماس نکالا جس پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ پھر اس نے کمرے کے پچھلے حصے میں ایک کرسی منتخب کی اور اس پر بیٹھ گیا۔

گروپ کے بقیہ لوگ ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک بیس سالہ لڑکی تھی جس نے سفید اسکرٹ اور سرخ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ ایک دبلا پتلا مونچھوں والا پچاس سالہ شخص تھا جو پتلون اور بغیر آستینوں کا بنیان پہنے ہوئے تھا۔ اس گروپ میں ایک عورت بھی تھی جس کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے بے ڈھب سا سیاہ اسکرٹ اور سلیٹی رنگ کا سویٹر پہن رکھا تھا۔ ان سب نے ریفریجریٹر سے اپنے اپنے تھرماس نکالے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بعد میں ایک دبلی پتلی عورت آئی جس نے اپنے کندھے پر ایک بڑا سا پرس لٹکا رکھا تھا۔ وہ سب مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔

میں بھی ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی اور گلا صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے یہاں آ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔'' میرا نام لی ہے اور میں عارضی طور پر تمہاری گروپ لیڈر مقرر کی گئی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم لوگ کل کے واقعے سے کافی پریشان ہوئے ہوگے؟''

''یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔'' دبلا پتلا مونچھوں والا شخص میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''فریڈ کو ہمارے کمروں کی تلاشی لینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ بروشر میں ہماری پرائیویسی کی ضمانت دی گئی تھی ورنہ میں کبھی یہاں نہ آتا۔''

''ہاں، میں بھی اسی وجہ سے اس سینٹر میں آئی تھی۔'' نوجوان عورت بولی۔ ''کیونکہ وعدہ کیا گیا تھا کہ ہماری پرائیویسی کی سختی سے حفاظت کی جائے گی۔''

میں اس دوران میں تمام مہمانوں کے کوائف جان چکی تھی۔ دبلا پتلا مونچھوں والا شخص برائن تھا۔ دولت مند کاروباری شخص جس کا وزن بچپن سے ہی بڑھا ہوا تھا لیکن صرف چھ مہینے میں ہی اس کا اسی پونڈ وزن کم ہو گیا۔ اسے بھوکا رہنے اور ورزش کرنے کی عادت تھی اور اس کے ڈاکٹر نے خبردار کیا تھا کہ اگر اس کے جسم میں چربی کی مقدار مزید کم ہوئی تو اس کی صحت کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ نوجوان عورت کورٹنی تھی جسے نقل کرنے کی عادت تھی اور اسے کالج سے اس وقت تک کے لیے نکال دیا گیا تھا جب تک وہ بحالی کے مرکز میں رہ کر اپنی یہ عادت ترک نہ کردے۔

''کورٹنی!'' برائن نے ناگواری سے کہا۔ ''میری بات مت دہراؤ۔ تم ہمیشہ یہی کرتی ہو۔ کبھی اپنی طرف سے بھی کوئی بات کہہ دیا کرو۔''

''میں نے ہو بہو تمہاری بات نہیں دہرائی۔'' کورٹنی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے مختلف انداز میں الگ الفاظ استعمال کیے ہیں اور میرے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو پھر وہ بھی محض اتفاق ہی تھا جب کل کے سیشن میں جو کچھ تم نے کہا، وہ حرف بہ حرف مارتھا کے جرنل میں لکھا ہوا تھا۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ تم ایک رات پہلے کسی وقت اس کے کمرے میں گئیں اور چپکے سے اس کا جرنل پڑھ ڈالا۔''

مارتھا پروف ریڈر رہ چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس بحث میں الجھتی، میں نے اس کی توجہ دوسری سمت مبذول کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اس تلاشی کے بارے میں کیا محسوس کرتی ہو؟''

''مجھے اس کا یہ فعل اچھا نہیں لگا۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

''تمہاری فائل سے معلوم ہوا ہے کہ تم کاپی ایڈیٹر بھی رہ چکی ہو؟''

''میں اب بھی کاپی ایڈیٹر ہوں اور ٹیوشن پڑھاتی ہوں لیکن باقاعدہ ملازمت کے بجائے فری لانس کام کرتی ہوں۔''

''یہ ایک پبلشر کے پاس کام کرتی تھی لیکن گزشتہ سال وہاں سے نکال دی گئی۔'' برائن نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ یہ اسٹاف میٹنگ میں اپنے ساتھیوں کی گرامر میں غلطیاں نکالتی تھی۔ میں محسوس کر سکتا ہوں کہ ان پر کیا گزرتی ہوگی... کسی کی غلطیاں پکڑنا کوئی تفریح نہیں ہے۔''

''بالکل! ان کا ردعمل فطری تھا۔'' کورٹنی نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی گرامر کو درست کیا جائے۔''

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ بہت سے لوگ اپنی غلطیوں کی اصلاح پر خوش ہوتے ہیں کیونکہ وہ کچھ سیکھنا اور اپنی گرامر کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔'' مارتھا ترخ کر بولی۔

سونا گھاٹ کا پجاری، انکا، اقابلا...

جیسی یادگار اور سدا بہار داستانیں جو آج بھی قارئین کے دلوں میں زندہ ہیں

ہوش ربا، پرتحیر، پرتجسس اور سنسنی خیز کہانیوں کے خالق

انوار صدیقی

کے قلم سے

ایک نئی

سلسلے وار

دلچسپ کہانی

کشکول

بہت جلد ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ میں پیش کی جارہی ہے

ازل سے برسرِ پیکار، خیر و شر کی متضاد قوتوں کی آویزش کی داستان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے محسوس کیا کہ پورا ایشن آپس کی بحث و تکرار کی نذر ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ کورٹنی کوئی جواب دیتی، میں نے بات کا رخ بدلنے کے لیے اس سے پوچھا۔ ”اس مرکز میں تمہارا پہلا ہفتہ کیسا گزرا؟ کیا تم کچھ بہتری محسوس کر رہی ہو؟“

اس نے غیر یقینی انداز میں اپنے اردگرد دیکھا اور کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ”ہاں، سب ٹھیک ہے۔ میرا مطلب ہے کہ یہاں مساج بہت اچھا ہوتا ہے اور یوگا کی پریکٹس بھی عمدگی سے کرائی جاتی ہے۔ مجھے گرم پانی کے ٹب میں نہانا اچھا لگتا ہے اور جہاں تک پروگریس کا تعلق ہے تو اس کی پروا کس کو ہے۔ میں تو صرف اس لیے یہاں چلی آئی کہ میرے والدین نے پرنسپل سے مجھے ایک اور موقع دینے کی درخواست کی تھی۔“

”کورٹنی نے آٹھ مرتبہ دوسرے لوگوں کے مضامین چوری کیے تھے۔“ برائن نے انکشاف کیا۔

”یہ درست ہے کہ میں آٹھ مرتبہ پکڑی گئی۔ میری پرنسپل نے کہا کہ جب تک میں یہ عادت ترک نہیں کر دیتی، اس وقت تک وہ مجھے واپس نہیں لیں گے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میرے ڈیڈی کالج کو ایک اور عمارت عطیہ میں دیں۔ اس کے مقابلے میں بحالی کے مرکز کے اخراجات کم تھے اس لیے میں یہاں چلی آئی۔“

”یہ مرکز اتنا سستا بھی نہیں۔“ برائن بولا۔ ”سچ پوچھو تو یہ لوگ بھی اچھی طرح ہماری کھال اتارتے ہیں۔“

کورٹنی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”مجھ میں نہیں آتا کہ والدین میری تعلیم ختم کیوں نہیں کروا دیتے۔ کالج میں ہوتا کیا ہے بس وہاں بیٹھ کر الٹے سیدھے مضامین لکھتے رہو۔ والدین صرف یہ چاہتے ہیں کہ میں تعلیم مکمل کر کے کچھ عرصہ کوئی مناسب ملازمت کروں پھر کسی مناسب بندے سے شادی کر کے اچھی اچھی پارٹیوں میں جاؤں لیکن میں ایسا نہیں چاہتی۔ جب میں چھوٹی تھی تو ممی مجھے زبردستی گارڈن شوز، ہارس شوز اور مختلف تقریبات میں لے جاتی تھیں۔ مجھے بہت بوریت ہوتی تھی۔ میں اپنی ساری زندگی اس طرح کی تقریبات میں ضائع نہیں کر سکتی۔“

”تم کیا کرنا چاہتی ہو کورٹنی؟“ میں نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔

وہ پرجوش انداز میں بولی۔ ”میں کسی بڑی کمپنی میں پرسنل اسسٹنٹ کے طور پر کام کرنا چاہتی ہوں۔ میں ہالی ووڈ یا نیویارک جا کر کسی مشہور شخصیت سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس کی اسسٹنٹ بن کر جوتوں اور پرس کی شاپنگ میں اس کی مدد کرنا چاہتی ہوں اور جب وہ کسی پارٹی سے نشے کی حالت میں باہر آئے تو اس کی گاڑی چلا کراسے گھر لانا چاہتی ہوں۔ میں یہ سارے کام بخوبی کرلوں گی کیونکہ خوب صورت اور اسمارٹ ہوں اور میرا ذوق بہت اچھا ہے۔“

”تمہارے والدین اس طرح کی اسکیموں کے لیے تمہیں ایک پینی بھی نہیں دیں گے اور تمہارے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہے۔“ برائن نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

”جب میں پچیس سال کی ہو جاؤں گی تو مجھے میرا حصہ مل جائے گا لیکن اس وقت تک دیر ہو چکی ہوگی۔ بھلا کون درمیانی عمر کی لڑکی کو پرسنل اسسٹنٹ رکھنا چاہے گا۔“

اسی لمحے میرے اندر کی ٹیچر بیدار ہوگئی اور میں نے کورٹنی سے کہا۔ ”تم نے کبھی غور نہیں کیا کہ کالج کی تعلیم تمہارے لیے کتنی کارآمد ہو سکتی ہے۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ جو علم اور مہارت تم حاصل کر رہی ہو، وہ تمہارے منتخب کردہ کیریئر سے مطابقت نہیں رکھتا۔ تب بھی اس کے ذریعے تمہارے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور اگر تم اپنا کام ایمان داری اور آزادانہ طور پر کرتی ہو تو اس سے تمہارے اندر اعتماد پیدا ہوتا ہے جس کی بدولت تم کسی بھی فیلڈ میں کامیابی حاصل کر سکتی ہو۔“

”کیا واقعی... تم نے تو میرا اشتیاق بڑھا دیا۔“

برائن اسے چھیڑنے کے لیے کوئی سخت جملہ کہنے ہی والا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور فریڈا ایک دراز قد شخص کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کے بال گھنگھرالے، گہری نیلی آنکھیں اور چہرے پر ہلکی سی شرم تھی۔

”یہ رولینڈ ہے۔“ فریڈ نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ”یہ آج ہی یہاں پہنچا ہے اور اس گروپ میں شامل ہو رہا ہے۔ بقیہ لوگوں کا تعارف لی کرا دے گی۔“

میں الجھ کر رہ گئی۔ فریڈ کو اس کے بارے میں مجھے پہلے بتا دینا چاہیے تھا۔ وہ ایک ابھرتا ہوا مزاحیہ اداکار تھا اور اس نے رات گئے ہونے والے شوز کے ذریعے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ میری دونوں بیٹیاں اس کی پرستار تھیں اور اب وہ اپنی پہلی فلم میں ہالی ووڈ کی ایک مشہور اداکارہ کے ساتھ کام کرنے والا تھا لیکن گزشتہ چند برسوں سے اس کی شہرت غیر فلمی سرگرمیوں کی وجہ سے بڑھ رہی تھی۔ مثلاً ہوٹلوں میں جا کر شور شرابہ کرنا، ہدایت کاروں سے لڑنا جھگڑنا، ریہرسل سے غائب ہو جانا، چیک باؤنس ہونا اور خطرناک ڈرائیونگ کی وجہ سے گرفتار ہونا وغیرہ وغیرہ۔ میں سوچ ہی رہی تھی کہ

ان میں سے کون سی عادت چھڑانے کے لیے اسے اس مرکز میں بھیجا گیا ہے۔

اس کا تعارف ختم ہوا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تم سب لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی... اگر یہ کہوں کہ یہاں آ کر بہت خوش ہوں تو شاید تم لوگ یقین نہیں کرو گے۔“

اس نے کوئی لطیفہ نہیں سنایا تھا لیکن مجھ سمیت بھی لوگ ہنس پڑے۔ یہاں تک کہ مارتھا بھی اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

وہ مارتھا کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ نہ جانے کتنے برسوں بعد کسی مرد نے اسے مسکرا کر دیکھا تھا پھر وہ ایک خاص انداز سے بولا۔ ”جج کے ساتھ تھوڑا سا اختلاف ہو گیا تھا۔ دراصل اس وقت میں ستر کی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہاں قریب ہی کوئی اسکول بھی ہے لیکن اس پولیس والے نے میری ایک نہ سنی اور چالان کر دیا پھر یوں ہوا کہ میرے ذہن سے پیشی کی تاریخ نکل گئی۔ اتنے سارے کاموں میں اس کا دھیان ہی نہیں رہا۔“

”واقعی جب آپ اتنے مصروف ہوں تو ہر بات یاد رکھنا مشکل ہو جاتی ہے۔“ کورٹنی نے لقمہ دیا۔

”لیکن جج پر میری کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ اس نے مجھے توہین عدالت کا مرتکب قرار دے دیا۔ میرے وکیل کی درخواست پر وہ میری سزا معطل کرنے پر تیار ہو گیا بشرطیکہ میں ایک مخصوص مدت کے لیے بحالی کے مرکز میں داخل ہو جاؤں۔ شرط یہ تھی کہ وہ فینسی نہیں بلکہ حقیقی مرکز ہو اور ہالی ووڈ سے دور ہو۔ میرے ایجنٹ نے یہ مرکز تلاش کیا اور اس طرح میں یہاں چلا آیا۔“

”جج نے یہ تو بتایا ہوگا کہ تمہیں کس عادت سے چھٹکارا پانا ہے۔“

رولینڈ نے ایک سرد آہ بھری اور بولا۔ ”مجھے ناکام ہونے کی عادت ہے۔ جب بھی میرا کیریئر آگے بڑھنے لگتا ہے تو کوئی نہ کوئی واقعہ ایسا ہو جاتا ہے کہ میں پٹڑی سے نیچے اتر جاتا ہوں۔ میں بھی بھی دولت اور شہرت کے بارے میں نہیں سوچ سکا۔ ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ سب مصنوعی نہ ہوں۔ مجھے اسی خوف سے نجات حاصل کرنی ہے اور تم لوگوں کی مدد سے میں اس پر قابو پا لوں گا۔“

”تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تم اس مرکز کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہو گے؟“

اس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”فریڈ نے مجھے ایک کتابچہ دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے مجھے مطلوبہ معلومات مل جائیں گی۔“ اس نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا اور بولا۔ ”ان تھرماسوں میں کیا ہے؟“

”ہم تھراپی سیشن یا فری پیریڈ میں جو مشروب پینا چاہیں۔ وہ صبح نو بجے سے پہلے ان میں رکھ دیا جاتا ہے۔ میں ہمیشہ اپنے لیے منرل واٹر کا انتخاب کرتا ہوں۔ تم بھی جو مشروب پینا چاہو۔ اس کے لیے کچن کے اسٹاف کو بتا دو۔“ برائن نے بتایا۔

”مارتھا۔ تمہارے تھرماس میں کیا ہے؟“ رولینڈ نے پوچھا۔

”میٹھی چائے۔“ اس نے شرماتے ہوئے کہا۔ ”بچپن میں ہم گرمی کی چھٹیوں میں اپنی آنٹی سے ملنے جایا کرتے تھے۔ وہ ہر روز شام کے وقت میٹھی چائے تیار کرتیں اور ہم سب سامنے والے پورچ میں بیٹھ کر یہ چائے پیتے تھے۔ یہ میرے بچپن کی یاد ہے کیونکہ.....“

”میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری آنٹی کا انتقال ہو چکا ہے۔“ برائن اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ اسے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ رولینڈ کی توجہ مارتھا پر ہے۔ ”تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا اور تم شوگر کی مریضہ ہو جاؤ گی پھر ایک دن اسی مرض میں تمہارا بھی انتقال ہو جائے گا۔“

”میں ہمیشہ اپنے تھرماس میں ڈائٹ سوڈا لیتی ہوں۔“ کورٹنی نے رولینڈ کو ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس میں کیلوریز نہیں ہوتیں۔“

”لیکن اس میں مصنوعی مٹھاس تو ہوتی ہے۔“ برائن بولا۔ ”یہ تمہارے لیے اور بھی بری ہے اس سے تمہارا ہاضمہ بگڑ جائے گا اور تم تیس کی ہونے سے پہلے موٹی ہو جاؤ گی۔“

”میں ایسا نہیں سمجھتا۔“ رولینڈ نے کورٹنی پر بھرپور نگاہ ڈالتے ہوئے کہا پھر وہ فیلیکس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم کیا پیتے ہو؟“

میں بھول ہی گئی تھی کہ فیلیکس بھی اس کمرے میں موجود ہے۔ وہ اتنی دیر سے خاموش بیٹھا ہوا تھا کہ اس کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو سکا۔ وہ رولینڈ کی بات سن کر پریشان ہو گیا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ جواب دینا چاہ رہا ہے لیکن اس سے بولا نہیں جا رہا۔ میں اس کی عادت سے واقف ہو چکی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم کچھ پوچھنا چاہ رہے ہو فیلیکس؟“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے سکون کا سانس لیا اور رولینڈ سے بولا۔ ”کیا تمہیں دودھ پسند ہے؟“

اس سے پہلے کہ برائن کوئی نیا شوشا چھوڑتا، میں نے تمام مہمانوں سے کہا کہ وہ اپنے جرنل نکالیں اور صبح کے سیشن کے بارے میں اپنے تاثرات لکھیں۔ ان لوگوں کو کام میں لگا کر دفتر چلی گئی تاکہ سہ پہر میں آنے والے گروپ کی فائلیں دیکھ سکوں۔ آدھے گھنٹے بعد ہی مجھے بے چینی ہونے لگی۔ صبح کے سیشن میں ان لوگوں کے درمیان جو بحث و تکرار ہو رہی تھی اس سے مجھے خوف آنے لگا۔ میں نے سوچا کہ چل کر دیکھنا چاہیے۔ خالی پیریڈ میں کیا کر رہے ہیں۔

عقبی لان سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ برائن اور رولینڈ باتوں میں مصروف تھے۔ برائن اسے گزشتہ سہ ماہی میں اپنی کمپنی کو ہونے والے منافع کے بارے میں بتا رہا تھا۔ شاید اس طرح وہ رولینڈ کو اپنی کمپنی میں سرمایہ کاری کرنے پر آمادہ کرنا چاہ رہا ہو۔ کورٹنی اور فیلیکس کمرے میں ہی تھے۔ کورٹنی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی جبکہ فیلیکس دلچسپی سے اپنی بنائی ہوئی تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے مارتھا کے بارے میں پوچھا تو کورٹنی نے بتایا کہ وہ لنچ سے پہلے کچھ دیر کے لیے سونا چاہ رہی تھی۔ میں مطمئن ہو کر اپنے دفتر میں آ گئی۔

☆☆☆

شام کو گھر آنے کے بعد میں نے سام کو اپنی کارکردگی بتاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے دوسرے دو گروپ کے بارے میں نوٹس بنانے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ پورے دن میں ایک منٹ کی بھی فرصت نہیں ملی۔“

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ سام نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بقیہ دونوں گروپ کیسے ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟“

”نہیں، ان میں بھی بھانت بھانت کے لوگ موجود ہیں اور ان سب کی عادتیں عجیب و غریب ہیں خیر، چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ کہ تمہاری میٹنگ کیسی رہی؟“

”بہت اچھی، ان دونوں میاں بیوی کو میرا بنایا ہوا ڈیزائن پسند آ گیا اور انہوں نے ایڈوانس کے طور پر ایک چیک بھی دے دیا۔ اس سے ہماری دو ماہ کی قسطیں ادا ہو جائیں گی۔ لہٰذا اگر تم چاہو تو کل سے ملازمت پر جانے کی ضرورت نہیں۔“

”مجھے جانا ہوگا۔“ میں نے مسز فریڈا اور اپنے گروپ کے لوگوں سے وعدہ کیا ہے پھر میں کیوں نہ جاؤں؟“

”میں نہیں چاہتا کہ تم وہاں کام کرو۔“ سام نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ لوگ کسی وقت بھی تمہارے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ تم نے آج دوپہر کی خبریں نہیں سنیں۔ ایک منشیات فروش کو گولی مار دی گئی۔ اس کی عمر صرف انیس سال تھی۔ ایک مخبر نے پولیس کو بتایا کہ یہ قتل اس کے سپلائر نے کیا ہے کیونکہ مقتول نے رقم کے لین دین میں گڑبڑ کی تھی۔ اسی طرح ایک اور شخص نے شراب کے نشے میں دو آدمیوں کو زخمی کر دیا تھا۔ اسی لیے میں نہیں چاہتا کہ تم یہ ملازمت کرو۔ یہ لوگ پاگل ہوتے ہیں اور کسی وقت بھی کوئی وحشیانہ حرکت کر سکتے ہیں۔“

”یہ لوگ شراب یا منشیات کے عادی نہیں ہیں بلکہ ان کی عادتیں بڑی بے ضرر سی ہیں۔ ان میں سے کوئی دوسروں کے مضامین چوری کرتا ہے تو کسی کو غلطیاں نکالنے کی عادت ہے اور یہ جو تم خوفناک خبریں سنا رہے ہو اس سے ان لوگوں کا کوئی واسطہ نہیں۔ اب تم اپنا ڈیزائن مکمل کرو۔ مجھے بھی تھوڑا سا کام کرنا ہے۔“

☆☆☆

دوسرے دن معمول کے مطابق میں نے اپنا کام شروع کیا۔ سہ پہر کا سیشن منسوخ ہو گیا تھا۔ ہم سب کمرے میں بیٹھے خبریں شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ میرے پاس نوٹس بنانے کے لیے کافی وقت تھا لیکن میں کم صم سی بیٹھی تھی اور مجھ میں پنسل پکڑنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ میں جب کمرے میں آئی تو مجھے اسی وقت محسوس کر لینا چاہیے تھا کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔ میں پانچ منٹ پہلے آ گئی تھی۔ برائن وہاں موجود تھا اور جسمانی مشقیں کر رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ”تمہارے لیے اس طرح کی ایکسر سائز مناسب نہیں ہے۔ تمہیں کمزوری کی ضرورت ہے تم اپنا تھرماس لے کر ایک جگہ بیٹھ کیوں نہیں جاتے۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ وہ کاؤچ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

وہ اپنا تھرماس لینا بھول گیا تھا۔ میں نے فریج کھول کر اس کا تھرماس نکالا اور اس کے قریب میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ تم نے بہت زیادہ ورزش کر لی ہے جس سے تمہارے جسم میں پانی کی کمی ہو گئی ہے اور تم کمزوری محسوس کر رہے ہو۔ تھوڑا سا پانی پی لو۔“

”ایک منٹ۔“ وہ تھوڑا سا جھکا اور اس نے تینوں سرخ رنگ کے تکیے اپنے پیٹ کے ساتھ لگا لیے اور بولا۔ ”فی الحال مجھے پیاس نہیں لگ رہی۔“

دوسرا آنے والا شخص فیلیکس تھا۔ اس نے معمول کے مطابق فریج کھول کر اپنا تھرماس نکالا اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ایک منٹ بعد مارتھا آ گئی۔ اس نے بھی اپنا تھرماس نکالا اور کرسی پر بیٹھ گئی پھر اس نے تھرماس میں سے ایک گھونٹ لیا اور منہ بناتے ہوئے تھرماس زمین پر رکھ دیا۔ اس کے بعد رولینڈ کمرے میں داخل ہوا اور اس کے آتے ہی کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ وہ خوش مزاجی سے بولا۔

”کون کہتا ہے کہ میں ریہرسل پر دیر سے آتا ہوں۔ دیکھ لو، ٹھیک دس بجے میں یہاں موجود ہوں۔ مجھے یہاں آنے سے فائدہ ہوا ہے اور شرطیہ کہتا ہوں کہ ایک ہفتے میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ دیکھتا ہوں کہ میرے لیے تھرماس رکھا گیا ہے یا نہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے فریج کھولا اور ایک اورنج کلر کا تھرماس اٹھا لیا جس پر اس کا نام لکھا ہوا تھا، اس نے ایک گھونٹ لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اورنج جوس میں نے اسی کی فرمائش کی تھی۔ اب اگر اس میں واڈکا ملانے کے لیے کہوں گا تو شاید یہ یہاں کے اصولوں کے خلاف ہوگا۔“

مجھے نہ جانے کیوں ہنسی آ گئی۔ حالانکہ اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی۔ میں نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”کورٹنی آ جائے تو ہم اپنا کام شروع کرتے ہیں۔“

سات آٹھ منٹ بعد کورٹنی آئی اور بولی۔ ”سوری، میری مما کا فون آ گیا تھا اور وہ کسی طرح خاموش ہی نہیں ہو رہی تھیں۔“

”شاید تمہیں معلوم ہوگا کہ اس مرکز میں باہر سے آنے والے فون سننے کی ممانعت ہے۔“

”فریڈا نے مجھے رعایت دے رکھی ہے۔ جب تک میں اکیس سال کی نہیں ہو جاتی، میرے والدین مجھے فون کر سکتے ہیں۔“

میں نے اس سے مزید الجھنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے مہمانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”آج تم سب اپنے بارے میں گفتگو کرو گے۔“

رولینڈ نے فوراً ہی اپنی غلطیاں اور خامیاں بیان کرنا شروع کر دیں۔ درمیان میں اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کچھ اعترافات بھی کیے جبکہ بقیہ لوگوں نے اس بارے میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ فیلیکس اپنی عادت کے مطابق خاموش رہا۔ مارتھا نے دو مرتبہ رولینڈ کی گرامر درست کی۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں بولی۔ کورٹنی تمام وقت اپنی مٹھیاں بھینچے بیٹھی رہی۔ وہ کسی سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔ البتہ برائن کی خاموشی سب سے زیادہ حیران کن تھی۔ جبکہ گزشتہ روز وہ خوب چہک چہک کر بول رہا تھا لیکن آج وہ اپنے پیٹ میں تکیے دبائے زور زور سے سانس لے رہا تھا اور اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو گیا تھا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

”تم ٹھیک تو ہو برائن؟“

”نہیں۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ”میرے پیٹ میں شدید تکلیف ہو رہی ہے اور دل بھی تیزی سے دھڑک رہا ہے۔“

”تمہیں آرام کرنا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”رولینڈ! کیا تم کمرے تک جانے میں اس کی مدد کرو گے؟“

لیکن کمرے تک جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کیونکہ رولینڈ نے اسے مضبوطی سے سہارا دے رکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ دو قدم چل کر گھٹنوں کے بل جھک گیا اور زور سے قے کر دی۔ مارتھا نے فوراً اس کے سامنے ٹوکری رکھ دی اور میں نرسنگ روم کی طرف بھاگی۔

جب میں نرس کو لے کر واپس آئی اس وقت برائن کاؤچ پر لیٹا ہوا زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ نرس نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تم صبح بستر سے اٹھتے وقت بھی اپنے آپ کو

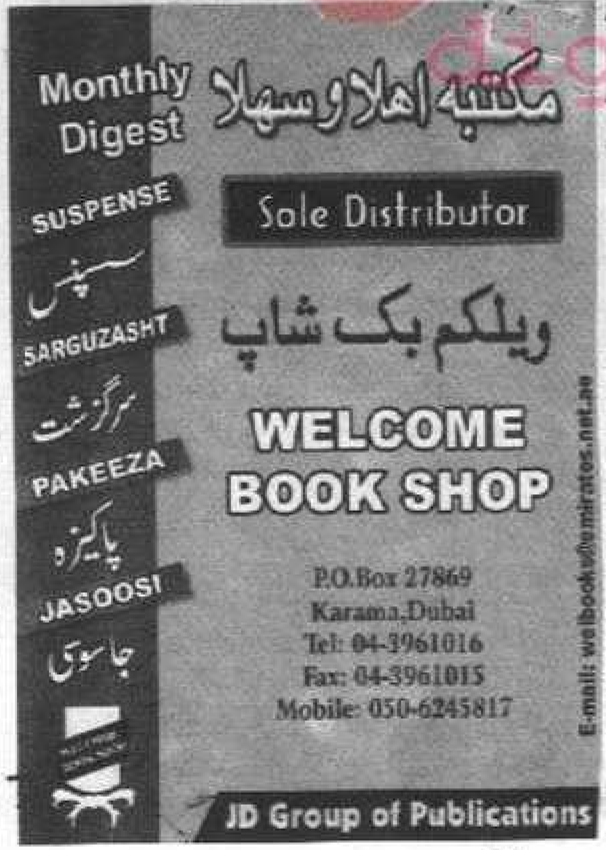

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیمار محسوس کر رہے تھے؟"

براؤن جواب دینے کے قابل نہیں تھا۔ اس کے بجائے مارتھا بولی۔ "یہ مجھے بالکل ٹھیک لگ رہا تھا۔ میں نے اسے باغیچے میں چہل قدمی کرتے دیکھا۔ اس وقت بالکل صحت مند تھا۔"

"گویا اس کی طبیعت اچانک ہی خراب ہو گئی۔ ایسا زہرخورانی کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔" نرس بولی۔

"اس نے ناشتے میں کیا لیا تھا؟"

"جو کا دلیا۔" رولینڈ بولا۔ "ہم سب نے یہی ڈش لی تھی بلکہ میں نے تو اس کے مقابلے میں چار گنا زیادہ کھایا تھا۔ وہ تو صرف پانی ہی پیتا رہا۔"

"یہ بھی زہرخورانی کی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔" نرس بولی۔ "اسے کمرے میں پہنچا دو۔ میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔ لی، تم فریڈ کو بھی مطلع کر دو۔"

نہ جانے یہ بات اس وقت میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی جب میں نے براؤن کا تھرماس ہاتھ میں لیا تو وہ مجھے بہت ہلکا محسوس ہوا۔ بعد میں جب کھول کر دیکھا تو وہ تقریباً خالی تھا۔ میرا نہیں خیال کہ براؤن نے سیشن کے دوران میں پانی پیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ اس نے اس سے پہلے ہی تھرماس خالی کر دیا ہو لیکن کیا منرل واٹر پینے سے زہرخورانی ہو سکتی ہے؟ میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ میں براؤن کے کمرے میں گئی اور ڈاکٹر کو تھرماس کے بارے میں بتا دیا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ اس کا زہرخورانی سے کوئی تعلق ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "لیکن میں یہ تھرماس اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور اس پانی کا لیبارٹری میں تجزیہ کرواؤں گا۔ بہتر ہو گا کہ ہم اسے اسپتال بھیج دیں، اس کے دل کی رفتار بے ترتیب ہو رہی ہے۔"

اس نے براؤن کی طرف دیکھا جس کا پورا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ "میں نے اس کی فائل دیکھی ہے، اس نے چھ مہینے میں اسی پونڈ وزن کم کیا ہے۔ اس سے بھی دل متاثر ہوتا ہے۔ اگر یہ اب بھی کم خوراکی اور ورزش میں لگا رہا تو اس طرح کے دورے پڑتے رہیں گے۔"

ڈاکٹر نے بڑی وضاحت سے سب کچھ بتا دیا تھا لیکن میں بے چینی محسوس کر رہی تھی جب ایمبولینس براؤن کو لے کر چلی گئی تو میں دوسرے مہمانوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ سب مارتھا کے کمرے میں جمع تھے۔ مارتھا اپنی میز پر بیٹھی کلاک پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ فیلیکس اس کے برابر میں خاموش کھڑا تھا۔ کورٹنی اور رولینڈ کھڑکی کے پاس کھڑے باہر کا نظارہ کر رہے تھے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ براؤن کو اسپتال بھیج دیا گیا ہے تو رولینڈ بولا۔

"فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر یہ دل کا دورہ ہے تب بھی بروقت طبی امداد سے اس کا علاج ممکن ہے۔"

"ہاں۔" کورٹنی نے اس کی تائید کی۔ "بعض اوقات دل کا دورہ مہلک ثابت نہیں ہوتا۔ براؤن بہت جلد صحت یاب ہو جائے گا۔"

"مجھے بھی یہی امید ہے۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "لنچ کا وقت ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کہ تم لوگوں کا دل کھانے کو نہ چاہ رہا ہو لیکن ہمیں نظام الاوقات پر تو عمل کرنا ہی ہوگا۔"

وہ سعادت مندی سے سر جھکائے لنچ کے لیے چلے گئے۔ میں براؤن کے کمرے میں دوبارہ گئی تو فریڈ اس کے دروازے کو تالا لگا رہا تھا۔ یہ یہاں کا دستور تھا کہ اگر کوئی مہمان غیر متوقع طور پر مرکز سے چلا جائے تو اس کی واپسی تک کمرا مقفل رہتا ہے۔ فریڈ نے سہ پہر کا سیشن منسوخ کر دیا اور ہم سب خبروں کا انتظار کرنے لگے۔ میں نے ایک سینڈوچ لیا اور اسٹاف روم میں آ کر نوٹس تیار کرنے لگی۔

"سوا پانچ بجے کے قریب جیسے ہی میں نے اپنا کام مکمل کیا۔ فریڈ میرے پاس آیا اور اس نے بری خبر سنائی کہ براؤن کا انتقال ہو گیا ہے۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میں نے گھر آ کر سام کو یہ بات بتائی تو وہ بولا۔

"اگر تمہیں شک ہے کہ براؤن طبعی موت نہیں مرا بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے تو تم پولیس کو فون کیوں نہیں کرتیں؟"

میں نے اپنے والٹ سے ایک بوسیدہ سا کارڈ نکالا اور اس پر لکھا ہوا نمبر ڈائل کرنے کے بعد بولی۔

"لیفٹیننٹ بروک! میں لی ابرم بول رہی ہوں۔ کیا تم میرے پاس آ سکتے ہو؟"

ایک گھنٹے بعد وہ میری کچن ٹیبل پر بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ میں نے اسے کوکون سینٹر اور وہاں رہنے والے مہمانوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور صبح جو واقعہ پیش آیا، اسے بھی تفصیل سے بیان کر دیا۔ میری بات ختم ہونے پر وہ بولا۔

"میں تمہاری پریشانی کی وجہ سمجھ سکتا ہوں۔ ایک شخص جو بالکل صحت مند تھا۔ اچانک ہی بیمار ہوا اور مر گیا۔ میں بھی تمہاری جگہ ہوتا تو پریشان ہو جاتا۔ تمہارے ساتھ پہلے بھی چار مرتبہ ایسا ہو چکا ہے جب بھی تم نے کوئی عارضی ملازمت

Digests of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی، کوئی بندہ قتل ہو گیا لیکن یہاں آنے سے پہلے میں اسپتال گیا تھا اور جو کچھ ڈاکٹرز نے مجھے بتایا اسے سننے کے بعد یقین ہو گیا کہ یہ شخص طبعی موت مرا ہے۔ اس کی عمر باون سال تھی اور وہ ہمیشہ سے ہی فربہ جسم کا مالک تھا۔ اس نے گزشتہ چھ ماہ میں بڑی تیزی سے اپنا وزن کم کیا تھا اور اب بھی اسی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اس کے ڈاکٹر نے تنبیہ بھی کی تھی کہ وہ مزید وزن کم کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اس کا نتیجہ دل کے دورے کی صورت میں سامنے آیا۔"

"یہ سب میں جانتی ہوں۔" میں بولی۔ "لیکن بہت سی باتیں عجیب لگتی ہیں۔ تھرماس میں جو پانی تھا، اس کی رپورٹ کیا کہتی ہے؟"

بروک نے سر ہلایا اور بولا۔ "ہاں، وہ خالص منرل واٹر ہے اور اس میں کسی قسم کا زہر نہیں ملا ہوا۔"

"اوہ۔" میں نے اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھ دیا اور بولی۔ "کیا اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوگا؟"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" بروک نے کہا۔ "موت کی وجہ واضح ہے۔ اس کا ایک ہی وارث ہے دوسری بیوی سے سوتیلا بیٹا۔ وہ تدفین کے انتظامات کے لیے شکاگو سے روانہ ہو چکا ہے اور اس نے بھی پوسٹ مارٹم کے لیے نہیں کہا۔"

"لیکن تم پوسٹ مارٹم کروا سکتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔"

"یہ بتاؤ کہ اگر کوکون سینٹر کے کسی شخص نے اسے زہر دیا ہے تو اس کی موت سے اس کو کیا فائدہ ہوگا؟ سب کچھ تو اس کے بیٹے کے حصے میں آئے گا پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ سینٹر کا کوئی آدمی اسے زہر دے۔"

"یہ میں نہیں جانتی۔ بہرحال وہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔ اس نے گروپ میں شامل ہر شخص کی بے عزتی کی تھی لیکن اتنی زیادہ بھی نہیں کہ وہ قتل کا محرک بن سکے اور نہ ہی میں یہ جانتی ہوں کہ اسے کس طرح زہر دیا گیا۔ یہ تو طے ہے کہ ناشتا میں جو لیا اس نے کھایا۔ اس میں زہر نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی دوا یا وٹامن کی گولیاں لیتا ہو۔ کیا تم ان کا تجزیہ کروا سکتے ہو؟"

"ایسا ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کا کوئی جواز ہو۔" بروک بولا۔ "ویسے بھی اس وقت ہمارے پاس کئی دوسرے اہم کیس ہیں۔ بہرحال تم نے اس سے پہلے چار مرتبہ قتل کے کیس میں ہماری مدد کی ہے۔ میں پوسٹ مارٹم کی کوشش کروں گا۔ ممکن ہے کہ کیپٹن اس کے لیے راضی نہ ہو لیکن میں اسے سمجھا لوں گا اور اگر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے کوئی خاص بات معلوم ہوئی تو تمہیں ضرور فون کروں گا۔ ویسے تم خود اس کے کمرے میں جا کر دوائیں چیک کر سکتی ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ میں ایسا کر سکتی ہوں۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تمہارے آنے کا بہت بہت شکریہ۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "تم جو کتاب لکھ رہی تھیں۔ اس کا کیا بنا؟"

"مجھے ابھی تک کوئی پبلشر نہیں مل سکا۔ اب میں ایک دوسری کتاب پر کام کر رہی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یہ تجارتی اعتبار سے کامیاب رہے گی۔"

☆☆☆

جب میں نے برائن کا سامان پیک کرنے کی پیشکش کی تو اس نے خوشی سے اس کی اجازت دے دی۔ میں نے اس کے کمرے میں وٹامنز کی کئی شیشیاں دیکھیں۔ اس کے علاوہ پلنگ کے لیے کوئی خاص سامان نہ تھا۔ سوائے کپڑوں کے۔ میں اس کے موزے تہ کر رہی تھی کہ مجھے ایک جراب میں شکن نظر آئی۔ میں نے اس میں ہاتھ ڈالا تو وہاں سے دو ریپر برآمد ہوئے۔ میرے چہرے پر افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ میٹھے سے پرہیز کرتا تھا اور چوری چھپے میٹھی چیز بھی کھاتا تھا۔ گزشتہ روز جب میں کمرے میں گئی تو وہ وہ وزش کر رہا تھا۔ اس کا یہی مطلب ہوا شکر کی صورت میں اس نے جو زائد کیلوریز لی تھیں، وہ انہیں خرچ کر رہا تھا۔

میں نے اس کے بستر پر بیٹھتے ہوئے گزشتہ روز کے مناظر یاد کیے۔ برائن کا تقریباً خالی تھرماس مارتھا کا چائے کا گھونٹ لے کر منہ بنانا اور تھرماس نیچے رکھ دینا۔ کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ برائن وقت سے پہلے کمرے میں آ گیا تھا اور اس نے مارتھا کی میٹھی چائے پی لی پھر اپنی چوری کو چھپانے کے لیے اس کے تھرماس میں منرل واٹر انڈیل دیا اسی لیے مارتھا کو چائے بدمزہ لگی۔ اور اس نے کسی سے شکایت کرنے کے بجائے تھرماس زمین پر رکھ دیا۔

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ گزشتہ شب نیند پوری نہ ہونے کے سبب میرا سر چکرا رہا تھا۔ میں رات بھر یہی سوچتی رہی کہ سینٹر کا کوئی شخص برائن کو کیوں مارنا چاہتا تھا جبکہ مجھے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ کوئی مارتھا کو کیوں مارنا چاہ رہا تھا۔

اس خیال کے آتے ہی میرا ذہن مارتھا کی طرف چلا گیا۔ مارتھا نے زندگی میں کوئی عیش و آرام نہیں دیکھا تھا۔

اسے ملازمت سے جواب مل چکا تھا اور وہ فری لانسنگ کے ذریعے اپنا گزارہ کر رہی تھی۔ یقیناً اس کا ہیلتھ انشورنس بھی نہیں ہوگا پھر وہ یہاں کے اخراجات کس طرح برداشت کر رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھ ایک قدیم کلاک اور کھانا پکانے کی ترکیبوں کی فائل بھی لے کر آئی تھی۔ آخر کیوں؟ بحالی کے مرکز میں یہ چیزیں لانے کی کیا ضرورت تھی۔

فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے بروک بول رہا تھا۔ "مبارک ہو۔ پہلا رزلٹ مثبت آیا ہے۔ اس کے جسم میں زہر کے اثرات پائے گئے ہیں جو اولینڈر نامی پودے کے ہیں۔ یہ کینسر کی قسم کا پودا ہے جس میں عموماً سفید اور گلابی پھول کھلتے ہیں۔ اس پودے کے تمام حصے زہریلے ہوتے ہیں، اگر یہ کسی کے پیٹ میں پہنچ جائیں تو شدید گھبراہٹ، بدہضمی اور اختلاج قلب کے نتیجے میں موت واقع ہو سکتی ہے۔ لگتا ہے کہ کسی نے اس پودے کو پانی میں ڈبو کر اسے زہریلا کیا اور کسی ایسی چیز میں ڈال دیا جو وہ باقاعدگی سے پیتا تھا لیکن ایک مسئلہ ابھی بھی حل طلب ہے۔ ہم نے اس کے تھرماس کے پانی کا تجزیہ کرایا تو اس میں کسی قسم کا زہر موجود نہیں تھا جبکہ اس نے پانی کے سوا کچھ نہیں لیا تھا۔"

"شاید اس نے کل چائے بھی پی تھی۔ فی الحال اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ ممکن ہے کسی نے اس چائے میں زہریلا پانی ملا دیا ہو۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ تمہارا کہنا ہے کہ سینٹر میں کئی قسم کے پودے لگے ہوئے ہیں۔ کیا ان میں کوئی اس قسم کا پودا بھی ہے؟"

"میں نہیں جانتی کہ اولینڈر کس طرح کا ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں وہیں آ رہا ہوں۔ اس وقت تم اپنی زبان بند رکھنا۔ لگتا ہے کہ اب ہمارا واسطہ کسی قاتل سے پڑنے والا ہے۔"

میں نے فون بند کر کے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بجنے والے تھے۔ مجھے اپنے گروپ کے لوگوں سے ملنا تھا اور انہی میں سے کوئی ایک قاتل تھا۔ وہاں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ فیلکس ہمیشہ کی طرح خاموش اور گم صم اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ مارتھا ایمبرائیڈری کا کوئی ڈیزائن بنا رہی تھی۔ رولینڈ اور کورٹنی ایک دوسرے سے قریب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ رولینڈ اپنی فلم کے بارے میں اسے بتا رہا تھا۔ مارتھا نے دخل اندازی کی تو ان کے درمیان بحث شروع ہو گئی اور یہ اتنی بڑھ گئی کہ مارتھا نے غصے میں آ کر اپنا نمونہ ایک طرف رکھا اور پیر پٹختی ہوئی کمرے کی طرف چلی گئی۔ رولینڈ نے حیران ہوتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے جیسے کہہ رہا ہو کہ میں نے کیا کیا ہے؟

مارتھا کے جانے کے بعد میں نے اس کا نمونہ اٹھایا اور دیکھنے لگی۔ اس میں ایک عقاب پہاڑی کی جانب پرواز کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ بہت کچھ میری سمجھ میں آ گیا۔ مارتھا کا بریسلیٹ، اس کا پیپر، وہ خبریں جو سام مجھے سنایا کرتا تھا، میں نے اچانک ہی فیلکس سے پوچھا۔ "آرنلڈ کے معنی کیا ہیں؟"

اس نے حسب عادت سوالیہ انداز میں جواب دیا۔ "عقاب کیا ہوتا ہے؟"

"اور بیلمونٹ کے معنی کیا ہیں؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"خوب صورت پہاڑی کیا ہوتی ہے؟" اس نے جواب دیا۔

اب معاملہ پوری طرح میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ میں نے اپنے مہمانوں سے کہا۔ "تم لوگ بریک لے لو۔ میں مارتھا سے بات کر کے آتی ہوں۔"

میں اس کا بنایا ہوا نمونہ لے کر اس کے کمرے میں پہنچی تو وہ اپنے بریسلیٹ پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے یہ ہنگامہ ہوا لیکن کیا کروں۔ میں بھی گولیوں اور جرم کی باتیں سنتے سنتے تنگ آ گئی تھی۔"

میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "بہت خوب صورت بریسلیٹ ہے، کیا کسی شاگرد نے تحفے میں دیا تھا؟"

"ہاں، وہ ایک نوجوان شخص تھا جسے میں نے کچھ عرصہ پڑھایا تھا۔"

میں نے وہ نمونہ اس کے سامنے والی میز پر رکھ دیا اور بولی۔ "کیا یہ تحفہ بھی اسی شاگرد کے لیے ہے۔ میرا مطلب ہے آرنلڈ بیلمونٹ۔"

اس کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا اور وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "اوہ خدایا! انہوں نے مجھے تلاش کر لیا۔ تم مجھے مارنے کے لیے آئی ہو۔ میں ایک ایک پائی واپس کر دوں گی۔ قسم کھاتی ہوں کہ مجھے اس باکس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے تو اس کے مرنے کے بعد وہ باکس کھولا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں اس کے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میں مخبریات فروش نہیں ہوں اور نہ ہی ان کے لیے کام

digestpk.blogspot.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتی ہوں۔ میں تو ایک عام سی سیکریٹری ہوں جس کا شوہر روزانہ اخبار سے جرائم کی خبریں پڑھ کر سناتا ہے۔ تم نے ڈیمر اینڈرزی کے نمونے میں عقاب اور پہاڑی کے طور پر پیش کیا ہے جس سے میرے ذہن میں آرنلڈ ہنل مونٹ کا نام تازہ ہو گیا لیکن تمہارا تحفہ لینے سے پہلے وہ اس دنیا سے چلا گیا۔ اس نے تمہارے پاس اپنی ایک امانت رکھوائی تھی کیونکہ سپلائرز کو اس پر چوری کا شبہ ہو گیا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ اس کی رقم تمہارے پاس محفوظ رہے گی لیکن اس کے باوجود وہ قتل کر دیا گیا۔“

”اس کی عمر صرف انیس سال تھی۔ وہ ایک اچھی زندگی گزارنے کا خواہش مند تھا۔ اسی لیے میں اس کی امانت رکھنے پر رضامند ہو گئی۔ اس کے مرنے کے بعد جب میں نے باکس کھولا تو حقیقت معلوم ہوئی۔“

”تمہیں شاید یہ ڈر ہو کہ اس نے مرنے سے پہلے قاتلوں کو تمہارے بارے میں نہ بتا دیا ہو لہٰذا تم نے چھپنے کے لیے اس مرکز کا انتخاب کیا۔ حالانکہ تمہیں پولیس کو اطلاع دینی چاہیے تھی۔“

”مجھے ڈر تھا کہ وہ میری بات پر یقین نہیں کریں گے اور یہی سمجھا جائے گا کہ میں بھی آرنلڈ کے ساتھ مل کر کام کرتی تھی۔ ویسے بھی میرے لیے یہ رقم بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ میں نے ساری عمر مفلسی میں گزاری ہے۔ بہت جدوجہد کی ہے اس لیے میں اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھتی تھی۔“

”تمہیں یقین ہے کہ وہ رقم محفوظ ہے اور کسی نے اسے ہاتھ نہیں لگایا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

میں نے اس فائل کو دیکھا جس میں کھانا پکانے کی ترکیبیں لکھی ہوئی تھیں اور بولی۔ ”یہ فائل تو بہت بڑی ہے لیکن اس کے صفحات بہت کم ہیں۔ میرا خیال تھا کہ تم نے رقم اس میں چھپائی ہوگی اور کسی نے اس میں سے نکال لی۔“

”تمہارا مشاہدہ بہت اچھا ہے۔“ وہ تعریفی انداز میں بولی۔ ”میں نے پہلے وہ رقم اسی فائل میں چھپائی تھی لیکن جب فریڈ نے ہمارے کمروں کی تلاشی لی تو میں گھبرا گئی اور میں نے وہ پیسے کہیں اور چھپا دیے۔ اب وہ رقم محفوظ جگہ پر ہے۔ میں اس میں سے آدھے پیسے تمہیں دے سکتی ہوں۔“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”پولیس آفیسر آ رہا ہے۔ تم سب باتیں اسے بتا دینا۔“

”تم نے پولیس کو بھی بلا لیا۔ اب وہ مجھے یہ رقم رکھنے کے الزام میں گرفتار کر لیں گے۔“

”وہ تمہیں گرفتار کرنے نہیں بلکہ یہ جاننے کے لیے آ رہا ہے کہ تمہیں کس نے مارنے کی کوشش کی تھی۔“

لیفٹیننٹ بروک کے آنے سے پہلے میں خود بھی بہت کچھ جان چکی تھی۔ پہلے میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کوئی شخص برائن یا مارتھا کو کیوں مارنا چاہ رہا ہے۔ ہر قتل کا کوئی نہ کوئی محرک ضرور ہوتا ہے اور اب وہ محرک واضح ہو گیا تھا۔ سینٹر کے کسی فرد کو اس رقم کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا اور وہ اسی لیے مارتھا کو راستے سے ہٹانا چاہ رہا تھا تاکہ اس کے مرنے کے بعد چپکے سے اس رقم کو ہتھیا سکے لیکن مارتھا نے ہوشیاری سے وہ رقم کسی دوسری جگہ منتقل کر دی اور بے چارہ برائن مارتھا کی چائے پینے کے چکر میں مارا گیا جس میں کسی نے زہر آلود پانی ملا دیا تھا۔

لیکن قاتل کا پتا چلانا ابھی باقی تھا۔ فیلیکس تو پہلے ہی بہت دولت مند تھا اور اس کی ضروریات بھی بہت مختصر تھیں۔ لہٰذا اس پر شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کورٹنی بھی امیر ماں باپ کی بچی تھی جبکہ رولینڈ ایک ہفتے میں اتنا کما لیتا تھا جتنا دوسرے لوگ سال بھر میں بھی نہیں کما سکتے تھے البتہ ان دنوں وہ دونوں ہی مشکلات کا شکار تھے۔ اب یہ معلوم کرنا باقی تھا کہ ان دونوں میں سے کس نے مارتھا کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی یا وہ کون تھا جسے اس رقم کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی اور میں کمرے سے نکل کر باہر ہال میں آ گئی۔ بروک مجھے دیکھتے ہی بولا۔

”میں نے تمہیں خاموش رہنے کے لیے کہا تھا لیکن تم نے اپنے طور پر تفتیش شروع کر دی۔ کیا تمہیں اس عورت پر شبہ ہے؟“

”مارتھا قاتل نہیں ہے بلکہ اس کی جان لینے کی کوشش کی گئی تھی۔“

”ہم برائن کے قتل کی تفتیش کر رہے ہیں۔ یہ مارتھا بیچ میں کہاں سے آ گئی؟“

”میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔ مارتھا کے پاس بھی کہنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ اس کے بعد میرا خیال ہے کہ تمہیں کورٹنی سے بھی بات کرنا ہوگی۔“

☆☆☆

”یہ بتاؤ کہ مارتھا نے وہ رقم کہاں چھپائی تھی؟“ سام نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے دوسری بار۔“

میں نے بروک کے لیے لیمن جوس کا گلاس بنایا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”اس نے یہ رقم ایک تکیے میں سی کر بڑے کمرے میں رکھ دی تھی۔ مجھے اس پر پہلے ہی غور کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ پہلے روز میں نے وہاں دو تکیے دیکھے تھے جبکہ اگلے دن ان میں ایک کا اضافہ ہو گیا تھا۔ لگتا ہے کہ فریڈ کی جانب سے کمروں کی تلاشی کے بعد مارتھا گھبرا گئی۔ اس نے بڑے کمرے سے ایک تکیہ اٹھایا۔ اس میں اپنی رقم رکھ کر اسے سی دیا اور واپس پرانی جگہ پر رکھ کر چلی گئی۔“

”لیکن تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا کہ کورٹنی نے ہی مارتھا کو مارنے کی کوشش کی ہوگی، وہ رولینڈ بھی تو ہو سکتا تھا۔“ بروک بولا۔

”اس کی ایک نہیں کئی وجوہات ہیں۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”برائن نے کورٹنی پر مارتھا کے کمرے میں جانے اور اس کے جرنل میں سے آئیڈیا چرانے کا الزام لگایا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا کیونکہ اگلے روز اس نے برائن کے جرنل سے بھی نقل کی تھی۔ یہ اس کی پرانی عادت ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب وہ مارتھا کے کمرے میں گئی تو اس نے وہ فائل بھی دیکھی ہوگی جس میں کھانا پکانے کی ترکیبیں درج ہیں۔“

”وہ ایسا کیوں کرے گی؟“ سام نے پوچھا۔

”اس لیے کہ اس فائل کی وہاں موجودگی کسی کو بھی چونکنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ جب سینٹر میں ہر طرح کے کھانے فراہم کیے جاتے ہیں تو اس فائل کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ کورٹنی نے جب وہ فائل کھولی تو رقم کی موجودگی کا انکشاف ہوا لیکن مارتھا کسی وقت بھی کمرے میں آ سکتی تھی اس لیے فوری طور پر وہ اپنا کام نہ کر سکی۔“

”پھر بھی اس نے تین سو ڈالر تو نکال ہی لیے۔“ بروک بولا۔ ”ہم نے وہ رقم اس کے گدے کے نیچے سے برآمد کر لی ہے۔“

”وہ جانتی تھی کہ مارتھا کے ہوتے ہوئے وہ اتنی بڑی رقم نہیں چرا سکتی اگر مارتھا چوری کی رپورٹ کر دیتی تو اس کے لیے مسئلہ بن جاتا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ مارتھا ایسا نہیں کر سکتی کیونکہ اس نے خود یہ رقم چھپا کر رکھی ہوئی ہے بہرحال اس نے ان پیسوں کے حصول کے لیے مارتھا کو زہر دینے کا منصوبہ بنایا۔ میرا خیال ہے کہ تم یہ بات ثابت کر سکتے ہو۔“

بروک نے مایوسی سے سر ہلایا اور بولا۔ ”جب میں نے اسے گرفتار کیا تو اس کا کہنا تھا کہ میں اس پر برائن کے قتل کا الزام عائد نہیں کر سکتا کیونکہ وہ برائن کو نہیں بلکہ مارتھا کو مارنا چاہ رہی تھی۔ اگر برائن نے مارتھا کی چائے پی لی تو اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ بڑے سے بڑا وکیل بھی اسے مجرم ثابت نہیں کر سکتا بہرحال ہم نے اس کی الماری سے وہ زہریلا پودا برآمد کر لیا ہے جو مرنز کے عقبی لان سے توڑا گیا تھا۔ کیا تم کچھ مزید ثبوت فراہم کر سکتی ہو مسز ابرم۔“

”اس روز وہ کلاس میں بھی دیر سے آئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی ماں سے فون پر بات کر رہی تھی۔ کیا تم نے وہ فون کال چیک کی تھی؟“

”ہاں۔“ بروک نے کہا۔ ”اس وقت اس کی ماں پیٹ کی تکلیف میں مبتلا تھی اور اس کی کورٹنی سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت بھی وہ مارتھا کے کمرے کی تلاشی لے رہی ہوگی لیکن اسے رقم نہیں ملی تو وہ پاگل ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ مارتھا کے مرنے کے بعد اس کا کمرا مقفل کر دیا جائے گا۔ اس لیے وہ اس سے پہلے ہی وہ رقم حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔ بہرحال اس نے جرم تو کیا ہے۔ اب سزا کا فیصلہ جیوری کرے گی۔“

”مارتھا کا کیا بنے گا؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا اس پر رقم چھپانے کا الزام عائد ہو سکتا ہے؟“

”میرے خیال میں وہ بے قصور ہے اور بلاوجہ ہی اس معاملے میں پھنس گئی۔ ویسے بھی وہ ہم سے پوری طرح تعاون کر رہی ہے۔“

”شاید تم نے غور نہیں کیا کہ اس واقعے کے بعد وہ اور فیلیکس قریب آ گئے ہیں۔ جب تم نے کورٹنی کو گرفتار کیا تو ہم سب بڑے کمرے میں تھے۔ اس وقت فیلیکس، مارتھا کے پاس گیا اور بولا۔ ”مجھے امید ہے کہ تم بالکل پریشان نہیں ہو گی۔ اس پر مارتھا نے اس کا شکریہ ادا کیا اور بولی کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔“

”اس میں کیا خاص بات ہے؟“ سام نے پوچھا۔

”تم نے نوٹ نہیں کیا کہ پچھلی بار فیلیکس نے سوالیہ انداز میں گفتگو نہیں کی اور نہ ہی مارتھا نے اس کی گرامر میں کوئی غلطی نکالی۔ انہیں یقیناً ایک دوسرے سے محبت ہو گئی ہے۔“

”ایسے معجزے محبت میں ہی ہوتے ہیں۔“ بروک جماہی لیتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنی نئی کتاب کے لیے کافی مواد مل گیا ہے اور اس کے لیے تمہیں پبلشرز ڈھونڈنے میں بھی کوئی مشکل نہیں ہوگی۔“

میں مسکرا کر رہ گئی۔ اسے یہ بتانا ضروری نہیں تھا کہ میں پہلے ہی اس کتاب پر کام شروع کر چکی ہوں۔

Digest Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

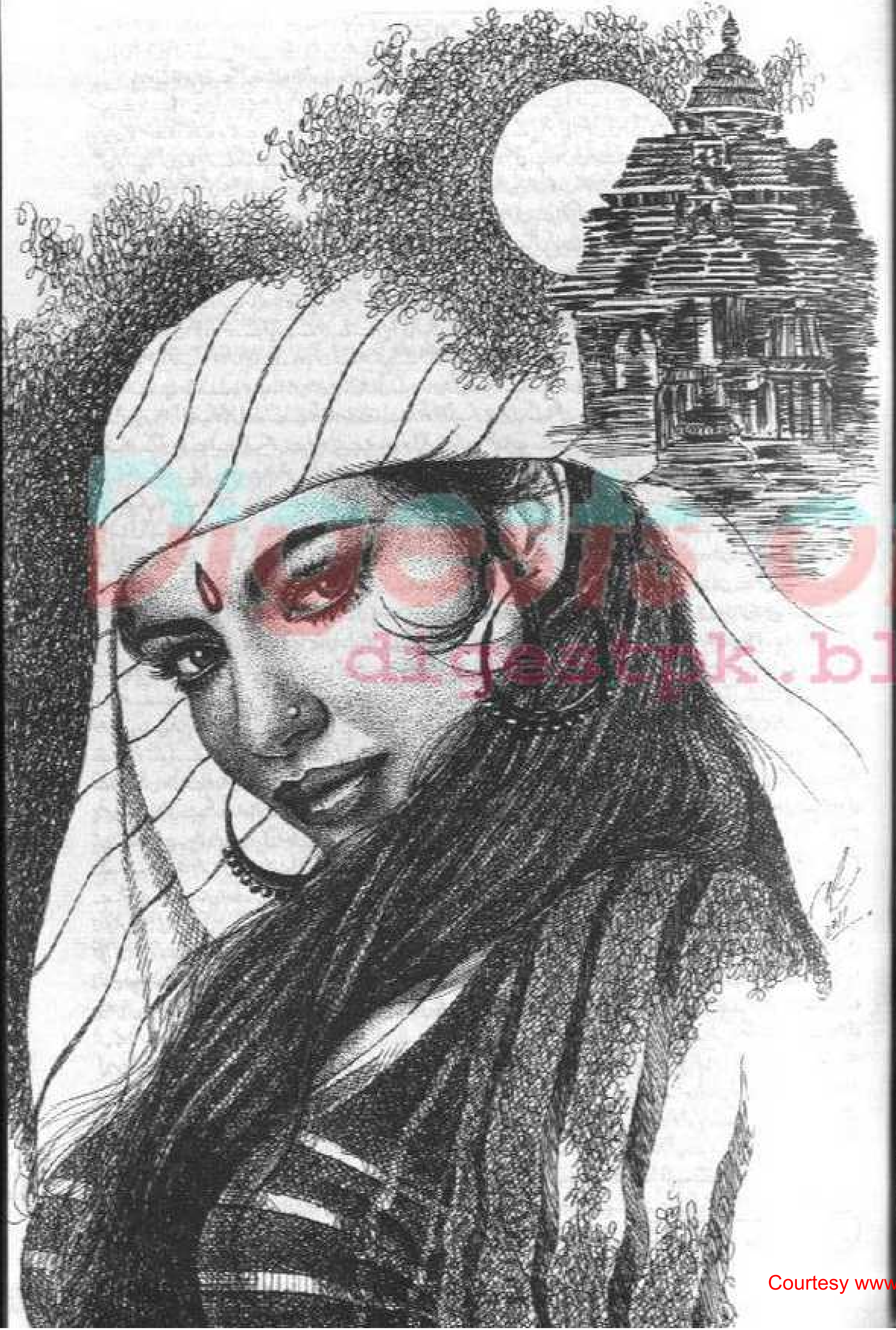

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل۔۔۔ ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

اسما قادری

قسط 25

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ
ڈور با اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی
بدل کے رہ جاتے ہیں۔۔۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی
کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و
تشریح ٹھہرتی ہے۔۔۔ یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر
ہوتی ہے۔۔۔ ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا
نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی
جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے
پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت
نہ تو روایتوں کو مانتی ہے۔۔۔ نہ طبقوں میں
تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب
کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے
اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے
آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے
دھارے سب قسمت کی بازیں اور مقدر کی چالیں ہیں۔۔۔ کبھی بازی پلٹ بھی
جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے۔۔۔ اس
وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔۔۔ جرم،
افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا
آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

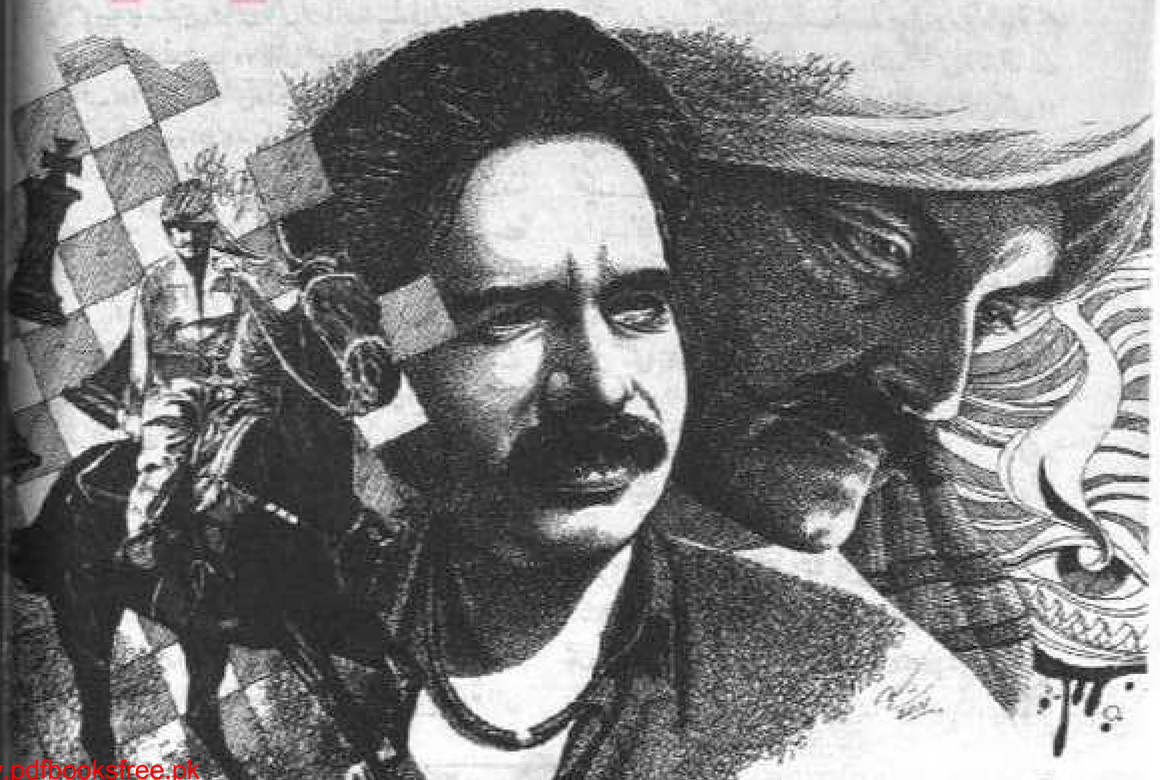

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرنگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں ویرآباد کا چوہدری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا ہے اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ویرآباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہریار کا سہارا پاکر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چوہدری کی مخالفت پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ آفتاب اور کشور خفیہ نکاح کر لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی ویرآباد سے ہے۔ چوہدری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چوہدری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چوہدری اسے اغوا کروا لیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شہریار اپنے ڈرائیور مشاہرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کالونی میں منتقل کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ ماہ بانو کو اغوا کر لیتے ہیں۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چوہدری ماہ بانو کی تلاش میں ہے وہ اسے ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو عمران نامی شخص کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ چوہدری افتخار کو کشور کے غیاب کے حوالے سے ڈیوڈ کی زبانی آفتاب اور اس کے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چوہدری، ماسٹر آفتاب کو اغوا کر لیتا ہے۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کہ مخبر ہوتا ہے وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ادھر مشاہرم خان تربیت کے دوران زخمی ہو جاتا ہے اور پاکستان آرمی والوں کے ہاں پہنچنے سے ان کی تحویل میں آ جاتا ہے۔ شہریار، ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جگو کا سہارا لیتا ہے اور جگو آفتاب کو چوہدری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ ماہ بانو کو بچانے والا مہربان شخص اپنے واقف کار کے توسط سے اسے ایک مجبر سے ملوا دیتا ہے جو ماہ بانو کی فراہم کردہ معلومات کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہریار کو بھی اس واقعے کی اطلاع مجبر کے ذریعے مل جاتی ہے اور شہریار فوراً اسکردو پہنچ جاتا ہے اور مشاہرم خان اور ماہ بانو کو آرمی کی کسٹڈی سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ماہ بانو کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے کراچی منتقل کر دیتا ہے۔ ماہ بانو کراچی میں میڈیکل کالج میں میرٹ کے نام سے داخلہ لے لیتی ہے۔ وہاں اسے راحیلہ نامی ایک لڑکی ملتی ہے جو اس سے گہری سہیلی بن جاتی ہے۔ ماہ بانو اس کی بہن راحیلہ کے بھائی سے ملوانے گھر لے جاتی ہے۔ وہاں ماہ بانو پڑوس کے بچے میں جہاں گیر کو دیکھ لیتی ہے اور شہریار کو مطلع کرتی ہے۔ شہریار فوراً کراچی آ جاتا ہے۔ نگرانی کے دوران اسے سردار نظر آتا ہے۔ وہ اس سے مل کر جہاں گیر کو پکڑ لیتا ہے اور ماریہ کی مدد سے اس پر قبضہ پا لیتا ہے۔ ادھر چوہدری کے کارندے پانچ کوٹ کے گرد آفتاب اور کشور کو پکڑ لیتے ہیں لیکن وہ وہاں سے نکل بھاگتے ہیں۔ کشور کی ملازمہ خاص رانی کا منگیتر اوکنگل میں پوست کی کاشت کا پتا لگاتا ہے۔ اسے وہاں چوہدری کے کارندے دیکھ لیتے ہیں اور اس کا پیچھا کرکے اسے مار دیتے ہیں۔ جہاں گیر (درما) کے لوگ درما کو اسپتال سے نکال لے جاتے ہیں۔ لیاقت داد پر قاتلانہ حملے کی خبریں کر شہریار پریشان ہو جاتا ہے اور انہیں دیکھنے کے لیے لاہور جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر ماریہ بھی اس کے ساتھ لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے۔ راستے میں ڈاکٹر ماریہ کی طبیعت کی خرابی کے باعث انہیں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں مختصر قیام کرنا پڑتا ہے۔ اس قیام کے دوران وہ ماریہ کے قریب ہو جاتا ہے۔ ماہ بانو ایک بار پھر چوہدری کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ ادھر شہریار اپنے قدم بہکنے پر خود کی اور ماریہ کی نظروں میں گر جاتا ہے اور ماریہ کی خواہش پر اس سے شادی کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ وڈی چوہدرائن اپنے داماد سے ماہ بانو کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کرتی ہے اور اشرف شاہ، ماہ بانو کو چوہدری کی قید سے نکال کر ڈاکوؤں کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ ماہ بانو ڈاکوؤں کے جنگل میں ہوتی ہے اور ان کے کام کاج کرتی ہے۔ وہاں موجود ڈاکو اسلم کے مطابق اس نے سردار سے ماہ بانو سے متعلق اجازت لے لی ہوتی ہے کہ ماہ بانو پر صرف اس کا حق ہے۔ مگر وہ ماہ بانو کو غلط نظر سے نہیں دیکھتا۔ ماہ بانو کو پسند کرنے لگتا ہے۔ وہ ماہ بانو کو کھلی فضا میسر کرنے کے لیے اپنی بنائی ہوئی ایک پھلواری میں لے جاتا ہے۔ مشاہرم خان آرمی کسٹڈی سے چھوٹ کر واپس آ جاتا ہے۔ آفتاب شہریار کو فون کر کے اسے را کے ایجنٹ کی اسلام آباد میں موجودگی کی اطلاع دیتا ہے۔ ایک رات غلام محمد نامی را کا ایجنٹ آفتاب کے گھر پر دھاوا بول دیتا ہے۔ اس لڑائی میں کشور کو گولی لگتی ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے تاہم غلام محمد پکڑا جاتا ہے۔ شہریار، مشاہرم خان اور فوری کی مدد سے اس پر قابو پاتا ہے۔ ادھر ماہ بانو پھلواری میں بیٹھی ہوتی ہے کہ اسے نسوانی چیخوں کی آواز آتی ہے۔ وہاں موجود ڈاکو جمروقی نامی عورت کی عزت پامال کر رہا ہوتا ہے۔ ماہ بانو اسے اس سے چھڑانے کی کوشش کرتی ہے۔ جمروقی کو چھوڑ کر وہ ماہ بانو کو پکڑ لیتا ہے۔ پھر اسلم بروقت پہنچ کر ماہ بانو کو بچاتا ہے۔ اسلم اور جمروقی میں زبردست لڑائی ہوتی ہے پھر سردار کے آنے پر دونوں کو خاموش ہونا پڑتا ہے۔ بگی غلط بیانی کرتی ہے۔ ادھر کشور کی زندگی بچالی جاتی ہے۔ اس دوران آفتاب کو پتا چلتا ہے کہ چوہدری کے گرگے اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ آفتاب اور کشور بیرونِ ملک چلے جاتے ہیں۔ ادھر فریدہ چوہدرائن کی سازش کا شکار ہو کر سیڑھیوں سے گر جاتی ہے اس کی جان بچ جاتی ہے اور اس کے ہاں ایک بیٹے کی پیدائش ہوتی ہے۔ راحیلہ کو ڈاکٹر طارق ہوٹل میں چھوڑ کر سرپر یا چلا جاتا ہے۔ راحیلہ واپس اپنے گھر آ جاتی ہے۔ اس کی نگرانی پر مامور شہریار کا آدمی اسے رپورٹ دیتا ہے۔ شہریار جگو کو فون کر کے چوہدری کی مرمت کرنے جاتا ہے۔ وہ لائبریری میں بات کر رہا ہوتا ہے کہ اچانک اسے دروازے کے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے سامنے ماریہ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ ذہنی طور پر مضطرب ہوتی ہے تاہم شہریار اسے سمجھا بجھا کر کمرے میں واپس لے جاتا ہے۔ عبدالستار شہریار کو بتاتا ہے کہ ماہ بانو ڈاکوؤں کے پاس ہے۔ شہریار مختار مرزا کو ٹیلی فون کر کے جنگل میں آپریشن پر زور دیتا ہے۔ ادھر چوہدری کے کہنے پر ڈاکو شہریار کے گھر پر دھاوا بول دیتے ہیں اور زیورات لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ چوہدری مختیار، چوہدری افتخار کے گھر جا کر اسے فریدہ کے ساتھ ہونے والی سازش کے بارے میں بتاتا ہے اور فریدہ کو اپنے ساتھ لے جانے کی اطلاع دیتا ہے۔ ادھر ڈیوڈ شہریار کے خلاف چوہدری کی کارروائی سے ملال ہوتا ہے۔ آفتاب کے ہاں ایک لڑکی کی پیدائش ہوتی ہے۔ ادھر ماہ بانو کو اسلم کے ذریعے شہریار کی شادی کی اطلاع ملتی ہے تو وہ صدمے سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ اسلم سے اس کی بے چینی تک چھوڑنے آتا ہے۔ ماہ بانو اس سے کچھ پوچھتی ہے جسے سن کر وہ سوچتا ہے کہ اس کی قوتِ سماعت ٹھیک طرح سے کام کر رہی ہے؟

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

’’تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا اسلم؟‘‘ اسلم ابھی تک گم صُم کی حالت میں کھڑا تھا جبکہ اسے اپنے سوال کا جواب پانے کی جلدی تھی۔ حیرت اور خوشی کی شدت سے گنگ رہ جانے والے اسلم نے سوال دہرائے جانے پر نظریں اٹھا کر اس کا بھرپور جائزہ لیا۔ کچھ دیر قبل اسلم نے ہوش میں لانے کے لیے اس کے اوپر صراحی بھر کر پانی انڈیلا تھا چنانچہ اب وہ اس کے سامنے بھیگی ہوئی کھڑی تھی لیکن اسلم کو لگ رہا تھا کہ صرف اس کا لباس ہی بھیگا ہوا نہیں ہے بلکہ پلکیں بھی بھیگی بھیگی سی ہیں۔ شاید اس کے اندر کہیں بہت زور کا ساون برس رہا تھا جس نے اس کی پلکوں کو بھی بھگو دیا تھا۔

’’تم کچھ بول کیوں نہیں رہے اسلم؟‘‘ اس کی مسلسل خاموشی پر ماہ بانو نے ایک بار پھر اس سے پوچھا۔

’’مجھے یقین نہیں آرہا کہ جو کچھ میں نے سنا ہے، تم نے مجھ سے وہی سوال کیا ہے یا مجھ سے کوئی غلطی ہو رہی ہے؟‘‘ آخر اس نے اپنی خاموشی کو توڑا اور بے بسی سے بولا۔

’’اگر تمہیں یقین نہیں آرہا تو میں اپنا سوال ایک بار پھر دُہرا دیتی ہوں۔ میں نے تم سے پوچھا ہے کہ کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟‘‘ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اپنا سوال دُہرا دیا۔ اپنی زندگی کا یہ اہم ترین فیصلہ اس نے بہت قلیل وقت میں کیا تھا۔ اسلم کے ساتھ پھلواری سے یہاں تک آنے میں جو وقت صرف ہوا تھا، بس اتنے ہی وقت میں اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ پھلواری میں جب وہ شہریار کی شادی کی خبر سن کر فوری صدمے سے سنبھل نہیں سکی تھی اور بے ہوش ہو گئی تھی تو یہ اسلم ہی تھا جو اسے ہوش میں لایا تھا اور پھر بڑی محبت سے سہارا دے کر یہاں تک پہنچایا تھا۔ اسلم کے سہارے یہاں تک آتے ہوئے اس کے دل میں خیال آیا تھا کہ زندگی صرف اپنی خوشیوں اور خواہشوں کے حصول کے لیے جیتے رہنے کا نام نہیں ہے۔ اپنی ذات سے دوسرے کو خوشی دے کر بھی تو جیا جا سکتا ہے اور جب سامنے والا شخص اسلم جیسا ہو تو اس کے لیے تو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اسلم نے اس کے لیے کیا نہیں کیا تھا؟ یہ اسلم ہی تو تھا جس کی وجہ سے وہ ڈاکوؤں کے اس ڈیرے پر اپنی عزت بچا کر رہ رہی تھی۔ وہ پہلی نظر میں اس کی محبت کا شکار ہوا تھا اور پھر اپنی اس محبت میں اس حد تک آگے گیا تھا کہ اپنا سارا مال و اسباب لٹا ڈالا تھا۔ گروہ میں اپنے لیے دشمن بنا لیے تھے اور ہر دم وہ ہر پل اس پر جان نثار کرنے کو تیار رہتا تھا۔ جسے وہ چاہتی تھی وہ تو اس کی دسترس سے پہلے ہی بہت دور تھا اور اب ڈاکٹر ماریا کا بننے کے بعد مکمل طور پر ناقابلِ حصول بھی ہو گیا تھا۔ ان حالات میں کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ وہ اس شخص کا دامن خوشیوں سے بھر دیتی جو بڑی شدت سے اس کے ساتھ کا خواہاں تھا... اور وہ جانتی تھی کہ اس خواہش میں اتنی شدت ہے کہ وہ اس کی یہ خواہش پوری کرنے کے عوض اس سے اپنی کوئی بھی شرط منوا سکتی ہے۔ خود اس کی اپنی ذات کے لیے کوئی ایسی تمنا نہیں تھی جو اسلم پوری کر سکتا لیکن وہ اسلم کے لیے یہ خواہش رکھتی تھی کہ یہ شخص ڈاکوؤں کے اس گروہ سے الگ ہو جائے اور ایک اچھی شریفانہ زندگی گزارے۔

یہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں تھا۔ اس نے کئی بار خود سے یہ دعویٰ کیا تھا کہ دل جس کی محبت میں مبتلا ہے اس کے سوا کسی دوسرے کا نہیں ہوگا لیکن آج وہ اپنے دعوے سے دست بردار ہو گئی تھی تو صرف یہ سوچ کر کہ کسی کو پانے کی تمنا میں ناکام ہونے کے بعد ساری زندگی ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے گزارنے سے کہیں بہتر ہے کہ خود کسی کی بن کر اس کی زندگی سنوار دی جائے۔ وہ اسلم کو بُرائی کی دلدل سے نکال کر شریفانہ زندگی کی طرف لے جاتی تو یہ اس کی اتنی بڑی کامیابی ہوتی جس کی خوشی اسے اپنی ناکام محبت کے دکھ سے نکال دیتی۔ یہ ساری باتیں اس نے ذرا سی دیر میں سوچ لی تھیں اور فوری طور پر اسلم کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ وہ زبان سے تسلیم کرتی یا نہ کرتی لیکن اس حقیقت کو نہیں جھٹلایا جا سکتا تھا کہ اس نے شہریار کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد جذباتی پن میں یہ فیصلہ کیا ہے۔

’’تم نے مجھ سے جو سوال کیا ہے، درحقیقت تمہیں یہ سوال کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ تم جانتی ہو کہ میں اول روز سے تمہارا خواہش مند ہوں اور اگر تم میری بن گئیں تو میرے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔‘‘ اسلم جواب تک حیرت سے ساکت تھا، اس کی خواہش کو دُہرائے جانے پر خوشی سے لرزاں آواز میں بولا۔

’’لیکن میری ایک شرط ہے۔‘‘ ماہ بانو نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ خود اس کی اپنی یہ کیفیت تھی کہ وہ یک دم ہی ہر احساس سے عاری ہو گئی تھی اور کسی روبوٹ کی طرح غیر جذباتی لہجے میں بول رہی تھی۔

’’مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔‘‘ اسلم نے ایک لمحہ لگائے بغیر جواب دیا اور بڑے جذب سے بولا۔ ’’تمہارے کہنے پر تو میں اپنی جان بھی بغیر سوچے سمجھے قربان کر سکتا ہوں۔‘‘

’’تمہیں میری خاطر اس ڈکیت گروپ کو چھوڑنا ہوگا اور ہم شادی تب کریں گے جب اس جنگل سے نکل کر کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مہذب آبادی میں پہنچ جائیں گے۔" اس نے اپنی شرط بیان کی جسے سن کر اسلم کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ دوسری طرف وہ اسے جواب طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتا، کسی نے اسے پکارا۔ اس نے پکارنے والے کی طرف مڑ کر دیکھا۔

"سردار تجھے بلا رہا ہے۔" پکارنے والے نے اسے اطلاع دی تو وہ فوری طور پر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔ ماہ بانو کی نظریں اس کے تیز رفتار قدموں سے لپٹی اس الجھن میں ہی جتلا رہیں کہ جانے اسلم کا فیصلہ کیا ہوگا؟

☆☆☆

"مبارک ہو چودھری صاحب! آپ نانا بن گئے ہیں۔ امید ہے آپ کو یہ خبر سن کر خوشی محسوس ہوئی ہوگی۔ ہمیشہ بڑوں کو کہتے سنا ہے کہ اصل سے سود پیارا ہوتا ہے۔ پوتا پوتی اور نواسا نواسی کی محبت اپنی اولاد سے بڑھ کر محسوس ہوتی ہے، چنانچہ میں آپ سے یہ امید کرتا ہوں کہ آپ اپنی نواسی کی خوشی میں ہماری جان بخشی کر دیں گے اور ہمارے پیچھے اپنے آدمیوں کو بھیجنے کے بجائے ہمیں ہماری دنیا میں سکون سے رہنے دیں گے۔"

کوریئر سروس کے ذریعے حویلی پہنچنے والا وہ خط اگرچہ زیادہ طویل نہیں تھا لیکن چودھری پر بُری طرح اثر انداز ہوا تھا اور یہ اثر منفی تھا۔ خط بھیجنے والا کتابوں کی دنیا کا فرد تھا چنانچہ بدترین حالات میں بھی لوگوں سے اچھی امیدیں رکھتا تھا۔ اب بھی اس نے ایسی ہی امید کے سہارے یہ خط حویلی بھیج ڈالا تھا لیکن اس کی امیدوں کے برخلاف اس خط کو پڑھ کر چودھری سخت طیش میں آ گیا۔ اسے ایسا لگا کہ اس خط کے ذریعے آفتاب نے اس کا مذاق اڑایا ہے اور اسے چیلنج کیا ہے کہ لو، دیکھ لو... تمہارے تمام تر اختیارات اور رعب و دبدبے کے باوجود میں نہ صرف تمہاری بیٹی کو تمہاری ناک کے نیچے سے نکال کر لے گیا بلکہ اسے ایک بچی کی ماں بھی بنا بیٹھا ہوں اور تم اپنے اتنے سارے پچھوؤں کے ہوتے ہوئے میری گرد بھی نہیں پا سکے۔

اس سوچ کے بعد اس کا چراغ پا ہونا لازمی تھا، سو وہ کسی زخم خوردہ درندے کی طرح سرخ آنکھیں لیے ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ اس تک خط پہنچانے والا منشی اللہ رکھا ایک جانب مؤدب کھڑا تھا۔ اسے تجسس تھا کہ خط کے مضمون کو جان سکے لیکن چودھری کا غصہ اس کے تجسس کو سوال بن کر زبان پر آنے سے روک رہا تھا۔ اس نے لفافے کی پشت پر واضح طور پر لکھا آفتاب کا نام پہلی ہی نظر میں پڑھ لیا تھا اور اس نام کو پڑھ کر بُری طرح بے چین ہو گیا تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو چودھری کو لفافہ پہنچانے سے قبل خود اسے کھول کر دیکھ لیتا لیکن ظاہر ہے، یہ ممکن نہیں تھا اور اب بھی وہ یہ نہیں جان سکا تھا کہ خط میں کیا لکھا ہے۔ البتہ اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ خط میں کوئی ایسی بات تحریر ہے جس نے چودھری کی انا کو ٹھیس لگائی ہے جو وہ یوں بلبلایا ہوا نظر آ رہا ہے۔

"اللہ رکھا...!" ٹہلتے ٹہلتے چودھری اچانک رکا اور اسے پکارا۔

"حکم سرکار!" منشی نے فوراً کسی نازک موقع پر اختیار کیے جانے والے مخصوص غلامانہ انداز میں مستعدی سے پکار کا جواب دیا۔

"ذرا وہ لفافہ تو اٹھا کر دے۔" طیش کے عالم میں اس نے خط کو پڑھنے کے ساتھ ہی پُرزہ پُرزہ کر کے لفافے سمیت دور اچھال کر پھینک دیا تھا۔ خط کے پرزے پنکھے کی ہوا کے زور سے کمرے میں ادھر اُدھر بکھر گئے تھے جبکہ لفافہ ایک جانب دیوار کے قریب پڑا ہوا تھا۔ اس کا حکم سنتے ہی منشی پھرتی سے لفافے تک گیا اور جھک کر اسے اٹھانے کے بعد اس کی خدمت میں پیش کر دیا۔ لفافہ ہاتھ میں لے کر اس نے اس پر چھپے مونوگرام کو غور سے دیکھا۔ وہ ایک مشہور کوریئر کمپنی کا مونوگرام تھا۔ اس مونوگرام کے علاوہ لفافے پر حویلی کا پتا اور آفتاب کا نام درج تھا۔ ظاہر ہے، آفتاب نے اپنے نام کے ساتھ اپنا پتا نہیں لکھا تھا۔ اسے ایسی کوئی ضرورت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لفافے کو دیکھتے ہوئے وہ مشکل ہی سہی لیکن ایسا راستہ ڈھونڈ چکا تھا جس کے ذریعے آفتاب اور کشور تک پہنچا جا سکتا تھا۔

"اس کوریئر کمپنی کے دفتر جا کر چھان بین کرواؤ کہ یہ خط کہاں سے بھیجا گیا ہے۔ علاقے کا معلوم ہو گیا تو ہمارے لیے اس مردود ماسٹر تک پہنچنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔" اس نے ہم راز دستِ راست منشی کو حکم دیا۔

"جو حکم سرکار!" منشی بوتل کے جن کی طرح حکم کی بجا آوری کے لیے وہاں سے غائب ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد چودھری نے حویلی کے زنان خانے کا رخ کیا۔ زنان خانے میں اس کی منزل چھوٹی چودھرائن ناہید کا کرا تھی۔ کشور کے حویلی سے فرار ہونے کے بعد وہ اس کی ماں ہونے کے ناتے سخت معتوب ٹھہری تھی اور سزا کے طور پر اسے حویلی کے معاملات سے عملی طور پر بے دخل کر دیا گیا تھا، چنانچہ اب وہ زیادہ تر اپنے کمرے تک ہی محدود رہتی تھی۔ اس سزا کو اس نے اس لیے زیادہ دل پر نہیں لیا تھا کہ اس کے حویلی میں

اختیارات پہلے ہی محدود تھے اور اصل کرتا دھرتا وڈی چودھرائن ہی تھی لیکن اسے کشور کے اقدام سے شدید دکھ پہنچا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ اس جرم کی سزا میں اسے اپنی جان گنوانی پڑے گی اور وہ جیسی بھی تھی ماں تھی۔ اگرچہ اس نے ضرورت سے زیادہ عیش و آرام میں پڑ جانے کے باعث کبھی اپنی اولاد کا خیال رکھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور ہمیشہ اس بات کو کافی سمجھا تھا کہ بے تحاشا دولت اور خدمت گار اس کی اولاد کو آرام پہنچا رہے ہیں لیکن اب اپنی تمام تر بے پروائی اور کاہلی کے باوجود وہ اس غم میں جتلا رہنے لگی تھی کہ جلد یا بدیر اس کی بیٹی ماری جائے گی۔ اس کا حال اس ملزم کی ماں کا سا تھا جسے عدالت سے سزائے موت سنائی جا چکی ہو اور وہ اس دن کے نہ آنے کی دعا کر رہی ہو جب سزا پر عمل درآمد کا دن آئے گا۔ چودھری اس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اسے دیکھ کر چونک پڑی اور عجلت میں اس کے استقبال کے لیے مسہری سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھ جا ناہید! مجھے تجھ سے ایک ضروری گل کرنی ہے۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے چودھرائن ناہید کو واپس مسہری پر بیٹھنے کا حکم دیا اور خود ایک اونچے پایوں والی منقش کرسی پر بیٹھ گیا۔

"حکم کریں چودھری صاحب۔" چھوٹی چودھرائن ناہید اس کے حکم پر بیٹھ تو گئی لیکن اندر سے وہ سخت تشویش میں جتلا تھی کہ جانے چودھری کون سی ضروری بات کرنے آیا ہے۔ اس کا دل تو آج کل کشور میں ہی اٹکا رہتا تھا اور وہ اس خیال سے ہولتی رہتی تھی کہ جانے کب کشور کے بارے میں کون سی خبر حویلی پہنچ جائے۔

"حکم وکم کچھ نہیں ہے۔ تجھے ایک خوشی کی خبر سنانی ہے۔"

"خوشی کی خبر...؟" وہ حیران ہوئی۔ "وہ کیا؟"

"تو نانی بن گئی ہے۔ ابھی ابھی میرے پاس خبر آئی ہے کہ کشور کے ہاں دھی پیدا ہوئی ہے۔" چودھری نے اسے خوشخبری سنائی۔ اسے سن کر وہ بھونچکی رہ گئی۔ وہ بھلا کیسے یقین کر سکتی تھی کہ کل تک جو شخص کشور کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا، آج وہ اس کی بیٹی کی پیدائش کی خبر سن کر خوش ہو سکتا ہے... پھر اسے یہ خبر ملی کیسے تھی؟ کیا وہ کشور تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا؟ یہ خیال آتے ہی اس کا دل بُری طرح دھڑک اٹھا اور اس نے خوف زدہ نظروں سے چودھری کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ جیسی سختی و کرختگی چھائی ہوئی تھی اور کہیں بھی خوشی کی کوئی معمولی سی رمق دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا چودھری صاحب! کیا کشور آپ کو مل گئی ہے؟" آخر کار وہ اپنے خدشے کو حیرت کی شکل میں سوال بنا کر ہونٹوں پر لے آئی۔

"نہیں، کشور مجھے نہیں ملی۔ یہ خبر جو میں نے تجھے سنائی ہے اس کے شوہر نے خط میں لکھ کر بھیجی ہے۔" چودھری نے اسے جواب دیا۔ اس جواب کو سن کر ناہید کو کافی سکون محسوس ہوا اور وہ دل ہی دل میں شکر ادا کرنے لگی کہ چودھری خود کشور تک نہیں پہنچ سکا۔

"میرا دل کرتا ہے کہ اس خوشی میں تجھے کوئی تحفہ دوں۔" وہ جس خوشی کا اظہار کر رہا تھا، اس کی کوئی جھلک اس کے چہرے پر نظر نہیں آ رہی تھی۔

"آپ نے اپنا دل کشور کے لیے نرم کر لیا، میرے لیے یہی کافی ہے۔ ہور کوئی تحفہ نہیں چاہیے مجھے۔" اس نے چودھری کی بات کے جواب میں کہا۔

"پر میرا جی کرتا ہے کہ میں تجھے کوئی ہور تحفہ بھی ضرور دوں۔ میں ایہ کرتا ہوں کہ اس حویلی کے سارے اختیارات تیرے ہاتھ میں دے دیتا ہوں۔ تو حویلی کے اندر کے سارے معاملات دیکھنا۔ آج سے تیرا حویلی میں وہی مقام ہوگا جو وڈی چودھرائن کا ہے۔" چودھری کی بات کسی بم دھماکے سے کم نہیں تھی۔ اس بات کو سن کر وہ کچھ دیر تو سکتہ زدہ سی بیٹھی رہ گئی پھر ذرا ہمت کرتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"لیکن چودھری صاحب، وہ وڈی آپا...؟" اس کے ادھورے جملے میں ہی پورا سوال تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وڈی چودھرائن خود کو اس حویلی کا مالک سمجھتی ہے اور کسی کو بھی اپنے اختیارات میں دخل دینے کی اجازت نہیں دے سکتی۔

"وہ کچھ عرصے آرام کرے گی۔ اسے آرام کی وڈی ضرورت ہے۔" یہ جواب دیتے ہوئے چودھری کے لہجے میں بھیڑیے کی سی غراہٹ تھی۔ چودھرائن نے اس جواب کو سن کر اپنے اندر ایک سرد سی لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی اور مزید کوئی سوال کرنے کی جرأت نہیں کر سکی۔

☆☆☆

"میرے پاس آپ کو سنانے کے لیے ایک اچھی خبر ہے سر!" اس کے پاس ایس پی کا فون آیا ہوا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے یہ جملہ کہا تو وہ چونک پڑا۔ جنگل میں جو آپریشن شروع کیا جانے والا تھا، اس کی منصوبہ بندی میں ایس پی کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ چنانچہ اچھی خبر کا سن کر اسے فوراً

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی یہ خیال آیا کہ خبر کا تعلق آپریشن سے ہی ہے۔

''خبر اچھی ہے تو سنانے میں دیر مت کیجیے ایس پی صاحب! یہاں اچھی خبریں ویسے بھی مشکل سے ہی سننے کو ملتی ہیں۔'' اس نے خوش گوار لہجے میں ایس پی کو جواب دیا۔ یہ ایس پی سابقہ ایس پی معظم تارڑ کے مقابلے میں کافی بہتر آدمی تھا اس لیے وہ اسے پسند کرتا تھا حالانکہ اس شخص نے بعض مواقع پر اسے مایوس بھی کیا تھا خاص طور پر ماسٹر غیب اور اس کے دوسرے ساتھی اساتذہ کے سفاکانہ قتل کے موقع پر وہ جس طرح چودھری کے سامنے بے دست و پا نظر آیا تھا، اس چیز نے اسے کافی تکلیف پہنچائی تھی۔ اس موقع پر ایس پی نے کھل کر اپنا کردار ادا کرنے کے بجائے یہ کوشش کی تھی کہ چودھری اور شہریار کے درمیان صلح ہو جائے اور وہ خود ہاتھیوں کی لڑائی میں روندے جانے سے محفوظ رہے۔ اس نے ایس پی کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا تھا لیکن ساتھ ہی اس کی مجبوری کو بھی قبول کر لیا تھا۔ وہ بے چارہ اس لیے سارے معاملات سے الگ تھلگ رہنا چاہتا تھا کہ اسے اس کی جوان بیٹی کو اغوا کرنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ وہ شخص مجبور اور بزدل تھا لیکن سابقہ ایس پی معظم تارڑ کی طرح کرپٹ نہیں تھا۔ معظم تارڑ تو پولیس کی وردی میں لٹیروں کو تحفظ فراہم کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ کی وجہ سے جنگل سے بڑے پیمانے پر درختوں اور جانوروں کی کھالوں کی اسمگلنگ کی گئی۔ فاریسٹ آفیسر اقبال باجوہ بھی اس جرم میں برابر کا شریک رہا تھا۔ اقبال باجوہ اپنے ہی شریک چودھری کے ہاتھوں موت کے گھاٹ پہنچا اور معظم تارڑ بیرون ملک فرار ہو گیا۔ ان دونوں بے ایمانوں کی جگہ وہ موجودہ ایس پی اور نئے فاریسٹ آفیسر عابد انصاری کو لایا تھا اور ان کی طرف سے خاصا مطمئن بھی تھا۔ خاص طور پر اسے اتنا اطمینان ہو گیا تھا کہ جنگل سے غیر قانونی طور پر درخت کاٹ کر اسمگل نہیں کیے جا رہے ہیں اس لیے اس کے ان دونوں سے تعلقات بھی کافی خوش گوار تھے۔ خاص طور پر وہ عابد انصاری کو خاصا پسند کرنے لگا تھا۔

''خوش خبری یہ ہے جناب کہ ہمیں ایک ایسا مخبر مل گیا ہے جو ہمیں جنگل میں ڈاکوؤں کے ٹھکانے کے متعلق بتا سکتا ہے۔ اس سے ہمیں یہ فائدہ ہوگا کہ ہم جنگل میں اِدھر اُدھر بھٹکنے سے بچ جائیں گے اور افرادی قوت بھی نسبتاً کم ہو جائے گی۔'' ایس پی خود بھی خاصا خوش لگ رہا تھا۔

''خبر تو واقعی اچھی ہے لیکن ایسا کام کا آدمی آپ کے ہاتھ آیا کیسے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا خود ڈاکوؤں سے کوئی تعلق ہو اور وہ ہمیں بھٹکانے کے لیے منظر پر آیا ہو؟'' اس نے شک کا اظہار کیا۔

''ایسا نہیں ہے جناب! اس آدمی کو پولیس والے جانتے ہیں۔ وہ کوئی سادھو قسم کا آدمی ہے۔ سارا وقت اِدھر سے اُدھر بھٹکتا رہتا ہے۔ کبھی آبادی میں نظر آتا ہے تو کبھی مہینوں کے لیے جنگل میں غائب ہو جاتا ہے۔ زیادہ تر خاموش رہتا ہے لیکن جب موڈ میں ہو تو اپنے بارے میں بھی بتانے لگتا ہے۔ اس کی باتوں سے ہی لوگوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے غیاب کے عرصے میں کہاں بھٹکتا رہا... جنگل کے کس حصے میں رہا... کیا کھایا پیا اور کیا کچھ دیکھا۔ لوگ اس کی باتوں کو بہت زیادہ توجہ سے نہیں سنتے ہیں۔ یہ تو اتفاق ہے کہ کل شب جب وہ اپنی خاموشی کا روزہ توڑ کر بولنا شروع ہوا اور جنگل میں اپنے بسیرے کی داستان سناتے سناتے ڈاکوؤں کو دیکھنے اور ان کے پیچھے پیچھے ان کے ڈیرے پر پہنچنے کی داستان سنا رہا تھا تو قریب ہی موجود پولیس کے ایک آدمی نے اس کی باتیں سن لیں۔ وہ اس سادھو کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے آیا اور اس سے ڈاکوؤں کے ٹھکانے کے بارے میں خاصی معلومات اگلوا لیں۔'' ایس پی نے جوش و خروش کے ساتھ اسے تفصیل سے آگاہ کیا۔

''آپ کے خیال میں ہم اس قسم کے کسی آدمی کے بیان پر اتنے اہم آپریشن میں اپنا لائحہ عمل طے کر سکتے ہیں؟'' ایس پی کے جوش و خروش کے باوجود وہ بھروسا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''آئی تھنک سر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ میرے آدمیوں نے جو معلومات فراہم کی ہیں، اس کے مطابق سادھو بابا کا ان سے تعلق نہیں ہے۔ وہ بس تنہائی پسند اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا ہے۔ یہ بات اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ ایک بار گاؤں کی ایک بچی گم ہو گئی تھی اور ہر طرف ڈھونڈنے کے باوجود اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ ایسے میں سادھو بابا جنگل سے برآمد ہوا اور اس نے بتایا کہ بچی جنگل میں ہے اور وہاں ایک درخت کے نیچے سو رہی ہے۔ لوگوں نے سادھو سے جگہ کے متعلق معلومات حاصل کیں اور دوڑ پڑے۔ بچی عین اسی جگہ موجود تھی جس کی سادھو نے نشان دہی کی تھی۔''

''اوہ...! اگر ایسا ہے تو ہمارے لیے یہ بہت ہی بہترین ہے۔ آپ کا کیا ارادہ ہے، آپریشن کے دوران اسے اپنے ساتھ رکھیں گے یا نہیں؟'' ایس پی کے بیان پر اسے خود بھی سادھو کی اہمیت کا احساس ہوا اور اس نے سوال کیا۔

''ساتھ تو خیر نہیں رکھ سکتے۔ وہ من موجی آدمی ہے، ہمارے کہنے پر ہمارے ساتھ چلنے پر راضی نہیں ہو سکتا اور اگر راضی ہو بھی گیا تو جانے کب راستے میں ہی اپنا رخ بدل لے کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ جو کچھ اس نے بتایا ہے، اس کی اس سے مزید تصدیق و تفتیش کر لی جائے تا کہ کسی قسم کا کوئی ابہام نہ رہے اور ہم صحیح مقام پر پہنچ سکیں۔'' ایس پی نے ذرا وضاحت کے ساتھ اسے جواب دیا۔

''اوکے! جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ لیکن یہ بتائیں کہ سادھو کا آپ کیا کریں گے؟ وہ پولیس کسٹڈی میں ہی رہے گا یا اسے آزاد کر دیا جائے گا؟'' اس نے ذہن میں ابھرنے والے کسی خیال کے تحت ایس پی کو کریدا۔

''جب تک پولیس فورس جنگل میں داخل نہیں ہو جاتی، وہ احتیاطاً پولیس کسٹڈی میں رہے گا، اس کے بعد اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ وہ کوئی مجرم تو ہے نہیں کہ اسے قید میں رکھا جائے۔ ہماری فورس کے جنگل میں داخل ہونے کے بعد وہ قطعی بے ضرر بھی ہو جائے گا۔ ویسے بھی اس پر جس طرح خاموشی کے دورے پڑتے ہیں اس کے پیش نظر یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی کو اس بارے میں کچھ بتائے گا یا اگر بتا بھی دے گا تو زیادہ سے زیادہ یہی بتا کر وہ ڈاکوؤں کے ٹھکانے کے بارے میں جانتا ہے اور اس نے یہ بات پولیس کو بتا دی ہے... تو اس سے ہمارے آپریشن پر کیا فرق پڑ سکتا ہے؟ ہماری اپنی پلاننگ تو کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی نا!'' ایس پی نے اسے مدلل جواب دیا۔

''ٹھیک ہے ایس پی صاحب! آپ مطمئن ہیں یہ کافی ہے۔ اس سارے معاملے کو دیکھنا تو آپ ہی کو ہے۔ باہر سے جو لوگ آپ کی مدد کے لیے آئیں گے وہ تو آپ کے آرڈرز کو ہی فالو کریں گے۔'' اس نے ایس پی پر اپنے بھروسے کا اظہار کرتے ہوئے گفتگو کو سمیٹ دیا۔

''اوکے سر! یہ سب آپ کے پرسنل انٹرسٹ کی وجہ سے ہو رہا ہے اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کو اپ ڈیٹ کر دوں ورنہ آپ کی یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے کہ اس معاملے کو مجھے اور میرے عملے نے ہی دیکھنا ہے۔ اچھا اب اجازت دیجیے۔ ان شاء اللہ اب کامیابی کی خوش خبری کے ساتھ ہی دوبارہ بات چیت یا گفتگو ہوگی۔'' ایس پی نے خوش خلقی سے ہنستے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ اس کی کال سے فارغ ہوا ہی تھا کہ موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔

''السلام علیکم ماموں جان! کیسے سب خیریت ہے نا۔ آپ کے مزاج تو اچھے ہیں؟'' اسکرین پر آفرین رانا کا نمبر دیکھ کر اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کال ریسیو کی اور خوش دلی سے بات کرنے لگا۔

''میرے مزاج تو اچھے ہیں لیکن میں اور تمہارے ماموں جان تمہاری مزاج پرسی کے لیے پہنچے ہوئے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ گھر کب تک پہنچ رہے ہو؟'' جواباً وہ رعب سے بولیں تو وہ خوش گوار حیرت میں گھر گیا۔

''کیا واقعی آپ دونوں یہاں پر ہیں؟'' اس کی حیرت و خوشی کا اظہار اس کے لہجے سے بھی ہوا۔

''تو تمہارے خیال میں، میں تمہیں بغیر موقع کے اپریل فول بنا رہی ہوں؟'' آفرین رانا نے مصنوعی ناراضی کا اظہار کیا۔

''ناراض مت ہوں۔ میں بس ابھی پانچ منٹ میں گھر پہنچ رہا ہوں۔'' اس نے ہنستے ہوئے ان سے کہا اور لائن کاٹ کر اپنی جگہ سے اٹھ ہی رہا تھا کہ انٹرکام بج اٹھا۔

''سر! فاریسٹ آفیسر عابد انصاری آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔'' دوسری طرف سے عبدالمنان نے اسے اطلاع دی۔

''اوکے! انہیں اندر بھیج دو۔'' وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ عابد انصاری ایسا شخص نہیں تھا کہ وہ اس کی ملاقات کی خواہش کو ٹال سکتا۔ چند لمحوں کے بعد عابد انصاری اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے حسب معمول سفاری سوٹ پہن رکھا تھا اور آنکھوں پر نفیس فریم کی عینک تھی۔

''آپ کیا لینا پسند کریں گے انصاری صاحب! ٹھنڈا یا گرم؟'' وہ دفتر میں بیٹھ کر لوگوں کی خاطر داری سے عموماً پرہیز ہی کرتا تھا لیکن عابد انصاری کی بات ذرا الگ تھی۔

''ان تکلفات میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے شہریار صاحب! میں آپ کا زیادہ وقت لینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ایک چھوٹی سی بات کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، وہ کام ہو جائے تو آپ سے اجازت چاہوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ خاصے مصروف آدمی ہیں اس لیے میں آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔'' اس نے بہت رکھ رکھاؤ سے شہریار سے کہا۔

''آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں انصاری صاحب! اب میں ایسا بھی مصروف آدمی نہیں ہوں۔ چلیں ایسا کرتا ہوں کہ چائے منگوا لیتا ہوں۔ ہم دفتری کام کرنے والوں کو تو چائے ہر موسم میں ہی اچھی لگتی ہے اور ایک پیالی چائے پینے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وقت بھی زیادہ نہیں لگتا۔'' اس نے بڑے خلوص کے ساتھ اسے جواب دیا اور انٹرکام پر چائے کا آرڈر دینے لگا۔

''جی اب فرمائیے کہ آپ نے کس چھوٹی سی بات کے لیے یہاں تک آنے کی تکلیف فرمائی؟'' چائے کا آرڈر دینے کے بعد وہ مسکراتا ہوا عابد انصاری سے مخاطب ہوا۔

''بات یہ ہے اے سی صاحب کہ مجھے کچھ درخت یہاں سے باہر بھجوانے ہیں۔ آپ کے علم میں یہ بات ہوگی کہ کسی بھی جنگل میں درختوں کی کٹائی اور جانوروں کے شکار پر پابندی ہونے کے باوجود مخصوص اوقات میں محدود پیمانے پر ان دونوں باتوں کی اجازت دی جاتی ہے۔ اسی اصول کے تحت میں نے جنگل سے کچھ درختوں کو کٹوایا ہے اور اب یہ کٹے ہوئے درخت ٹرکوں پر لوڈ ضلع سے باہر جانے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ ٹرکوں کو لے جانے والے افراد کے پاس باقاعدہ پرمٹ موجود ہوں گے اور یہ ایک قطعی قانونی کام ہے اس کے باوجود میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کے علم میں یہ بات لے آؤں تاکہ اوّل تو میرے عملے کو راستے میں غیر ضروری تفتیش اور چیکنگ کا سامنا نہ کرنا پڑے، دوسرے میری ذات کسی قسم کے شک وشبے کی زد میں نہ آئے کہ شاید میں بھی سابقہ فاریسٹ آفیسر کی طرح درختوں کی اسمگلنگ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' عابد انصاری نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں انصاری صاحب! اگر کوئی کام قانونی طریقے سے کیا جائے گا تو مجھے اس پر بھلا کیا اعتراض ہوگا اور میں کیوں آپ پر کسی قسم کا شک کروں گا؟ آپ بے فکر ہو کر سامان بھجوایئے، میں پولیس اسٹیشن پر پیغام بھیج دوں گا کہ آپ کے عملے کو پریشان نہیں کیا جائے۔'' اس نے عابد انصاری کو اطمینان دلایا۔

''میں اس تعاون کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں گا۔'' اس نے انکساری سے جواب دیا۔

''شکریے کی کوئی بات ہی نہیں ہے، اگر آپ اس کے علاوہ بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کہہ سکتے ہیں۔'' اس نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

''جی نہیں شکریہ۔'' اس نے انکار کیا۔

''تو پھر آیئے چائے پیتے ہیں۔'' ملازم اسی وقت دروازے پر دستک دے کر چائے سمیت اندر آیا تو وہ عابد انصاری سے بولا۔ چائے کے دوران وہ دونوں اِدھر اُدھر کے موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ معلومات کی دونوں طرف کوئی کمی نہیں تھی اس لیے دونوں کو ہی گفتگو میں لطف محسوس ہو رہا تھا۔

''اچھا بھئی! اب اجازت دیجیے۔ میں چند منٹ کی ملاقات کا سوچ کر آیا تھا اور اب اچھا خاصا وقت گزر چکا ہے۔'' آخر عابد انصاری کو ہی خیال آیا تو اس نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کیا اور اس سے اجازت چاہی۔

''آپ سے باتیں کر کے بہت اچھا لگا انصاری صاحب۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔'' اس نے کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دیا اور پھر بڑے وقار سے چلتا ہوا وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد شہریار واپس اپنی سیٹ پر بیٹھا نہیں اور خود بھی دفتر سے باہر نکل گیا۔ اسے اچھی طرح سے احساس تھا کہ وہ آفرین رانا سے پانچ منٹ میں گھر پہنچنے کا کہہ کر اچھا خاصا لیٹ ہوگیا ہے۔

''کورٹ میں پانچ منٹ اتنے طویل ہوتے ہیں، مجھے نہیں معلوم تھا۔'' گھر پہنچ کر وہ سلام دعا کے مرحلے سے فارغ ہوا تو حسبِ توقع آفرین رانا نے پہلی فرصت میں اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کے اس انداز پر وہ مسکرا دیا اور شرارت سے بولا۔

''اصل میں یہاں ہم نے وقت کو اپنے کنٹرول میں کرنے کا جادو سیکھ لیا ہے۔ ہم جب چاہیں منٹوں کو گھنٹوں میں اور گھنٹوں کو منٹوں میں بدل سکتے ہیں۔''

''یہاں آکر سیکھ لینے کی کیا بات کر رہے ہو۔ یہ ہنر تو سرکاری افسروں اور سیاست دانوں کی گھٹی میں شامل ہوتا ہے۔ بے وقوف تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو تمہاری بات کا یقین کر لیتے ہیں۔'' انہوں نے منہ بنا کر اس کی بات کا جواب دیا تو سب ہنس پڑے پھر لیاقت رانا اس کا شانہ تھپکتے ہوئے بولے۔

''برخوردار! یہ جو تمہاری ممانی جان ہیں انہوں نے اپنی زندگی ان ہی دو کیٹیگریز کے لوگوں کو بھگتتے ہوئے گزاری ہے اس لیے یہ خوب جانتی ہیں کہ ہمارا تمہارا کچا چٹھا کیا ہے۔''

''اسی لیے تو میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری پیاری ممانی جان میری مجبوری کو سمجھ سکتی ہیں۔'' وہ بڑے یقین سے بولا اور لاڈ سے آفرین رانا کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

''ڈیئر ممانی جان! جب میں نے آپ سے فون پر کہا کہ میں پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں تو یقین کریں میں پانچ منٹ میں ہی یہاں پہنچنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن عین وقت پر ایک ایسے ملاقاتی آفس پہنچ گئے کہ میں کسی صورت انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ان سے فارغ ہوتے ہی میں یہاں پہنچا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں بیٹا! میں جانتی ہوں ان مسائل کے بارے میں۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔'' حسبِ عادت انہوں نے اس کے لیے اپنا دل فوراً ہی کشادہ کر لیا۔ ویسے بھی ان کی ناراضی مصنوعی تھی۔ میکے سے لے کر شوہر کے گھر تک انہوں نے مردوں کی یہی مصروفیات دیکھی تھیں اس لیے اس طرح کی باتوں کو خوب سمجھتی تھیں۔

''کھانا لگ گیا ہے۔ آپ لوگ کھانے کے لیے آجائیں۔'' ماریا جو اس گفتگو کے دوران میں خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھی، واپس آکر بولی۔

''آپ لوگ چلیں پلیز۔ میں بس دو منٹ میں چینج کر کے آتا ہوں۔'' وہ دفتر میں پہنے جانے والے پُرتکلف لباس میں خود کو غیر آرام دہ محسوس کر رہا تھا چنانچہ ان لوگوں سے بولتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ ماریا ان دونوں کو اپنی معیت میں ڈائننگ روم میں لے گئی۔ ڈائننگ ٹیبل پُرتکلف کھانے سے سجی ہوئی تھی۔ ماریا نے اپنے سسرالی رشتے داروں کے لیے خاصا اہتمام کیا تھا۔ اس اہتمام کو دیکھ کر آفرین رانا خوشی سے مسکرا دیں۔ شہریار کے ماریا سے شادی کے فیصلے سے وہ جتنی ناخوش تھیں، وہ احساس آہستہ آہستہ معدوم ہونے لگا تھا۔ ماریا ایک پروفیشنل ڈاکٹر ہونے کے باوجود اچھی خاتونِ خانہ ثابت ہو رہی تھی البتہ ماریا کا غیر مسلم ہونا ان کے لیے اب بھی باعث خلش تھا۔ شہریار ان کے لیے شوہر کے بھانجے سے بڑھ کر بیٹے کی سی حیثیت رکھتا تھا اور وہ تشویش میں مبتلا تھیں کہ اس کی آنے والی نسل ایک غیر مسلم ماں کی آغوش میں پرورش پا کر جانے کس رخ پر چل نکلے گی۔

''بڑا تکلف کر ڈالا تم نے۔ تمہارے ماموں جان تو پرہیزی کھانا کھاتے ہیں اور خود مجھے کھانے پینے کا اتنا زیادہ شوق رہا نہیں ہے۔'' کرسی پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے ماریا سے کہا تو ان کے جملے کے آخر میں اداسی کا وہ رنگ بھی تھا جو ایک جوان بیٹے کو گنوا دینے والی ماں کی گفتگو کا لازمی جزو ٹھہرا تھا۔ صبر اور وضع داری کے تقاضے نبھانے کے لیے انہوں نے بے شک خود کو سنبھال لیا تھا لیکن سجاد رانا کی موت نے جو زخم ان کے دل پر لگایا تھا، وہ بھی مندمل ہونے والا نہیں تھا۔

''آپ لوگ پہلی بار یہاں آئے ہیں۔ اتنی مہمان نوازی تو میرا فرض بنتی ہے۔ انکل کے پرہیز کا مجھے علم ہے اس لیے میں نے ان کے لیے الگ سے کھانا بنوایا ہے۔ باقی آپ کو میری خاطر ہر ڈش ضرور چکھنی ہوگی۔'' اس نے محبت بھرے اصرار سے کہا تو وہ سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے مسکرا دیں۔ اپنی قلبی کیفیت جو بھی تھی لیکن وہ بڑی بامروت اور وضع دار خاتون تھیں جنہیں دوسروں کا خیال اپنی ذات سے کچھ بڑھ کر ہی رہتا تھا۔

لیاقت رانا اس گفتگو کے دوران خاموش رہے تھے۔ وہ بہت زیادہ بولنے والے آدمی نہیں تھے۔ شیبا اور سجاد رانا کی موت کے صدمے کے بعد پے در پے گھیر لینے والی بیماریوں نے انہیں بہت کمزور کر دیا تھا اور وہ پہلے کی نسبت اور بھی کم بات کرنے لگے تھے۔

''ارے، آپ لوگوں نے ابھی تک کھانا شروع نہیں کیا؟'' شہریار اپنے کہے کے مطابق دو منٹ میں ہی چینج کر کے ڈائننگ روم میں پہنچ چکا تھا۔

''تمہاری بیگم نے اہتمام ہی اتنا کر ڈالا ہے کہ کچھ نہیں آ رہا کہاں سے شروع کریں۔'' آفرین رانا نے شگفتگی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''یہ مشکل میں آسان کر دیتا ہوں۔'' وہ ان کے برابر والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ سے ان کی پلیٹ میں کھانا ڈالنے لگا۔

''آپ بھی شروع کریں نا انکل۔'' ماریا نے لیاقت رانا سے کہا تو انہوں نے اپنے سامنے رکھے پرہیزی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ دوسری طرف آفرین رانا اور شہریار کے درمیان لاڈ پیار کا سلسلہ جاری تھا۔

''اتنا کھانا...... تمہیں کس نے بتایا ہے کہ میں نے پیٹ بھر کے کچھ نہیں کھایا ہے؟'' وہ مختلف ڈشز سے اپنی پلیٹ میں منتقل کیے جانے والے کھانے کو دیکھ کر شہریار سے احتجاج کر رہی تھیں۔

''کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے، آپ کی حالت دیکھ کر پتا چل رہا ہے کہ آپ کافی عرصے سے کھانا کھانے کے بجائے صرف سونگھنے پر اکتفا کر رہی ہیں۔ اگر آج بھی آپ نے اپنی یہ روش برقرار رکھی تو بے چاری ماریا کا دل ٹوٹ جائے گا۔ اس نے اتنا اہتمام آپ ہی کے لیے تو کیا ہے، ورنہ مجھے کہاں اتنا پُرتکلف کھانا کھانے کو ملتا ہے۔'' وہ ماموں، ممانی کو اپنے گھر میں پا کر دلی خوشی محسوس کر رہا تھا اس لیے لہجے میں بھی کچھ شوخی آگئی تھی۔ اسے ماریا کا اپنے عزیزوں کا اتنا خیال رکھنا بھی اچھا لگا اور اس کی خوبیوں میں ایک اور پلس پوائنٹ شامل ہو گیا۔

''یہ اتنی باتیں اس کے سامنے بنانا جو تمہیں جانتا نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو۔ میں نے تو تمہیں اپنے ہاتھوں سے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے۔ کیا مجھے نہیں معلوم کہ تم کس طرح کا کھانا کھاتے ہو۔ یہ بے چاری اگر تمہارے لیے اہتمام کروا بھی لے تو تم کون سا خوش ہو جاؤ گے۔ تمہیں کہاں اچھے لگتے ہیں یہ کوفتے کباب اور نہاری قورمہ جیسے کھانے۔ تم جو پھیکے سیٹھے ذائقے پسند کرتے ہو وہ تو تمہارے ماموں جان کے پرہیزی کھانے میں ہی مل سکتے ہیں۔" انہوں نے اس کی اچھی خاصی کھچائی کر دی لیکن کھانے کا سلسلہ بہرحال جاری تھا۔ وہ اپنی عادت اور خواہش کے برخلاف صرف ماریا کو خوش کرنے کے لیے کھانے سے رغبت کا اظہار کر رہی تھیں۔

"آپ لوگ یہاں آ رہے تھے تو مریم بھابی کو بھی ساتھ لے آتے۔ فیملی کے سب لوگ ایک ساتھ جمع ہوں تو اچھا لگتا ہے۔ وہ ہوتیں تو اس وقت فیملی مکمل ہو جاتی۔" کھانے کے دوران میں اسے خیال آیا تو اس نے آفرین رانا سے کہا۔

"مریم کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ ہمارے ساتھ نہیں آ سکی لیکن تمہاری خواہش اس طرح پوری ہو سکتی ہے کہ تم لوگ ہمارے ساتھ لاہور چلو۔ ہم بھی کچھ دن سکون سے رہیں کہ ہمارے بچے ہماری نظروں کے سامنے ہیں اور خیریت سے ہیں۔" اس کی بات سے سرا پکڑتے ہوئے آخرکار آفرین رانا اپنے مطلب کی بات پر آ گئیں۔

ان کی بات سن کر شہریار نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔ وہ پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ ان دونوں کا یوں اچانک چلے آنا خالی از علت نہیں ہے۔ اب ان کے الفاظ سن کر اسے اچھی طرح سمجھ آ گیا کہ وہ لوگ اس کے بنگلے پر ہونے والی ڈکیتی کی خبر سننے کے بعد پریشان ہو کر یہاں پہنچے ہیں اور لیاقت رانا کی خاموشی سے ظاہر تھا کہ جو کچھ آفرین رانا کہہ رہی ہیں، وہ اس سے متفق نہیں بھی ہیں تو واقف ضرور ہیں۔

"میں کوشش کروں گا کہ فرصت ملتے ہی لاہور پہنچوں۔ فی الحال یہاں کچھ معاملات ایسے ہیں جنہیں میرا دیکھنا ضروری ہے۔ آپ ایسا کریں کہ ماریا کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ یہ کچھ دن آپ کے ساتھ رہ لے گی پھر میں بعد میں اسے لینے آؤں گا تو خود بھی ایک دو دن کے لیے رک جاؤں گا۔" غیر محسوس انداز میں کھنکھارتے ہوئے اس نے بہت سنبھل کر یہ تجویز پیش کی تاکہ آفرین رانا کو قائل کر سکے۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اپنی اندرونی کیفیت کو اس سے چھپا رہی ہیں اور درحقیقت اندر سے بے حد مضطرب ہیں لیکن وہ اس کے اندازے سے بھی زیادہ جذباتی بحران کا شکار تھیں اور کچھ اور ہی ٹھان کر یہاں آئی تھیں چنانچہ بڑے دوٹوک انداز میں بولیں۔

"میں تم لوگوں کو چند دن کے لیے لاہور آنے کی دعوت نہیں دے رہی ہوں۔ میں تمہارے لاہور میں مستقل قیام کی بات کر رہی ہوں۔ چھوڑو اس نوکری کو۔ اتنا پیسا چھوڑ کر گئے ہیں تمہارے ماں باپ۔ تمہارے ماموں جان کے پاس بھی جو کچھ ہے، وہ تمہارا ہی ہے۔ اس رقم سے کوئی اچھا سا بزنس کرو۔ ہر وقت کی اس جھک جھک اور مار دھاڑ سے تو جان چھوٹے گی۔" وہ گویا سب کچھ طے کر کے آئی تھیں۔ ان کی تجویز سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا اور سوالیہ نظروں سے لیاقت رانا کی طرف دیکھا۔ وہ بے بسی سے شانے اچکا کر رہ گئے۔ یعنی جو کچھ آفرین رانا کہہ رہی تھیں، وہ خود ان کی اپنی سوچ تھی اور وہ شاید خاموش رہنے کا وعدہ کر کے آئے تھے۔

"آپ اتنی جذباتی کیوں ہو رہی ہیں ممانی جان! ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا کہ میں نوکری چھوڑ چھاڑ ایک طرف ہو کر بیٹھ جاؤں اور اپنی شکست کا اعتراف کر لوں۔" آخر جب یہ طے ہو گیا کہ اسے اپنی وکالت خود ہی کرنی ہے تو وہ پوری طرح سنبھل کر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تم مجھے بتاؤ کہ اب کیا ہونا باقی رہ گیا ہے؟ جب سے تم نے یہ نوکری کی ہے، کیا کیا نہیں ہوا؟ کئی بار تم زخمی ہوئے۔ تمہیں اغوا کیا گیا۔ دھمکی آمیز فون کالز اور خطوط آتے رہے اور اب رہی سہی کسر اس ڈکیتی نے پوری کر دی۔ کیا تمہاری جان، مال اور عزت تینوں خطرے میں نہیں پڑ گئے تھے؟ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ معاملہ مال پر ہی ٹل گیا۔ اگر اس بچی کی عزت چلی جاتی تو پھر کیا ہوتا؟ تم لاکھ سر پٹختے رہتے لیکن کھوئی ہوئی عزت تو کسی صورت واپس نہیں آتی یا پھر اگر وہ ڈاکو تمہیں قتل کر ڈالتے تو کیا اس نقصان کا کوئی مداوا ہو سکتا تھا؟ ہم نے شینا اور سجاد کو کھویا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اپنی اولاد کو کھونا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جن ہاتھوں سے اولاد کو پروان چڑھایا جاتا ہے، وہ ہاتھ اپنی پلی پلائی اولاد کو قبر میں اتارتے ہوئے کانپ جاتے ہیں اور ہر بار ان ہاتھوں سے اپنی آنکھوں سے بہنے والے آنسو صاف کرتے ہوئے دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔"

وہ اس کے اندازے سے کہیں بڑھ کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ وہ سب لوگ کھانے سے پہلے ہی ہاتھ روک چکے تھے۔ آفرین رانا کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے تو وہ اپنی جگہ سیدھا بیٹھا نہ رہ سکا اور دائیں طرف ذرا سا جھک کر ان کے گرد اپنا بازو پھیلا دیا۔ ماریا بھی لپک کر اپنی جگہ سے اٹھ کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان کے بائیں طرف آ کھڑی ہوئی اور ٹشو پیپر کی مدد سے ان کے آنسو صاف کرنے لگی۔

"میرے خیال میں لیونگ روم میں چلتے ہیں۔ کھانا تو اب مزید کسی سے بھی نہیں کھایا جائے گا۔" لیاقت رانا نے نہایت سنجیدگی سے یہ تجویز پیش کی جس پر سب نے صاد کیا۔ ڈائننگ روم میں بٹلر کا آنا جانا بھی لگا رہتا تھا اور یہ قطعی مناسب نہیں تھا کہ ان کی اتنی نجی نوعیت کی گفتگو کسی ملازم کے علم میں آ جائے۔ ماریا، آفرین رانا کو سہارا دے کر لیونگ روم میں لے آئی اور انہیں پانی پلایا۔ پانی پی کر وہ کچھ پُرسکون محسوس ہونے لگیں۔

"سوری ممانی جان! میری وجہ سے آپ ہرٹ ہوئیں لیکن یقین کریں کہ صورتِ حال اتنی خراب نہیں ہے جتنی آپ محسوس کر رہی ہیں۔" آفرین رانا لیونگ روم میں ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اس صوفے کے قریب عین ان کے قدموں میں کارپٹ پر بیٹھ گیا اور ان کے گھٹنوں پر رکھے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر نہایت رسانیت سے بولا۔ آفرین رانا کے سامنے اس طرح بیٹھا وہ صرف ایک محبت کرنے والا بیٹا محسوس ہو رہا تھا جسے اپنی ماں جیسی ممانی کے قدموں میں بیٹھ کر ساری افسرانہ شان بھول گئی تھی۔

"مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو شہری! یہ ٹھیک ہے کہ میں کبھی عملی میدان میں نہیں اتری اور میں نے اپنی ساری زندگی ایک گھریلو عورت کی طرح گزار دی لیکن یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ مجھ جیسا فیملی بیک گراؤنڈ رکھنے والی عورت اتنی بے وقوف نہیں ہو سکتی کہ حالات کا درست تجزیہ نہیں کر سکے۔ ان علاقوں میں ڈاکوؤں کی سرپرستی کون کرتا ہے اور وہ کس کے اشارے پر کام کرتے ہیں، میں اچھی طرح جانتی ہوں اس لیے تمہارے گھر ہونے والی ڈکیتی کو ایک عام ڈکیتی کی واردات تسلیم نہیں کر سکتی۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ اس موقع پر ڈاکوؤں نے مال و اسباب لوٹنے کے سوا اگر کچھ اور نہیں کیا تو صرف اس لیے کہ تمہارا دشمن تمہیں وارننگ دینا چاہتا تھا۔ اگر تم نے اس وارننگ کو نہیں سمجھا تو آگے چل کر معاملہ اور بھی گمبھیر ہو جائے گا۔" وہ بالکل درست تجزیہ کر رہی تھیں۔ اس بار شہریار انہیں کوئی طفل تسلی نہیں دے سکا اور مناسب یہی سمجھا کہ ان سے کھل کر بات کر لی جائے چنانچہ ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے بولا۔

"ممانی جان! آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں، میں اس کے درست ہونے سے انکار نہیں کروں گا۔ ڈکیتی کے بارے میں جو اندازہ آپ نے قائم کیا ہے، وہی میرا بھی اندازہ ہے۔ میں نے خود کو دی جانے والی وارننگ بھی اچھی طرح سمجھ لی ہے لیکن میں ڈر کر پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آپ اسے میری ضد یا انا کا معاملہ مت سمجھیے گا۔ اگر یہ ضد ہوتی تو میں آپ کے ایک اشارے پر اس سے دست بردار ہو جاتا لیکن میں جس سوچ کے تحت اپنی جگہ پر ڈٹا ہوا ہوں، وہ مجھے قدم پیچھے ہٹانے نہیں دیتی۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر میں اس سیٹ پر ہوں تو اس ملک کا کم از کم ایک ضلع تو کرپٹ افسر سے محفوظ ہے۔ میرے جیسے چند ایک اور بھی ہوں گے لیکن ان میں سے کسی اور کو میری جیسی سہولیات یا فیملی بیک گراؤنڈ شاید ہی میسر ہو۔ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اگر اس نے مجھے حق و باطل میں فرق کا شعور دیا ہے تو ایسے اسباب بھی بہت مہیا کیے ہیں جن کی مدد سے میں اپنی جنگ کو جاری رکھ سکوں... اور یہ اللہ کا اصول ہے کہ جسے..... نوازتا ہے اسے آزمائش میں بھی..... مبتلا کرتا ہے۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں اس آزمائش میں ناکام ہو جاؤں؟ ہزاروں انسانوں کی بھلائی کو بھول کر صرف اپنی جان کی سلامتی کا سوچوں اور وہ سارے اسباق فراموش کر دوں جو آپ نے مجھ میں جذبۂ حب الوطنی پیدا کرنے کے لیے پڑھائے تھے؟ آپ اگر ضد کریں گی تو میں ہو سکتا ہے صرف آپ کی خاطر پیچھے ہٹنے کو تیار ہو جاؤں لیکن کیا یہ بہت سے لوگوں کے ساتھ ناانصافی نہیں ہو گی؟ میں تو پھر اس بزدلی پر اپنے ضمیر کے طعنے سن سن کر ہی مر جاؤں گا۔" وہ بات کرتے کرتے خاصا آزردہ ہو گیا۔ اس موقع پر لیاقت رانا نے اس گفتگو میں دخل دیا اور اس کی حمایت میں آواز بلند کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے آفرین! یہ ہمارے ہاتھوں کا پلا ہوا بچہ ہے۔ ہم سے بڑھ کر کون اسے سمجھ سکتا ہے۔ اگر آج ہم نے زبردستی اسے اس کی جاب سے الگ ہونے پر مجبور کر دیا تو اس کے اندر توانائی کا جو سرچشمہ ہے، وہ سوکھ جائے گا۔ ہم اسے اپنے قریب تو رکھ لیں گے لیکن شہریار عادل کے اصل کو کھو دیں گے۔ میری مانو تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اور اسے وہ جنگ لڑنے دو جو شاید ہم میں سے ہر ایک پر فرض ہے لیکن ہم مسلسل ظلم کے آگے سر جھکانے کی روش اختیار کر کے اس جنگ میں شامل ہونے سے کتراتے ہیں۔ یہ جنگ کسی نہ کسی کو تو لڑنی ہے تو پھر وہ ہمارا یہ بیٹا کیوں نہ ہو کہ ہم بھی فخر سے سربلند کر سکیں اور بارگاہِ الٰہی میں سرخ رو ہوں کہ ہم نے اس مجاہد کی پرورش کی تھی جو اللہ کے حکم کے عین مطابق باطل کو مٹانے کے لیے لڑا۔ اگر میری مانو تو تم اسے بالکل نہیں روکو کیونکہ یہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے، وہ فرضِ کفایہ ہے جو کسی نہ کسی کو

"تو ادا کرنا ہی ہے ورنہ جواب طلبی تو سب ہی سے ہوگی۔"

لیاقت رانا خاموش ہو چکے تھے لیکن ان کے لفظوں کی آنچ اب بھی ہر ایک اپنے دل پر محسوس کر رہا تھا۔ آفرین رانا اپنی جگہ بالکل خاموش اور ساکت بیٹھی تھیں۔

"مجھے اجازت دیں ممانی جان! میں اپنے حصے کا فرض ادا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ پر بہت قرض ہیں۔ مجھے اپنے ہم وطنوں کے لیے کچھ کرنا ہے اور... اور ان قاتلوں تک بھی پہنچنا ہے جنہوں نے میری شینا اور سجاد بھائی کی زندگیوں کا چراغ گل کیا۔ ان قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچائے بغیر مجھے کسی صورت قرار نہیں آئے گا۔" وہ اب بھی آفرین رانا کے قدموں میں بیٹھا تھا اور جلتی آنکھوں سے ان سے مخاطب تھا۔ آفرین رانا نے جواب میں زبان سے کچھ نہیں کہا اور اپنا دایاں ہاتھ اس کے سیاہ گھنے بالوں سے ڈھکے سر پر رکھ دیا۔ یہ ان کا خاموش اجازت نامہ تھا جسے پا کر وہ کھل اٹھا۔

"تھینک یو سو مچ مائی سوئٹ ممانی جان!" اس نے کسی نوعمر لڑکے کی طرح خوشی کا اظہار کیا اور پھر ماریا کی طرف پلٹ کر بولا۔ "ذرا اچھی سی چائے تو بنواؤ۔ ممانی جان کے مان جانے کی خوشی کو ہم خوشبودار و خوش ذائقہ چائے کے ساتھ انجوائے کریں گے۔" اس کے لہجے کی شوخی واپس لوٹ آئی تھی۔ اس ساری صورت حال میں خاموش تماشائی کا کردار ادا کرنے والی ماریا حرکت میں آئی اور انٹرکام کی سہولت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہیں سے چائے کے لیے آرڈر دے دیا۔

"او کے! تو پھر ہم اپنے اسی پروگرام پر واپس آجاتے ہیں۔ ماریا آپ کے ساتھ لاہور جائے گی اور میں بعد میں فرصت ملتے ہی وہاں پہنچوں گا۔"

"لیکن میرا ہیلتھ یونٹ؟" ماریا ذرا ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"تم تو پہلے ہی ڈکیتی کے بعد سے وہاں نہیں جا رہی ہو۔ کچھ دن اور چھٹی کر لو۔ میں تمہارے کسی متبادل کا بندوبست کر دوں گا۔" وہ اتنے حتمی لہجے میں بات کر رہا تھا کہ ماریا کے لیے انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اندر سے سخت جز بز ہونے کے باوجود اسے اس فیصلے کو مسکراتے ہوئے قبول کرنا پڑا۔

☆☆☆

اپنی لگائی پھلواری میں کھڑا اسلم ایک ایک پودے کو الوداعی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ان پھول پتوں سے اسے ایک خاص انسیت تھی۔ یہ اس کی تنہائی کے ساتھی تھے اور انہوں نے اس کے اندر اس گوشے کو سلامت رکھنے میں معاونت کی تھی جو ڈاکو اسلم کے اندر اسلم تنیو کی باقیات تھا۔ ایک ڈاکو کی حیثیت سے وہ جس سفاکی اور بے رحمی پر مجبور تھا، اس پر اس کے اندر کا اسلم تنیو روتا تھا اور وہ اس روتے بلکتے اسلم تنیو کو بہلانے کے لیے اس پھلواری میں لے آتا تھا۔ یہاں نظروں کو تسکین دینے والے ان رنگ برنگے پھولوں کے علاوہ وہ مچان بھی تھی جہاں بیٹھ کر کبھی وہ کسی کتاب کا مطالعہ کرتا تھا اور کبھی دوربین کی مدد سے جنگل میں دور تک کا نظارہ۔ اب اسے یہ سب کچھ چھوڑ کر کسی نئی منزل کی طرف جانا تھا کہ یہی حکم یار ٹھہرا تھا۔ ماہ بانو نے بہت اچانک اسے شادی کی پیشکش کرتے ہوئے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ اس سے شادی اسی صورت میں کرے گی جب وہ اس جنگل سے نکل کر کہیں اور شریفانہ زندگی اختیار کرے گا۔

اس نے ماہ بانو کی یہ شرط بنا کسی سوال جواب کے مان لی تھی اور ان شکوک و شبہات کو ذرا خاطر میں نہیں لایا تھا جو اس کے دل میں سر ابھارتے رہے تھے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ابھی کچھ دن قبل ہی ماہ بانو نے اس کی محبت کو قبول کرنے سے صاف انکار کرتے ہوئے خود کے کسی اور کی محبت میں گرفتار ہونے کا اعتراف کیا تھا اور ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ وہ جس سے محبت کرتی ہے، وہ اسے ملے یا نہ ملے وہ اپنی زندگی اسی کے نام پر گزار دے گی... لیکن پھر اچانک ہی اس نے اپنا یہ فیصلہ بدل کر اسے شادی کی پیشکش کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں سے نکلنے کی شرط رکھ دی تھی۔ اس مشروط پیشکش نے اس کے دل میں یہ شک پیدا کیا تھا کہ شاید وہ اس قید سے نجات کے لیے اس کی محبت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے لیکن وہ اپنے دل و دماغ میں ابھرتے اس شک کو خاطر میں نہیں لایا تھا۔ وہ ایسا ہی دیوانہ عاشق تھا جس کا عشق اسے بنا سوچے سمجھے آگ میں کود جانے پر اکساتا تھا۔ اس نے اپنے اندر پیدا ہونے والے شک کو اس دلیل سے دبا دیا تھا کہ ایک نہ ایک دن تو مجھے تاریک راہوں میں مارا ہی جانا ہے تو پھر کیا یہ زیادہ بہتر نہیں ہے کہ میں اس کی خاطر کچھ کر گزروں جو مجھے بے حد عزیز ہے۔ ویسے بھی وہ ہمیشہ اس دکھ میں جلتا رہا تھا کہ اس کی زندگی اس کے اپنے پیاروں کے کام نہیں آسکی تھی۔ وہ ایک ایسا بے بس بھائی ثابت ہوا تھا جس سے اپنی بہن کی خوشیوں کا بندوبست نہ ہو سکا تھا اور وہ موت کی آغوش میں پناہ لے بیٹھی تھی۔ وہ ایک ایسا بیٹا تھا جس کی ماں آج بھی ایک ایسے گاؤں میں جہاں پانی جیسی بنیادی سہولت بھی دستیاب نہیں تھی، تنہا کسمپرسی کی

زندگی گزار رہی تھی اور اس سے ناراض، اس سے ملنے سے بھی انکاری تھی۔ اپنے ان دونوں عزیز رشتوں سے جدا ہونے کے بعد وہ کبھی کسی سے محبت نہیں کر سکا تھا۔

اسے لگتا تھا کہ اس کے دل کی سرزمین محبت کی فصل کے لیے بنجر ہو گئی ہے لیکن پھر اس کی زندگی میں ماہ بانو چلی آئی۔ ماہ بانو اس کے لیے ایک ایسی لڑکی ثابت ہوئی تھی جس کے سامنے وہ پہلی نظر میں ہی دل ہار بیٹھا تھا اور اس نے اپنی بنجر ہو جانے والی سرزمین دل پر محبت کی کونپل پھوٹتی ہوئی محسوس کی تھی۔ اس کونپل نے اتنی زور آوری کے ساتھ سر ابھارا تھا کہ وہ یہ جاننے کے بعد بھی کہ ماہ بانو کسی اور سے محبت کرتی ہے، مرجھانے نہیں پائی تھی اور آج اسی محبت کو سرخ رو کرنے کا وقت آیا تھا تو وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے گروہ سے بغاوت کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اس نے ماہ بانو کو بتا دیا تھا کہ آج کی رات وہ لوگ وہاں سے نکل پڑیں گے چنانچہ وہ ذہنی طور پر سفر کے لیے تیار رہے۔ وہ آمد و رفت کے لیے استعمال ہونے والے عمومی راستے سے ہٹ کر سفر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا چنانچہ اس سلسلے میں کچھ ضروری تیاریاں بھی کرنا تھیں۔ اس نے پھلواری کی طرف آتے ہوئے چپکے سے ماہ بانو کے کان میں کہہ دیا تھا کہ وہ بھی وہیں آجائے چنانچہ اب اپنے بجائے اس گلستان سے الوداعی ملاقات کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا انتظار بھی کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر گزری تو وہ بھی وہاں آتی نظر آئی۔ پیروں میں پڑی زنجیر کی وجہ سے وہ کافی آہستہ چل رہی تھی۔ اس کے پیروں میں پڑی اس زنجیر نے اسے ہمیشہ بہت تکلیف دی تھی۔ اسے ماہ بانو کا کسی جانور کی طرح اس طرح زنجیر کیا جانا کبھی اچھا نہیں لگا تھا لیکن اس سلسلے میں وہ سردار کو قائل نہیں کر سکا تھا۔ اب آج کی رات وہ اس زنجیر سے بھی نجات پانے والی تھی۔

"تمہارے کام ختم ہو گئے یا ابھی کچھ باقی ہے؟" وہ اس کے نزدیک آئی تو اس نے اس کے ماتھے پر چمکتے موتیوں جیسے پسینے کے قطروں کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ختم ہی سمجھو۔ کھانا پک چکا ہے۔ کپڑوں کی دھلائی کو میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا ہے کہ آج طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔ اس کام کو کل پر اٹھا رکھتے ہیں۔" اس نے رپورٹ دی۔

"یہ تم نے اچھا کیا۔ ہمیں جو سفر کرنا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ تم کچھ دیر آرام کر لو۔ سفر طویل بھی ہے اور مشکل بھی۔ ویسے تو میں نے اپنے طور پر ایسے راستے سے جانے کا فیصلہ کیا ہے جس کی طرف کسی کا دھیان جانا مشکل ہی ہے لیکن وقت کا کیا پتا۔ جب یہاں ہمارے غائب ہونے کا علم ہوگا تو سردار ہماری تلاش میں ہر طرف بندے دوڑا دے گا۔ اگر کوئی تلاش میں آنے والا ہماری راہ پر لگ گیا تو اس سے بھی مقابلہ کرنا ہوگا۔ بہر حال، وہ میرا اپنا مسئلہ ہے، تم یہ چیزیں اپنے پاس رکھ لو۔ آدھی رات کے بعد تیار رہنا۔" اس نے کپڑوں کا ایک تھیلا اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ ماہ بانو نے اس کے ہاتھ سے تھیلا لے کر اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک جوڑی ربر کے نرم جوتے اور مردانہ جوڑا تھا۔ یہ جوڑا گہری نیلی جینز اور دھاری دار سیاہ ہاف آستین کی ٹی شرٹ پر مشتمل تھا۔ اس نے اس سامان کو دیکھ کر اسلم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ جوتے اور کپڑے میں نے آپا حمیداں کے سامان میں سے غائب کیے ہیں۔ جوتے آپا حمیداں کے ہیں۔ تمہیں سائز میں کچھ بڑے ہوں گے، آگے کوئی کپڑا وغیرہ پھنسا کر پہن لینا۔ کپڑوں کا جوڑا اس کے بیٹے کا ہے۔ وہ ایک بار غلطی سے اپنے سامان کے ساتھ رکھ کر لے آئی تھی اور میرے سامنے اس کا ذکر کیا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات رہ گئی اس لیے جب مجھے سفر کے لیے تمہارے کپڑوں کا خیال آیا تو میں یہ کپڑے لے آیا۔ آپا حمیداں کا بیٹا دبلا پتلا ہونے سے قد کا ٹھگنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کے کپڑے پورے آجائیں گے۔" اس نے وضاحت کی۔

"لیکن یہ کپڑے؟ میرا مطلب ہے کہ میں نے کبھی اس قسم کا لباس نہیں پہنا ہے۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

"مجھے اندازہ ہے لیکن ہمیں جو سفر درپیش ہے، اس میں اسی قسم کا لباس مناسب رہے گا۔ تمہارا ڈھیلا ڈھالا لباس ادھر ادھر اٹک کر مشکل پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ لباس لہراتا ہوا دور سے ہی نمایاں ہو جائے گا۔ اس لیے فی الحال تمہیں حالات کے ساتھ کمپرومائز کرنا پڑے گا۔ ایک بار ہم یہاں سے نکل جائیں تو پھر تم آزاد ہو... جو جی چاہے پہننا۔" اسلم نے اسے سمجھایا تو اس نے وقت کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی۔ زندگی میں یوں بھی تو بہت کچھ اس کی مرضی کے خلاف ہی ہو رہا تھا تو پھر ایک لباس کے معاملے میں سمجھوتا کرنے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اگر زندگی اسے چوائس کا حق دیتی تو وہ نیلے پھولوں والی اس سیاہ چادر کو بھی اپنے وجود سے علیحدہ نہیں ہونے دیتی جو شہریار نے ایک بیرے سے خرید کر اسے دی تھی۔ ادھر سے ادھر بھاگتے اور منتقل ہوتے میں اس کا سامان جانے کہاں سے کہاں پہنچ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیا تھا۔ اس سامان میں وہ چادر بھی تھی جو اسے بہت عزیز تھی لیکن وہ پھر بھی اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکی تھی اور یہی تو انسان کی بے اختیاری و بے بسی ہے۔ اسے اپنی عزیز از جان چیزوں پر بھی اختیار نہیں ہوتا اور تقدیر کے سامنے سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔ اگر یہ بے بسی و بے اختیاری نہ ہوتی تو بے جان چیزوں کی کیا بات... آدمی اپنے پیاروں کے بچھڑنے پر صبر کیونکر کر پاتا۔

"میرے خیال میں اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔ آرام کے لیے جتنا وقت مل جائے، مناسب ہے ورنہ آگے چل کر شاید ہی آرام کا وقت مل سکے۔ تم اب اپنے جھونپڑے میں جاؤ۔ میں آدھی رات سے کچھ پہلے تمہارے پاس آؤں گا اور کچھ وقت گزاروں گا۔ اس کے بعد ہم مناسب وقت پر نکل پڑیں گے۔ میں پہرے داروں کو یہ تاثر دے کر آؤں گا کہ میں تمہارے ساتھ شب گزاری کا ارادہ رکھتا ہوں، اس طرح وہ مشکوک نہیں ہوں گے۔" اسلم نے اسے اپنے منصوبے کی مزید تفصیلات سے آگاہ کیا جنہیں سن کر اس کا چہرہ شرم سے سرخ پڑ گیا لیکن وہ خاموش رہی۔ اعتراض کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اسلم وہ کر رہا تھا جو بہتر سمجھتا تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے بہرحال اتنا طویل عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ ہر بات سے واقف ہوتی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں تیار ملوں گی۔" اس نے اسلم کو رضامندی کا عندیہ دیا اور واپسی کے لیے پلٹی۔ پلٹتے ہی وہ بری طرح چونکی۔ اس کی طرف متوجہ اسلم بھی چونک پڑا۔ اس کی نظروں نے بھی وہ منظر دیکھ لیا جو ماہ بانو کے چونکنے کا سبب بنا تھا۔ ایک درخت کی آڑ سے بالکل ہی اچانک للی نکل کر ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے ہونٹوں پر جو معنی خیز مسکراہٹ تھی، وہ صاف ظاہر کر رہی تھی کہ اس نے ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی ہے۔ اسلم اور ماہ بانو کچھ بھی کہے بغیر اس کی طرف دیکھتے رہے۔ للی جس قسم کی عورت تھی، انہیں ضرورت ہی نہیں تھی کہ وہ اس پچویشن میں اپنی زبانوں کو زحمت دیتے۔ اب تو جو کہنا تھا وہ للی کو ہی کہنا تھا۔ ان کی یہ توقع پوری ہوئی اور وہ کچھ دیر دور سے ہی ان دونوں کو گھورتے رہنے کے بعد ماہ بانو کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹاتی ہوئی اسلم کے عین مقابل آ کھڑی ہوئی۔

"تو تم یہاں سے جا رہے ہو؟" اسلم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر ٹکا کر پوچھا۔ اسلم خاموش رہا۔ تصدیق یا تردید کی گنجائش نہیں تھی۔ للی یقیناً سب کچھ سن چکی تھی۔ معلوم نہیں وہ پہلے سے اس جگہ موجود تھی یا ماہ بانو کا پیچھا کرتی ہوئی خود لینے کے لیے آئی تھی۔

"بچ بچ..." اس نے اسلم کی خاموشی سے شہ پاتے ہوئے استہزائیہ انداز اختیار کیا۔ "تم دونوں کا تو اس وقت ان ٹین ایجرز جیسا حال لگ رہا ہے جو نئے نئے عشق کے مرض میں مبتلا ہوئے ہوں اور دنیا والوں سے بچ کر اپنی الگ دنیا بسانے کا ارادہ کرتے ہوئے گھر سے بھاگنے کو تیار ہوں لیکن عین وقت پر دھر لیے جائیں۔ ویسے تم دونوں کو دیکھ کر مجھے انڈین فلم قیامت سے قیامت تک یاد آ رہی ہے۔ اس میں بھی تو ہیرو اور ہیروئن بھاگ کر نئی دنیا بسانے نکلے تھے۔ بس فرق اتنا ہے کہ وہ شہر سے بھاگ کر جنگل میں پہنچے تھے، تم جنگل سے بھاگ کر شہر جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔"

"تم اسی انداز میں سوچ سکتی ہو۔ تمہارا فلمی ہیروئن بننے کا خواب تو پورا نہیں ہوا لیکن افسوس کہ تمہارے ذہن پر فلموں کا بھوت اب بھی سوار ہے۔" اسلم نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"فلموں کا بھوت بھی اور تمہارے عشق کا بھوت بھی۔ میں بہت ضدی عورت ہوں اور جو چیز میرے سر پر سوار ہو جائے، اس کو کبھی بھولتی نہیں ہوں۔" اس کے طنز کو خاطر میں لائے بغیر للی بولی۔

"فضول بکواس بند کرو، وہ کہو جو کہنا چاہتی ہو۔" اسے اندازہ تھا کہ ان کے راز سے واقف ہونے کے بعد للی بلیک میلنگ ضرور کرے گی اس لیے زیادہ بحث میں پڑنے کے بجائے اس سے پوچھا۔ ماہ بانو دخل اندازی کیے بغیر ان کے درمیان ہونے والی مکالمے بازی سن رہی تھی۔ ان کی گفتگو کے حتمی نتیجے پر اس کے مستقبل کا بھی دارومدار تھا اس لیے اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔

"تمہیں مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا ہوگا۔" للی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

"کیا کہا تم نے...؟" اسلم اس کا مطالبہ سن کر چراغ پا ہوا۔

"میں نے کوئی اتنی زیادہ مشکل بات نہیں کی ہے جو تمہیں سمجھ نہیں آئے۔ بہت سیدھا اور صاف مطالبہ ہے میرا۔ جب تم یہاں سے جاؤ گے تو میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" اس نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔

"اور اگر میں نے تمہارا یہ مطالبہ پورا نہ کیا تو...؟" اسلم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"پھر سیدھی سی بات ہے۔ تم دونوں بھی یہاں سے نہیں جا سکو گے۔" اس نے شانے اچکاتے ہوئے دوٹوک

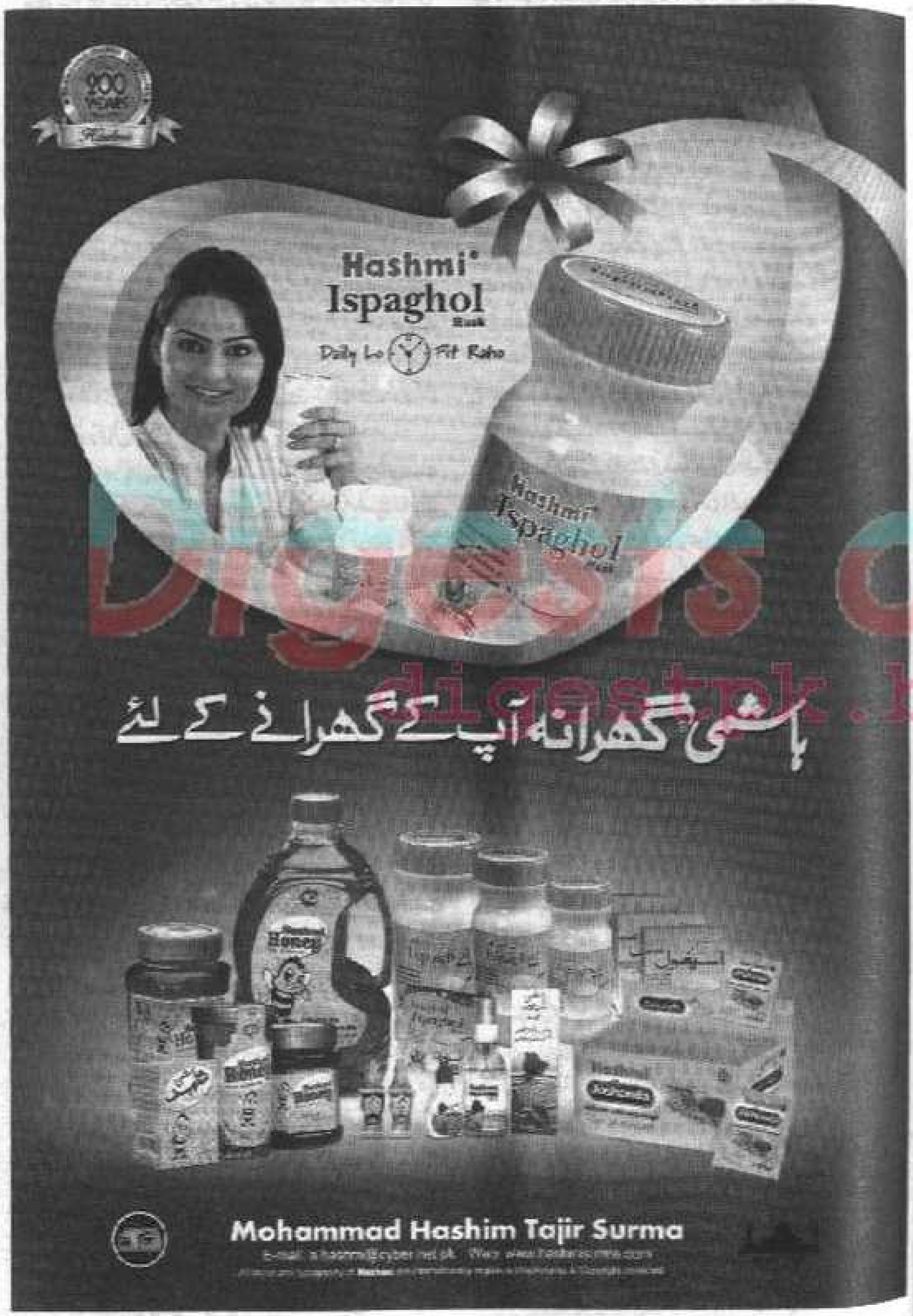

Digests of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بچے میں جواب دیا اور یہ تو اسلم بھی جانتا تھا کہ یہ صرف دھمکی نہیں ہے۔ اس نے مشورہ لینے والے انداز میں ماہ بانو کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی یہی لکھا تھا کہ فی الوقت لی سے بگاڑنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آخر وہ اس مدقوق نظر آنے والی لیکن درحقیقت اندر سے بے حد شاطر عورت کے سامنے اپنی بے بسی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا اور دھیمی آواز میں بولا۔

"او کے! تم بھی ہمارے ساتھ چلو گی۔ ہمارا سارا پلان تو تم نے سن ہی لیا ہے۔ اپنے لیے تم خود سوچنا اور انتظام کرنا کہ کیا اور کیسے کرنا ہے۔ میں صرف تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کا ذمے دار ہوں۔"

"اتنا ہی کافی ہے۔ باقی راستے نکالنا مجھے خود آتا ہے۔" وہ کمال کی خوداعتماد تھی۔

"اور ہاں... یاد رکھنا کہ ہمارا ساتھ بس یہاں سے نکل کر کسی شہر تک پہنچنے جتنا ہی ہوگا۔ اس کے بعد تم اپنے راستے جانا اور ہم اپنے راستے۔" اس نے مناسب سمجھا کہ حفظ ماتقدم کے تحت اسے پہلے ہی اس کی حدود سے آگاہ کر دے۔

"کون کس راستے جاتا ہے، اس کا فیصلہ بعد میں ہو گا۔ تمہیں اس بارے میں سوچ کر ابھی سے اپنی جان ہلکان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا اور خراماں خراماں چلتی ہوئی یہاں سے جانے لگی۔ اسلم اس کی پشت کو گھورتے ہوئے فقط بے بسی سے دانت ہی کچکچا سکا۔

☆☆☆

"کھانا کھا لیں بی بی۔" ملازمہ نے کھانے کی ٹرے وڈی چودھرائن کے سامنے رکھی تو اس نے نظر اٹھا کر ٹرے میں رکھے کھانے کو دیکھا۔ دو عدد موٹی موٹی روٹیوں اور پتلی پانی جیسی بے رونق دال نے بے ساختہ ہی اس وسیع و عریض دسترخوان کی یاد دلائی جس پر ایک وقت میں اتنی اقسام کے کھانے ہوتے تھے کہ بعض اوقات وہ ہر کھانے کو چکھ بھی نہیں پاتی تھی... اور یہاں اس قید خانے میں اسے وہ کھانا فراہم کیا جا رہا تھا جسے کھانا تو دور کی بات، اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس کے سامنے زندگی میں کبھی کھانے کے نام پر ایسی کوئی چیز بھی رکھی جا سکتی ہے۔ اس سے قبل بھی اس کے لیے کچھ اسی قسم کا کھانا لایا گیا تھا۔ بس اس کھانے میں دال کی جگہ آلو کی بھجیا تھی۔ اس نے نخوت سے اس کھانے کو ٹھکرا دیا تھا اور نتیجے میں بھوکی رہی تھی۔ اب پھر کھانا دیکھ کر اسے سمجھ آ گیا تھا کہ اسے ایک بار پھر بھوکا رہنا ہو گا۔ اس کے لیے اس قید خانے کو منتخب کرنے والا جتنا بے رحم شخص تھا، اس سے اسی سلوک کی امید کی جا سکتی تھی لیکن وہ بھی تو وڈی چودھرائن تھی۔ حویلی کے ایک بے انتہا آرام دہ کمرے سے اس قید خانے تک منتقل ہونے میں بے شک اس کے غرور کو زبردست دھچکا لگا تھا لیکن اس کا وہی حال تھا کہ رسّی جلنے کے بعد بھی بل نہیں گئے تھے۔

"لے جا اپنا یہ کھانا اور لے جا کر گھورے میں ڈال دے۔ تُو کھانے کے نام پر جو کچھ میرے لیے لے کر آئی ہے، وہ تو میں اپنے پالتو جناور (جانور) کو بھی نہ کھلاؤں۔" اس نے نخوت سے منہ پھیرتے ہوئے ملازمہ سے کہا۔

"کھا لیں بی بی! چودھری صاحب کا حکم ہے کہ اگر آپ نے اب کھانا لوٹایا تو پھر دوبارہ آپ کو کھانا بھجوایا ہی نہیں جائے گا۔" ملازمہ نے ڈرتے ڈرتے اسے چودھری کا حکم سنایا۔ اس کے سامنے ایک معزول ملکہ تھی جس کی اوقات اب دو کوڑی کی بھی نہیں رہی تھی لیکن اس بے چاری نے اپنی ساری زندگی وڈی چودھرائن سے ڈرتے ڈرتے گزاری تھی، سو ایک دم سے اس خوف سے کیسے نجات پاتی۔

"تیرا چودھری بھی اپنی اس حرکت کا مزہ چکھ لے گا۔ کوئی لاوارث اور مجبور ملازمہ نہیں ہوں میں چودھری کی کہ وہ مجھے یہاں قید کر کے مار ڈالے گا اور کوئی اس سے کچھ پوچھے گا ہی نہیں۔ میرے میکے والے حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے، اور میرا پُتّر مراد شاہ باپ کا گریبان پکڑے گا کہ مجھے میری ماں کا پتا بتاؤ۔" اس کی خوش فہمیاں اپنی جگہ قائم تھیں۔

"ایسا تو جب ہو گا نا بی بی جب کسی کو پتا چل سکے گا کہ آپ کہاں ہو؟ چودھری صاحب نے سب سے کہہ دیا ہے کہ آپ کو گلے کا کینسر ہو گیا ہے اور انہوں نے آپ کو علاج کے لیے ولایت بھجوا دیا ہے۔" ملازمہ نے دبی آواز میں اسے صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ سوچ میں پڑ گئی پھر ملازمہ کی طرف دیکھتے ہوئے رازداری سے بولی۔

"دیکھ چھو! تُو ایسا کر کہ میرے بھرا کی حویلی میں یہ گل کسی طرح پہنچا دے کہ چودھری نے مجھے قید کر کے حویلی کے تہ خانے میں ڈال رکھا ہے۔ تجھے بس یہ پیغام پہنچانا ہو گا، آگے وہ لوگ خود ہی سب کچھ دیکھ لیں گے۔ تیرا نام بھی کہیں نہیں آئے گا، اور میں یہاں سے نکلنے کے بعد تجھے وڈا سارا انعام دوں گی۔" اس نے ملازمہ کو ترغیب دی لیکن وہ ڈر کر پیچھے ہو گئی اور سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہ بی بی نہ۔ چودھری صاحب تو میرے ٹوٹے ٹوٹے کر کے کتوں کو کھلا دیں گے۔"

"میں کہہ رہی ہوں نا کہ تیرا نام کہیں نہیں آئے گا، اور تجھے انعام بھی ملے گا۔ تو نے میرے کنگن دیکھے ہیں نا اور وہ چوڑیاں بھی۔ میں اپنے کنگن معہ بارو کی بارہ چوڑیاں تجھے دے دوں گی۔" وڈی چودھرائن کی پیشکش بہت بڑی تھی۔ ملازمہ کی نظریں بے ساختہ ہی اس کی کلائیوں پر گئیں۔ بھاری گول کلائیاں جو ہر دم سونے کے کنگنوں اور چوڑیوں سے بھری رہتی تھیں، بالکل سونی پڑی تھیں۔ وڈی چودھرائن کو اس قید خانے میں ڈالنے سے قبل تن کے لباس کے علاوہ ہر شے سے محروم کر دیا گیا تھا اور ایسا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہاں سے نکل کر اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کر سکے گی۔ ہو سکتا تھا کہ اس کے میکے والے اگر اس کی حالت سے باخبر ہو جاتے تو اس کی کچھ مدد کرتے لیکن یہ صرف ایک امکان تھا جبکہ چودھری کو دھوکا دینے کی صورت میں اسے یقینی اندوہناک انجام سے دوچار ہونا پڑتا۔ اس انجام کا سوچ کر وہ اندر تک کانپ گئی اور بڑی عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"مجھے معاف کر دیں بی بی! میں آپ کی باندی ہوں لیکن مجھ میں بڑے سرکار سے بغاوت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔"

"ہمت کر لے جھلیے! ہمت کرے گی تو مالا مال ہو جائے گی ورنہ ادھر تجھے کچھ نہیں ملنے والا۔ چودھری کی چاکری کر کے اس کو تنگ حال کرنے میں تیرے ہاتھ جوتوں کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔" ملازمہ کو عقل سکھاتی چودھرائن کو قطعی یاد نہیں تھا کہ اب سے پہلے وہ خود اس قبیل میں شامل تھی جو اپنی تجوریاں بھر کر اپنے زیردست افراد میں فاقے بانٹ دیتا ہے۔

"مجھے معاف کر دو بی بی! میں بہت بزدل ہوں۔" ملازمہ ہاتھ جوڑے جوڑے پیچھے ہٹ گئی۔ اس پر چودھری کی اتنی شدید دہشت طاری تھی کہ کسی قسم کا لالچ اس دہشت پر غالب نہیں آ سکا تھا۔

وڈی چودھرائن نے ملازمہ کی اس بزدلی پر خوب دانت کچکچائے لیکن اس وقت وہ خود اتنی بے بس تھی کہ ملازمہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ البتہ اسے دوبارہ قائل کرنے کی کوشش کی جا سکتی تھی چنانچہ زبردستی لہجے کو نرم کرتے ہوئے بولی۔ "چل ٹھیک ہے، جیسی تیری مرضی۔ میں کوئی تیرے نال زبردستی تھوڑی کر رہی ہوں۔"

"وڈی مہربانی بی بی۔" ملازمہ پلٹ کر واپسی کے راستے پر چل دی۔ چودھرائن کے کہنے کے باوجود وہ کھانے کی ٹرے اپنے ساتھ واپس نہیں لے گئی تھی کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ چودھری کی طرف سے جو دھمکی دی گئی ہے اس پر عمل بھی ضرور ہو گا۔ لرزتی کانپتی وہ جب تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچی تو وہاں منشی اللہ رکھا اس کا منتظر تھا۔

"یہ تو نے اچھا کیا کہ لالچ میں نہیں پڑی۔ ورنہ ادھر سے باہر نکلتے ہی تیری لاش چیل کوؤں کی دعوت کے کام آتی۔" منشی اللہ رکھا کی بات نے اسے سہما کر رکھ دیا۔ منشی کی اس بات کا یہ مطلب تھا کہ اس نے تہ خانے میں چودھرائن سے جو کچھ بھی بات کی تھی، وہ اس نے کسی ذریعے سے سن لی تھی۔ دل ہی دل میں اپنے لالچ میں نہ پڑنے پر شکر ادا کرتی وہ اپنے راستے چل دی۔

دوسری طرف چودھرائن ابھی تک اکڑی ہوئی بیٹھی تھی اور کھانے کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھایا تھا۔ ایسا وہ صرف ضد میں کر رہی تھی ورنہ بھوک کا تو یہ عالم تھا کہ لگتا تھا کوئی اندر بیٹھا آنتوں کو نوچ رہا ہے۔ کبھی ایک وقت کا کھانا بھی نہ چھوڑنے والی کے لیے یہ فاقہ کشی بہت مشکل تھی۔ اس نے تو کبھی رمضان کے روزے بھی نہیں رکھے تھے تو اس فاقے کو کیسے برداشت کر سکتی تھی؟ بس زبردستی خود پر جبر کیے بیٹھی تہ خانے کی دیواروں کو تکتی رہی۔ یہ تہ خانہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ زیادہ عرصہ تو نہیں گزرا تھا جب اس تہ خانے میں کشور کی ملازمہ خاص رانی کو قید کیا گیا تھا۔ وہ رانی پر تشدد کے سارے ظالمانہ حربے آزما کر اس سے کشور کا پتا اگلوانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ تہ خانے کے در و دیوار سے اب بھی رانی کی وہ چیخیں ٹکراتی اور ٹکرا کر گونجتی محسوس ہو رہی تھیں جو اس کے حلق سے بہیمانہ تشدد کے نتیجے میں نکلی تھیں۔ اسی تہ خانے میں رانی نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں لی تھیں لیکن اس وقت وڈی چودھرائن کے دل میں ذرا درد نہیں جاگا تھا۔ اسے کسی قسم کی ندامت نہیں ہوئی تھی کہ ایک زندگی سے بھرپور لڑکی یوں دیکھتے ہی دیکھتے موت کی آغوش میں جا سوئی ہے۔ آج وقت خود اسے ان دیواروں کے بیچ لے آیا تھا۔ کل اگر وہ صیاد تھی تو آج اس تہ خانے کی قیدی اور زندگی کی ساری بہاریں دیکھ لینے کے باوجود اس قید سے آزاد ہونے کے لیے بری طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ حویلی میں راج کرتے کرتے وہ اچانک اس سیلن زدہ تہ خانے میں فریدہ کو قتل کرنے کی سازش کے نتیجے میں پہنچی تھی۔ چودھری نے اس سے اس کے جرم کی وضاحت نہیں مانگی تھی، بس براہ راست سزا سنا کر یہاں ڈلوا دیا تھا۔ سازش تیار کرتے ہوئے وہ کبھی گمان بھی نہیں کر سکی تھی کہ معاملہ کھل جانے پر اس کے ساتھ یہ سلوک ہو گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ بھی خود کو حویلی کے معاملات سے الگ کر کے خوابگاہ تک محدود کیے جانے کا تصور کر سکتی تھی لیکن چودھری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے تو کچھ زیادہ ہی غضب ناکی کا مظاہرہ کیا تھا۔ شاید وہ اسے باور کروانا چاہتا تھا کہ حویلی میں کسی بھی شخص کو چاہے جتنے بھی اختیارات حاصل ہوں لیکن حاکم بہرحال وہی ہے اور ایک جھٹکے میں سارے اختیارات چھین لینے کی طاقت رکھتا ہے۔

”مینوں یہاں سے نکلنے دے چوہدری۔ میں تیری ساری چوہدراہٹ تیری اپنی اولاد کے ہاتھوں نکلوا دوں گی۔“ دیواروں کو گھورتے ہوئے وہ غصے سے بڑبڑائی اور اپنی نظروں کا زاویہ اس ٹرے پر مرکوز کرلیا جس میں اس کے لیے آیا ہوا کھانا رکھا تھا۔ کھانے کو دیکھ کر اس کے چہرے پر موجود نفرت بھرے تاثرات میں مزید اضافہ ہوگیا۔ یہ کھانا چوہدری کی کمینگی کا بھرپور اظہار تھا۔ وہ ایک بار پھر دانت کچکچانے لگی اور ٹرے کی طرف سے منہ پھیر لیا لیکن آخر کب تک؟ ہر شخص کی برداشت کی ایک حد ہوتی ہے اور اس کی برداشت کی حدیں تو ویسے بھی بہت محدود تھیں۔ کھا کھا کر بچیلا ہو جانے والا جسم بھوک کی سختی کو زیادہ دیر برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ وہ اپنے لیے فرش پر بچھائی گئی چٹائی پر نڈھال سی لیٹ گئی۔ اسے بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ پیروں سے جان کھنچتی جارہی ہے۔ اس کیفیت میں لحہ بہ لحہ شدت آتی جارہی تھی۔ آخر کار اس کی ضد ٹوٹ گئی اور وہ کہنیاں ٹکا کر اپنے بھاری بدن کو اٹھا کر بیٹھی۔ بیٹھنے کے بعد اس نے خود کو کھانے کی ٹرے کی طرف کھسکایا اور پھر ہاتھ بڑھا کر ٹرے اپنی طرف سرکالی۔ ٹرے میں موجود روٹی کو توڑتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ کافی دیر گزر جانے کے باعث روٹی سوکھ گئی ہے لیکن اب وہ بھوک کی شدت سے اتنی بے حال تھی کہ سوکھی روٹی کھانے کے لیے بھی آمادہ ہوگئی اور روٹی کو دال میں بھگو کر پہلا لقمہ منہ میں رکھا۔ دال دیکھنے میں جتنی بے رونق تھی، کھانے میں بھی اتنی ہی بدذائقہ محسوس ہورہی تھی یا پھر یہ بات تھی کہ ہمیشہ مرغ مسلم کھانے والی کی زبان دال کے ذائقے کو قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ اس پہلے لقمے کو نگلتے ہوئے اس نے بہت بُرا سا منہ بنایا لیکن پھر بھی اس کا ہاتھ دوسرا لقمہ توڑنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ سچ ہے کہ پیٹ میں لگی آگ زبان کو لگے ذائقے کی چاٹ پر حاوی ہونے میں کمال رکھتی ہے۔ دوسروں کو دانے دانے کو ترسانے والی آج خود پیٹ کی آگ سے مجبور ہو کر ایک نہایت ناپسندیدہ کھانا تناول کررہی تھی۔ ایک روٹی سے کچھ اوپر کھا کر یہ آگ ذرا سرد پڑی تو اس نے سکون کا سانس لیا اور ٹرے ذرا پرے سرکا کر دوبارہ چٹائی پر ڈھیر ہوگئی۔ کھانے کے بعد اسے شدت کی پیاس بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ پانی کمرے کے ایک کونے میں رکھے مٹی کے گھڑے میں موجود تھا لیکن ساری عمر اٹھ کر پانی نہ پینے والی کو اس گھڑے تک جا کر پانی پینا سخت دشوار محسوس ہورہا تھا۔ آخر کار بھوک کی طرح پیاس کی شدت نے بھی اسے زیر کردیا اور اپنی بدحرامی کے باوجود اسے اٹھ کر پانی پینے کے لیے جانا پڑا۔ ایک ساتھ دو گلاس پانی چڑھا کر وہ واپس چٹائی پر آ کر ٹکی تو پیٹ کی حالت عجیب ہورہی تھی اور اس میں سے گڑگڑ کی آوازیں آرہی تھیں۔ آہستہ آہستہ ان آوازوں نے شدت اختیار کرلی اور وہ اپنے پیٹ میں درد کی لہریں سی اٹھتی محسوس کرنے لگی۔ ہمیشہ تر نوالہ کھانے والی کو سوکھی روٹی اور دال ہضم نہیں ہوسکی تھی۔ وہ درد سے بے طرح تڑپتی ہوئی چیخیں مارنے لگی۔ تہ خانے کے در و دیوار نے بہت کم مدت میں مکافات عمل کی ایک چھوٹی سی مثال دیکھی تھی۔ کچھ عرصہ ہی تو گزرا تھا انہیں مظلوم رانی کی چیخیں سنے اور اب اس پر ظلم ڈھانے والی جابر چوہدرائن کی چیخیں سن رہے تھے۔

☆☆☆

وہ جیپ طوفانی رفتار سے سڑک پر دوڑی جارہی تھی۔ اسی رفتار سے چلتی جب وہ آبادی میں داخل ہوئی تو راہ چلتے لوگ خود کو بچانے کے لیے گھبرا گھبرا کر ایک طرف ہونے لگے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے زیر لب یا بہ آواز بلند بھی جیپ والوں کو گالیوں سے نوازا لیکن جیپ سواروں کو فی الحال ان کی فکر نہیں تھی۔ وہ بہت دور سے آئے تھے اور کسی راہ گیر سے الجھنے کے بجائے سیدھے اس مقام تک پہنچنا چاہتے تھے جہاں ان کا اصل شکار موجود تھا۔ ان کا رخ ایک اسپتال کی طرف تھا۔ جوں جوں اسپتال کی عمارت نزدیک آتی جارہی تھی، ان کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اسی وقت جیپ میں ایک موبائل فون کی گھنٹی کی آواز گونجی۔ اس گھنٹی کو سن کر ایک شخص نے پھرتی سے اپنی جیب میں سے موبائل نکالا اور کال ریسیو کی۔

”سلام منشی جی۔“ نمبر وہ دیکھ چکا تھا اس لیے کال ریسیو کرتے ہی سلام جھاڑا۔

”کیا رپورٹ ہے شیدے؟“ اس کے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے منشی نے سوال کیا۔ جب سے بالا، جگو کے آدمیوں کے ہاتھوں بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے کے بعد چارپائی سے لگا تھا، شیدا چوہدری کی ناک کا بال ہوگیا تھا۔ نئی نئی ہونے والی اس ترقی پر نازاں اسے ذرا احساس نہیں تھا کہ وہ جس مقام کو پا کر اتنا خوش ہے، کبھی اس مقام پر بالا بھی رہا تھا اور آج بالے کا کوئی پرسان حال نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ وہ جب تک چوہدری کے کام کے لائق تھا، چوہدری اسے نوازتا رہا اور اب ناکارہ ہو کر چارپائی سے لگا تھا تو کوئی اسے پوچھنے والا نہیں تھا۔ اگر شیدا ناکارہ ہو جاتا تو چوہدری اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتا اور کسی استعمال شدہ ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیتا لیکن فی الحال شیدا اس بات کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”ہم لوگ بس پہنچ چکے ہیں۔ مجھے سامنے اسپتال کے دروازے پر کھڑا سومرو صاف نظر آرہا ہے۔“

”کام صفائی سے کرنا۔ اب غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ منشی نے اسے ہدایت دی۔

”تسی فکر ہی نہ کرو منشی جی۔ تھوڑی دیر میں، میں فون کر کے آپ کو خوش خبری سناؤں گا۔“ وہ بہت پُراعتماد ہورہا تھا۔ اس سارے معاملے میں اس نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ چوہدری کو کوریئر کے ذریعے آفتاب کا جو خط ملا تھا، اس سے یہ تو فوراً ہی معلوم ہوگیا تھا کہ یہ خط میرپور خاص سے بھیجا گیا ہے۔ ان دنوں شیدا چوہدری کے کسی کام سے کراچی میں تھا چنانچہ اسے حکم دیا گیا کہ باقی کی معلومات حاصل کر کے آفتاب کے بارے میں معلوم کیا جائے۔ معلومات کے لیے سب سے اچھا ذریعہ اسپتال ہی تھا کیونکہ قوی امید یہی تھی کہ بچی کی پیدائش جس اسپتال میں ہوئی ہوگی، وہاں آفتاب نے فرضی نام کے بجائے اپنا اصل نام ہی لکھوایا ہوگا کیونکہ کوئی بھی باپ بہرحال یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کی اولاد کے نام کے آگے اس کے نام کے سوا کسی دوسرے کا نام لکھا جائے۔

یہ آئیڈیا بہت ہی عمدہ ثابت ہوا۔ شیدے کے میرپور خاص میں کچھ ذاتی رابطے تھے چنانچہ اس نے کراچی سے روانہ ہونے سے قبل ہی اسپتالوں کو چیک کروا لیا تھا۔ ایک چھوٹے شہر میں جہاں اسپتال محدود تعداد میں ہوں، اس قسم کی معلومات حاصل کرنا زیادہ دشوار نہیں ہوتا۔ اسے راستے میں ہی اطلاع مل گئی تھی کہ آفتاب اور کشور کی بچی کی پیدائش کس اسپتال میں ہوئی ہے اور بچی کے نرسری میں ہونے کی وجہ سے کشور بھی ابھی تک اسپتال میں ہی مقیم ہے۔ آفتاب کے بارے میں بھی یہی معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت اسپتال میں ہی گزارتا ہے اور صرف کسی ضرورت کے تحت ہی باہر جاتا ہے۔ اس نے یہ ساری معلومات فوری طور پر منشی اللہ رکھا کو پہنچا دی تھیں۔ جواباً اس نے کچھ ہدایات دی تھیں اور اب پھر اس سے تازہ ترین حالات جاننے کا خواہش مند تھا۔

”دیکھ بھال کر کام کرنا شیدے! سرکار آج کل وڈے خراب موڈ میں ہیں۔ اب کی واری اگر ناکامی ہوئی تو جانے ان کا غصہ کیا دکھائے۔“ شیدے کے اعتماد کے باوجود منشی نے اسے تنبیہہ کرنا ضروری سمجھا۔

”میں خیال رکھوں گا۔“ اس نے زیادہ بحث میں پڑنے کے بجائے تسلی دی اور سلسلہ منقطع کردیا۔ اس دوران میں ان کی جیپ اسپتال کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک چکی تھی۔ جیپ کو رکتے دیکھ کر سامنے کھڑا سومرو فوراً لپک کر نزدیک آیا۔

”کیا خبر ہے سومرو! وہ لوگ یہیں موجود ہیں نا؟“ شیدے نے اس سے پوچھا اور جیپ سے اتر گیا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کی تقلید کی۔

”بالکل بابا، وہ لوگ سو فیصد اندر ہے۔ ہم نے پوری خبر رکھی ہے ان کی۔“ سومرو نے جواب دیا تو شیدا سر ہلاتا ہوا اس کے ساتھ اندر کی طرف بڑھ گیا۔ باقی پانچوں بھی ظاہر ہے اس کے پیچھے ہی تھے۔ ان کا انداز واضح طور پر جارحانہ تھا اس لیے وہ جیسے ہی اسپتال کے دروازے سے اندر داخل ہونے لگے، وہاں موجود چوکیدار نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔

”کون ہو بابا تم لوگ، کدھر منہ اٹھا کر جارہے ہو؟“ وہ لپک کر ان کے راستے میں آیا۔ اس کے اس سوال کا جواب زبان سے دینے کے بجائے رائفل کے بٹ سے دیا گیا۔ سر پر لگنے والی زوردار ضرب نے بے چارے چوکیدار کو مزید کچھ پوچھنے کی مہلت ہی نہیں دی اور وہ بغیر آواز نکالے بے ہوشی کی وادی میں چلا گیا۔ چوکیدار سے فارغ ہو کر وہ لوگ ایک بار پھر دندناتے ہوئے چل پڑے۔ اب انہوں نے چادروں کی بکل میں چھپائے اپنے اسلحے باہر نکال لیے تھے چنانچہ جیسے ہی وہ مرکزی عمارت میں داخل ہوئے، ریسیپشن پر بیٹھی لڑکی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ شیدے نے فوراً ہی ایک ہوائی فائر کیا۔

”خاموش... نہ کوئی حرکت کرے اور نہ ہی آواز نکالے۔ اگر تم لوگوں نے ہماری گل مانی تو کسی کو کچھ نہیں ہوگا ورنہ دوسری صورت میں اپنی جان سے جاؤ گے۔“ نہایت بھیانک لہجے میں یہ اعلان کر کے اس نے اپنی نظریں ادھر ادھر گھمائیں۔ وہاں موجود لوگ یوں ساکت ہوگئے تھے جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھما کر انہیں پتھر کے مجسموں میں تبدیل کردیا ہو۔ گولی اور گالی شریف لوگوں کے لیے ایسی ہی زود اثر ہوتی ہیں۔ بے چارے ان دونوں چیزوں کا مقابلہ نہیں کرپاتے اور چپ سادھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

”تم یہیں ٹھہر کر ان پر نظر رکھو۔“ جائزے سے فارغ

ہوکر اس نے اپنے ایک ساتھی کو حکم دیا اور پھر خود باقی ماندہ ساتھیوں کے ساتھ سومرو کی راہنمائی میں اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں کشور اور آفتاب موجود تھے۔

دروازے پر پہنچ کر انہوں نے اسے زور سے دھکا دیا لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ اصل میں دروازہ کچھ اس قسم کا تھا جو اندر سے تو صرف لٹو گھمانے پر کھل جاتا تھا لیکن باہر سے کھولنے والے کے لیے چابی کا استعمال لازمی تھا چنانچہ انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس ناکامی پر مشتعل ہوکر شیدے نے دروازے پر زوردار دستک دی۔ وہ گاؤں میں اپنے غنڈا راج کی وجہ سے اسی انداز سے کام کرنے کا عادی تھا۔ حکمت عملی اور منصوبہ بندی اس کے مزاج میں شامل نہیں تھی۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ چودھری کا چمچہ ہے۔ چودھری کی دہشت سے کانپنے والے گاؤں کے بے چارے مکین تو ایک اشارے پر ہی چودھری کے آدمیوں کے سامنے ہاتھ باندھ کر حاضر ہوجاتے تھے لیکن اندر موجود افراد ظاہر ہے چودھری کی بے بس رعایا میں شمار نہیں ہوتے تھے۔

دروازے کو ٹھکنے والے پہلے دھکے پر ہی آفتاب بُری طرح چونک گیا تھا اور اس نے خودکار انداز میں حرکت کرتے ہوئے سب سے پہلے دروازے کی چٹخنی لگائی اور پھر ڈور آئی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ اسے دروازے کے باہر کھڑے مسلح افراد فوراً ہی نظر آگئے۔ وہ پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ دروازہ نہ کھلنے کی صورت میں اس کے لاک پر فائر کیا جائے گا تاکہ لاک توڑا جاسکے۔ اس کوشش میں کوئی گولی دروازہ پار کرکے سامنے موجود شخص کو بھی نشانہ بنا سکتی تھی۔

"کک... کون ہے؟" کشور کو انجکشن لگانے کی تیاری کرتی نرس اس صورت حال پر سخت متوحش ہوگئی اور دہشت زدہ سی سوال کررہی تھی۔

"ہمارے کچھ دشمن یہاں گھس آئے ہیں، کیا اس کمرے سے نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ ہے؟" آفتاب نے جواب دیتے ہوئے نرس سے سوال کیا۔ یہ وہی نرس تھی جس نے اسے بیٹی کی پیدائش کی خوش خبری سنا کر مٹھائی کی فرمائش کی تھی۔ دہشت زدہ نرس کیا جواب دیتی، خود آفتاب کے دماغ نے ہی کام کرنا شروع کردیا۔ اس کمرے اور اس کے پیچھے والے کمرے کے درمیان میں ایک مشترک باتھ روم تھا۔ باتھ روم کے دو دروازے تھے، ایک اس کمرے میں اور دوسرا پچھلے کمرے میں۔ جس کمرے کے مکین باتھ روم استعمال کرتے وہ دوسری طرف کا دروازہ بند کر دیتے۔ موجودہ صورت حال میں یہ مشترک باتھ روم انہیں فرار کے لیے بہترین راہ فراہم کرسکتا تھا۔ اس نے فوراً حرکت میں آتے ہوئے کشور کے بیڈ کا رخ کیا۔ وہ صورت حال کو بھانپ چکی تھی اور کسی نہ کسی طرح کوشش کرکے بستر پر اٹھ کر بیٹھ بھی چکی تھی۔ آفتاب نے اسے بانہوں میں اٹھایا اور باتھ روم کی طرف بڑھا۔ نرس بھی اس کے پیچھے لپکی۔ غنیمت یہ تھا کہ باہر موجود افراد نے پہلے دستک دینے اور پھر دھکے مار کر دروازہ کھولنے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع کردیا اوران لوگوں کو تھوڑی سی مہلت مل گئی۔ پہلی گولی اس وقت چلائی گئی جب آفتاب باتھ روم میں گھس کر دروازے کی چٹخنی لگا چکا تھا۔ دروازے کا لاک ٹوٹنے کے بعد چٹخنی ٹوٹنے میں کتنی دیر لگتی چنانچہ اس نے مزید تیزی سے کام لیا اور دوسرے کمرے میں کھلنے والا باتھ روم کا دروازہ کھول کر اس کمرے میں پہنچ گیا۔ کمرا خالی پڑا تھا۔ اس میں موجود مریض کو شاید آج ہی ڈسچارج کیا گیا تھا ورنہ تو ان کو کمرے اور باتھ روم کا درمیانی دروازہ کھلا ملنا مشکل تھا۔ مشترک باتھ روم ہونے کی وجہ سے عام طور پر لوگ باتھ روم کا دروازہ اپنی طرف سے بند کرلینا پسند کرتے تھے۔ ان بدترین حالات میں یہ چھوٹی سی خوش قسمتی بھی اس وقت غنیمت تھی۔ آفتاب نے کمرے سے نکلنے سے قبل کمرے اور باتھ روم کا درمیانی دروازہ بند کر دیا۔ وہ لوگ کمرے سے باہر نکلے تو بالکل الگ کوریڈور میں موجود تھے لیکن محفوظ بہرحال نہیں تھے کہ جس راستے سے وہ اس کوریڈور میں پہنچے تھے، اسی راستے سے ان کے دشمن بھی پہنچ سکتے تھے۔ انہیں بس چند منٹوں کی سبقت حاصل تھی۔

"سسٹر! آپ ہمیں یہاں سے کسی محفوظ راستے سے باہر نکال سکتی ہیں؟" اس نے کوریڈور میں رک کر ادھر اُدھر کا جائزہ لیتے ہوئے لرزتی کانپتی نرس سے پوچھا۔

جواب میں اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ "ادھر ڈاکٹر کرمانی کے روم سے ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا ہے۔"

"اوکے... تو پھر وہیں سے نکلتے ہیں۔" آفتاب نے ایک بار پھر دوڑنا شروع کردیا۔ پیچھے سے مسلسل آتی آوازیں اسے بتا رہی تھیں کہ درمیانی دروازوں کو توڑنے کا سلسلہ جاری ہے اور ان کے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے۔ ڈاکٹر کرمانی اپنے کمرے میں موجود تھا اور کمپیوٹر کی اسکرین کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ اچانک کھلنے پر چونک کر دیکھا اور ایک اسٹاف نرس اور ایسے آدمی کو دیکھ کر جس کی بانہوں میں ایک عورت تھی، مزید حیران رہ گیا۔

"کیا بات ہے؟ یہ کیا ہورہا ہے؟" اس نے سخت لہجے میں نرس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"سر... وہ..." نرس نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اسے کچھ بتانے کی کوشش کی مگر خود اس بے چاری پر بھی صورت حال واضح نہیں تھی اس لیے وہ اسے کیا بتا پاتی۔ اسی وقت ایک فائر کی آواز سنائی دی۔

"سسٹر پلیز! ہیلپ می۔" ڈاکٹر کرمانی کے کمرے کے دروازے کی بھی چٹخنی چڑھا کر آفتاب نے التجائیہ لہجے میں نرس سے کہا تو وہ اسے نظر انداز نہیں کرسکی اور خود آگے بڑھ کر وہ دوسرا دروازہ کھول دیا جو ایک کھلے احاطے میں کھلتا تھا۔

"سوری ڈاکٹر۔" آفتاب حیران پریشان ڈاکٹر سے کہتا ہوا تیزی سے نرس کے پیچھے باہر نکل گیا۔ ان کے پاس اس دروازے کو باہر سے بند کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی ورنہ وہ اسے بھی بند کرتے ہوئے جاتے۔

"ادھر اسٹاف کے کوارٹرز ہیں۔ میں بھی وہیں رہتی ہوں۔" نرس نے اشارے سے بتایا تو وہ اسی طرف دوڑ پڑا۔ ہمدرد نرس اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ وہ قطار سے بنے کوارٹرز کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک ایسے کوارٹر کے سامنے پہنچے جس کے دروازے کے آگے سفید رنگ کی سوزوکی مہران کھڑی تھی۔ نرس نے انہیں وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود دروازے پر دستک دی۔ دستک کافی بلند تھی۔

"کون؟" جواب میں اندر سے ایک نسوانی آواز نے پوچھا۔

"دروازہ کھولو نازیہ... میں ہوں شبانہ۔" نرس نے جواب دیا۔

"تم تو ایسے دروازہ بجا رہی ہو جیسے تمہارے پیچھے کتے لگے ہیں۔" نازیہ نے بولتے ہوئے دروازہ کھول دیا اور پھر اس کے پیچھے اس حالت میں کھڑے ہوئے آفتاب کو دیکھ کر کہ اس نے کشور کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا ہوا تھا، گنگ رہ گئی۔

"اندر آجائیں۔" نازیہ نامی اس لڑکی کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے نرس شبانہ نے آفتاب سے کہا اور پھر ان کے اندر آتے ہی فوراً دروازہ بند کرلیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا جو بیڈروم اور نسبتاً بڑے لاؤنج پر مشتمل تھا۔ باتھ روم اور کچن کے دروازے اسی لاؤنج میں کھل رہے تھے۔ یہاں ایک سترہ انچ کا کلرڈ ٹی وی بھی رکھا ہوا تھا جس کے عین مقابل ایک آرام دہ کاؤچ پڑا تھا۔ ٹی وی آن تھا اور اس پر کوئی نیوز چینل لگا ہوا تھا۔ ان لوگوں کی آمد سے قبل یقیناً نازیہ کاؤچ پر بیٹھی خبریں دیکھ رہی تھی۔ آفتاب نے کشور کو اسی کاؤچ پر لٹا دیا۔ ایک تو ذہنی پریشانی، دوسرے وزن اٹھا کر بھاگنا... وہ بے چارہ پسینا پسینا ہوگیا تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ کشور آپریشن سے بچی کی پیدائش ہونے کی وجہ سے اس وقت بھاگ دوڑ کرنے کے لائق نہیں تھی چنانچہ اسے یہ طریقہ کار استعمال کرنا پڑا۔ کشور کو کاؤچ پر لٹانے کے بعد وہ خود بھی نیچے فرش پر پڑے کارپٹ پر بیٹھ گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ صورت حال کو پوری طرح نہ سمجھنے کے باوجود نازیہ نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور ایک طرف رکھے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کرلے آئی۔

"تھینک یو۔" آفتاب نے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیتے ہوئے ممنونیت سے کہا اور پھر بہت زیادہ حلق خشک ہونے کے باوجود ٹھہر ٹھہر کر گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگا۔ نازیہ نے کشور اور نرس شبانہ کو بھی پانی سے بھرے گلاس تھما دیے تھے۔

"یہ میری کزن نازیہ ہے۔ جامشورو یونیورسٹی میں پڑھاتی ہے۔ مجھ سے ملنے یہاں آئی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد یہاں سے روانہ ہوجاتی ہے۔ اگر موجودہ سچویشن نہیں ہوتی، تب بھی میں آپ کی مسز کو انجکشن لگانے کے بعد اسے رخصت کرنے یہاں آتی۔" پانی پینے کے بعد نرس شبانہ نے اپنے کوارٹر میں موجود لڑکی کا تعارف کروایا۔

"باہر جو گاڑی کھڑی ہے انہی کی ہے؟" آفتاب نے سوال کیا۔

"ہاں، یہ پبلک ٹرانسپورٹ کے بجائے اپنی ذاتی سواری پر ہی آنا جانا پسند کرتی ہے۔" شبانہ نے جواب دیا اور پھر چونک کر بولی۔ "آپ لوگ ایسا کریں کہ نازیہ کے ساتھ یہاں سے نکل جائیں۔ یہ حیدرآباد جاتے ہوئے آپ کو جہاں آپ کہیں گے ڈراپ کردے گی۔"

"مشورہ تو اچھا ہے۔" آفتاب نے اس سے اتفاق کیا۔ دشمن کی یہاں تک رسائی کے بعد اس کے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اب اس چھوٹے سے شہر میں ان کا چھپنا ممکن نہیں ہے اور انہیں رخت سفر باندھنا پڑے گا۔

"میری بچی آفتاب... میری امید۔" ترتیب پاتے اس پروگرام کو سن کر کشور نے اپنی نومولود بیٹی کی یاد دلائی۔

"آپ کی بچی نرسری میں حفاظت سے ہوگی۔ فی الحال آپ لوگ یہاں سے نکل جائیں اور میرا فون نمبر ساتھ لے جائیں۔ کسی محفوظ جگہ پہنچ کر آپ مجھ سے رابطہ کیجیے گا۔ میں آپ کی بچی کو آپ تک پہنچا دوں گی۔"

شبانہ نے تجویز پیش کی جو موجودہ حالات میں مناسب معلوم ہورہی تھی لیکن کشور ایک ماں تھی۔ اس کے لیے اپنی بچی

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو یوں چھوڑ کر جانا آسان نہیں تھا۔ وہ بری طرح رونے لگی۔

”آپ روئیں نہیں۔ میں امید کو لانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ اس کے آنسوؤں نے حسبِ معمول آفتاب کو بے قرار کر دیا اور وہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”نن... نہیں۔ باہر آپ کے لیے خطرہ ہوگا۔“ کشور نے جھٹ اس کا ہاتھ تھام کر اسے باہر جانے سے روک لیا۔ اگر بیٹی عزیز تھی تو شوہر بھی کم محبوب نہیں تھا۔ بیٹی کی خاطر وہ اس کی جان خطرے میں کیسے ڈالتی؟

”خطرہ آپ کے لیے یہاں بھی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ آپ کے پیچھے کون لوگ لگے ہوئے ہیں لیکن یہ تو صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ لوگ آپ کی جان کے دشمن ہیں۔ شکر ہے کہ وہ یہ نہیں جانتے کہ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہوں۔ واحد ڈاکٹر کرمانی ہیں جنہوں نے مجھے آپ کے ساتھ دیکھا ہے۔ وہ بہت غصے والے آدمی ہیں لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ انہوں نے آپ کے دشمنوں کو ہرگز بھی یہ بات نہیں بتائی ہوگی مگر آپ پھر بھی بہت دیر تک یہاں نہیں چھپ سکتے۔ اگر ان لوگوں کو شک ہو گیا تو وہ زبردستی یہاں کے ہر کوارٹر کی تلاشی لے سکتے ہیں۔“ شبانہ نے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان دونوں کو سمجھایا تو وہ دونوں ہی سوچ میں پڑ گئے۔

”بچی کے بارے میں، میں آپ کو ایک بار پھر یقین دلاتی ہوں کہ آپ کی بچی آپ تک پہنچا دوں گی۔ میری طرف سے یہ صرف ایک تجویز ہے۔ زبردستی میں آپ کے ساتھ کر بھی نہیں سکتی۔ اتنا ساتھ بھی اس لیے دے رہی ہوں کہ آپ لوگ مجھے اچھے لگے ہیں ورنہ موجودہ حالات میں تو مجھے خود پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسپتال کی مینجمنٹ مجھ سے وضاحت مانگے گی کہ میں نے خود کو اس پچویشن میں کیوں انوالو کیا؟“ شبانہ کی بات میں سچائی تھی۔ آفتاب فوراً نتیجے پر پہنچ گیا۔

”ٹھیک ہے، ہم نازیہ صاحب کے ساتھ یہاں سے نکل رہے ہیں۔ آپ میرا فون نمبر رکھ لیں اور اپنا دے دیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے موبائل نکالنے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ خالی واپس آیا۔ اس کا موبائل بھاگ دوڑ میں کہیں گر چکا تھا۔

”آپ میرا نمبر رکھ لیں۔ اگر کسی وجہ سے فون پر رابطہ نہیں ہو سکا، تب بھی آپ کے لیے مجھ تک پہنچنا مشکل نہیں ہوگا۔ میں تو مستقل یہیں ہوتی ہوں۔“ شبانہ ذہین لڑکی تھی اس نے فوراً سمجھ لیا کہ آفتاب کا موبائل اس کے پاس نہیں رہا ہے چنانچہ جھٹ نیا مشورہ دے دیا۔ آفتاب نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ ایک کاغذ پر فون نمبر لکھ کر اسے دینے کے بعد شبانہ کوارٹر کی کھڑکی تک گئی۔ یہ کھڑکی کوارٹر کی پشت پر تھی اور یہاں سے ڈاکٹر کرمانی کے کمرے کا دروازہ صاف نظر آ رہا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ حملہ آور باہر نکل آئے ہیں لیکن خوش قسمتی سے ابھی انہوں نے اس طرف کا رخ نہیں کیا تھا پھر اس کے کوارٹر کا دروازہ بھی اس طرف سے سامنے نہیں پڑتا تھا کہ اگر آفتاب اور کشور دروازے سے باہر نکلتے تو فوراً نظروں میں آ جاتے۔

”آپ لوگوں کو یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔ اگر کچھ دیر اور گزر گئی تو میرے لیے آپ کی کوئی بھی مدد کرنا ممکن نہیں ہوگا۔“ باہر کی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد اس نے کھڑکی بند کر کے پردہ برابر کیا اور اپنا رخ ان لوگوں کی طرف کرتے ہوئے بولی۔

”اوکے، ہم یہاں سے نکلتے ہیں۔“ آفتاب نے فوراً اعلان کیا۔

”تمہیں تو کوئی پریشانی نہیں ہوگی شبانہ؟“ نازیہ کا اس صورتِ حال میں بڑا اہم کردار تھا۔ انہیں اس کی گاڑی میں ہی یہاں سے روانہ ہونا تھا لیکن شاید اس کے اور شبانہ کے تعلقات کی نوعیت ایسی تھی کہ اس نے اپنی کزن سے تین اختلاف نہیں کیا تھا اور خاموشی رضامندی سے اپنی دوستی کا مان رکھا تھا لیکن اس کی طرف سے تشویش کا شکار تھی۔

”میری طرف سے بے فکر رہو۔ یہ اسپتال میرا گھر ہے اور یہاں میرا خیال رکھنے والے بہت لوگ ہیں۔“ شبانہ نے اسے اپنی طرف سے اطمینان دلایا پھر وہ لوگ دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

”تھینک یو سو مچ مس شبانہ! آپ کا یہ احسان میں ساری زندگی یاد رکھوں گا۔“ اس بار آفتاب نے کشور کو بانہوں میں اٹھانے کے بجائے صرف سہارا دیا ہوا تھا اور نہایت ممنونیت سے شبانہ سے کہہ رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں سر... انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور فوراً ہی اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر کشور کی طرف رخ موڑ گئی۔

”بہت سے کام لیجیے گا اور اپنا خیال رکھیے گا۔ اتنا چاہنے والا زندگی کا ساتھی سب کو نہیں ملتا چنانچہ جسے ملے اسے قدر کرنی چاہیے اور زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا چاہیے کیونکہ آپ کے پاس زندہ رہنے کی ایک بہت ہی خوب صورت وجہ موجود ہے۔“ اس کی یہ نصیحت سن کر کشور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دھیرے سے مسکرا دی اور اس سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ نازیہ بھی باہر نکلنے سے قبل اس سے گلے ملی اور پھر وہ سب باہر نکل گئے۔

کشور کو انہوں نے گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹا دیا۔ اس طرح وہ آرام سے بھی رہتی اور باہر سے دیکھنے والوں کو نظر بھی نہ آتی۔ آفتاب نازیہ کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اس نے اپنے جسم کو دُہرا کر کے بالکل جھکا لیا تھا۔ اب نازیہ گاڑی لے کر نکلتی تو دور سے دیکھنے والوں کو یہی تاثر ملتا کہ وہ اکیلی گاڑی میں جا رہی ہے۔ گاڑی حرکت میں آئی تو شبانہ نے الوداعی انداز میں ہاتھ اٹھا کر ہلایا اور اس وقت تک ہلاتی رہی جب تک گاڑی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ گاڑی کے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد وہ اپنے کوارٹر میں آئی اور دروازہ بند کر کے اس سے پشت لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اس پل اس کی دائیں آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ ٹپکا۔ یہ قطرہ اس خاموش محبت کا گواہ تھا جو ایک اجنبی کے لیے اس کے دل میں جاگی تھی اور اظہار کی جرأت نہ پا سکی تھی کہ وہ شخص تو پہلے ہی پور پور کسی اور کا تھا ورنہ اس پل جب آفتاب نے کہا تھا کہ مس آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا، اس کا دل چاہا تھا اس سے کہے کہ اور میں آپ کو زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی... لیکن محبت کے معاملات ہوتے ہی دنیا کے ہر معاملے سے انوکھے ہیں۔ بڑی بڑی سمندر جیسی گہری محبتیں اظہار کے چند لفظوں سے محروم رہ جاتی ہیں اور شاید محبت کو اس کی حاجت ہوتی بھی نہیں ہے۔

☆☆☆

شیدا شدید غصے اور پریشانی کا شکار تھا۔ جس کام کو وہ بہت آسان سمجھ رہا تھا، اسے سرانجام دینے میں بری طرح ناکام رہا تھا۔ کشور اور آفتاب کا پتا چل جانے پر اس نے تو یہی سوچا تھا کہ بس سیدھا وہاں پہنچے گا اور بندوق کے بل پر دونوں کو قابو کر کے اپنے ساتھ لے آئے گا لیکن اسے تو ان دونوں کی شکل بھی دیکھنے کو نہیں ملی۔ وہ کمرے کے بند دروازے کے پیچھے سے ایسے غائب ہوئے تھے کہ وہ بس ان کی آہٹوں کے پیچھے ہی بھاگتا رہ گیا۔ کشور کے کمرے اور دونوں کمروں کے مشترکہ باتھ روم کے دروازے کھولنے میں انہیں کچھ وقت لگا تھا۔ اس کے بعد وہ جب پچھلے کمرے سے گزر کر کوریڈور میں پہنچے تو فوری طور پر اندازہ نہیں لگا سکے کہ ان کا شکار کس طرف گیا ہے۔ کوریڈور میں بہت سے کمروں کے دروازے کھل رہے تھے۔ وہ لوگ ایک ایک کر کے ہر کمرے کو دیکھتے آگے بڑھتے رہے۔ سب سے آخر میں ڈاکٹر کرمانی کے کمرے کا دروازہ تھا، انہوں نے اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کی تو وہ اندر سے بند ملا۔ وہ لوگ سمجھ گئے کہ ان کا شکار اسی کمرے میں ہے۔ دروازے کے لاک کو گولی سے اڑانے کے بعد وہ اندر گھی پتچھی گرانے کے لیے اس پر زورآزمائی کرنے لگے۔ ان کی کامیابی سے پہلے دروازہ خود ہی کھل گیا اور ایک ادھیڑ عمر آدمی کا غصے بھرا چہرہ نظر آیا۔

”کون ہو تم لوگ اور یہ کیا بدتمیزی ہے؟“ ان کے ہاتھوں میں موجود اسلحے کو خاطر میں لائے بغیر اس نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔ شیدا اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اسے دھکیلتا ہوا کمرے میں گھس گیا۔ پیچھے اس کے چیلے بھی تھے لیکن خلافِ توقع کمرا خالی تھا۔

”کہاں ہیں وہ دونوں؟“ وہ ڈاکٹر کرمانی کی طرف منہ کر کے غرایا۔

”چلے گئے۔“ ڈاکٹر نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔

”کہاں چلے گئے؟“ اس نے پوچھا۔

”آئی ڈونٹ نو۔ انہوں نے مجھے بتایا نہیں تھا۔“ ڈاکٹر کرمانی جو کچھ نکی سا آدمی تھا، اسی اطمینان سے بولا۔ دروازہ کھولتے وقت اس کے چہرے پر جو غصہ تھا اب اس کا نام و نشان بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ وہ اس صورتِ حال کو انجوائے کر رہا ہے۔

”استاد! اس طرف ایک دروازہ اور ہے۔ لگتا ہے وہ لوگ اس دروازے سے باہر نکل گئے ہیں۔“ شیدے کا ایک ساتھی وہ دروازہ دریافت کر کے چلایا جو کھڑکیوں اور دروازوں پر پڑے بڑے سے مشترکہ پردے کی وجہ سے فوراً نظر میں نہیں آیا تھا۔ دروازہ کھولا گیا تو سامنے کھلا برآمدہ نظر آیا اور ساتھ ہی یہ بات یقینی ہو گئی کہ فرار ہونے والے اسی راستے سے گئے ہیں۔

”مین گیٹ کی طرف دیکھو۔“ شیدے نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ایک تو وہ اتنا ذہین نہیں تھا، دوسرے اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ جن لوگوں کے پیچھے ہے انہیں کسی نرس کا تعاون بھی حاصل ہے۔ اس لیے وہ یہی سوچ سکا تھا کہ وہ لوگ مین گیٹ سے گزر کر اسپتال سے فرار ہونے کی کوشش کریں گے۔ وہ لوگ مین گیٹ تک پہنچے ہی تھے کہ پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے۔ پولیس کی آمد کی بعید از امکان نہیں تھی، وہ لوگ اسپتال میں موجود ہر شخص کو اپنے کنٹرول میں نہیں لے سکے تھے۔ کوئی بھی شخص پولیس کو کال کر سکتا تھا۔ اس بات کی انہوں نے اتنی زیادہ فکر اس لیے نہیں کی تھی کہ ان کے نزدیک ان کا کام محض چند منٹوں کا

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا اور چند منٹوں میں وہ پولیس کی آمد کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن یہاں تو چال ہی الٹی پڑ گئی۔ وہ کشور اور آفتاب کی گرد کو بھی نہیں پا سکے، الٹا خود مشکل میں پڑنے والے تھے۔ شیدے نے موبائل پر کال کر کے اسپتال کے..... اندر موجود ساتھیوں کو باہر نکلنے کا حکم دیا اور پھر وہ لوگ اپنی جیپ میں جا بیٹھے۔ سومرو اپنی الگ گاڑی میں آیا تھا اور اب انہیں اس کے ساتھ ہی جانا تھا۔ جونہی انہیں پولیس کی گاڑی کی جھلک دکھائی دی، اندر موجود دونوں بندے بھی ان سے آن ملے۔ ان دونوں کے جیپ میں سوار ہوتے ہی وہ برق رفتاری سے وہاں سے بھاگ نکلے۔ ان حالات میں ان کا دھیان اس سفید سوزوکی مہران کی طرف جانا ممکن ہی نہیں تھا جسے ایک لڑکی ڈرائیو کر رہی تھی۔

"بہت برا ہوا سومرو..... بہت ہی برا ہوا۔ اس ناکامی پر تو چودھری صاحب میرے ٹوٹے ٹوٹے کر ڈالیں گے۔" شیدا، سومرو کے ساتھ اس کی گاڑی میں ہی بیٹھا تھا۔ وہ لوگ پولیس سے ذرا محفوظ فاصلے پر پہنچے تو اس نے ہاتھ ملتے ہوئے سومرو سے کہا۔

"برا تو خیر ہوا یار! مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ اتنے تیز ہیں ورنہ میں تمہیں ایسے ڈائریکٹ حملہ کرنے کے بجائے ذرا سوچ سمجھ کر انہیں گھیرنے کا مشورہ دیتا۔" سومرو نے جواب دیا۔

"کوئی صورت نکالو سومرو! سوچو کہ وہ اسپتال سے نکل کر کدھر جا سکتے ہیں۔ اس شہر میں ان کا کوئی ٹھکانا تو ہوگا نا؟" شیدے کو اپنی جان کے لالے پڑے تھے چنانچہ وہ اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔

"اسپتال کے ریکارڈ سے میں نے اس گھر کا پتا نکلوایا تھا جدھر آج کل وہ لوگ رہ رہے تھے۔ ادھر چیک کر لیتے ہیں لیکن اگر وہ اتنے ہُشیار (ہوشیار) ہیں تو مشکل ہے کہ واپس گھر کا رخ کریں۔ وہ سب سے پہلے شہر سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔" سومرو نے اسے بتاتے ہوئے خیال آرائی کی۔

"وہ ایسا نہیں کر سکتے سومرو۔ تم نے بتایا تھا کہ ان کی بچی اسپتال کی نرسری میں ہے۔ وہ ابھی جان بچا کر بھاگے ہیں لیکن بچی کو لینے کے لیے تو واپس آئیں گے۔ اگر کسی طرح وہ بچی ہمیں مل جائے تو اس کے ذریعے ہم انہیں قابو کر سکتے ہیں۔" شیدے کے دماغ نے بھی اب کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

"بچی کا مسئلہ نہیں ہے۔ میں اسے اسپتال سے نکلوا سکتا ہوں لیکن اس کے لیے رقم خرچ کرنی پڑے گی۔" سومرو نے جواب دیا۔

"رقم کی فکر نہ کرو۔ اس کا بندوبست ہو جائے گا۔ تم بس یہ کام کرواؤ۔" اس نے سومرو سے کہا تو وہ ڈرائیونگ کے دوران ہی فون پر مصروف ہو گیا۔ دوسری طرف شیدے نے بھی منشی اللہ رکھا کو فون کر کے اب تک کی رپورٹ دی اور اگلے مرحلے کے لیے ڈرتے ڈرتے رقم کی فراہمی کا مطالبہ کر ڈالا۔ منشی نے رپورٹ سن کر خوب برا بھلا کہا لیکن رقم کی فراہمی کے لیے رضامندی دے دی۔

"کیا ہوا، بچی کب تک ملے گی؟" جس دوران وہ منشی سے بات کر رہا تھا سومرو فارغ ہو چکا تھا چنانچہ اس نے بے تابی سے سومرو سے پوچھا۔

"ایک گھنٹے میں کام ہو جائے گا۔ اگر تم چاہو تو اتنی دیر میں ہم ماسٹر کے گھر کو دیکھ لیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ادھر ہی چلتے ہیں۔" اس نے ہامی بھر لی اور گاڑیوں کا رخ آفتاب کے گھر کی طرف ہو گیا۔ حسب توقع وہاں کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے گھر میں موجود مختصر سامان کو بری طرح توڑا پھوڑا اور ایک نسبتاً پڑھے لکھے آدمی سے یہ تحریر لکھوا کر کاغذ دیوار پر چسپاں کر دیا۔ "اگر اپنی بچی زندہ سلامت چاہتے ہو تو اس شخص کے پاس چلے آؤ جس سے بھاگے پھر رہے ہو۔" اس کام سے فارغ ہو کر وہ لوگ سومرو کے گھر واپس لوٹ گئے۔ آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد بچی بھی ان تک پہنچ گئی۔ گلابی کپڑوں اور گلابی ہی چادر میں لپٹی وہ نازک سی بچی اتنی پیاری تھی کہ دیکھنے والوں کے دل موہ لے لیکن اسے دیکھنے والوں کے پاس دل تھے ہی کہاں؟ وہ تو بس پیسوں کے پجاری اور غلام ابن غلام تھے جن کی ساری حسیات مر چکی تھیں۔

بچی ہاتھ آئی تو شیدے نے منشی کے حکم کے مطابق فوراً روانگی کا اعلان کر دیا۔ ان کے ساتھ کوئی عورت تو تھی نہیں۔ بچی کی ضرورت کی چند اہم چیزیں اپنے ساتھ لے کر وہ لوگ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ انہیں یہاں سے کراچی تک کا سفر بائی روڈ طے کرنا تھا پھر وہاں سے صرف شیدا بچی کو لے کر بائی ائر لاہور پہنچتا۔ منشی کی ہدایت تھی کہ اگلا کوئی حکم آنے تک بچی کو لاہور والی کوٹھی میں رکھا جائے۔ وہاں کے ملازمین میں ایک عورت بھی شامل تھی چنانچہ بچی کی دیکھ بھال کا مسئلہ حل ہو جاتا لیکن فی الحال وہ سارے اس ذرا سی بچی کی وجہ سے ہلکان تھے۔ ان میں سے ایک اسے اپنی گود میں لے کر پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔ ہتھیاروں کو اٹھانے والے ہاتھوں کو کیا معلوم تھا کہ ایک معصوم بچی کو کس طرح سنبھالا جاتا ہے۔ بچنے والے کے اناڑی ہاتھوں کی گرفت نے بچی کو بے چین کر دیا اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگی۔

"اوئے یار! چپ کرواؤ اس کو۔ تھکا پہلے ہی گھوما ہوا ہے، اس پر سے اس کی ریں ریں سن کر ہور بھی سر میں درد ہو رہا ہے۔" کچھ دیر برداشت کرنے کے بعد شیدا اپنے ساتھی پر بگڑا۔

"چپ کروانے کی کوشش تو کر رہا ہوں لیکن اس کا بھونپو کسی طرح بند ہی نہیں ہو رہا۔" بچی کو ہاتھوں پر جھلا جھلا کر اسے خاموش کروانے کی کوشش میں ہلکان ہوتے شخص نے جواب دیا۔

"اس کے منہ میں دودھ کی بوتل ٹھونس دو۔" شیدے نے غصے سے مشورہ دیا جس پر عمل کرنے کی کوشش کی جانے لگی لیکن بچی بھوک کے بجائے کسی اور مسئلے سے دوچار تھی اس لیے بوتل منہ میں لینے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔

"اگر چودھری صاحب نے اسے زندہ سلامت نہ مانگا ہوتا تو میں اس کا گلا گھونٹ کر ہمیشہ کے لیے چپ کروا دیتا۔" ناکام و نامراد شیدا سارا غصہ معصوم بچی پر نکال رہا تھا۔ وہ بچی چودھری افتخار عالم شاہ کی نواسی تھی لیکن چونکہ اس کی مرضی کے خلاف اس دنیا میں آئی تھی اس لیے اس کے معمولی ملازم بھی اس معصوم پر غرا رہے تھے۔ ابھی جو اگر وہ اپنے نانا کی آنکھ کا تارا ہوتی تو کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ اسے اُف بھی کہہ پاتا۔ سارے کے سارے چودھری کی خوشنودی کے لیے اس پر اپنی جان نثار کر رہے ہوتے۔ رویوں کے فرق سے ناواقف وہ نومولود بچی گلا پھاڑ پھاڑ کر روتی رہی اور دوسروں کی جان ہلکان کر رہی تھی۔ اس کے رونے نے ان سب کی توجہ بانٹ دی تھی چنانچہ وہ نوٹ ہی نہیں کر سکے کہ ایک گاڑی بہت دیر سے ان کے تعاقب میں ہے۔ وہ تو جب اس گاڑی کی کھڑکیوں سے جھانکنے والی کلاشنکوفوں نے شعلے اگلے اور جیپ کے سواروں میں سے تین کو شکار کر لیا تو انہیں ہوش آیا لیکن سنبھلنے کا موقع ہی نہیں تھا۔ گولیوں کا شکار ہونے والے تینوں افراد میں سے ایک بھی اس لائق نہیں تھا کہ جوابی فائر کر سکے۔ صرف ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شیدا اور بچی کو گود میں لے کر بیٹھنے والا شخص گولیوں کی زد میں آنے سے محفوظ رہے تھے یا پھر شاید انہیں نشانہ بنانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی تھی۔ شیدے نے جب دیکھا کہ وہ لوگ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو جیپ کی رفتار مزید بڑھا کر وہاں سے نکل جانے کی کوشش کی لیکن اب حملہ کرنے والی گاڑی ان کی جیپ کے بالکل ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ شیدے نے ایک نظر اس گاڑی کی طرف ڈالی تو ایک ہتھیار بردار شخص نے اسے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ ہتھیار سے لیس شخص جب کسی کو نشانے پر لے کر اشارہ کرے تو وہ اشارہ صرف اشارہ نہیں رہتا، حکم بن جاتا ہے۔ شیدے کے پاس بھی بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسے گاڑی روک کر سائڈ پر لگانی پڑی۔

"ہمارے پاس کوئی مال دولت نہیں ہے۔ تم جو کوئی بھی ہو تمہیں ہم سے کچھ نہیں ملے گا۔" موٹی عقل کا شیدا یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ جنہیں مال چاہیے ہو، وہ پہلے ہی سے اتنی بے دردی سے قتل و غارت نہیں کرتے۔

"بکواس بند کراوئے۔ ہمیں تیری اوقات اچھی طرح پتا ہے۔ ہمیں مال نہیں یہ بچی چاہیے۔" شیدے کے منہ پر بٹ مار کر اس کا تھوبڑا نیز ھا کرتے ہوئے اسے جواب دیا گیا۔

"نہیں، میں یہ بچی تمہیں نہیں دے سکتا۔ اگر تم اسے لے گئے تو چودھری صاحب میری کھال کھچوا دیں گے۔" خود کو لگنے والی چوٹ کی پروا نہ کرتے ہوئے شیدے نے مزاحم ہونے کی کوشش کی۔ وہ جانتا تھا کہ پہلی ناکامی پر ہی اسے

نمک پارے

☆ بچوں کو نافی مت دو، ہمارے تک پارے دو۔
☆ میرا روپ نہ حسن سے بنا تھا، نہ تازو نزاکت سے بلکہ حوصلوں ہمتوں اور مقابلوں سے۔
☆ مشکل اچھی چیز ہے بشرطیکہ تم اسے صحیح استعمال کر سکو۔
☆ اٹھ جاگ رے راہی بھور بھئی اب رین کہاں جو سووت ہے، جو جاگت ہے سو پاوت ہے، جو سووت ہے سو کھووت ہے۔
☆ یہ ایک دل فگار مسئلہ ہے جس کا حل دو نئے مسئلوں کو جنم دیتا ہے۔
☆ میں اپنے درد کے لیے گرم بوتل کی جگہ کرے بلی لگا کر سوتا ہوں، وہ ٹھنڈی نہیں ہوتی۔
☆ ہائے کتنے پرسکون دن تھے اور پرسکون راتیں جب ٹیلی فون ایجاد نہیں ہوا تھا۔
☆ جب سقراط جیسا عقل مند زہر پی گیا تو ظاہر ہوا، احمق سے احمق عورت عقل مند سے عقل مند مرد کو احمق بنا سکتی ہے۔
اذہان نعیم ہودہری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چودھری کے اچھے خاصے عتاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بچی ہاتھ سے نکل جاتی تو اس کا وہ حشر کیا جاتا کہ دیکھنے والے لرز اٹھتے۔ خود کو اس انجام سے بچانے کے لیے ہی اس نے مزاحمت کی کوشش کی جو سراسر ناکام رہی۔

"اگر تو نے ہماری راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی تو ہم تیری کھال کھچوانے کے ساتھ اس میں بھس بھی بھر دیں گے۔" اس کے شانے پر ایک زوردار ضرب لگا کر راستے سے ہٹاتے ہوئے جواباً کہا گیا اور بچی کو جھپٹ لیا گیا۔ تمام تر کوششوں سے چپ نہ ہونے والی بچی فائرنگ کی آواز پر رونا بند کر چکی تھی۔ شاید وہ ننھی سی جان حیران تھی کہ یہ مجھے کس دنیا میں سانس لینے کو بھیج دیا گیا ہے؟

"تمہیں اس بچی کو ساتھ لے جانے کے لیے میری لاش پر سے گزرنا پڑے گا۔" ٹھیک ٹھاک چوٹ کھا لینے کے باوجود شیدے کا دم خم باقی تھا۔ دوسرے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جان اس کی ہر حال میں خطرے میں ہے۔ اگر وہ بچی سے ہاتھ دھو کر چودھری کے پاس پہنچا تو بڑی دردناک موت سے دوچار ہوتا چنانچہ بہتر تھا کہ یہیں تھوڑی سی جدوجہد کر لی جائے۔ اگر کامیاب ہو گیا تو چودھری کی طرف سے تھوڑی رعایت مل جائے گی ورنہ کم از کم وہ ان حملہ آوروں کے ہاتھوں ہی نسبتاً آسان موت مارا جائے گا۔

"اسے جان پیاری نہیں ہے یارا۔ یہ اتنی ضد کر رہا ہے تو اس کا کام تمام ہی کر دو۔" بچی کو گود میں لے لینے والے نے اپنے کسی ساتھی کو حکم دیا اور واپس گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنی پشت پر فائر کی آواز سنی لیکن پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ جو کچھ ہوا تھا، اسے وہ بغیر دیکھے بھی جان سکتا تھا۔ شیدے کا واحد سالم ساتھی جس کی گود میں تھوڑی دیر قبل بچی تھی حیرت سے یوں گنگ ہوا تھا کہ مجسمہ ہی بن گیا تھا۔ موت کے ہرکاروں کو موت سے دوچار کرنے والے اپنی گاڑی میں واپس بیٹھے اور گاڑی ایک بار پھر چل پڑی۔ آفتاب اور کشور کی ننھی امید ان کے ساتھ تھی اور نہیں جانتی تھی کہ جن کے ساتھ سفر کر رہی ہے، وہ اس کے دوست ہیں یا دشمن۔ ابھی تو اسے ان دونوں جذبوں کے درمیان فرق کرنا بھی نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

جنگل پر رات اتر آئی تھی اور رات کے اندھیرے نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ تاریکی نے جنگل کی ہیبت ناکی اور وحشت کو کچھ اور بھی بڑھا دیا تھا۔ جنگل کا یہ حصہ جسے ڈاکوؤں نے اپنی رہائش کے لیے کاٹ چھانٹ کر ذرا کم گنجان کر لیا تھا، دن کی روشنی میں کچھ کچھ خوب صورت بھی محسوس ہوتا تھا۔ کچھ کچھ اس لیے کہ یہاں موجود ڈاکوؤں کے جھونپڑوں نے اس کی خوب صورتی کو داغ دار کر دیا تھا اور انسانی ہاتھوں کی غیر جمالیاتی چھیڑ چھاڑ نے جنگل کے اس حصے کی خوب صورتی میں سے کافی کچھ چھین لیا تھا۔ جنگل کا یہ حصہ ظالم و مظلوم سب کے لیے ایک سی پناہ گاہ ثابت ہوا تھا۔ یہاں ظلم کا بازار گرم رکھنے والا اجرو بھی تھا اور اپنے خواب اور مقصد حیات کھو دینے والا اسلم بھی۔ باہر سے دیکھنے والا ان دونوں میں فرق محسوس نہیں کر سکتا تھا لیکن دونوں میں فرق تو تھا جب ہی آج اسلم اس جگہ کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

طے کردہ پروگرام کے تحت وہ آدھی رات کے قریب اپنے جھونپڑے سے نکلا۔ باہر نکل کر اس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ آسمان پر چمکتے چاند نے بھی ابھی اپنی عمر کی کچھ منزلیں ہی طے کی تھیں اس لیے آدھا ادھورا تھا اور شاعری کے کسی بھی استعارے و تمثیل میں استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چاندنی کی اس بے حد مدھم روشنی میں چلتا ہوا وہ ماہ بانو کے جھونپڑے کی طرف بڑھا تو اپنے ایک ساتھی سے ٹکراؤ ہو گیا۔

"کی گل ہے سوہنیو۔ آج یہ ہمارا شہزادہ اس وقت کدھر چہل قدمی کرتا نظر آ رہا ہے؟" اس نے ذرا مسکراتے ہوئے اسلم سے سوال کیا۔ چاندنی کی مدھم روشنی میں مسکرانے پر نظر آنے والے اس کے چوڑے چوڑے پیلے دانت اور بھی بدنما محسوس ہو رہے تھے۔

"شہزادہ بھی کہتے ہو اور پھر ایسے سوال بھی کرتے ہو۔ جانتے نہیں ہو کہ شہزادوں کے مزاج کا کچھ پتا نہیں ہوتا اور وہ کبھی بھی کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

اسلم نے اس کی بات کو مذاق میں ٹالا جسے سن کر وہ زوردار قہقہہ لگا کر ہنسا پھر ایک آنکھ کا کونا دباتے ہوئے رازداری سے بولا۔ "سچ کہو، ادھر جا رہے ہو نا جدھر جانے پر باقی سب کے لیے پابندی ہے؟" اس کے سوال کا مطلب سمجھتے ہوئے اسلم نے سر کو اثبات میں ہلا دیا۔ اس کے ساتھیوں کے لیے یہی تاثر سب سے مناسب تھا کہ وہ سمجھیں کہ وہ ماہ بانو کے ساتھ شب بسری کے لیے جا رہا ہے۔

"جا فیر عیش کر۔" اس نے ایک اور قہقہہ لگایا اور اس کے شانے پر دھپ مارتے ہوئے بولا۔ اسلم نے بھی وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور فوراً چل پڑا۔ آگے بڑھتے ہوئے اسے للی نظر آئی۔ وہ جنگل کے شرقی حصے کی طرف جا رہی تھی۔ اس سے اسلم نے جو معاملات طے کیے تھے، اس کے مطابق للی نے شرقی حصے میں پہرا دینے والے کو خود سنبھال لینے کا دعویٰ کیا تھا اور اسلم جانتا تھا کہ وہ ایسی چلتا پرزہ عورت ہے کہ یہ کام آسانی سے کر گزرے گی۔ للی کے اس معاملے میں شامل ہونے پر وہ شروع میں تو تھوڑا الجھا تھا لیکن بعد میں اسے احساس ہوا تھا کہ للی کی شمولیت سے اس کا کام تھوڑا آسان ہو جائے گا۔ اب بھی اسے مخصوص سمت میں جاتے دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان اترا۔ خود اس نے ماہ بانو کے جھونپڑے کے باہر پہنچ کر دھیرے سے دستک دی۔

"آ جاؤ۔" اندر سے اس نے جواب دیا، وہ فوراً ہی اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ہی وہ لالٹین کی مدھم روشنی میں کھڑی نظر آ رہی تھی اور روشنی کی کمی نے بھی اس کی سندرتا پر کوئی فرق نہیں ڈالا تھا۔ ہمیشہ ڈھیلے ڈھالے لباس میں چھپا رہنے والا اس کا جسم بھی بار تنگ جینز اور ٹی شرٹ سے آشنا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا کہ یہ ناری جس خزانے کو چھپائے پھرتی ہے، لو آج تم نے اس کے دیدار کی ایک صورت نکال ہی لی۔ اگرچہ یہ دیدار اب بھی ادھورا ہے لیکن صاف پتا چلتا ہے کہ جس خزانے کو چھپا چھپا کر رکھا جاتا ہے، وہ واقعی بڑا قیمتی اور نایاب ہے۔ وقت کے ان لمحوں میں اسلم ذرا دیر کے لیے تو بھول ہی گیا تھا کہ وہ یہاں کس لیے آیا ہے۔ وہ بس مبہوت سا کھڑا اسے دیکھے جا رہا تھا اور اس کے اس انہماک پر وہ اپنی اوڑھنی کو جو اس نے اس خالصتاً مغربی لباس پر بھی اوڑھ رکھی تھی، مزید پھیلانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن چھپ پھر بھی نہیں پا رہی تھی۔

"کب تک نکلنا ہے؟"

آخر اس نے اسلم کا انہماک توڑنے کے لیے اس سے پوچھا تو وہ ہوش میں آیا اور بولا۔ "بس ابھی چلتے ہیں۔ میں ذرا حالات کا جائزہ لے لوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکلا اور جھونپڑے کے ساتھ بالکل چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے پیچھے اس نے دروازہ بند کر دیا تھا کہ اندر جلتی لالٹین کی روشنی باہر آ کر اسے عیاں نہ کر سکے۔ اس طرح تاریکی کا حصہ بن کر چپ چاپ کھڑے ہونے کی دو وجوہات تھیں، وہ انتظار کر رہا تھا۔ یہاں سے روانگی سے قبل دو واقعات ظہور پذیر ہونے لازمی تھے۔ اس کا یہ انتظار رائگاں نہیں گیا۔ حسب توقع وہ شخص جو اسے راستے میں ملا تھا اور رات کو پہرا دینے والوں میں سے ایک تھا، اس طرف آتا نظر آیا۔ جھونپڑی کے قریب پہنچ کر اس نے اپنے قدموں کی آواز کو بالکل ہی دبا لیا اور دروازے کے سامنے کھڑا ہو کر اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ بھی یہاں موجود ہوس پرستوں میں سے ایک تھا جو مال ہاتھ نہ آنے پر صرف آنکھوں کی سینکائی کے ذریعے ہی اپنے نفس کی کچھ نہ کچھ تسکین کر لینا چاہتا تھا۔ اپنی اس جدوجہد میں مگن اسے علم ہی نہ ہو سکا کہ کب تاریکی کا حصہ بنا اسلم سانپ کی سی پھرتی سے اس پر آن پڑا اور اس کا منہ اور ناک اپنے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں لے کر اس طرح دبایا کہ وہ سوائے پھڑپھڑانے کے کچھ نہیں کر سکا اور کچھ دیر میں ہی بے دم ہو کر اس کے بازوؤں میں جھول گیا۔ وہ صرف ہوش سے بیگانہ ہوا تھا یا زندگی کی بازی ہی ہار گیا تھا، یہ دیکھنے کی اسلم کے پاس فرصت نہیں تھی۔ اس نے بازوؤں میں جھولتے آدمی کو ایک طرف ڈالا اور مشرق کی طرف آسمان پر نظر جمائی۔ اس کی منتظر نظروں کو زیادہ دیر زحمت نہیں کرنی پڑی اور روشنی کی ایک لکیر سی تین بار اندھیرے میں جھلملا کر غائب ہو گئی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ للی نے اپنے حصے کا کام کر لیا ہے اور اس طرف موجود شخص بھی اتنا معطل ہو چکا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس شخص کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ پہلے للی نے اس کی ہوس کو جگایا ہوگا اور جب وہ ہوس میں مبتلا ہو کر اپنے اردگرد سے بے خبر ہوا ہوگا تو اس کا کام تمام کر دیا ہوگا۔ یہ اشارہ پا کر وہ تیزی سے اندر گیا۔ ماہ بانو اس کی ہی راہ تک رہی تھی۔ آج اس کے پیر اس زنجیر سے آزاد تھے جو یہاں آنے کے بعد سے مستقل اس کے جسم کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ زنجیر کا تالا کھولنے والی چابی اسلم نے ہی فراہم کی تھی اور اسے آزاد دیکھ کر خوشی سی محسوس کر رہا تھا لیکن یہ آزادی ابھی نامکمل تھی۔ آزاد تو وہ جب ہوتی جب اس جنگل کی فضا سے دور کسی مہذب دنیا میں پہنچ جاتی۔

"کیا ہوا... چلیں؟" اسلم کو دیکھتے ہی اس نے استفسار کیا۔

"ہاں۔" اس نے صرف ایک لفظی جواب دیا اور وہ دونوں ساتھ ساتھ باہر نکل آئے۔ باہر نکلتے ہوئے ماہ بانو نے اپنی اوڑھنی کو حتی الامکان مزید پھیلا لیا تھا۔ اسلم چاہتا تھا کہ اسے یہ اوڑھنی اتارنے کا کہہ دے تاکہ بھاگ دوڑ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو سکے لیکن اس کی جھجک اور شرم و حیا دیکھ کر نہ کہہ سکا۔ باہر نکل کر وہ دبے قدموں چلنے لگے۔ اسلم پوری طرح چوکنا تھا۔ انہوں نے صرف دو پہرے داروں کو خاموش کروایا تھا اور کسی تیسرے سے سامنا ہونا بھی بعید از امکان نہیں تھا۔ خیر گزری کہ وہ جب تک جھونپڑوں کے درمیان سے نکل کر اس مقام تک نہیں پہنچے جہاں للی ان کی منتظر تھی، تب تک ان کا کسی اور سے سامنا نہیں ہوا۔ سامنا ہوا تو اتنی اچانک کہ پوری طرح ہوشیار ہونے کے باوجود اسلم کو معلوم نہیں ہو سکا اور ایک رائفل کی نال اس کے سر سے آ لگی۔

digestpk.blogspot.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کون ہے؟'' رائفل بردار ایک تو اس کی پشت پر سے آیا تھا اور دوسرے روشنی بھی نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے وہ اسلم کو فوری طور پر پہچان نہیں سکا۔

''میں ہوں اسلم۔'' اس نے بغیر گھبرائے جواب دیا۔

''اسلم... تُو ادھر کیا کر رہا ہے اور تیرے ساتھ یہ دوسرا کون ہے؟'' رائفل کی نال اس کے سر سے ہٹ گئی اور تعجب سے پوچھا گیا۔

''بس ایسے ہی ہوا خوری کے لیے نکلا تھا۔'' وہ جواب دیتا ہوا پلٹا اور یکدم ہی پوچھنے والے پر حملہ کر دیا لیکن وہ اپنے اور اس کے مابین فاصلے کا درست اندازہ نہیں لگا سکا تھا اس لیے وار چھیچھلتا ہوا پڑا۔

''پاگل ہو گیا ہے کیا تو؟'' اس شخص نے خود کو گرنے سے سنبھالا اور غصے سے پوچھنے لگا لیکن اسلم کے پاس زبان سے جواب دینے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے ہاتھ سے جواب دینے کی کوشش کی اور اس شخص پر جا پڑا۔ اس بار اس شخص نے بھی رعایت نہیں کی اور نیچے گر جانے والی رائفل اٹھا کر اس کو دے ماری۔ رائفل کا بٹ اسلم کے شانے پر پوری قوت سے لگا۔ اگر وہ زمانہ طالب علمی والا اسلم ہوتا تو اس وار کو کھا کر لمبا لمبا لیٹا ہوا نظر آ رہا ہوتا لیکن اس جنگل میں گزارے ماہ و سال نے اسے بہت سخت جان بنا دیا تھا۔ چوٹ کھا کر وہ بس ذرا سا ڈگمگایا اور پھر سنبھل گیا۔ اس بار اس نے اپنی لات گھما کر رکاوٹ بننے والے شخص کے بڑھتے پر رسید کی اور حتمی طور پر اس کا جبڑا ٹوٹ گیا۔ ٹوٹے ہوئے جبڑے کو تھام کر وہ یکدم ہی گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ گیا۔ اسلم نے اسے سنبھلنے کی ذرا بھی مہلت دیے بغیر ایک بار پھر اس کے ہاتھ سے نکل جانے والی رائفل جھپٹ کر اٹھائی اور نال سے پکڑ کر پوری قوت سے اس کے سر پر مار دی۔ کھوپڑی چٹخنے کی آواز سنائی دی اور وہ شخص کوئی بھی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

''شاباش میرے شیر! تم نے تو دل خوش کر دیا۔ یہ دل ایسے ہی تو سب کو چھوڑ کر تم پر نہیں مرتا ہے۔ تمہارے سامنے ان سالے ساروں کی مردانگی پانی بھرتی ہے۔'' وہ جس جگہ موجود تھے، وہاں للی کی موجودگی متوقع تھی لیکن وہ انہیں نظر نہیں آئی تھی۔ راہ روکنے والے آدمی کے زمین پر گرتے ہی وہ جانے کہاں سے نکل کر آئی اور اسلم سے چمٹ کر اسے بوسا دیتے ہوئے بولی۔

''دور مر۔'' اسلم نے فوراً ہی اسے دھکیل دیا۔

''کتنا ہی دور ہٹاؤ رہوں گی تو میں تمہارے ساتھ ساتھ ہی۔'' اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''مار کر ابھی یہیں دفن کر دوں گا۔'' وہ غرایا۔

''کوشش کر دیکھو۔ مرنے سے پہلے اتنا شور مچاؤں گی کہ ڈیرے کے سارے لوگ ادھر جمع ہو جائیں گے... پھر نکل کر دکھانا اپنی محبوبہ دلنواز کے ساتھ یہاں سے۔'' اس نے طنز کیا۔

''یہ جھگڑا چھوڑو۔ جب طے ہے کہ للی ہمارے ساتھ جائے گی تو پھر بیکار کی بحث کس لیے؟'' اس مرحلے پر ماہ بانو نے ثالث کا کردار ادا کیا تو اسلم نے بھی مزید کچھ کہنے سے گریز کیا اور وہ تینوں بے آواز لیکن تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔ انہیں جلد از جلد اس جگہ سے نکل کر پہاڑی سلسلے میں داخل ہونے کی فکر تھی۔ ایک بار وہ اس سلسلے میں داخل ہو جاتے تو انہیں ڈھونڈنا آسان نہیں رہتا لیکن اصل مرحلہ تو اس سلسلے تک پہنچنے کا ہی تھا۔ وہ ابھی کافی فاصلے پر ہی تھے کہ انہیں اپنی پشت پر فائرنگ کی زوردار آوازیں سنائی دیں۔ شاید پہرے داروں کی لاشیں دریافت کر لی گئی تھیں اور اب پہرے داروں کو جنہوں نے لاشوں میں تبدیل کیا تھا، انہیں تلاش کیا جا رہا تھا۔

''بھاگو!'' اسلم نے ان دونوں سے کہا اور خود ماہ بانو کا ہاتھ تھام کر بھاگ پڑا۔ اس کے پاس ایک پسٹل، چاقو اور پہرے دار کی رائفل کے علاوہ مزید کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ للی کے پاس بھی شاید ایک ریوالور موجود تھا لیکن وہ تین افراد اتنے محدود اسلحے کے ساتھ ڈھیر سارے لوگوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ کم از کم اس کھلے حصے میں تو بالکل بھی نہیں اس لیے ان کے لیے بہتر تھا کہ جتنی تیزی سے ممکن ہو بھاگیں اور پہاڑی سلسلے میں پناہ لے لیں۔ پہاڑوں کی آڑ مل جاتی تو محدود اسلحے کے ساتھ بھی مقابلے کا امکان تھا اس لیے وہ دیوانہ وار دوڑتے چلے جا رہے تھے اور ان کی پشت پر ابھرتی فائرنگ کی آوازیں بھی اسی تناسب سے زور پکڑتی جا رہی تھیں۔ معلوم نہیں یہ جنگل انہیں اپنی قید سے آزاد ہونے بھی دیتا یا نہیں؟ ان کے پاس ذہنوں میں ابھرتے اس سوال کا جواب موجود نہیں تھا لیکن وہ اپنی پوری کوشش کر لینا چاہتے تھے۔ اس پرندے کی طرح جس کے پنجرے کا دروازہ غلطی سے کھلا رہ گیا ہو اور وہ اپنے پوری طرح پرواز نہ چڑھنے والے پروں کے باوجود ایک اونچی اڑان اڑنا چاہتا ہو تاکہ آزادی کا ذائقہ چکھ سکے۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں

سرگرداں ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

آدم خور

محمد عرفان آزاد

رہِ شوق کن کن مقامات سے ہو کر گزرتی ہے... اسے اس کا قطعی اندازہ نہیں تھا... دشوار گزار راستے سے بچنے کے لیے وہ اس جگہ جا پہنچا جہاں انتقام کا انوکھا کھیل کھیلا جا رہا تھا... اس سفاک شکاری کی داستان جس کے سینے میں محبت کی شمع روشن تھی۔

شارٹ کٹ کی تلاش میں ایک سائیکل سوار پر گزرنے والی بپتا کا احوال

ٹریوی دیوانوں کی طرح سائیکل کے پیڈل پر پاؤں مارے جا رہا تھا۔ اس کا جسم تپ رہا تھا۔ یہ جیت کی لگن کا بخار تھا۔ شدید سردی پڑ رہی تھی مگر سب سے آگے نکلنے کی دھن میں وہ جس تیزی سے سائیکل دوڑا رہا تھا، اس کے باعث اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ شام ڈھلتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہوا بھی بہت ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ لہو کو جما دینے والی سرد ہوا میں ٹریوی کے منہ سے نکلنے والی سانس بھاپ کی شکل میں دکھائی دے رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے منہ اور ناک سے دھواں نکل رہا ہو۔

گزشتہ ستمبر کی بات ہے جب ٹریوی نے شوقیہ سائیکل ریس کھیلنے والے ان سواروں کے گروپ میں شمولیت اختیار کی تھی۔ بدھ اور جمعہ ان شوقین سائیکل سواروں کی تربیت

Digests of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے مخصوص تھا۔ کبھی کبھار ہفتے کو بھی خصوصی کلاس کا انعقاد کیا جاتا تھا۔ شوقیہ سائیکل ریس سیکھنے کے ان خواہش مندوں کی تربیت کے لیے پانچ میل لمبا راستہ منتخب کیا گیا تھا۔ یہ راستہ نہایت ہی آڑا ترچھا تھا جس میں کئی خطرناک موڑ اور چڑھائی آتی تھی۔ یہ ایک بڑی سی جھیل کے ساتھ ساتھ ہوتا ہوا گزرتا تھا۔ سائیکل سواروں کو اس راستے کی دلکشی سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ تو بس اپنے سے آگے والے سائیکل سوار کو پیچھے چھوڑنا چاہتے تھے۔ اگر جیت کی لگن نہ ہو تو ایک عام آدمی کے لیے یہ بہت ہی خوبصورت راہ گزر تھی۔

عام طور پر سائیکل سوار شام پانچ بجے کلب سے نکلتے اور بیس سے پچیس منٹ کے دوران اس دشوار ترین راستے پر اپنی تربیت کا عمل مکمل کرتے ہوئے واپس کلب پہنچ جایا کرتے تھے۔ سائیکل ریس میں شریک ہونے والوں کے لیے عام طور پر پانچ میل کی مسافت طے کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن ایک تو یہ ہموار میدانی راستہ نہیں تھا۔ دوسری بات یہ کہ بہت ہی دشوار گزار تھا۔ اوپر سے یہ لوگ ابھی تربیت حاصل کر رہے تھے، اس لیے یہ مسافت اتنی دیر میں طے ہوا کرتی تھی۔ زیوی کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن اس کے گروپ میں جو عورتیں اور مرد شامل تھے، ان میں سے زیادہ تر عمر کی چوتھی دہائی میں تھے۔ جس کی وجہ سے وہ جوانوں کی طرح سائیکل نہیں چلا پاتے تھے اور وہ گروپ جس میں زیوی شامل تھا، اکثر تاخیر سے راستہ طے کرتا تھا۔ مختصر سا راستہ زیادہ وقت میں طے کرنے کی یہ تیسری اور سب سے اہم وجہ تھی۔

اگرچہ زیوی نہایت تن دہی سے اس تربیت میں دلچسپی لے رہا تھا لیکن مجموعی طور پر زیادہ عمر والے شاگردوں کی وجہ سے پورے گروپ کو مشکل کا سامنا تھا۔ اگرچہ زیوی کو بچپن سے ہی سائیکل ریس کا جنون رہا تھا لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی کلب میں باقاعدہ شمولیت اختیار کی تھی۔

سائیکل ریس سیکھنے والے ان زیرِ تربیت لوگوں کو انسٹرکٹر نے کئی گروپوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ زیوی سب سے بڑے گروپ میں شامل تھا۔ پہلے تو وہ خوش تھا کہ جتنے زیادہ لوگ اس گروپ میں ہوں گے، مقابلے کا رجحان اتنا ہی زیادہ بڑھے گا مگر بدقسمتی سے اس کا یہ خواب بہت جلد چکنا چور ہو گیا۔

زیوی نے کلب میں اس لیے داخلہ لیا تھا کہ سائیکل ریس سیکھ لے۔ اس طرح ایک پنتھ کئی کاج والا معاملہ ہو جائے گا۔ سائیکل ریس کی وجہ سے ورزش بھی ہو جائے گی اور وہ اپنے بڑھتے ہوئے وزن پر بھی قابو پا سکے گا۔ بڑھتے ہوئے وزن کی وجہ سے وہ گزشتہ کئی مہینوں سے خاصا فکرمند تھا۔ مگر ہوا یہ کہ کلب میں داخلے کے بعد اس کے گروپ میں جتنے لوگ شامل ہوئے تھے، ان میں سے زیادہ تر کو شاید سائیکل ریس سے زیادہ ورزش کا شوق تھا اور وہ صرف اور صرف اپنا بڑھا ہوا وزن کم کرنے کے لیے ہی یہاں آئے تھے اس لیے تربیت کے جو نتائج برآمد ہونا چاہیے تھے، وہ نہیں نکل رہے تھے۔ اس صورتِ حال کے باعث زیوی دل ہی دل میں سخت ناخوش تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ بھی کئی دوسرے ساتھیوں کی طرح اپنا بڑھا ہوا وزن کم کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ریس کی تربیت بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دوسرے لوگ شاید ریس میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ ان کی عدم دلچسپی اس وقت صاف ظاہر ہو جاتی تھی، جب وہ متعین شدہ راستوں پر سائیکل چلاتے تھے۔

زیوی کے گروپ میں زیادہ تر خواتین شامل تھیں اور بڑھتی ہوئی عمر کے باعث ان کی جسمانی قوت بھی کمزور پڑنے لگی تھی۔ مزید ستم یہ تھا کہ جس راستے پر انہیں تربیت کے لیے لے جایا جاتا تھا، اس میں خاصی چڑھائی تھی۔ راستہ بھی پختہ نہیں تھا بلکہ پہاڑی کنکروں سے بنے والی ایک طرح کی چوڑی پگڈنڈیاں تھیں۔ یوں تھوڑی ہی دیر میں آڑے ترچھے راستوں پر سائیکل دوڑاتے ہوئے ان عورتوں کا سانس پھولنے لگتا اور جسمانی قوت جواب دینے لگتی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ مقررہ وقت میں متعین فاصلہ طے نہیں کر پاتے تھے جس کا نتیجہ آخر میں انسٹرکٹر کی جھاڑ کی صورت میں نکلتا تھا۔

زیوی کا گروپ عموماً سب سے آخر میں کلب پہنچتا تھا۔ وہ بھی اس حال میں کہ ادھیڑ عمر عورتیں اس طرح سائیکل سے اترتیں کہ جیسے ان کی پنڈلیوں کی جان نکل چکی ہو۔ زیوی کو سائیکل ریسر بننے کا بہت شوق تھا اور اسی شوق میں اس نے یہ کلب جوائن کیا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ سمجھا کہ اس کا گروپ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ اب یہ بات زیوی کو بے حد پریشان کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر موقع ہوتا تو وہ اپنا گروپ بدل لیتا۔ ان تھکے ہوئے لوگوں کے ساتھ سائیکل دوڑانے کا کیا فائدہ۔ زیوی ہمیشہ اپنے ساتھیوں پر کڑھتا رہتا۔ اس کی بنیادی وجہ اس کے ساتھ دوڑ میں حصہ لینے والے یہی ڈھلتی عمر کے مرد و خواتین تھے۔ انسٹرکٹر کو بھی یہ وجہ جان چکا تھا۔

"یہ مت سوچو کہ تم چالیس سال کے ہو۔ بس یہ یاد رکھو کہ اس کا نصف بیس سال ہے۔ تم خود کو اپنی عمر سے آدھا سمجھو۔" اس دن تربیت شروع کرنے سے پہلے انسٹرکٹر نے تمام شاگردوں کو نیم دائرے کی شکل میں کھڑا کیا اور خلافِ معمول دوڑ شروع کرنے سے پہلے لیکچر دینا شروع کر دیا۔ "تمہارے پاس حوصلہ ہے، شوق ہے۔ بس ہمت سے کام لو۔ تمہیں تو جوانوں کی طرح سوچنا چاہیے۔ سائیکل کے پیڈل پر پاؤں مارتے ہوئے خود کو جوان تصور کرو۔" وہ سب خواتین و حضرات دھیان سے اس کی بات سن رہے تھے۔ "تم لوگ بڑھتی عمر کی وجہ سے نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو چکے ہو۔ اس دباؤ سے باہر نکلو۔ خود کو توانا محسوس کرو۔ اس سے تمہاری تربیت اور صحت، دونوں پر خوش گوار اثر پڑے گا۔ بس... اپنے اندر ذرا سی تبدیلی لاؤ، پھر دیکھنا تم لوگ خود کو کتنا بہتر محسوس کرتے ہو۔"

"ہاں... کسی حد تک تمہاری بات درست ہے۔" جولی نے انسٹرکٹر کی بات کاٹتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔ اس کی آواز سن کر سب لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ جولی چالیس سال کی تھی اور اس کا وزن بھی قدرے زائد تھا مگر اس کے باوجود وہ سائیکل ریسر بننا چاہتی تھی مگر ہر بار ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی ہانپنے لگتی تھی۔

"بہت خوب... اپنی خامیوں کا اعتراف کرو اور انہیں دور کرنے کی کوشش کرو۔" انسٹرکٹر نے دھیان سے جولی کی بات سنی۔ "دنیا میں ہر شخص اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جب تک وہ خود اپنے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کو نہیں جان لیتا اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے خامیوں پر قابو نہیں پالیتا، اس وقت تک دنیا میں وہ کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتا۔" زیوی کی تقریر سے شاگردوں میں نئی ہمت اور جذبہ جنم لے رہا تھا۔ "مجھے یقین ہے کہ آج سے تم تربیت میں حصہ لیتے ہوئے میری باتوں کو مدِنظر رکھو گے۔"

"جی ہاں... کوشش کریں گے کہ ایسا ہی ہو۔" نیم دائرے میں کھڑے مرد و خواتین نے یک زبان ہو کر اعلان کیا۔

"ایک بات اور..." انسٹرکٹر کو جیسے کچھ اچانک یاد آ گیا ہو۔ "دوڑتے ہوئے یہ یاد رکھو کہ یہاں ہر شخص تمہارا حریف ہے اور تم نے اسے پیچھے چھوڑ دینا ہے۔" انسٹرکٹر نے ایک بار پھر تقریر شروع کر دی تھی۔ "اگر تم صحیح طریقے سے نہیں دوڑ رہے تو یاد رکھو کہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جو صحیح طریقے سے دوڑ رہے ہیں، تم اپنی سستی کے باعث انہیں آگے بڑھنے کا موقع دے کر دراصل انہیں بھی ناکارہ بنا رہے ہو۔ سست لوگوں کے ساتھ دوڑتے ہوئے آگے نکل جانا کوئی خاص بات نہیں۔ یاد رکھو کہ ایسے لوگ کبھی اور شاید ہی جیت سکیں۔ اس لیے پوری لگن، جذبے اور ہمت سے سائیکل کے پیڈل پر پاؤں مارو اور اپنے سے آگے چلنے والے کو پیچھے چھوڑ دینے کی پوری کوشش کرو۔"

"بہت بہتر... کوشش کریں گے کہ آج سے ایسا ہی ہو۔" ایک بار پھر سب نے یک زبان کہا۔

انسٹرکٹر نے انہیں حسبِ معمول سائیکل ریس میں کامیابی حاصل کرنے کے چند مزید گر بتائے۔ اس کے بعد سب نے اپنی اپنی سائیکلیں سنبھالیں اور اس دن کی تربیتی کلاس شروع ہو گئی۔

زیوی اپنی سائیکل پر بیٹھا۔ بڑے آرام سے کانوں پر ہیڈ فون لگایا، پینٹ میں اڑسے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبایا، ہیلمٹ درست کیا۔ متوازن انداز میں پیڈل تھاما، تھوڑا سا آگے جھکا اور پھر انسٹرکٹر کے سیٹی بجاتے ہی اس نے پیڈل پر پنڈلیوں کی پوری قوت سے دباؤ ڈالا اور تیز تیز پاؤں چلانے لگا... سائیکل ریس شروع ہو چکی تھی۔

اس وقت دوڑ والے راستے پر لگ بھگ پچاس کے قریب لوگ موجود تھے۔ یہ سب مقامی باشندے تھے اور سائیکل ریس میں دلچسپی رکھتے تھے۔ جیسے ہی دوڑ شروع ہوئی، انہوں نے نعرے لگا کر ان زیرِ تربیت سائیکل ریسلرز کی حوصلہ افزائی کرنا شروع کر دی۔ چند لمحوں کے اندر اندر زیوی اپنے دوسرے ساتھیوں سے کافی آگے نکل آیا۔ ان کا انسٹرکٹر حسبِ معمول ان کے پیچھے پیچھے اپنی سائیکل پر چلا آ رہا تھا۔

اس دن انسٹرکٹر کی تقریر رنگ لائی۔ خود زیوی بھی جان لڑا رہا تھا۔ اس کی تو کیا بات کریں، وہ تو پہلے بھی تن دہی سے تربیت میں حصہ لے رہا تھا۔ اس دن دوسرے لوگ بھی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے جان توڑ کوششیں کر رہے تھے۔ ریس ختم ہوئی تو دن ڈھلنے میں خاصا وقت باقی تھا۔ زیوی ہی نہیں، اس دن سب خوش تھے۔ انسٹرکٹر نے بھی سب کی تعریف کی۔ آج زیوی کو پہلی بار اس دوڑ میں اصل لطف آیا تھا۔

ریس ختم ہونے کے بعد جب وہ گھر پہنچا تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی جیلارات کا کھانا تیار کر چکی تھی اور اپنے شوہر کی واپسی کی منتظر تھی۔ جب سے زیوی نے سائیکل ریس کلب کی تربیتی کلاس میں داخلہ لیا تھا، تب سے

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے لگے بندھے معمول میں کافی فرق آچکا تھا۔ اب وہ رات کا کھانا جلدی کھالیتا تھا تاکہ سونے سے پہلے اپنی فیملی کے ساتھ اتنا وقت ضرور گزار سکے جس سے انہیں خود کو نظر انداز کیے جانے کا احساس نہ ہو۔ ویسے بھی وہ سویرے سویرے کام پر نکل جاتا تھا اور جس دن تربیتی کلاس ہوتی تھی، اُس دن سہ پہر ڈھلے گھر پہنچتا، کپڑے بدلتا اور پھر اپنی سائیکل سنبھال کر سیدھا کلب کا رُخ کرتا۔

واپس آکر وہ سیدھا باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا کر باہر نکلا تو جیلا کھانا لگا چکی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس کا ننھا بیٹا زیوی جونیئر بھی ماں کے ساتھ اس کی آمد کا منتظر تھا۔ زیوی اپنے خاندان سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس وقت کھانے کی اشتہا انگیز مہک اس کی بھوک کو جگا چکی تھی لیکن بیٹے کی مسکراہٹ دیکھ کر محبت بھوک پر غالب آگئی۔ وہ سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھا اور واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کیمرا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی کئی تصویریں اتاریں۔ اس کے بعد تینوں کھانا کھانے لگے۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی وہ عجیب عجیب سی شکلیں بناتا ہوا اپنے کمسن بیٹے کو ہنساتا رہا۔

"آج بھی تمہیں واپسی میں خاصی دیر ہوگئی۔" جیلا اپنے شوہر کی سائیکل ریس کلب میں شمولیت سے خوش تھی۔ وہ بھی زیوی کے بڑھتے ہوئے وزن سے پریشان تھی لیکن حسب سابق جب آج بھی کلب سے اندھیرا ہونے پر گھر لوٹا تو اس نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"بس... وہ ذرا میں نے لمبا راستہ لے لیا تھا، ورنہ تو کافی پہلے ہی گھر پہنچ جاتا۔" اس نے نوالہ نگلتے ہوئے کہا۔

"تو تم آج بھی وائزر بلیوارڈ کی طرف سے آئے ہو؟"

"ہاں۔" زیوی نے پلیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جیلا سے نظر نہیں ملانا چاہتا تھا۔

"اس راستے سے مت آیا کرو۔ تم نے دیکھا ہے وہاں کتنا رش ہوتا ہے۔ کیا پتا کون نشے میں گاڑی چلا رہا ہے۔ اگر کسی گاڑی نے تمہیں ٹکر ماردی تو..." جیلا کا لہجہ تشویش، شکایت اور ڈانٹ کا ملا جلا تاثر پیش کررہا تھا۔ "خیر تمہیں کیا۔ تم پر تو میری کسی بات کا اثر نہیں ہوتا ہے۔" اس کے چہرے پر ناراضی کے تاثرات اُمڈ آئے تھے۔

"بات یہ ہے کہ..." زیوی اِدھر اُدھر نظریں گھماتے ہوئے، بیوی کو تسلی بخش جواب دینے کے لیے مناسب الفاظ سوچنے لگا۔

"بھول جاؤ اسے کہ میں نے تم سے کیا کہا ہے۔" جیلا بدستور روٹھی ہوئی لگ رہی تھی۔

"بات یہ ہے کہ بس ذرا یونہی..." زیوی سے کوئی جواب نہیں بن پڑ رہا تھا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" جیلا نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے طنز سے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ تمہارے پاس میرے سوال کا کوئی جواب نہیں۔ تم صرف لمبے راستے کی وجہ سے وہاں سے آتے ہو۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس بے ہنگم ٹریفک والی سڑک کے بجائے کسی مختصر راستے سے کیوں نہیں آتے۔ آخر تمہیں مختصر راستہ تلاش کرکے اس سے آنے جانے میں کیا تکلیف ہوسکتی ہے؟"

زیوی جواب دینے کے بجائے چپ چاپ سر جھکائے کھانا کھاتا رہا۔ "جیلا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ مجھے وائزر بلیوارڈ کی طرف سے نہیں آنا چاہیے۔" اس نے دل ہی دل میں کہا اور آج پیش آنے والے واقعے کے بارے میں سوچنے لگا۔

شام کو جب وہ کلب سے لوٹ کر گھر آرہا تھا تو وائزر بلیوارڈ پر چوراہے سے مڑتے ہوئے کئی گاڑیاں اس کے پیچھے آرہی تھیں۔ کئی نے تو راستہ دینے کے لیے ہارن بھی بجائے۔ سب سے حیرت کی بات اُس وقت ہوئی جب موڑ مڑتے ہوئے پیچھے سے آنے والی ایک گاڑی بس اسے چھو کر گزر گئی۔ یہ تو سائیکل اور اس کے پیڈل پر اس کا قابو تھا ورنہ اگر سائیکل ذرا سی بھی لڑکھڑا جاتی تو وہ اُس تیز رفتار گاڑی کے نیچے آکر کچلا جاتا۔

"ٹھیک ہے۔ تمہاری بات میں وزن ہے۔ میں اب آئندہ وائزر بلیوارڈ کے بجائے کوئی شارٹ کٹ لوں گا۔" اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور خاموش تھی اور کھانا کھائے جارہی تھی۔ "اب تو مسکرادو۔ بس یہ آج آخری بار غلطی کی ہے۔" زیوی نے کان پکڑتے ہوئے کہا تو جیلا مسکرادی۔

"شکر ہے تمہیں میری بات سمجھ آگئی۔ ویسے بھی اس عمر میں لگنے والی چوٹ آسانی سے ٹھیک نہیں ہوتی۔" وہ شوہر کی یقین دہانی سن کر خوش ہوتے ہوئے بولی۔ "یوں بھی تم کوئی پہلوان تو نہیں ہو کہ اس ڈھلتی عمر میں لگی والی چوٹوں کی تکلیف آسانی سے برداشت کرلو۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے مگر اب ایسی بھی بات نہیں۔" زیوی نے جوشِ مردانگی سے اپنے بازوؤں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "پہلوان نہ سہی مگر پھر بھی کسی سے کم نہیں ہوں۔"

"او کے... میں نے سن لیا۔ اب چپ کرکے کھانا کھاؤ۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

☆☆☆

زیوی کو کھلی فضا میں رہنا پسند تھا۔ اس کی بیوی بھی دیہاتی زندگی گزارنے کی خواہش مند تھی۔ اُن دونوں کو شہر کے بھاگم دوڑ والے ماحول میں رہنا سخت ناپسند تھا۔ اس لیے اُن لوگوں نے شہر کے مضافاتی علاقے میں یہ فارم ہاؤس خریدا تھا۔ یہ گھر تو بہت زیادہ بڑا نہیں تھا البتہ فارم ہاؤس کی تمام خوبیاں اس میں ضرور موجود تھیں۔ زیوی اور دو چار دوسرے گھروں کو چھوڑ کر یہاں پر کئی بڑے بڑے فارم ہاؤس واقع تھے۔ ابھی اس جوڑے کو یہاں منتقل ہوئے بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اس لیے نہ تو وہ اڑوس پڑوس والوں سے واقف تھے اور نہ ہی انہیں اردگرد کے راستوں کا بہت زیادہ علم تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ سڑک کے استعمال کو ترجیح دیتے تھے۔

یہ پہاڑیوں میں گھری ایک چھوٹی سی خوبصورت وادی تھی۔ میدانی علاقے سے ہائی وے گزرتا تھا۔ زیوی سائیکل کلب آنے جانے کے لیے ہائی وے کا ہی راستہ استعمال کرتا تھا۔ یہ راستہ ویسے تو محفوظ تھا لیکن صرف گاڑیوں والوں کے لیے۔ پیدل یا سائیکل پر چلنے والوں کے لیے یہ قطعی مناسب نہیں تھا۔ اس بات کا تجربہ آج شام کو ہی کلب سے واپسی پر زیوی کو ہوچکا تھا۔ جیلا کو آج شام والے واقعے کا تو علم نہیں تھا البتہ وہ پچھلے واقعات کے بارے میں آگاہ تھی۔ اس لیے وہ زیوی کو منع کرتی تھی کہ وہ سائیکل پر وائزر بلیوارڈ کے راستے آنے جانے کی عادت چھوڑ دے۔ اگر جیلا کو آج شام ہونے والے واقعے کی بھنک مل جاتی تو وہ قیامت اٹھا دیتی۔ جیلا کی تشویش بڑی حد تک ٹھیک تھی۔ وائزر بلیوارڈ والی شاہراہ پر گاڑیاں نہایت تیز رفتاری سے گزرتی تھیں۔ اس وجہ سے کسی سائیکل پر جانے والے کا ان کے تلے آکر کچلا جانا ایسی بات نہیں تھی کہ جس کا گمان نہ کیا جاسکتا ہو۔ اس لیے زیوی نے سوچا کہ سائیکل کلب آنے جانے کے لیے فارم ہاؤسز کے درمیان کوئی مختصر راستہ تلاش کرنا ہوگا۔

رات کے کھانے سے فارغ ہوکر کچھ دیر تک زیوی کمسن بیٹے کے ساتھ کھیلتا رہا۔ جب وہ سوگیا تو اس نے علاقے کا نقشہ نکالا اور بغور دیکھنے لگا۔

زیوی نے جو قریب ترین راستہ تلاش کیا، وہ ایلیزا گارڈن سے ہوکر گزرتا تھا اور پھر شیرا ڈین فارم سے ہوتا ہوا جنگل کی سمت نکل جاتا تھا۔ اس کے آگے ایک قدرتی نالا بہتا تھا جس پر بنے لکڑی کے پل کو عبور کرکے اگر تھوڑا سا آگے بڑھا جائے تو ایک پگڈنڈی اُسے سیدھا کلب پر لے جاتی۔ وائزر بلیوارڈ کے ذریعے کلب آتے جاتے ہوئے اسے تقریباً ڈیڑھ گھنٹا لگتا تھا لیکن اس راستے سے وہ بیس منٹ کے اندر یہ مسافت طے کرسکتا تھا۔ بس ایک خرابی تھی اور وہ تھی اس کے قریب واقع ایلیزا گارڈن۔ گو کہ فارم ہاؤس اس کے گھر کے بالکل برابر واقع نہیں تھا البتہ اُس کے گھر کے بعد جو پہلا گھر آتا تھا، وہ یہی تھا۔ اس لیے زیوی انہیں ہمسایہ ہی سمجھتا تھا۔ ایلیزا گارڈن کے مکینوں سے متعلق اس کی رائے اچھی نہیں تھی۔ اگرچہ وہ انہیں نہیں جانتا تھا لیکن اس نے کئی بار وہاں سے گولیاں چلنے کی آوازیں سُنی تھیں۔ زیوی کا خیال تھا کہ یا تو وہاں منشیات وغیرہ کے دھندے میں ملوث دو نمبر لوگ رہتے ہیں یا پھر وہاں کسی قسم کی کوئی اور مجرمانہ سرگرمیاں ہوتی ہوں گی۔ ورنہ ہر ہفتہ دس دن میں کئی بار گولیاں چلنے کی آوازیں کیوں سنائی دیتیں۔

زیوی اپنے حال میں مگن رہنے والا انسان تھا۔ اس نے کبھی سُن گُن لینے کی کوشش نہیں کی کہ اس کے پڑوس میں کیا چکر چل رہا ہے۔ اب جب وہ مختصر راستے کی تلاش میں نقشے کا مطالعہ کررہا تھا تو اس پر انکشاف ہوا کہ اس کے گھر سے جو بھی مختصر راستہ اختیار کیا جائے، اسے ایلیزا گارڈن کے کسی نہ کسی حصے سے ہوکر لازماً گزرنا پڑے گا۔ وہ ہچکچا رہا تھا کہ یہ راستہ اختیار کرے یا نہیں۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس فارم کے مکین اچھے کردار کے حامل نہیں۔ کافی دیر سوچ بچار کرنے کے بعد اُس نے وائزر بلیوارڈ کے پُرہجوم اور طویل راستے کو ہی اس مختصر راستے پر ترجیح دینے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تن آسانی کے چکر میں کسی اور بڑی مصیبت میں پھنس جائے۔

اگرچہ اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ وائزر بلیوارڈ سے ہی سائیکل ریس کلب جائے گا، تاہم اس نے یہ بات جیلا کو نہیں بتائی۔ وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وائزر بلیوارڈ کی ٹریفک سے جیلا خوف زدہ ہے تاہم وہ یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ ڈیڑھ گھنٹے کے بجائے بیس منٹ کا راستہ اختیار کرنے میں اس کی اپنی احتیاط پسندی آڑے آرہی ہے۔

اگرچہ زیوی، جیلا سے کہہ چکا تھا کہ اس نے ایک مختصر راستہ دریافت کرلیا ہے۔ اب وہ وائزر بلیوارڈ کے بجائے اسی کچے مگر مختصر راستے سے آجارہا ہے۔ یہ اور بات تھی کہ اسے وقت بچانے کے لیے اب کلب سے گھر واپس آتے ہوئے دیوانوں کی طرح سائیکل چلانا پڑتی تھی۔ اپنی تیز رفتاری کے باعث اب وہ تقریباً پچاس منٹ میں گھر پہنچ جاتا لیکن بُری طرح تھکنے کے بعد...

اسی طرح مزید کچھ دن گزر گئے۔

اُس دن تربیتی کلاس کے بعد انسٹرکٹر نے لیکچر کے لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سب لوگوں کو روک لیا۔ ٹریوی کا خیال تھا کہ لیکچر تھوڑی ہی دیر میں ختم ہو جائے گا مگر بات نکلی تو پھر نکلتی چلی گئی۔ لیکچر ختم ہوا تو ٹریوی نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ وہ آدھا گھنٹا لیٹ ہو چکا تھا۔ جب وہ کلب سے باہر نکلا تو سورج مغرب کی آغوش میں سمٹ جانے کے قریب تھا۔ بس اسی لمحے ٹریوی نے فیصلہ کیا کہ وہ وقت بچانے کے لیے آج اس راستے کو اختیار کرے گا جو ایلیز اگارڈن سے ہو کر گزرتا ہے۔ اگر کوئی اور دن ہوتا تو وہ اس راستے پر جانے کا سوچتا بھی نہیں لیکن آج اسے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ وہ دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں اس کے جھوٹ کا پول نہ کھل جائے۔ اب تک تو وہ جیلا سے بدستور جھوٹ بولتا آ رہا تھا کہ وہ وائزر بلیوارڈ کے راستے آتا جاتا نہیں ہے لیکن اب تو پہلے ہی خاصی دیر ہو چکی تھی۔ ایسے میں اگر وہ وہی راستہ اختیار کرتا تو پھر اتنی دیر ضرور ہو جاتی جس سے جیلا ازحد پریشان ہو سکتی تھی۔

کلب سے نکل کر وہ تھوڑی دور تک تو سامنے والی سڑک پر چلتا رہا۔ اچانک اسے بائیں ہاتھ پر ایک پگڈنڈی نظر آئی۔ اس نے سائیکل اس راستے پر ڈال دی۔ تھوڑا آگے جانے کے بعد وہ ایک خشک قدرتی نالے کے قریب سے گزرا۔ اس راستے پر قدرتی حسن کی فراوانی تھی اور ٹریوی کو فطرت سے خاصا لگاؤ تھا۔ اس نے پیڈل پر پاؤں مارنے کی رفتار دھیمی کر دی اور اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس سے پہلے وہ اس راستے پر کبھی نہیں آیا تھا لیکن اس کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ اسے یقین تھا کہ یہ وہی راستہ ہے جسے اس نے نقشے میں دیکھا تھا۔ یہ نقشہ باقاعدہ طور پر کسی نقشہ ساز نے نہیں بنایا تھا بلکہ اس علاقے میں رہنے والے ایک ڈرافٹس مین نے کئی سال پہلے اسے شوقیہ طور پر تیار کیا تھا جسے مقامی اخبار نے شائع کر دیا۔ اس کے بعد ایک مقامی ناشر نے اسے اہتمام سے شائع کر دیا۔ اس طرح یہ نقشہ علاقے کو سمجھنے کے لیے مستند سمجھا جانے لگا۔ ٹریوی کو کچھ عرصے قبل یہ نقشہ کتابوں کی ایک دکان پر خریداری کے بعد تحفے کے طور پر ملا تھا۔

اب وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اچھا ہوا کہ اس دن یہ نقشہ اسے مل گیا ورنہ وہ اتنے خوبصورت علاقے کی سیر سے محروم رہتا۔ چلتے چلتے وہ یہ بھول چکا تھا کہ نقشے کے مطابق وہ اپنے گھر اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے، جب ایلیز اگارڈن کے احاطہ کرنے والے علاقے سے گزر کر گارڈن کے دوسری طرف واقع سڑک پر نہیں پہنچ جاتا۔ بصورت دیگر اسے پلٹ کر واپس آنا ہوتا اور پھر وائزر بلیوارڈ کا راستہ اختیار کرنا پڑتا۔

”اوہ میرے خدا....“ ٹریوی نے سائیکل کے بریک دبائے اور کھڑا ہو کر اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”مجھے تو ایلیز اگارڈن سے ہی ہو کر گزرنا پڑے گا۔“

دن ڈھل چکا تھا لیکن اب بھی اُجالا ہو رہا تھا۔ وہ تیز تیز پیڈل چلاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ جب سے اسے کتوں کا خیال آیا تھا، اس کی ساری تفریح غارت ہو چکی تھی۔ ایک بار بچپن میں ٹریوی کو ایک کتے نے بھنبھوڑ دیا تھا۔ بس اس دن سے آج تک ٹریوی ہمیشہ کتوں کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا تھا۔

کچھ دیر بعد ٹریوی ایلیز اگارڈن کے عقبی حصے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کی رفتار بہت ہی دھیمی تھی۔ وہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ کہیں کوئی کتا تو موجود نہیں ہے۔ وہ نہایت خاموشی سے سن گن لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایلیز اگارڈن کوئی باغ نہیں بلکہ ایک فارم ہاؤس تھا جس کے مالک نے اسے یہ نام دے دیا تھا۔ بظاہر یہ فارم ہاؤس یہاں کے دیگر فارم ہاؤسز کی طرح ہی تھا لیکن یہاں ویرانی اور خاموشی کا راج اسے دیگر فارموں سے امتیاز بخشتا تھا۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا لیکن غور سے دیکھو تو ویرانے کے ساتھ ساتھ نحوست نے بھی ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ فارم کے ایک کونے پر لکڑی اور کھپریلوں کی چھت کا ایک کاٹیج بنا ہوا تھا۔ کارپورچ میں ایک رینج روور جیپ کھڑی تھی۔ کاٹیج کا اندازِ تعمیر قدیم تھا لیکن جیپ نئے ماڈل کی لگ رہی تھی۔ فارم خاصا وسیع تھا۔ کافی فاصلے پر ٹریوی کو دو سوئمنگ پول بھی بنے ہوئے نظر آئے۔ اس نے غور سے دیکھا تو سوئمنگ پول کے اطراف میں لان تھا جس کی سبز گھاس سلیقے سے تراشیدہ نظر آ رہی تھی۔ جیپ کی موجودگی سے یہ بات عیاں تھی کہ صاحب خانہ اندر موجود ہے تاہم ٹریوی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس وقت یہاں پر اس کے سوا کوئی اور ذی نفس موجود نہیں ہے۔ اس وقت وہ ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو کر اردگرد کا غور سے جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کئی بار یہاں گولیاں چلنے کی آواز سن چکا تھا۔ اس لیے خوف زدہ تھا کہ اگر کتوں سے بچ گیا تو کہیں گھر کا مالک اسے نہ دیکھ لے۔ ویسے بھی بنا اجازت کسی کے گھر کی حدود سے گزرنے پر قانون بھی اسے اجازت دیتا تھا کہ وہ اسے روک سکے یا اس پر گولی چلا سکے۔ ٹریوی شریف آدمی تھا۔ کتوں اور گولی دونوں سے خوف زدہ تھا۔ گھر جلدی پہنچنے کے چکر میں وہ اس طرف چلا تو آیا لیکن اب تذبذب کا شکار تھا کہ یہاں سے گزرے یا نہیں۔

کافی دیر تک سوچ بچار میں مبتلا رہنے کے بعد آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ گارڈن سے گزر کر اپنے گھر کی طرف نکل جائے گا۔ جس رفتار سے ٹریوی سائیکل چلاتا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے گھر سے صرف تین منٹ کے فاصلے پر تھا۔

اسی اثنا میں کافی اندھیرا چھا چکا تھا۔ ٹریوی کو یقین تھا کہ اس اندھیرے میں صاحب خانہ تو اسے دیکھنے سے رہا البتہ کتوں سے وہ بدستور خوف زدہ تھا، حالانکہ پچھلے دس منٹ میں وہ اچھی طرح تسلی کر چکا تھا کہ اردگرد کوئی کتا موجود نہیں ہے۔ ویسے اس کے لیے یہ تعجب کی بات بھی تھی۔ فارم ہاؤسز کے رہنے والے بالعموم کتے پالتے ہیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اتنے بڑے فارم کی نگرانی ان کے لیے ممکن نہیں ہوتی۔ عموماً ایسے بڑے گھر والے ایک سے زائد کتے پالتے ہیں لیکن اسے یہاں ایک بھی کتا نظر نہیں آیا۔ اسے حیرت تھی کہ گھر کے مالک نے حفاظت کے لیے کتے کیوں نہیں رکھے ہوئے ہیں۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ بے چارہ بھی میرے جیسے تجربے سے گزر چکا ہو۔ اسی لیے شاید اسے کتوں سے خوف آتا ہو۔“ ٹریوی نے خود کلامی کی۔ پھر سائیکل پر بیٹھا۔ ایک بار پھر چاروں طرف نظریں گھما کر جائزہ لیا۔ چند منٹ کے بعد وہ اپنے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔

”شکر ہے خدا کا بچ گیا۔“ ٹریوی کو خود کلامی کی عادت تھی۔ گھر پہنچ کر اس نے سائیکل کھڑی کی، ہیلمٹ اتارا اور پھر کتوں سے بچ کر گھر پہنچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ ”بڑا ہی مختصر راستہ ہے۔ ویسے اس راستے کے ذریعے تو کافی وقت بچایا جا سکتا ہے۔“ وہ چلتے چلتے بڑبڑایا۔ جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا، سامنے جیلا نظر آ گئی۔

”اوہو.... لگتا ہے آج بہت تیز سائیکل چلائی۔ کئی منٹ پہلے ہی گھر پہنچ گئے۔“

”اگر تم کہو تو اس سے بھی پہلے آ سکتا ہوں۔“ پسینے میں شرابور ٹریوی باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

جیلا تنہائی پسند تھی لیکن ٹریوی کے بغیر اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ اس کی اگلی کلاس دو روز بعد تھی۔ جیلا خوش تھی کہ اگلی دو شامیں ٹریوی گھر پر ہی گزارے گا۔

☆☆☆

ٹریوی کو ایلیز اگارڈن کا عقبی حصہ بہت پسند آیا۔ وہ یہاں گزشتہ چھ ماہ سے رہ رہے تھے لیکن اس سے پہلے اس نے فارم ہاؤسز کے دوسری طرف جانے کا سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کا اندازہ تھا ایلیز اگارڈن سے اکثر و بیشتر آنے والی گولیوں کی آوازیں تھیں مگر اس دن جب وہ وہاں سے آیا تو اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی [illegible] راستے سے آیا جایا کرے۔ ویسے بھی سائیکل ریس کلب کی تربیتی کلاسوں کی تکمیل میں مزید دو ماہ باقی تھے۔ اسے کئی بار مزید کلب جانا اور پھر جلدی گھر پہنچنا تھا۔ اسے وقت کی بچت کے لیے آسان حل مل چکا تھا لیکن وہ ڈر رہا تھا کہ اگر اس گھر کے مکینوں نے کبھی اسے اپنے گھر کی حدود سے گزرتے ہوئے دیکھ لیا تو نہ جانے کیا سمجھیں اور اس کے ساتھ کیا برتاؤ کریں۔

ایلیز اگارڈن میں کون رہتا ہے؟ ٹریوی نے یہ بات جاننے کی پہلے کبھی کوشش نہیں کی تھی لیکن وہ اب چاہ رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس کے مالک کا پتا چلائے تاکہ اگلے دو ماہ کے دوران اگر کبھی وہاں سے گزرتے ہوئے انہوں نے اسے دیکھ لیا تو کم از کم حق ہمسائیگی کا ہی واسطہ دے کر وہ معافی مانگ سکے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ موسم ابر آلود ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جیلا اور مسٹر ٹریوی جونیئر سو رہے تھے۔ ٹریوی خاموشی سے باہر نکلا، سائیکل اٹھائی اور آرام آرام سے چلاتا ہوا ایلیز اگارڈن کی طرف جانے والے راستے پر آگے بڑھنے لگا۔

یہ علاقہ تنہائی پسندوں کی جنت تھا۔ شاید اسی لیے اطراف میں کوئی بھی شخص نظر نہیں آیا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ ایسا کوئی شخص اسے مل جائے جس سے وہ ایلیز اگارڈن کے مالک کے بارے میں کچھ پوچھ سکے۔ کم از کم اس کا نام ہی معلوم ہو جائے۔ اطراف کا طویل چکر لگانے کے بعد بھی اسے کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ واپس پلٹتے ہوئے اسے یاد آیا کہ گھر کے باغیچے میں لگے ہوئے گلاب کے پودوں کو کیڑا لگ گیا ہے جس کے لیے اسے جراثیم کش دوا لینی تھی۔ وہ گھر واپس جانے کے بجائے قصبے کے بازار کی طرف چل دیا۔

دکان کے باہر وہ سائیکل کھڑی کر کے ذرا سا آگے بڑھا تو اسے رینج روور جیپ کھڑی ہوئی نظر آئی۔ جیپ دیکھ کر اسے یاد آیا کہ یہ گاڑی اس نے پہلے بھی کہیں دیکھی ہے۔ اچانک اسے یاد آیا کہ کل رات جب وہ ریس کلب سے واپس آتے ہوئے ایلیز اگارڈن کے باہر کھڑا اندر کا جائزہ لے رہا تھا، اس وقت یہ جیپ کاٹیج کے سامنے کھڑی تھی۔ جیسے ہی وہ دکان کے دروازے کی طرف بڑھا، ایک بوڑھا آدمی ہاتھ میں ایک بڑا سا گیلن اٹھائے باہر نکلا۔ اگرچہ اس شخص کی عمر پچاس سے اوپر ہو گی لیکن دیکھنے میں تنومند اور مضبوط بازوؤں والا آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

داڑھی تھی اور اس نے سر پر فلیٹ ہیٹ پہن رکھا تھا۔ اس لیے وہ اس کا چہرہ اچھی طرح نہیں دیکھ سکا۔ ممکن ہے یہی ایلیزا گارڈن کا مالک ہو۔ بظاہر تو معقول آدمی دکھائی دیتا ہے مگر اس کے گھر سے گولیاں چلنے کی آوازیں کیوں سنائی دیتی ہیں؟ ثریوی دل ہی دل میں سوچتا ہوا دکان کے اندر داخل ہوا۔

"ہائے جیمز۔"

"ہائے... کہو کیسے آنا ہوا؟" دکان کے مالک نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ثریوی گزشتہ کئی مہینوں سے اپنے باغیچے کے لیے کھاد اور بیج وغیرہ یہیں سے لیتا تھا۔ اسی وجہ سے دکان دار سے اس کی اچھی خاصی شناسائی ہو گئی تھی۔

"گلاب کے پودوں کو کیڑا لگ گیا۔ کوئی اچھی سی جراثیم کش دوا دے دو۔" ثریوی نے کہا تو جیمز الماریوں کی طرف بڑھ گیا۔

"ارے سنو... وہ کون شخص تھا جو ابھی ابھی دکان سے باہر نکلا ہے؟" تھوڑی دیر بعد جب ثریوی، جیمز کو پیسے دے رہا تھا تو اس نے پوچھا۔

"وہ... ارے بھئی وہ تمہارے ہمسائے ہیں جان ایڈورڈ۔"

"میرے ہمسائے؟"

"جی ہاں، ایلیزا گارڈن انہی کا ہے۔"

"اوہ... تو یہ ہیں اس فارم کے مالک۔ بھئی میرا ان سے کوئی تعارف نہیں ہوا۔ پہلی بار انہیں دیکھا ہے۔" ثریوی نے یہ بات اس انداز میں کہی کہ جیسے اسے اپنے ہمسائے سے لاعلمی پر شرمندگی محسوس ہو رہی ہو۔

"کافی پیو گے؟"

"ہاں... اگر تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو تو..." جیمز نے بے تکلفی سے پوچھا تو ثریوی نے کلائی کی طرف دیکھا۔ اس کے پاس کافی وقت تھا۔ وہ جیلا کے اٹھنے سے پہلے گھر واپس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ اسے محسوس ہو رہا تھا جیمز کے ذریعے اسے مسٹر جان کے بارے میں خاصی معلومات مل سکتی ہیں۔ اس لیے اس نے کافی کی پیشکش خندہ پیشانی سے قبول کر لی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ کافی پینے کے دوران میں وہ باتوں باتوں میں جیمز سے جان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

"مجھے بڑا افسوس ہوا یہ سن کر کہ میں مسٹر جان کو نہیں جانتا جبکہ وہ میرے پڑوسی ہیں۔" کافی پیتے ہوئے ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد ثریوی دل کی بات زبان پر لے آیا۔ وہ اس طرح بات کر رہا تھا کہ کہیں جیمز یہ محسوس نہ کرے کہ وہ جان کے بارے میں کوئی خاص سوچ رکھتا ہے۔

"ویسے وہ لاتعلق سے آدمی ہیں۔ پہلے تو بڑے خوش مزاج شخص تھے لیکن جب سے ایلن کا انتقال ہوا ہے، وہ دنیا سے بالکل ہی لاتعلق ہو گئے ہیں۔" جیمز نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"ایلن... یہ کون تھی؟" ثریوی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"جان کی بیٹی تھی۔ سترہ سال کی تھی اور ہائی اسکول میں پڑھتی تھی۔" ثریوی کے سوال کے جواب میں جیمز نے تفصیل سے کہانی سنانی شروع کی۔ "وہاں کچھ لڑکوں سے اس کی دوستی ہو گئی۔ وہ دراصل منشیات فروش تھے۔ پہلے تو انہوں نے اسے نشے کا عادی بنایا اور پھر منشیات کو ادھر سے ادھر لانے، لے جانے کے لیے استعمال کرنے لگے۔ اسی چکر میں ایلن نے گھر چھوڑ دیا۔ ایلن کی ماں بہت پہلے ہی فوت ہو چکی تھی۔ مسٹر جان کی ایلن کے سوا کوئی اور اولاد نہیں تھی۔ جب سے ایلن اس چکر میں پھنسی تھی، اس نے باپ کا گھر نہیں چھوڑا بلکہ ان سے ہر قسم کا تعلق توڑ لیا تھا۔"

"لیکن وہ مری کیسے؟" جیمز خاموش ہوا تو ثریوی نے سوال کیا۔

"مسٹر جان پولیس افسر تھے۔ ایک دن منشیات فروشوں کے ایک گروہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ پولیس کی فائرنگ میں چاروں منشیات فروش مارے گئے۔ مرنے والوں میں ایلن بھی شامل تھی۔"

"اوہ خدایا... باپ کی گولی سے..." ثریوی نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ہاں... پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ثابت ہو گیا تھا کہ ایلن کی موت کی وجہ بننے والی گولی جان کی پستول سے چلی تھی۔ بس، اس کے بعد جان نے ریٹائرمنٹ لے لی اور اب تنہا اس فارم پر رہتے ہیں۔ کبھی کبھار یہاں آ جاتے ہیں، دوا یا کھاد وغیرہ لینے کے لیے۔" یہ کہہ کر جیمز نے ٹھنڈی سانس لی اور خاموش ہو گیا۔

"بڑا افسوس ہوا یہ سن کر۔ بڑے دکھی ہیں وہ۔" ثریوی کا لہجہ ہمدردانہ تھا۔

"ہاں مگر بڑے ہی مضبوط اعصاب کے مالک ہیں۔"

"بہت کچھ جانتے ہو ان کے بارے میں۔" ثریوی نے کافی کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

"ارے بھئی یہ بہت عرصے سے یہاں رہ رہے ہیں..."

پہلے تو ان کا قصبے والوں سے کافی ملنا جلنا تھا لیکن کوئی پانچ چھ برس ہو چکے، جب سے ایلن فوت ہوئی ہے، وہ سب سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔" جیمز نے ثریوی کی بات سن کر کہا۔ "پہلے تو قصبے والوں نے ان کی دل جوئی کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ہر شخص سے رکھائی سے پیش آتے رہے۔ آخر کب تک... رفتہ رفتہ لوگ بھی ان سے دور ہوتے چلے گئے۔"

"بہت تکلیف دہ ہے یہ سب۔" ثریوی نے کلائی پر نظر ڈالی۔ "مجھے دیر ہو رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ کھڑا ہوا، دوا کی بوتل اٹھائی۔ "اچھا پھر ملتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ دکان سے باہر نکلا اور اپنی سائیکل کی طرف بڑھ گیا۔

راستے بھر وہ مسٹر جان کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے ہمدردی کے مستحق بوڑھے شخص پر بلاوجہ شک کیا اور اسے منشیات فروش سمجھ لیا۔ ثریوی سوچ رہا تھا کہ جان پولیس افسر رہا ہے۔ یہ جو کبھی کبھار اس کے گھر سے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، اس کی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ نشانے بازی کا شوق پورا کرتا ہو۔ وہ دل ہی دل میں مطمئن تھا کہ اب ایلیزا گارڈن سے گزر کر مختصر راستہ اختیار کرنے میں کوئی پریشانی نہیں۔

☆☆☆

دو ہفتے گزر گئے۔

ثریوی نے وائز ریلیوارڈ کا راستہ بالکل ہی ترک کر دیا تھا۔ وہ اب اپنے گھر سے نکلتا، ایلیزا گارڈن کو عبور کرتا اور چند منٹ میں ہی کلب پہنچ جاتا۔ اسے یہ راستہ اس لیے بھی پسند آیا تھا کہ نہ تو ٹریفک کا شور تھا اور نہ ہی خود کو کسی گاڑی کی زد میں آنے سے بچانے کی فکر در پیش رہتی تھی۔ وہ گنگناتا ہوا سارا راستہ طے کرتا اور اسی طرح گھر لوٹ آتا۔ اس دوران میں ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ مسٹر جان سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی ہو۔ البتہ ایک بات تھی۔ وہ ہر بار نہایت احتیاط سے درختوں کی اوٹ میں کھڑا ہو کر تفصیل سے اردگرد کا جائزہ لیتا اور پھر گارڈن میں داخل ہوتا۔ وہ خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ اپنی کسی بے احتیاطی کی وجہ سے وہ جان کے ہاتھوں پکڑا جائے اور خوامخواہ کی خفت اٹھائے۔

اس دن حسب سابق ثریوی گیت گنگناتا ہوا ٹریننگ کلاس سے واپس گھر جانے کے لیے ایلیزا گارڈن پہنچا۔ ابھی وہ سائیکل سے اتر رہا تھا کہ اس نے گاڑی کی آواز سنی۔ آواز سنتے ہی وہ چوکنا ہو گیا اور تیزی سے ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ کاٹیج اس کی نگاہوں کے عین سامنے تھا۔

گاڑی کاٹیج کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ گاڑی میں سے پہلے جان اترا پھر وہ دوسری طرف گیا اور دروازہ کھول کر کسی کو باہر اترنے میں مدد دینے لگا۔ ثریوی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک مجہول اور کمزور سا شخص گاڑی سے نیچے اترا۔ جان اسے سہارا دیتے ہوئے گھر کے اندر لے گیا۔

ثریوی کو یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ اس سے پہلے نہ تو اس نے کبھی جان کو گھر کے باہر دیکھا تھا اور نہ ہی کسی اور شخص کو یہاں آتے دیکھا تھا۔ ممکن ہے کوئی پرانا دوست ہو۔ اس نے دل میں سوچا۔ اسی دوران میں سورج غروب ہو چکا تھا۔ اندھیرا آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جیسے ہی جان اس اجنبی کے ساتھ کاٹیج کے اندر داخل ہوا، ثریوی نے موقع غنیمت سمجھا اور چھپتا چھپاتا وہاں سے نکل کر اپنے گھر لوٹ آیا۔

دوسرے دن اس کی کلاس نہیں تھی۔ وہ دفتر سے دوپہر کو ہی لوٹ آیا تھا۔ شام کے سوا سات بج رہے تھے۔ جیلا رات کا کھانا بنا رہی تھی اور ثریوی گھر کے باہر ٹہل رہا تھا۔ اچانک اس نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ گولیاں چلنے کی آوازیں تین بار آئیں۔ اس کے بعد مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔ یہ آوازیں ایلیزا گارڈن کی طرف سے آئی تھیں۔ پہلے تو وہ گولی چلنے کی آواز سن کر خوف زدہ ہو جاتا تھا لیکن اس بار اس نے ان آوازوں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ "مسٹر جان آج پھر نشانے بازی کر رہے ہیں۔" وہ بڑبڑایا اور پھر سر جھٹک کر گھر کے اندر چلا گیا۔

چند روز مزید گزر گئے۔

ثریوی حسب معمول کلب سے واپس لوٹ رہا تھا۔ ایلیزا گارڈن کے قریب پہنچ کر نہ جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے سائیکل ایک طرف کھڑی کی اور گھاس پر لیٹ کر آسمان کو تکنے لگا۔ وہ نہ جانے کن خیالوں میں گم تھا کہ اچانک اسے گاڑی کی آواز سنائی دی۔ اس کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ گھبرا کر اٹھا اور درختوں کی اوٹ میں ہو گیا اور گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر یہ دیکھنے لگا کہ گاڑی میں کون آیا ہے۔

گاڑی کاٹیج کے سامنے پہنچ کر رک چکی تھی۔ پہلے جان اترا۔ اس کے بعد ایک اور شخص باہر آیا۔ یہ شخص قدرے جوان لگ رہا تھا۔ وہ جان کے پیچھے چلتا ہوا کاٹیج کے اندر داخل ہو گیا۔

ثریوی کو یہ بات بہت عجیب لگی۔ اس نے پہلی بار جس شخص کو یہاں دیکھا تھا، اس کے بعد وہ پھر کبھی اسے نظر نہیں آیا۔ جیمز کے مطابق جان الگ تھلگ رہنے کا عادی تھا لیکن

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دو ہفتوں کے دوران وہ دوسرے شخص کو یہاں آتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی ایسے کہ جان اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر خود یہاں لایا تھا۔ ٹریوی کو یہ بات عجیب تو لگی لیکن ایک بار پھر اس نے سر جھٹک کر اپنے واہمے کو دور کیا اور گھر پہنچنے کی فکر کرنے لگا۔

اُس روز رات کو جب وہ ڈنر کر رہا تھا تو ایک بار پھر گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ گولی چلنے کی آواز چار بار آئی۔ جیلا نے سر اٹھا کر ٹریوی کی طرف تشویش بھری نگاہوں سے دیکھا۔

''ارے کچھ نہیں ہے۔ فکر مت کرو۔ مسٹر جان نشانے بازی کی مشق کر رہے ہوں گے کسی جنگلی خرگوش پر۔'' ٹریوی نے بیوی کا شک دور کرنے کے لیے کہا۔ ''تم کھانا کھاؤ۔'' ٹریوی، جیلا کو جان کی سرگزشت سے آگاہ کر چکا تھا۔ شوہر کی بات سن کر اس نے بھی ان آوازوں کو اہمیت نہ دی اور کھانا کھانے لگی۔

چند روز اور گزر گئے۔

ٹریوی کے تربیتی کیمپ ختم ہونے میں صرف دو ہفتے باقی رہ گئے تھے۔ اُس دن جب وہ کلاس سے واپسی پر گھر جانے کے لیے ایلیزا گارڈن پہنچا تو شام ڈھل چکی تھی۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ وہ گارڈن کے باہر سے تاکا جھانکی کر رہا تھا۔ اسے کاٹیج کے سامنے جیپ بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

''لگتا ہے جان گھر سے باہر گیا ہوا ہے۔ مجھے احتیاط سے نکلنا ہوگا۔'' ٹریوی نے خود کلامی کی۔ ابھی وہ گارڈن کی حدود میں داخل ہونے والا تھا کہ اسے گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ گاڑی کاٹیج کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ کاٹیج اس کی نگاہوں کے عین سامنے تھا۔ ٹریوی انتظار کر رہا تھا کہ جان اندر جائے تو وہ یہاں سے نکلے۔ اس کی نگاہیں جیپ پر جمی ہوئی تھیں۔ ذرا ہی دیر میں دروازہ کھلا اور جان باہر نکلا۔ دوسری طرف سے ایک عورت نکلی۔ وہ بمشکل پچیس تیس برس کی رہی ہوگی۔ کچھ دیر بعد دونوں کاٹیج کے اندر چلے گئے۔

آج ٹریوی کو شک ہوا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ کچھ تو گڑبڑ ہے۔ جیمز کے کہنے کے مطابق جان بیٹی کی موت کے بعد سے تنہائی پسند ہو گیا تھا۔ اس نے سب ملنے جلنے والوں سے قطع تعلق کرلیا تھا لیکن ایک مہینے کے اندر اندر یہ تیسرا موقع تھا جب اس نے کسی اجنبی کو اس کے ساتھ کاٹیج کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ اس نے جس شخص کو بھی ایک بار یہاں دیکھا، وہ دوبارہ نظر نہیں آیا۔ اسی ادھیڑ بن میں اس کی نظر کلائی پر بندھی گھڑی پر پڑ گئی۔ ''اوہ خدایا... جلدی کرو، ورنہ جیلا پریشان ہو جائے گی۔'' اس نے خود کلامی کی اور اپنے دریافت شدہ راستے پر چلتے ہوئے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

ٹریوی نے ایلیزا گارڈن سے نکلنے کے لیے جو راستہ منتخب کیا تھا، وہ قدرے محفوظ تھا۔ یہ دو ردیہ جنگلی جھاڑیوں کے درمیان بنی ہوئی ایک پگڈنڈی تھی۔ جھاڑیاں اتنی بڑی تھیں کہ یہاں سے گزرتے ہوئے اس کو دیکھا جانا محال تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے وہ یہ بات بھول چکا تھا کہ تیسری بار جان کے ساتھ ایک اجنبی کو اس کے کاٹیج میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ کیا سوچ رہا تھا۔

ڈنر کے بعد دونوں میاں بیوی کافی پی رہے تھے۔ ٹریوی جونیئر قالین پر بیٹھا ہوا کھلونوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اچانک انہوں نے گولیاں چلنے کی آواز سنی۔ تین بار گولی چلی۔ جب سے وہ جان کی حقیقت سے آگاہ ہوا تھا، اس نے گولیوں کے چلنے کی طرف توجہ دینا چھوڑ دی تھی لیکن آج یہ پہلا موقع تھا جب وہ ایلیزا گارڈن سے آنے والی ان آوازوں کو سن کر پریشان ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔

''کیا ہوا... تم ایک دم پریشان ہو گئے ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' جیلا نے اس کی حالت دیکھی تو گھبرا کر کہا۔

''کچھ گڑبڑ ہے۔''

''کیا مسئلہ ہے، کھل کر بتاؤ۔''

''یہ آواز سنی تم نے؟'' ٹریوی نے ایلیزا گارڈن کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں... مگر اس میں فکر کی بات کیا ہے؟ تم ہی تو کہتے ہو کہ مسٹر جان نشانے بازی...''

''غلط سمجھتا تھا میں۔'' ٹریوی نے بیوی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ میں نے جب بھی اس گھر میں کسی شخص کو داخل ہوتے دیکھا، اُسی روز رات کو گولیاں چلنے کی آوازیں آئی ہیں؟''

''کیا بات ہے... تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' جیلا نے پریشانی سے پوچھا۔ ''مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ نہیں آرہی؟''

''سمجھاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ٹریوی نے اب تک پیش آنے والے واقعات تفصیل سے جیلا کو بتانا شروع کیے۔

''واقعی... یہ تو کوئی اور ہی بات لگتی ہے۔'' ٹریوی کی بات سن کر جیلا کچھ دیر خاموش رہی اور پھر کہنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں قصبے کے شیرف کو یہ بات بتانا چاہیے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔''

دوسرے دن ٹریوی کی تربیتی کلاس کا ناغہ تھا۔ دفتر سے آنے کے بعد اس نے کھانا کھایا اور شیرف سے ملنے چلا گیا۔

☆☆☆

''تم ایک ذمے دار شہری ہو۔ میں مشکور ہوں کہ تم نے اپنا فرض پورا کیا مگر مسٹر جان ایک شریف آدمی ہیں۔ ان کے خلاف کبھی کوئی شکایت نہیں آئی۔ ویسے بھی وہ پولیس کے قابل افسر تھے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' شیرف ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ ٹریوی کی روداد سن کر جب اس نے یہ کہا تو اس کا منہ لٹک گیا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر تفتیش کر لینے میں کیا حرج ہے؟''

''ٹھیک ہے... ایک منٹ۔'' اچانک شیرف کو کچھ یاد آ گیا۔ وہ اٹھا اور الماری میں سے ایک فائل نکال کر اس میں لگے کاغذات کو غور سے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ پلٹا اور ایک تصویر ٹریوی کی نگاہوں کے سامنے کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''اس عورت کو کہیں دیکھا ہے؟''

''نہیں...'' ٹریوی نے غور سے تصویر دیکھنے کے بعد جواب دیا۔

''تمہیں اُن لوگوں میں سے کسی کا چہرہ یاد ہے جنہیں تم نے ایلیزا گارڈن میں جان کے ساتھ کاٹیج میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''نہیں...'' ٹریوی نے جواب دیا۔ ''اول تو وہ شام کا وقت ہوتا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ کاٹیج کافی دور ہے اور گاڑی سے اتر کر جانے والوں کی پیٹھ میری طرف ہوتی تھی اس لیے میں کسی کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔''

''اوکے... خیر تمہیں ہماری مدد کرنا ہوگی۔''

''وہ کیا؟'' ٹریوی نے حیرت سے پوچھا۔ جواب میں شیرف نے تفصیل سے اسے ساری بات سمجھائی۔ ٹریوی کو حیرت تھی کہ پہلے تو شیرف جان پر شبہ کرنے کو بھی تیار نہیں تھا لیکن اچانک اس فائل کو دیکھنے کے بعد اس کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ اب وہ ٹریوی سے درخواست کر رہا تھا کہ وہ ہر شام اس مخصوص وقت پر کاٹیج کی نگرانی کرے جس وقت اس نے اب تک اجنبیوں کو وہاں آتے ہوئے دیکھا ہے۔ ٹریوی نے شیرف کی مدد کرنے کا وعدہ کرلیا۔

چار دن گزر گئے لیکن کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ ٹریوی باقاعدگی سے کاٹیج پر نظریں رکھے ہوئے تھا۔ اُس دن جب وہ کلاس سے واپس لوٹنے لگا تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ آج

Mob: 0300-2219514, 0344-2609326
Tel: 021-34519074
معقول فیس میں ہنرمند بنیں
بذریعہ ڈاک
موبائل سے SMS کرتے وقت اپنا مکمل نام اور پتہ ضرور لکھیے
نوٹس برائے داخلہ
صبح 9 بجے تا شام 5 بجے
Registered with CBR
Govt. of Pakistan
دی انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر 3349 گلبرگ، کراچی 75080

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

راستے میں اس کی سائیکل کی ٹیوب پنکچر ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اسے کلب واپس پہنچ کر ٹیوب بدلنا پڑی۔ اوپر سے یہ ہوا کہ انسٹرکٹرز کو لیکچر بھی دینا تھا۔ اس لیے جب وہ فارغ ہوا تو تیز تیز سائیکل چلاتا ہوا اپنے مخصوص راستے سے گھر واپسی کے لیے چل دیا۔ جب وہ ایلیزا گارڈن پہنچا تو اس نے دیکھا کہ کاٹیج کے اندر دو افراد داخل ہو رہے ہیں۔ ایک کو تو وہ پہچان گیا۔ یہ جان تھا۔ ٹریوی اس کو کئی بار دیکھ چکا تھا اس لیے وہ اسے پیچھے سے دیکھنے کے باوجود صرف جسامت اور حلیے سے ہی پہچان لیتا تھا۔ دوسرا کوئی اجنبی تھا۔ کافی دیر ہو چکی تھی۔ وہ دونوں لمحہ بھر کے اندر ہی کاٹیج میں داخل ہو گئے اور پھر دروازہ بند ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ٹریوی پر ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ گھر پہنچا اور پہنچتے ہی فوراً شریف کو فون کیا اور سارا احوال اس کے گوش گزار کر دیا۔

"بہت شکریہ مسٹر ٹریوی... آپ کا کام ختم ہو گیا۔ آپ آرام کریں۔ اگر ضرورت پڑی تو آپ کو زحمت دوں گا۔"

"میں حاضر ہوں... بائے۔" یہ کہہ کر ٹریوی نے فون بند کیا۔ جیلا بھی اس کے برابر کھڑی تھی۔ وہ بھی خاصی پریشان تھی۔

"آج اگر فائرنگ کی آواز آئی تو سمجھ لینا کہ معاملہ واقعی گڑبڑ ہے۔ میرا شک درست تھا۔" اس نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"خیر... اب شریف جانے اور پولیس۔ تم نہا دھو لو تاکہ ہم ڈنر کر سکیں۔" یہ کہتے ہوئے جیلا نے اس کی طرف تولیہ بڑھایا۔

رات کے سوا آٹھ بج رہے تھے۔ ڈنر کے بعد دونوں میاں بیوی ٹی وی لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے۔ لاؤنج کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ ان کے کان باہر کی طرف لگے ہوئے تھے۔ اچانک گولی چلنے کی آواز آئی اور پھر اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہ بولے۔ وہ منتظر تھے کہ ابھی مزید گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں گی لیکن حیرت انگیز طور پر پھر کوئی آواز سنائی نہ دی۔

اسی طرح پانچ منٹ گزر گئے۔ دونوں میاں بیوی دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ کیا ہوا ہوگا لیکن وہ ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کرنے کے بجائے خاموشی کو ترجیح دے رہے تھے۔ اچانک پولیس کار کا سائرن سنائی دیا۔ ٹریوی کھڑکی کی طرف لپکا۔ لاؤنج کی کھڑکی سے سامنے کی سڑک صاف نظر آرہی تھی۔ ان کی نگاہوں کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے تین پولیس کاریں سائرن بجاتے ہوئے تیزی سے ایلیزا گارڈن کی طرف جانے والے موڑ پر مڑ گئیں۔ دونوں میاں بیوی کھڑکی میں خاموش کھڑے گاڑیوں کو جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ پولیس کار کے گزرنے کے چند لمحوں بعد ان کے پیچھے پیچھے ایک ایمبولینس بھی سائرن بجاتی ہوئی ایلیزا گارڈن کی طرف مڑ گئی۔ ٹریوی سمجھ گیا تھا کہ اس کا شک درست تھا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ دونوں میاں بیوی خاموشی سے آکر صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کے چہروں پر تشویش کے آثار نمایاں تھے۔ دونوں اس بات سے لاعلم تھے کہ ایلیزا گارڈن میں کیا ہو رہا ہے۔

تقریباً ایک گھنٹا گزر گیا۔ وہ دونوں بدستور ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایلیزا گارڈن کو جانے والی ایمبولینس اور ایک پولیس کار تو کچھ دیر بعد ہی واپس چلی گئی تھیں لیکن وہاں پولیس کی تین کاریں گئی تھیں۔ دو اب تک واپس نہیں ہوئی تھیں۔ اس کا مطلب تھا وہاں اب بھی کارروائی جاری تھی... مگر کیا ہو رہا تھا؟ اس سوال کا جواب دونوں میاں بیوی کے پاس نہیں تھا۔

اسی کشمکش میں تقریباً سوا گھنٹا مزید گزر گیا۔

اچانک ایمبولینس کے سائرن کی آواز ایک بار پھر گونجی۔ دونوں میاں بیوی ایک بار پھر کھڑکی میں آکر کھڑے ہو گئے۔ ایمبولینس تیزی سے سائرن بجاتی ہوئی ایلیزا گارڈن کی طرف چلی گئی۔

ٹریوی اور جیلا سخت پریشان تھے۔ جیلا کو تو ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ اچانک ایک بار پھر سائرن کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ دونوں پھر کھڑکی میں آکر کھڑے ہو گئے۔ چند ہی لمحوں میں دو پولیس کاریں اور ایک ایمبولینس تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئیں۔ یہ وہی گاڑیاں تھیں جو کچھ دیر پہلے ایلیزا گارڈن کی طرف گئی تھیں۔

"شکر ہے کہ معاملہ نمٹ گیا۔" گاڑیوں کو جاتا ہوا دیکھ کر ٹریوی نے گہری سانس لی اور دھیرے سے کہا۔ "میں ٹھیک سمجھ رہا تھا۔ جان کے گھر میں کوئی غلط کام ہو رہا تھا۔" کھڑکی کے پٹ بند کر کے پردے برابر کرتے ہوئے اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"یقیناً۔" جیلا نے مختصر سا جواب دیا۔ اب اس کے چہرے پر سکون نظر آرہا تھا۔

"ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔"

"وہ کیا؟" جیلا نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

"وہاں ایسا کیا ہو رہا تھا جو پولیس کو کارروائی میں اتنی دیر

لگی؟"

"یہ بات تو واقعی سوچنے کی ہے۔" جیلا نے تشویش سے جواب دیا۔ یہ وقت ان کے سونے کا تھا لیکن پولیس کارروائی کے باعث نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور جا چکی تھی۔

"خیر جو ہوا، اچھا ہی ہوا ہوگا۔" ٹریوی نے انگڑائی لی۔ "میرے تو اعصاب شل ہو چکے ہیں۔ ذرا کافی بنا لو۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے کچھ آرام مل جائے۔" اس نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور باورچی خانے کی طرف چل دی۔

ابھی وہ دونوں کافی پی رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔

"ہیلو۔" ٹریوی نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور کہا۔

"مسٹر ٹریوی بول رہے ہیں؟"

"جی ہاں... آپ کون؟"

"میں شریف بول رہا ہوں۔"

"سر!"

"میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے ہماری بہت مدد کی۔" شریف نے کہا۔

"جی نہیں... ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ میرا فرض تھا۔ آخر کو میں ایک ذمے دار شہری ہوں۔" شریف کی بات سن کر ٹریوی نے رسمی الفاظ میں اپنی بات کہی۔ دل ہی دل میں وہ بے تاب تھا کہ شریف اسے یہ بتائے کہ اصل ماجرا کیا ہے لیکن وہ خود پوچھنے کے بجائے منتظر رہا کہ وہ ازخود یہ بات کہے۔

"ویسے میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے شروع میں آپ کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ نے بھی یہ بات محسوس کی ہوگی اس لیے ایک مرتبہ پھر معذرت۔"

"ان باتوں کو چھوڑیے۔ یہ بتائیے کہ مجھے اور میری فیملی کو تو کوئی خطرہ نہیں ہے؟" ٹریوی دل ہی دل میں اپنی فیملی کے حوالے سے پریشان تھا۔ اس کارروائی کا بنیادی کردار وہ خود تھا۔ اب جبکہ پولیس کامیاب کارروائی کر چکی تھی تو وہ ڈر رہا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ اس واقعے میں کوئی خطرناک خونی گروہ ملوث ہو جو حقیقت کھلنے پر اس کے خاندان کے خون کے پیاسے نہ ہو جائیں۔

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ آپ ہر طرح سے محفوظ ہیں۔" شریف نے کہنا شروع کیا۔ "میری آپ سے ایک درخواست ہے۔"

"وہ کیا... کھل کر کہیے۔ میں ہر ممکن مدد کے لیے حاضر ہوں۔"

"آپ کو کل صبح نو بجے تھانے میں آنا پڑے گا۔ ہمیں آپ کا بیان لینا ہے۔ امید ہے کہ آپ ضرور پہنچیں گے۔" شریف نے مدعا بیان کیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں پہنچ جاؤں گا۔" ٹریوی نے چند لمحوں تک سوچا اور پھر جواب دیا۔ وہ کل دفتر سے رخصت لینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ "ویسے ماجرا کیا ہے، کچھ بتانا پسند کریں گے؟" ٹریوی سمجھ گیا تھا کہ شریف کی بات مکمل ہو چکی ہے اور اب وہ بنا حقیقت بتائے فون بند کرنے والا ہے۔ اس لیے اس نے تھوڑا سا ہچکچاتے ہوئے وہ سوال کر ہی ڈالا جو اسے پریشان کیے جا رہا تھا۔

"بات تو خاص ہے مگر اب کوئی خطرہ نہیں۔ کل صبح تم تھانے پہنچ ہی رہے ہو۔ وہیں تمہیں سب تفصیل سے بتا دوں گا۔ ویسے بھی ابھی ہم تفتیش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ دو چار گھنٹے میں اس کام سے فارغ ہو جائیں گے... ٹھیک ہے تو پھر کل صبح ملتے ہیں... بائے۔"

"بائے۔" ٹریوی نے فون رکھا تو جیلا اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی مگر اس کے پاس کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا، ماسوائے شریف کی اس یقین دہانی کے کہ کوئی خطرہ نہیں۔

وہ رات ان دونوں میاں بیوی نے نہایت بے چینی کے عالم میں گزاری۔ دوسرے دن ٹریوی مقررہ وقت پر تھانے پہنچ گیا۔ شریف اس کا ہی منتظر تھا۔ اس نے نہایت گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا اور فوراً کافی منگوالی۔

چند رسمی کلمات کے بعد شریف نے اسٹینوگرافر کو بلوایا اور ٹریوی سے درخواست کی کہ ایلیزا گارڈن میں اس نے گزشتہ شام تک جو کچھ دیکھا تھا، وہ بیان کرے۔ ٹریوی نے تمام تر جزئیات کے ساتھ واقعات بیان کر دیے۔ بیان تحریر ہو جانے کے بعد اسے پڑھا اور پھر اپنے دستخط کر دیے۔

کچھ دیر بعد ایک پولیس افسر نے آکر شریف کو بتایا کہ اخبار اور ٹی وی کے نمائندے پہنچ گئے ہیں اور اس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ ٹریوی پریشان تھا کہ شریف اسے حقیقت کیوں نہیں بتا رہا لیکن یہ سوال کرتے ہوئے وہ ڈر رہا تھا اس لیے خاموش رہا۔ شریف ٹریوی کو اپنے ہمراہ لے کر کانفرنس روم کی طرف چل دیا۔ وہاں ٹی وی اور اخبار کے درجن بھر نمائندے بیٹھے ہوئے تھے۔ شریف نے ٹریوی کو اپنے برابر والی کرسی پر بٹھایا اور چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

"گزشتہ ایک سال کے دوران میں نہ صرف ہمارے قصبے بلکہ اردگرد کے علاقوں سے ایسے پندرہ افراد کی پراسرار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گمشدگی کے واقعات درج ہوئے جن کا اب تک کوئی پتا نہیں چل رہا تھا۔ چند روز قبل ایک شریف اور ذمے دار شہری نے مجھ سے مل کر ایک شکایت کی۔ جب ہم نے اس شکایت کی تفتیش شروع کی تو ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ جن لاپتا افراد کی ہم تلاش کر رہے ہیں، اس کا سراغ اس شکایت میں پوشیدہ ہے۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوا اور پھر ٹریوی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔ "اس شریف آدمی کی مدد سے ہم نے پراسرار گمشدگی کا کیس حل کرلیا ہے مگر افسوس ہے کہ ہم صرف ایک شخص کو ہی زندہ بچا پائے ہیں۔" شیرف کی تعریف سے ٹریوی کا سیروں خون بڑھ گیا لیکن اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اتنے سارے لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

پریس کانفرنس خاصی طویل تھی۔ شیرف نے جو کچھ بیان کیا، اس کے مطابق گمشدگی کے واقعات کے پیچھے پولیس کا سابق افسر جان ایڈورڈ تھا۔ جب اس کی نشے باز بیٹی اس کی اپنی ہی گولی سے ماری گئی، تب سے وہ منشیات کے عادی اور ان کی خرید و فروخت میں ملوث افراد سے اپنی اکلوتی بیٹی کی موت کا انتقام لینے کا سوچ رہا تھا۔ آخرکار اس نے ایک عجیب و غریب منصوبہ بنایا۔ منصوبے کے تحت پہلے تو سب ملنے جلنے والوں سے کنارہ کش ہوا۔ اس کے بعد جان نے قصبے کے باہر ایسے افراد کو تلاش کرنا شروع کیا جو منشیات کے عادی تھے اور چھوٹے پیمانے پر اس کی خرید و فروخت بھی کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے شکار کو تاک لینے کے بعد اس سے راہ و رسم بڑھاتا اور جب وہ اس کا مکمل اعتماد حاصل کرلیتا تو موقع غنیمت دیکھ کر اسے اپنے فارم ہاؤس پر پہنچنے کی دعوت دیتا جہاں پر وہ نہایت بہیمانہ انداز سے اسے قتل کردیا کرتا تھا۔

جان ایڈورڈ اپنے شکار کو نہایت اذیت کی موت مارتا تھا۔ وہ سب سے پہلے اپنے شکار کو فارم ہاؤس کے کھلے میدان میں لاتا۔ اسے دھمکاتا، ڈراتا اور پھر ان کے پاؤں اور ران پر گولیاں مار کر زخمی کردیتا۔ اس حالت میں اس کا شکار بھاگنے کے قابل نہیں رہتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ شکار درد کی تکلیف سے چیختا چلاتا تھا لیکن جان کو اس بات کی فکر نہیں تھی۔ فارم ہاؤس الگ تھلگ اور اتنا بڑا تھا کہ چیخوں کا کسی شخص کو سنائی دینا ممکن نہیں تھا۔ جب کمزور و نحیف نشے کا عادی شخص خون میں اچھی طرح لت پت ہوجاتا تو وہ اسے گھسیٹتا ہوا تہ خانے میں لے جاتا جہاں اس نے تین شکاری کتے پالے ہوئے تھے۔ وہ اپنے شکار کو بھوکے کتوں کے آگے ڈال دیتا اور چند لمحوں میں ہی وہ آدم خور کتے اپنے زندہ شکار کو چٹ کرجاتے۔ بعد میں جان مرنے والے کی ہڈیوں اور دیگر باقیات کو ایک چھوٹے سے تالاب میں ڈال دیتا۔ اس تالاب میں تیزاب بھرا ہوا تھا۔ اس طرح اس کے جرم کا ہر نشان مٹ جاتا تھا۔

شیرف کے مطابق کتے نہایت خوں خوار تھے۔ وہ آدم خور بن چکے تھے اس لیے انہیں موقع پر ہی گولیاں مار کر ہلاک کردیا گیا۔ شیرف کا کہنا تھا کہ کل شام جب وہ اپنے تازہ شکار کو کاٹیج کے سامنے میدان میں لے کر پہنچا تو اس وقت پولیس نگرانی کر رہی تھی۔ جب وہ شکار کو باہر لایا تو پولیس نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ اب وہ کیا کرتا ہے۔ ابھی جان نے اپنے شکار کی ٹانگ پر ایک ہی گولی چلائی تھی کہ پولیس اس کے سر پر پہنچ گئی۔ یوں اس نشے باز کی جان بچ گئی۔ جان نے اعتراف جرم کرلیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے یہ سب کچھ جذبہ انتقام کے تحت کیا۔ شیرف نے دلچسپ بات یہ بتائی کہ وہ مارنے سے پہلے اپنے شکار کی تصویر کھینچتا تھا جسے بعد میں وہ تہ خانے میں لگے بورڈ پر چسپاں کردیتا تھا۔ انہی تصویروں کی مدد سے گمشدہ افراد کی شناخت اور ان کی موت کی تصدیق ہوسکی ہے۔

اس دن شام کے اخبارات اور ٹی وی کی خبروں میں یہ واقعہ نہایت تفصیل سے بیان کیا جارہا تھا۔ ٹریوی اس واقعے کا مرکزی کردار تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اس نے ایک خونی مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں پولیس کی مدد کی تھی۔ اس واقعے نے راتوں رات اسے علاقے کی نمایاں شخصیت بنادیا۔

☆☆☆

دوسرے دن ٹریوی کلب جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ جب وہ گھر سے نکلنے لگا تو جیلا قریب آئی۔ "سنو۔" اس نے بڑے پیار سے کہا۔ "واپسی پر واٹر ریلیوارڈ سے ہی آنا۔ کہیں وقت بچانے کے چکر میں کوئی اور مختصر راستہ ڈھونڈنے کے لیے مت نکل جانا۔"

"مگر وہاں تو ٹریفک کا ہجوم..."

"کوئی بات نہیں۔ اب تم گمنام شہری نہیں، علاقے کی جانی پہچانی شخصیت ہو۔ کوئی گاڑی والا تمہیں ٹکر مارنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔" جیلا نے فوراً اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے مگر واپسی میں دیر ہوسکتی ہے۔"

"کوئی بات نہیں، پر سیدھے راستے سے آنا۔" ٹریوی نے سائیکل آگے بڑھائی تو جیلا نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

"اوکے۔" ٹریوی نے اونچی آواز میں جواب دیا اور پیڈل پر تیزی سے پاؤں چلانے لگا۔

شرگزیدہ

ثنا منظر

نیکی اور بدی کا ازل سے ساتھ ہے... مگر بدی کا راستہ منتخب کرنے والے کوئی نہ کوئی منفی مقصد ضرور رکھتے ہیں... لالچ... طمع اور بدی انہیں عارضی کامیابی سے ضرور ہمکنار کرتی ہے... مگر دائمی کامیابی ہمیشہ کسی اور کے حصے میں آتی ہے...

اس مصیبت زدہ خاندان کی کتھا جس نے عارضی فتح پالی تھی

میں نے اپنی گاڑی اچانک ہی روک دی تھی حالانکہ رواں سڑک پر اس قسم کی کوئی بھی حرکت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے لیکن شکر تھا کہ اس وقت پیچھے کوئی اور گاڑی نہیں تھی۔

میں نے ماسٹر میرو کو دیکھ لیا تھا۔ ماسٹر میرو کوئی استاد نہیں بلکہ ایک ٹیلر ماسٹر ہے۔ ہمارے محلے میں ہی رہتا تھا۔ میں اپنے کپڑے اسی سے سلواتا تھا۔ وہ ایک ماہر کاریگر تھا۔ اس کو شہر کے ایک فٹ پاتھ پر بیٹھے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی اسی لیے میں نے ایک طرف اپنی گاڑی روک لی۔ میں گاڑی سے اتر کر اس کی طرف بڑھا۔ وہ بھی چونک کر

digestpk.blogspot.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے دیکھنے لگا پھر اس نے مجھے پہچان لیا۔
"فیاض بابو آپ؟" اس نے حیرانی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ پوچھا۔
میں نے بڑی محبت سے اس سے ہاتھ ملایا۔ "ماسٹر میرو تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"
"بس فیاض صاحب یہ بہت دردناک کہانی ہے۔" اس نے گہری سانس لی۔ "میرے ساتھ میری بیوی اور بیٹی بھی ہے۔" اس نے بتایا پھر اس نے روڈ کے دوسری طرف بنے پارک کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ دونوں اس پارک میں بیٹھی ہیں اور میں کسی پناہ کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔"
میں سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ "ماسٹر میرو فی الحال ایسا کرو کہ میرے ساتھ چلو بلکہ ایسا کرو ان دونوں کو بھی بلا کر لے آؤ۔"
"بس فیاض صاحب دو منٹ میں ابھی بلا کر لاتا ہوں۔" میں وہیں گاڑی کے پاس کھڑا رہا۔ وہ روڈ کراس کر کے پارک میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ دو عورتوں کو لے کر واپس آ گیا۔
بیوی تو واجبی سی صورت کی تھی لیکن اس کی بیٹی خوبصورت تھی۔ چھریرے جسم کی، بڑی بڑی آنکھوں والی...
اس نے ان دونوں سے میرا تعارف کرایا۔ "یہ فیاض صاحب ہیں۔ یہ دس بارہ سال سے اسی شہر میں ہیں۔ پتا نہیں انہوں نے مجھے کس طرح دیکھ لیا اور گاڑی روک لی اور فیاض صاحب یہ ہے میری بیوی نفیسہ اور یہ میری بیٹی انجم ہے۔" دونوں نے بہت ادب سے سلام کیا۔ وہ میری گاڑی اور مجھے دیکھ کر مرعوب ہو رہی تھیں۔
"آپ لوگ گاڑی میں بیٹھ جائیں۔" میں نے اشارہ کیا۔
"فیاض صاحب ہمارے پاس تھوڑا بہت سامان بھی ہے۔" ماسٹر میرو نے دبی زبان میں بتایا۔ "ہم نے کچھ دیر کے لیے سامنے والی دکان میں رکھوا دیا ہے۔"
"کوئی بات نہیں تم اپنا سامان بھی لے لو۔" میں نے کہا۔ سامان کیا تھا، ٹین کے دو بکس تھے اور اس وقت ماسٹر میرو کی شاید یہی کل کائنات تھی۔ میں نے ڈکی میں دونوں بکس رکھوا دیے۔
میں ان لوگوں کو اپنے گھر میں لے آیا۔ میرا گھر اچھا خاصا بڑا تھا۔ جس میں کئی کمرے تھے۔ میں نے شہر آ کر اپنی محنت اور ذہانت سے اچھی خاصی دولت حاصل کر لی تھی۔ اب میرا اپنا کاروبار تھا، گاڑی تھی، بینک بیلنس تھا...... سب کچھ تھا میرے پاس۔
زندگی بہت آرام اور سکون کے ساتھ گزر رہی تھی۔ میری محبت کرنے والی بیوی سارہ میرے پاس تھی۔ خدا نے ہمیں اولاد کی نعمت تو نہیں دی تھی لیکن ہم اس کی ذات سے مایوس نہیں تھے۔
سارہ سے شادی کے بعد اس قول کی سچائی کا احساس ہو گیا کہ بیوی اگر اچھی ہو تو گھر جنت بن جاتا ہے۔ میرا گھر جنت ہی تھا لیکن اچانک ہی اس کو کسی کی نظر لگ گئی۔
ایک حادثے میں سارہ کا انتقال ہو گیا اور وہ نہ جانے کتنی حسرتیں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اس کی موت کے بعد جیسے میری زندگی میں کچھ بچا ہی نہیں تھا۔
سارہ ہی میرے لیے سب کچھ تھی۔ میرا سکون، میرا چین اور میری زندگی۔ میرے سارے خواب صرف اسی سے وابستہ تھے۔ نہ جانے کتنے دنوں تک مجھے اپنا ہوش نہیں رہا تھا لیکن اب رفتہ رفتہ خود کو اس نے سنبھال لیا تھا کہ دنیا اسی کا نام ہے۔
ماسٹر میرو کو اس وقت تو میں نے یونہی لفٹ دے دی تھی یعنی کوئی خاص بات میرے ذہن میں نہیں تھی۔
انہیں گھر لا کر میں نے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور ان کے لیے چائے بنا کر لے آیا۔ سارہ کی موت کے بعد مجھے خود کام کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔
چائے کے دوران میں نے ماسٹر میرو سے پوچھا۔
"ہاں ماسٹر صاحب، اب بتاؤ وہاں کیا ہوا تھا جو اتنی افراتفری میں بھاگنا پڑ گیا؟"
"مجھے تو زمیندار فتح محمد نے برباد کر کے رکھ دیا فیاض صاحب۔" اس نے بتایا۔ "آپ نے تو اس کم بخت کو دیکھا ہوگا۔ ستر برس سے کم کا نہیں ہے لیکن وہ میری بیٹی کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں اپنی بیٹی سے اس کی شادی کر دوں۔" میں نے ماسٹر میرو کی بیٹی انجم کی طرف دیکھا۔
اس بے چاری نے اپنی گردن جھکا لی۔ واقعی یہ سب سن کر مجھے بہت افسوس ہوا تھا۔ یہ لوگ اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ انہیں کسی اور کے جذبات اور احساسات کی پروا نہیں ہوتی... یہ صرف اپنی تسکین چاہتے ہیں چاہے وہ کسی بھی انداز سے ہو۔
"فیاض صاحب، اس انکار کے بعد ہماری زندگی عذاب ہو گئی۔ اس کے آدمیوں نے ایک رات میری دکان میں آگ لگا دی اور میرا سب کچھ جل کر تباہ ہو گیا۔ یوں سمجھیں کہ ہم لوگ وہاں سے اپنی عزت اور جانیں بچا کر شہر

آ گئے ہیں۔"
"خدا غارت کرے ایسے لوگوں کو۔" میں نے کہا۔ "تو شہر کس کے پاس آئے تھے...... کیا یہاں کوئی ہے؟"
"ایک دور کا رشتے دار ہے۔" ماسٹر نے بتایا۔ "ہم نے سمجھا تھا کہ کچھ دن اس کے یہاں گزار کر پھر کوئی ٹھکانا تلاش کریں گے لیکن اس نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ کہنے لگا کہ وہ خود مکان بدل کر کہیں جا رہا ہے۔ اسی لیے وہ ہمیں نہیں رکھ سکتا۔ بس اسی پریشانی میں ہم ادھر ادھر بھٹک رہے تھے کہ آپ نے ہمیں دیکھ لیا۔" اس وقت میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ میں نے کہا۔
"ماسٹر تم لوگ یہیں رہ جاؤ۔"
"یہاں رہ جاؤں...... آپ کے ساتھ......؟" وہ حیران رہ گیا۔
"ہاں میرا اتنا بڑا گھر ہے میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "بیوی کی موت کے بعد کوئی میرے ساتھ نہیں ہے۔ تم لوگوں کے آنے سے گھر میں کچھ رونق بھی ہو جائے گی اور مجھے بھی کچھ آسانیاں ہو جائیں گی۔"
"کیا کہتی ہو تم دونوں؟" ماسٹر میرو نے اپنی بیوی اور بیٹی کو مخاطب کیا۔ "فیاض صاحب ہم پر اتنی بڑی مہربانی کر رہے ہیں تم دونوں کا کیا خیال ہے؟"
پھر پہلی بار اس کی بیوی مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "فیاض صاحب! آپ کی بہت مہربانی ہے کہ آپ ہم لوگوں کو سہارا دے رہے ہیں۔ ہمارے لیے اس سے اچھی بات اور کیا ہو گی۔"
"پھر یہ طے ہو گیا کہ تم لوگوں کو اب یہیں رہنا ہے۔"
میں نے ان کے لیے دو کمرے مقرر کر دیے اس کے باوجود بھی اس گھر میں بہت گنجائش تھی۔ انہیں سیٹ ہونے میں دو چار دن لگ گئے۔ اس کے بعد دونوں ماں بیٹی نے گھر کے کام سنبھال لیے۔ اب مجھے وقت پر گھر میں بنا ہوا کھانا ملنے لگا۔ یہ میرے لیے بہت بڑی آسانی ہوئی تھی۔
پہلے تو سارا کام مجھے خود کرنا پڑتا تھا لیکن اب اس کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ آہستہ آہستہ انجم مجھ سے باتیں بھی کرنے لگی۔ ہم شام کی چائے ایک ساتھ پیتے البتہ رات کے کھانے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا کیونکہ میں کبھی کبھی دوستوں کے ساتھ باہر بھی چلا جاتا تھا لیکن اتنا ضرور ہوتا کہ جب میں واپس آتا تو انجم میرا انتظار کر رہی ہوتی تھی۔ وہ کھانے کے لیے پوچھتی اگر خواہش ہوتی تو میں کھا لیتا ورنہ منع کر دیتا۔
میں نے ایک دن ماسٹر میرو سے کہا۔ "ماسٹر صاحب میرا خیال ہے کہ آپ شہر میں اپنا کام شروع کر دیں۔ آپ کاریگر آدمی ہیں آپ کو تو کہیں بھی کام مل جائے گا۔"
"فیاض صاحب، میں نے کبھی کسی کے یہاں نوکری نہیں کی۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر کوئی چھوٹی موٹی دکان مل جائے تو اپنا کام شروع کر دوں۔"
"ٹھیک ہے بسم اللہ کریں۔ آپ کوئی مناسب دکان ڈھونڈ کر بتائیں پیسے میں دے دوں گا۔" اس وقت اس کا پورا خاندان میری آفرین کر بار بار شکریہ ادا کیے جا رہا تھا۔ مجھے بھی شرمندگی ہونے لگی۔
میں نے احسان ہی کون سا کیا تھا۔ میرے نزدیک احسان وہ ہے جو آؤٹ وے میں جا کر کیا جائے۔ کسی کو اپنی زندگی کی روٹین میں شامل کر لینا کون سی بڑی بات ہے۔
دو دن کے بعد ماسٹر میرو کو دکان بھی مل گئی۔ میں نے ایک مشین خرید کر اس کی دکان سیٹ کروا دی۔
اس رات میں اپنے کمرے میں تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔
"آ جاؤ۔" انجم ٹرے میں دودھ کا گلاس لیے داخل ہوئی۔ میں رات کو سونے سے پہلے دودھ ضرور پیتا تھا لیکن عام طور پر لاؤنج میں بیٹھ کر ہی پیتا تھا۔ اس رات میں دودھ پینا بھول گیا تھا۔ اسی لیے انجم دودھ میرے کمرے میں لے آئی۔
"فیاض صاحب، مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔" اس نے ٹرے ایک طرف رکھ دی۔
"ہاں ہاں دس باتیں پوچھو...... بلکہ سامنے ہی بیٹھ جاؤ۔" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خود کو سمیٹ کر سامنے بیٹھ گئی۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ شاید یہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔
کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "فیاض صاحب ایک بات بتائیں۔ آپ ہم پر اتنی مہربانیاں کیوں کر رہے ہیں؟"
"تمہارا کیا خیال ہے؟"
"میرا تو کوئی خیال نہیں ہے اسی لیے تو پوچھ رہی ہوں۔" اس نے کہا۔
"انجم یہ صرف انسانی ہمدردی ہے۔" میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "کیونکہ میں تمہارے والد کو بہت پہلے سے جانتا ہوں اور جب انہیں اس حال میں دیکھا اور ان کے حالات سنے تو تم لوگوں کو اس گھر میں اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے۔"
"اوہ۔" اس نے گہری سانس لی۔ "سوری میں نے

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔"

"میں سمجھ گئی، تم کیا کہنا چاہتے ہو اور مجھے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"تو پھر ہمیں اپنے طور پر تاریخ طے کر لینی چاہیے۔"

"ضرور۔" ہم دونوں نے اسی وقت تاریخ بھی طے کر لی۔ اگلے مہینے کی چھ تاریخ۔ سارا پروگرام بھی طے پا گیا۔ نکاح کی تقریب تبسم کے ماموں کے یہاں ہونے والی تھی۔ جن کے پاس وہ عارضی طور پر ٹھہری ہوئی تھی اور پھر وہاں سے رخصت ہو کر ہمارے گھر آ جاتی لیکن اسی رات ماسٹر میرو نے مجھ سے ایک بات کہہ دی۔

"فیاض صاحب، اچھا تو نہیں لگتا کہ میں خود اپنی زبان سے یہ بات چھیڑوں لیکن مجبوری یہ ہے کہ آپ کا کوئی بڑا بھی نہیں ہے اور اب آپ سے بات کرنے میں مجھے کوئی جھجک بھی نہیں ہے۔"

"بتائیں ماسٹر صاحب کیا بات کرنی ہے آپ کو؟"

"میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ انعم کو قبول کر لیں۔" ماسٹر میرو نے کہا۔ "اس کی شادی ہو جائے تو ہمیں سکون مل جائے گا۔"

ہو سکتا تھا کہ تبسم کی ملاقات سے پہلے اگر ماسٹر میرو مجھ سے یہ بات کرتے تو میں فوراً ہی ہاں کر دیتا لیکن اب تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

میں نے ماسٹر میرو سے کہا۔ "ماسٹر صاحب اس میں کوئی شک نہیں کہ انعم بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس کے ساتھ زندگی بہت آرام اور سکون سے گزر سکتی ہے لیکن میں نے اپنی شادی کی تاریخ طے کر دی ہے۔ اگلے مہینے کی چھ تاریخ کو تبسم کے ساتھ میری شادی ہے۔"

"اوہ۔" ماسٹر میرو بجھ کر رہ گیا پھر خود کو سنبھال کر بولا۔ "کوئی بات نہیں جی۔ یہ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔ میری طرف سے بہت بہت مبارک باد ہو۔ آپ بتائیں ہم سے کیا خدمت لینی ہے؟"

"ظاہر ہے سارا انتظام آپ ہی لوگوں کو سنبھالنا ہے۔" میں نے کہا۔ "میرا آپ لوگوں کے علاوہ اور کون ہے۔"

"ہاں جی ہم ہر خدمت کے لیے تیار ہیں۔"

میرا خیال تھا کہ انعم ناراض ہو جائے گی یا اس کی ماں مجھ سے کھنچ جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ خود انعم نے مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔ "فیاض صاحب، آپ کو بہت مبارک ہو کہ آپ اپنی محبت کو حاصل کرنے جا رہے ہیں لیکن آپ کو بھی میری ایک بات ماننی ہوگی۔"

"کیوں نہیں۔"

"دلہن کو میں سجاؤں گی اور ساری شاپنگ بھی میں کروں گی۔"

"ضرور۔ سب کچھ تو تم ہی لوگوں کو کرنا ہے۔" مجھے خوشی تھی کہ کوئی ایشو نہیں بنا اور سب کچھ خیریت سے ہو گیا۔ وہ پورا خاندان شادی کے سلسلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔

گھر کا رنگ و روغن، نئے پردے، نیا فرنیچر پھر ان ہی لوگوں کے مشورے پر میں نے زیورات کے دو سیٹ بھی خرید لیے۔ خریداری کے لیے انعم اور اس کی ماں میرے ساتھ گئی تھیں۔ انعم کی پسند اس سلسلے میں بہت زبردست تھی۔ اس نے بہت اعلیٰ قسم کے دو سیٹ خریدے تھے۔ جن کی مالیت بارہ لاکھ کے قریب تھی۔ میں تبسم کے لیے سب کچھ کر گزرنا چاہتا تھا۔ میں نے تبسم سے ذکر کیا تو وہ ناراض ہو گئی۔

"آخر یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہی روپے بچا کر رکھ لیتے۔"

"تم یہ سمجھو کہ یہ ایک طرح کی انویسٹمنٹ ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "یونکہ سونا روز بروز مہنگا ہوتا جا رہا ہے۔" اس دلیل کے بعد اس نے پھر کچھ نہیں کہا۔

شادی سے ایک ہفتہ پہلے انعم نے اپنے ہاتھوں سے کیک بنایا جو دیکھنے ہی سے خوشنما دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "انعم تم نے کیک بنانا کہاں سے سیکھ لیا؟"

"یہیں آ کر سیکھا ہے۔" اس نے بتایا۔ "آج کل ٹی وی چینلز نے سب کو کھانا بنانے میں ماہر کر دیا ہے۔"

"یہ بات تو ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "شاید ہی کوئی ایسا چینل ہو جو اس قسم کے پروگرام نہ دے رہا ہو۔"

"ایک بات کہوں۔ اگر آپ کو یہ کیک پسند آ جائے تو آپ کی شادی کے دن میں سارے مہمانوں کے لیے کیک بناؤں گی۔" اور اسی رات وہ سب کچھ ہو گیا جس کی مجھے توقع بھی نہیں تھی۔

میرا خیال ہے کہ صرف آدھے گھنٹے بعد ہی میری حالت خراب ہونے لگی۔ ابتدا الٹیوں سے ہوئی تھی۔ اوہ خدا، جیسے آفتیں حلق میں آ گئی ہوں۔ میں الٹیاں کرتے کرتے بستر سے نیچے گر گیا تھا۔

میں چیخ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی میری مدد کے لیے نہیں آیا پھر مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ میری آنکھیں جیسے حلقوں سے باہر آنے لگی تھیں پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

اسی حالت میں شاید دو گھنٹے، چار گھنٹے یا دس گھنٹے گزر گئے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں خود اپنی ہی غلاظت میں لتھڑا ہوا تھا۔

میری الٹیوں سے خون بھی آیا تھا۔ میں نے بہت کمزور آواز میں انہیں پکارا لیکن کوئی بھی نہیں آیا۔ شاید کوئی بھی گھر پر نہیں تھا۔ میں باقاعدہ رینگتا ہوا دروازے تک پہنچا پھر آوازیں دیں لیکن کوئی نہیں آیا۔

مجھ پر ایک بار پھر غشی طاری ہو گئی۔ اس بار ہوش جلدی آ گیا تھا اور بدن میں توانائی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ان کے کمروں کا رخ کیا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا اور کمرے خالی تھے۔ مختصر یہ کہ وہ تینوں گھر سے بھاگ چکے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ میں نے تبسم کے لیے جو زیورات اور کپڑے خریدے تھے وہ بھی غائب تھے۔ میں نے کچھ پرائز بانڈز بھی رکھے ہوئے تھے وہ بھی چرا لیے گئے تھے۔

میں نے غسل خانے میں جا کر اپنے آپ کو صاف کیا۔ اس سے پہلے کمرے کی غلاظت صاف کی پھر اپنے آپ کو سنبھال کر ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے میرا معائنہ کرنے کے بعد بتایا۔ "آپ کی قسمت اچھی تھی جناب کہ آپ بچ گئے۔ آپ کو خطرناک قسم کا زہر دیا گیا تھا۔"

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے زہر کیک میں دیا گیا تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ زہر دینے والے کون لوگ تھے لیکن میں نے ان کے خلاف کوئی رپورٹ درج نہیں کروائی۔ ڈاکٹر کو بتایا کہ میں نے بازار کی الٹی سیدھی چیزیں کھائی تھیں شاید اسی وجہ سے میں فوڈ پوائزنگ کا شکار ہو گیا تھا۔

تبسم کو جب یہ پتا چلا تو اس نے باقاعدہ رونا دھونا شروع کر دیا۔

"خدا غارت کرے ایسے لوگوں کو تم نے ان کے ساتھ کتنی بھلائی کی اور انہوں نے تمہارے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے۔"

"اس بات پر شکر ادا کرو کہ میری جان بچ گئی۔" میں نے کہا۔ "اس واقعے کے بعد مجھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس قول پر ایمان لانا پڑا کہ جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو۔" کتنا سچا تھا یہ قول جو صدیاں بیت جانے کے بعد آج بھی اپنی جگہ اٹل ہے۔

موبائل فون اور دماغی سرطان

ترقی یافتہ ممالک میں موبائل فون سے خارج ہونے والی طاقتور ریڈیائی شعاعوں کے مضر صحت اثرات پر ایک مدت سے گہری تشویش پائی جا رہی ہے اور اس ضمن میں زور و شور سے تحقیقات جاری ہیں۔

مئی 2011ء کے اواخر میں انٹرنیشنل ایجنسی فار ریسرچ آن کینسر اور ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے سائنس دانوں کے ایک بڑے گروپ نے "کینسر اور موبائل فون کے استعمال" کے موضوع پر ایک ہفتے کے غور و خوض کے بعد طے کیا کہ موبائل فون کے ریڈیائی اخراج انسانوں میں کینسر کا سبب بن سکتے ہیں اور موبائل فون کو کیٹگری B2 میں شامل کر دیا۔

موبائل فون ہماری روزمرہ زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے مگر اس کے استعمال میں مضر خطرات بھی اپنی جگہ اٹل ہیں۔ انہیں کم ترین سطح پر رکھنے کے لیے ماہرین مندرجہ ذیل تدابیر تجویز کرتے ہیں۔

1- سیل فون کان سے لگانے کے بجائے تار سے منسلک ہینڈز فری جیک استعمال کریں۔

2- سیل فون کو دماغ سے حتی الامکان دور رکھیں۔ اس پر گفتگو سے گریز کرتے ہوئے ایس ایم ایس کو ترجیح دیں۔ یہ محفوظ طریقہ ہے۔

3- سوتے ہوئے سیل فون کو سرہانے کے قریب نہ رکھیں۔ فون کو جگانے کے لیے الارم کلاک کے طور پر ہرگز استعمال نہ کریں۔

4- مضافاتی علاقوں، عمارات، لفٹ اور بند کمروں میں سگنل کمزور ہوتے ہیں تو فون کا ریڈیائی اخراج بڑھ جاتا ہے۔ ایسی جگہوں پر فون استعمال نہ کریں۔

5- فون کو قمیص کی اوپر والی جیب میں، دل کے ساتھ نہ رکھیں۔

6- ممکن ہو تو فون کو ریڈیائی اخراج جذب کرنے والے کیس میں رکھیں۔ فی الحال ایسے کیس پاکستان میں بہت کم اور مہنگے ہیں۔

اسلام آباد سے ثوبیہ احمد کی تحقیق و جستجو

Digest of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

للکار

طاہر جاوید مغل

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے..... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی..... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے..... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے..... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے..... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیشِ نظر رکھتا ہے..... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستانِ محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے..... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے..... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمعِ نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر..... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے..... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیشِ نظر..... اپنا للکار ہے۔

اٹھارھویں قسط

Digests of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار گھڑیاں گن گن کر کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف وکی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کرلیا۔ ثروت خیریت سے گھر واپس تو آگئی لیکن اس کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے شہر چھوڑنے پر بھی مجبور کردیا۔ پھر سیٹھ سراج نے مجھے زدوکوب کیا اور میں خودکشی کا سوچنے لگا لیکن پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران واثق سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا۔۔۔ جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم معصورہ کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم معصورہ کی چھوٹی بہن نادیہ عمران پر بری طرح فریفتہ ہوگئی۔ نادیہ نے عمران کی سرد مہری کا انتقام لینے کے لیے ہمارے ایک دوست سیم کو بے دردی سے مار دیا۔ سیم کی موت کا بدلہ لینے کے لیے عمران نے نادیہ کو گولی ماردی۔ میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر راکٹ کا بھرپور ہٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے کے تاریک پانیوں میں اوجھل ہوگیا۔ اس کے بعد وہ میرے اہل خانہ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کو موقع سے بھگا دیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیر نے میری والدہ کو مجبور کردیا کہ وہ موت کو گلے لگالیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش وحواس چھین لیے۔ میں ماں کے جسد خاکی تک پہنچنے کے لیے چلاتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ گر گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ میں والدہ کو پکارتا ہوا ایک گھنے جنگل میں بھاگتا رہا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور آج میں کچھ عرصوں پہلے کے بعد تقریباً دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھاٹیہ اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں تھیں زرگاں اور ٹل پانی۔ زرگاں میں حکم جی کا اختیار چلتا ہے۔ حکم جی ایک عیاش اور بے انصاف شخص ہے۔ سلطانہ اس کی دسترس سے بچنے کے لیے اسٹیٹ کی دوسری بڑی آبادی ٹل پانی میں آگئی۔ یہاں حکم جی کا چھوٹا بھائی کارندہ تھا اسے چھوٹے سرکار کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں مجھے زرگاں میں پہنچا دیا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کردیا گیا۔ یہاں میری میڈم معصورہ سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے بچھوؤں سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ مجھ پر تشدد کرکے سلطانہ کو مجبور کیا گیا اور اس نے جارج کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ پھر میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر میں بھاگتے بھاگتے ایک غار میں پہنچ گیا۔ وہاں مجھے جوہان اور مگر ول مل گئے جو وہاں چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے جارج کے خلاف بغاوت کردی تھی۔ سلطانہ کی بہن بھی تھی۔ میں وہاں کے کئی افراد کے ساتھ خاموشی سے جارج کو قتل کرنے کے ارادے سے نکل پڑا مگر جارج نے بچاؤ کا راستہ بدل دیا۔ پھر ہم نے جارج کی سوتیلی بیٹی ماریہ کو اغوا کرلیا۔ ہم ماریہ کو لے کر وہاں سے نکلے۔ ہم نے ایک نہر کے پاس پہنچ کر کشتی میں سفر کیا۔ اس کشتی میں ہمیں ایک عجیب الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ بعد ازاں ہمیں پتا چلا کہ وہ جوڈو کراٹے کا ماسٹر [illegible] ہے۔ ہم واپس غار میں پہنچ گئے۔ ماریہ کے اغوا کا مقصد یہی تھا کہ [illegible]۔ پھر جوہان اور میں نے پتا لگایا کہ میرے جسم میں ایک چپ نصب کی گئی ہے۔ ماریہ کے وارثوں کو دی گئی مہلت ختم ہو چکی تھی۔ انہوں نے ہمارے بہت سے مطالبات مان لیے۔ [illegible] غائب ہوگیا۔ سفر کے دوران ہم ایک چوکی میں ٹھہر گئے۔ وہاں ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے [illegible] لیکن اس کوشش میں احمد اور جیمز سمیت ہمارے چار ساتھی مارے گئے۔ ہم بھاگتے رہے۔ میں ساتھیوں سے الگ ہوگیا اور [illegible] جنگل جا پہنچا۔ پھر دشمن یہاں بھی پہنچ گئے اور انہوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وہاں مقابلہ شروع ہوگیا۔ دشمن کو وہاں سے مار بھگایا گیا۔ مجھے اور جنگلی کو ٹل پانی چھوٹے سرکار کے دیوان میں پہنچوا دیا گیا۔ سلطانہ کی ذہنی حالت خراب تھی۔ ایک دن وہ خاموشی سے دیوان سے نکل گئی۔ مجھے پتا چلا کہ ٹل پانی پہنچنے والوں میں کشترا بھی شامل ہے۔ سلطانہ کے غائب کے بعد اس کی تلاش جاری تھی۔ اسی تلاش کے دوران ہم سلطانہ کے علاقے میں کشترا تک پہنچ گئے۔ کشترا کو دیوان لے آیا گیا۔ میں نے کشترا کو جنگلی کے بارے میں نہیں بتایا مگر ایک رات کشترا جنگلی کے کمرے میں پہنچ گئی۔ جنگلی کی حالت خراب تھی۔ جنگلی نے دم توڑ دیا۔ پھر زرگاں میں تین بندے قتل ہونے پر سلطانہ کو پکڑ لیا گیا۔ میں ایک روز اچانک [illegible] لوگوں کو چکمہ دے کر وہاں سے نکل پڑا۔ میں ایک ہندو جگی کے گھر پہنچ گیا۔ وہ گنر ہندو تھے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ سلطانہ کو اپنے طور پر سزا دینا چاہتے تھے لیکن ان کے پنڈت کے مطابق وہ سزا ایک خاص آدمی دیتا جو وہ مجھے سمجھ رہے تھے۔ رام پرشاد کے بیٹے تیتش کا تعلق انتہا پسند ہندو تنظیم سے تھا۔ پھر ایک روز تیتش نے بتایا کہ انہوں نے سلطانہ کو جارج اور حکم جی کے لوگوں سے چھڑا کر اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیا ہے اور اسے سزا دینے کا وقت آن پہنچا ہے۔ وہ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے گیا۔ تیتش کے مطابق سلطانہ کو زندہ جلایا جانا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ میرے ہاتھ میں مشعل تھما دی گئی۔ پھر ایک نوجوان اس پر تیل ڈالنے آیا۔ اس نے چہرے پر بھبوت مل رکھی تھی۔ اس نے عمران کا ذکر کیا تو میں ساکت رہ گیا۔ [illegible] وہ عمران تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے کہا کہ ہم سلطانہ کو یہاں سے نکال لیں گے۔ اس نے بتایا کہ [illegible] اور اس کی بیوی اس کے قبضے میں ہیں۔ گرو نے سلطانہ کی سزا تین دن کے لیے ملتوی کردی۔ عمران اکیلا نہیں تھا بلکہ اقبال بھی اس کے ساتھ تھا۔ پھر عمران نے [illegible] کے ذریعے تاڑی میں دھتورا ملا دیا اور وہاں موجود تمام پہرے دار بے ہوش ہوگئے۔ ہم ایک سکھ سردار کی گھوڑا گاڑی میں وہاں سے فرار ہوئے اور ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچے۔ وہاں ہم نے تاؤ افضل نامی شخص کے مکان میں قیام کیا۔ گرو سوبھاش وہاں سے بھاگ نکلے۔ یہ صورت حال تشویشناک تھی۔ ہم نے تاؤ افضل کا گھر چھوڑ دیا اور جنگل میں سفر کرنے لگے۔ [illegible] خطرناک ہوسکتا تھا۔ تاؤ افضل اور اس کی بیٹیاں بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ جنگل میں ہمیں ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ میں نے عمران سے کہا کہ وہ مجھے کچھ کرنے دے۔ کہ سلطانہ کا مجھ پر اعتماد بحال ہو۔ میں نے ایک ڈاکو سے دو بدو مقابلہ کیا اور اس مقابلے کو تماشے کی شکل دے دی۔ مجھے کئی چوٹیں آئیں مگر میں نے اپنے مدمقابل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔ ہم واپس بستی میں آئے مگر ہم نے ایک مندر کے مہمان خانے میں قیام کیا۔ رات کو ہمارا میزبان آفتاب باہر سے کوئی بری خبر لایا۔ اس نے بتایا کہ حالات ٹھیک نہیں۔ وہاں کافی ہندو جمع تھے۔ ہم نے [illegible] سے مندر کا منظر دیکھا۔ جنونی ہندوؤں نے گرو سوبھاش کا سر کاٹ دیا تھا اور وہ جاپ کر رہے تھے۔ گرو سوبھاش کی موت کے بعد جنونی ہندوؤں کے دو گروہ بن گئے تھے اور ان میں کسی بھی وقت لڑائی چھڑ سکتی تھی۔ کلثوم کے فرار کے بعد ہندوؤں نے اس کا الزام رام پرشاد کی بہو پر لگایا اور فیصلہ ہوا کہ رام پرشاد جلتے تیل میں ہاتھ ڈال کر پرکھشا دے گا۔ پھر پرکھشا کا وقت آگیا اور رام پرشاد نے جلتے تیل میں ہاتھ ڈال دیے۔ وہ چلانے لگا۔ اس کے ہاتھ جل گئے تھے۔ پھر جنونی ہندوؤں نے رام پرشاد کو ہلاک کردیا اور ملا کو پکڑ لائے۔ اب اسے جلتے تیل میں پھینکا جانے والا تھا۔ پھر عمران نے کچھ کرنے کا کہا اور گولی چلا دی۔ ہندو ہڑبڑا گیا۔ تیتش کے آدمیوں نے بھی گولیاں چلا دیں اور وہ لوگ ملا کو نکال لے گئے۔ ہم واپس تہ خانے میں آگئے۔ میری گردن کے زخم سے خون کا رساؤ پھر شروع ہو گیا تھا اور تکلیف بھی بڑھتی جارہی تھی۔ میں درد سے تڑپ رہا تھا۔ درد شدید تھا۔ مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو رہا ہوں۔ عمران ڈاکٹر [illegible] کو گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ لے آیا اور اسے میرا آپریشن کرنے پر مجبور کیا۔ اس میں میری جان بھی جاسکتی تھی۔ خیر میرا آپریشن ہوگیا اور میری گردن سے وہ خوفناک چپ نکال دی گئی۔ دس روز بعد میں پوری طرح صحت یاب ہوگیا تھا۔ میں اور عمران راج بھون پہنچ گئے۔ ہمارے پاس اسلحہ بھی تھا۔ ہم وہاں موجود پہرے داروں کو بچھاڑ کر اندر داخل ہوئے۔ وہاں حکم جی کے بیٹے کی پیدائش پر جشن منایا جارہا تھا۔ ہم نے فائرنگ کردی۔ گرانڈیل کا بھائی اس فائرنگ میں مارا گیا۔ ایک دو بندے زخمی ہوئے۔ پانڈے نے ہمارا پیچھا کیا مگر وہ بھی میرے ہاتھوں مارا گیا۔ ہم ایک ہندو جگی کے گھر میں گھس گئے اور جنتی نامی لڑکی کو یرغمال بنالیا مگر اس نے ہم سے پورا تعاون کیا۔ اسی کی زبانی ہمیں پتا چلا کہ اسحاق کو سزائے موت دی جارہی ہے۔ ہم وہاں سے نکلے مگر اسحاق کے لیے کچھ نہ کرپائے۔ اسے بے انتہا اذیت دے کر موت کی نیند سلا دیا گیا۔ ہم نے عہد کیا کہ اسحاق کی ایک ایک چیخ کا ایک ایک بدلہ ضرور لیں گے۔ ہم وہاں سے نکل رہے تھے کہ ایک گلی میں سپاہیوں کا ناکا نظر آیا۔ وہاں موجود افسر کو دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ میرے سامنے رنجیت پانڈے کھڑا تھا۔ وہ زندہ تھا۔ جو مارا گیا تھا وہ اس کا چچازاد گرومیت پانڈے تھا۔ پھر میں عمران کو ایک قہوہ خانے میں چھوڑ کر میڈم معصورہ کے پاس چلا گیا۔ اس کی [illegible] ہوگئی تھی اور وہ لال بھون پہنچ گئی تھی۔ میں نے اسے اپنی آمد کا مقصد بتایا اور عمران کے بارے میں بھی بتادیا۔ پھر عمران بھی وہاں پہنچ گیا مگر میڈم نے ہمیں دھوکا دیا اور کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملادی۔ وہ اپنی بہن کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ وہاں میڈم کے کارندوں اور ان کے ساتھ لڑائی ہوئی۔ اسی دوران میں میڈم کو سانپ نے کاٹ لیا۔ عمران نے میڈم معصورہ کی جان بچالی۔ میڈم کا رویہ ہمارے ساتھ ٹھیک ہوگیا۔ پھر میں ایک رات خاموشی سے نکل کر راج بھون پہنچ گیا اور جارج کو اس کے بیڈ پر [illegible]۔ مجھے ایک مہمان کے طور پر واپس میڈم معصورہ کے پاس بھیج دیا گیا۔ عمران اور میڈم معصورہ نے مجھے کہا کہ میں نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔ بہرحال میں نے وہاں اپنی جسمانی ورزش جاری رکھی اور مقابلے کی تیاری کرنے لگا۔ ایک رات میں اور عمران سو رہے تھے کہ میری آنکھ عمران کے جگانے پر کھلی۔ عمران نے انگلی سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ہم غسل خانے کی طرف دبک گئے۔ ہم نے دروازے میں تھوڑی جھری رہنے دی۔ کچھ وقت بعد کھڑکی کے پاس کسی سائے کی حرکت محسوس ہوئی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ہم غسل خانے کی تاریکی میں دم سادھے کھڑے رہے اور صورت حال کا جائزہ لیتے رہے۔ سایہ دروازے کی طرف بڑھا۔ ہم رات کو دروازہ مقفل کرکے سوتے تھے۔ یہ آہنی دروازہ تھا اور اس دروازے سے ملتا جلتا تھا جو چند روز پہلے فائرنگ کی وجہ سے خراب ہوا تھا اور اسے کھولنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اب ہمارا کمرا تبدیل ہو چکا تھا۔

چند سیکنڈ مزید گزرے، پھر دروازے کے آہنی قفل میں چابی گھومنے کی بہت مدھم آواز سنائی دی۔ شک تو ہمیں پہلے ہی ہو رہا تھا اب یقین ہونے لگا کہ یوں چوری چھپے ہمارے کمرے میں داخل ہونے والا اس عمارت میں موجود افراد میں سے ہی کوئی ہے۔ عین ممکن تھا کہ ہمارے محافظوں میں سے کوئی ہو۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ بے آواز کھل گیا اور ایک دراز قد شخص دبے پاؤں اندر آیا۔ اس نے وارداتیوں کی طرح اپنا چہرہ ایک کپڑے میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رائفل تھی جس کا بیرل معمول سے زیادہ لمبا نظر آرہا تھا۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ اندر آنے والے شخص کے جسم پر کمانڈوز والا مخصوص لباس ہے۔ وہ چند سیکنڈ تک تاریکی میں گھورا دونوں لحافوں کو گھورتا رہا پھر اس نے رائفل سیدھی کی اور بڑی تیزی سے دونوں لحافوں پر پانچ چھ فائر کیے۔

فائرنگ کی آواز سے انکشاف ہوا کہ رائفل پر سائلنسر چڑھا ہوا ہے۔

فائرنگ کے فوراً بعد وہ مڑا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب عمران نے اپنی جگہ سے تیز رفتار حرکت کی اور غسل خانے سے نکل کر دندناتا ہوا حملہ آور پر جا پڑا۔ حملہ آور اس کے نیچے اوندھے منہ گرا اور گرتے ہوئے آہنی دروازے سے ٹکرایا۔ اس تصادم سے زبردست شور پیدا ہوا۔ حملہ آور یقیناً ایک زورآور شخص تھا لیکن اس کے لیے یہ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ جیسے بھونچکا رہ گیا۔ میں عمران کی مدد کے لیے آگے بڑھا تاہم اس وقت دروازے پر ایک اور پرچھائیں نظر آئی۔ یہ بھی ایک محافظ تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے بلاتردد مجھ پر فائر کیا۔ دھماکے کے ساتھ شعلہ چمکا اور گولی میرے آس پاس سے گزر گئی۔ میں نے حملہ آور کو دوسرے فائر کا موقع نہیں دیا اور اس پر جا گرا۔ میں نے سب سے پہلے اس کا پستول والا ہاتھ دبوچا۔ پھر دائیں ہاتھ کا مکا اس کے چہرے پر رسید کیا۔ یہ بڑی شدید ضرب تھی۔ مدمقابل کے دو تین دانت ضرور اپنی جگہ چھوڑ گئے ہوں گے۔ وہ کراہا اور اس کا جسم ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس دوران میں وزنی بوٹوں کی دھمک سنائی دی اور سات آٹھ گارڈز موقع پر پہنچ گئے۔ مجھے ایک دو لمحے کے لیے شدید خطرہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محسوس ہوا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ گارڈز ہماری مدد کریں گے یا اپنے بچھی بھائیوں کی۔

"خبردار... خبردار۔" کئی آوازیں گونجیں۔

دو محافظوں نے میرے نیچے دبے ہوئے شخص کے سر سے رائفلیں لگا دیں۔ چند محافظوں نے عمران کا ہاتھ بٹایا اور دوسرے حملہ آور کو دبوچ لیا۔ لال بھون میں ہر طرف کھلبلی مچ گئی تھی۔ بتیاں روشن ہو رہی تھیں اور بھاگتے قدموں کی آوازیں آرہی تھیں۔ دونوں حملہ آوروں نے اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔ سیاہ رنگ کے ڈھاٹے ان کے چہروں سے علیحدہ کیے گئے، ہم نے پہچان لیا۔ یہ ہمارے محافظوں میں سے ہی تھے۔ ہم دن میں کئی بار انہیں اپنے آس پاس دیکھتے تھے۔ جس شخص کو میرا مکا لگا تھا، اس کے دہن کا کباڑا ہو گیا تھا۔ دونوں ہونٹ پھٹ گئے تھے اور دو تین دانت اپنی مقررہ جگہ سے غیر حاضر تھے۔

ہم پر گولی چلانے والا دراز قد محافظ پہلے تو سکتہ زدہ رہا پھر میری طرف رخ کر کے طیش میں چلانے لگا۔ "تم کو جندہ ناہیں چھوڑیں گے۔ ماریں گے تم کو۔ تم بچ جات... تم گندی نالی کے کیڑے۔ تم کو یہ جرأت ناہیں کرنے دیں گے، ناہیں کرنے دیں گے۔"

یقیناً وہ سابر کی لڑائی کا ذکر کر رہا تھا اور اپنی اس تکلیف کا اظہار کر رہا تھا جو راج بھون کے بلند و بالا دروازے کے سامنے میری "للکار" نے اسے پہنچائی تھی۔ محافظوں نے دونوں حملہ آوروں کی مشکیں کس دیں۔ اسی دوران میں منیجر مدن اور میڈم صفورا وغیرہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ میڈم سلیپنگ گاؤن میں تھی اور اس کے چہرے پر سخت الجھن تھی۔

"کیا ہو رہا ہے؟ واٹ از گوئنگ آن ہیئر؟" وہ گرجی۔

پھر چند ہی سیکنڈ میں ساری صورتِ حال اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ اگر محافظوں میں سے دو محافظ قاتل کا روپ دھار سکتے ہیں تو دو چار اور بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ضروری تھا کہ ہمیں فوراً موقع سے ہٹا لیا جاتا۔ اس نے ہمیں اپنے ساتھ لیا اور اپنے خصوصی پورشن میں لے آئی۔ یہ لگژری پورشن الیکٹرک ہیٹرز سے گرم تھا۔ "جب تک میں نہ کہوں، تم دونوں یہاں سے باہر نہیں نکلنا۔" وہ بولی۔

"آپ بے فکر رہیں۔" عمران نے اسے تسلی دی۔

وہ جلدی سے باہر چلی گئی۔

"یہ سب کیا ہے یار؟" میں نے عمران سے پوچھا۔

"اسے اردو میں شب خون اور انگریزی میں نائٹ اٹیک کہتے ہیں۔ فرانسیسی میں بھی اس کے لیے ایک بھلا سا لفظ ہے، اس وقت یاد نہیں آرہا۔"

"لیکن اس قاتلانہ حملے کا مقصد کیا تھا؟"

"اصل مقصد تو میڈم ہی ڈھونڈ کرائے گی۔ ہم تو بس اندازے ہی لگا سکتے ہیں۔ بظاہر تو یہی لگ رہا ہے کہ یہ لوگ تمہیں جارج گورا کے مدمقابل دیکھنا نہیں چاہتے۔"

"تمہیں پتا کیسے چلا کہ کوئی ہمارے کمرے کی طرف آرہا ہے؟"

"یارا میں نیوز چینل کا چڑیا ہوں۔ ایک تو چڑیا دوسرا نیم چڑھا۔ ہماری ناک بہت تیز ہوتی ہے بلکہ ہم تو مجسم ناک ہوتے ہیں۔ ان واقعات کی بو بھی سونگھ لیتے ہیں جن کی بو ہی نہیں ہوتی، یعنی جو وقوع پذیر ہی نہیں ہوتے لیکن جس تازہ واقعے کی تم بات کر رہے ہو، اس کا شک مجھے کل شام سے ہی تھا۔ دراصل بڑے پنڈت کا یہاں آنا اور میڈم سے مل کر تمہیں مقابلے سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ لوگ ہر صورت تمہیں سابر سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"تم نے سابر کی صورت ہی ایسی بنا دی ہے۔ اسے مرد و ہمدردی کی لڑائی کا ایک نعرہ دے دیا ہے اور یہ بات ہر جگہ پھیل بھی چکی ہے۔"

"اسے پھیلانے والے بھی تم ہی ہو۔ تم نے جان بوجھ کر گیتا کے سامنے بات کی۔ تم بڑے زبردست قسم کے کھوچل ہو عمران۔ میں اب آہستہ آہستہ تمہیں سمجھنا شروع ہو گیا ہوں۔"

"ایسے ہی موقع کے لیے محمد رفیع صاحب بڑے قصے کی بہت گہری بات کہہ گئے ہیں۔ تم نے بھی سنا ہوگا، میرے سامنے والی کھڑکی میں ایک چاند کا ٹکڑا رہتا ہے۔"

"یہ کیا بے تکی بات ہے؟"

"اور پھر بھی تم کہہ رہے ہو کہ آہستہ آہستہ مجھے سمجھنا شروع ہو گئے ہو؟ اس شعر میں چاند کے ٹکڑے سے مطلب انسان کے بیکار خیالات ہیں اور "کھڑکی" دماغ کا استخارہ ہے۔"

"یہ استخارہ نہیں استعارہ ہوتا ہے... اور اب تم چپ ہو جاؤ تو بہتر ہے۔"

میں اٹھ کر کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ ہم ایک خطرناک حملے سے بال بال بچے ہیں۔ یہ سب کھلی آنکھوں کے خواب جیسا لگ رہا تھا۔

میڈم کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ اس نے بتایا۔ "پکڑے جانے والے حملہ آوروں کے نام امرت اور شنکر ہیں۔ ان کے چار اور ساتھی بھی حراست میں لے لیے گئے ہیں۔ یہ سارے یہاں کے گارڈز ہیں۔"

"یہ سب کرایا کس نے ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"ابھی پورے یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر لگتا یہی ہے کہ اس کے پیچھے حکم جی کے کسی قریبی ساتھی کا ہاتھ ہوگا۔" آخری الفاظ کہتے کہتے میڈم نے اپنی آواز بہت دھیمی کر لی۔

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟" عمران نے پوچھا۔

"یہ لوگ ظاہر تو نہیں کر رہے لیکن اندر خانے ان کی مرضی یہی ہے کہ تمہارے اور جارج کے درمیان مرو یا مارو والی فائٹ نہ ہو۔ وہ شاید سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان کا اتنا قریبی دوست کسی ایسی لڑائی کا شکار ہو جائے... لیکن میں پھر کہتی ہوں، ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے یہ ان دو گارڈز کا انفرادی فعل ہی ہو۔ بہرحال یہ بات تو کنفرم ہے کہ تمہیں یہاں بہت زیادہ سیکیورٹی کی ضرورت ہے... اور میں اس سیکیورٹی کا ارجنٹ انتظام کر رہی ہوں۔"

ہم دونوں پر ہونے والے اس قاتلانہ حملے کی خبر بھی بہت جلد نرگاں میں پھیل گئی... اگلے روز دوپہر کے وقت میں اور عمران "جم" جانے کے لیے کمرے سے نکلے تو بڑی بڑی مونچھوں والے ایک سینئر گارڈ نے ہمیں روک لیا۔

"ناہیں سر!" اس نے ادب سے کہا۔ "اوپر سے آرڈر ہے۔ آپ ابھی کمرے سے ناہیں نکل سکتے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ میڈم کہاں ہیں؟" میں نے تنک کر پوچھا۔

"میڈم ابھی بھون سے باہر ہیں۔ وہ تھوڑی دیر میں آوت ہیں تو ان سے بات کر لیجیے گا۔" گارڈ بولا۔

"تم زیادہ تھانے دار بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں اپنی ذمے داری پر جا رہا ہوں۔"

"میں شما چاہت ہوں سرکار۔ یہ میری نوکری کا سوال ہے۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، آپ کی رکھشا کے لیے کر رہے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ میری اور سینئر گارڈ کی گفتگو تکرار کی شکل اختیار کرتی، گیتا بھی وہاں آگئی۔ وہ بہت چست لباس پہنے تھی اور اس کے جسم میں ماہر رقاصاؤں جیسا لوچ تھا۔ اس نے مداخلت کرتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ اندر آنے کے لیے کہا۔ میں اور عمران، گیتا کے ساتھ واپس کمرے میں آگئے۔ گیتا عمران سے خفا خفا نظر آتی تھی۔ اس کی وجہ وہی شیرین والا واقعہ تھا۔ اس دن وہاں بالکل "مقابلے" والا ماحول بن گیا تھا۔ مس انڈیا اور مسز پاکستان کے نعرے گونج رہے تھے۔ عمران کرتب دکھاتے ہوئے بلندی سے شیرین پر گرا تھا اور اسے زخمی کر دیا تھا۔ یہ بات اب تقریباً طے تھی کہ گیتا بھی اپنی ایک قیمتی شاگرد سے محروم ہو چکی ہے۔

کمرے میں آکر گیتا نے مجھے مخاطب کیا اور اپنے مخصوص بازاری انداز میں بولی۔ "اس بے چارے سے آپ کیوں مغز ماری کرت ہو۔ وہ آرڈر سے مجبور ہے۔ ابھی میڈم جی آجاوت ہیں، جو کہنا ہے ان سے کہہ لینا۔ بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ دونوں کا جیون بچ گیا۔ ویسے ابھی بھی خطرہ پوری طرح ٹلا نہیں۔ کل رات میڈم جی نے یہاں کے تقریباً سارے گارڈز تبدیل کر دیے ہیں۔ سات آٹھ بندوں کو پکڑا بھی گیا ہے۔"

"شہر کی کیا پوزیشن ہے؟" میں نے دبے لفظوں میں پوچھا۔

"آج تو میرا من بھی چاہ رہا ہے کہ لڑکیوں کی طرح آپ جناب سے آٹوگراف مانگوں اور سوال جواب کروں۔ رات والے واقعے کے بعد آپ کی شہرت میں ایک دم اضافہ ہوا ہے۔ ہر جگہ آپ ہی کا چرچا ہے۔ زیادہ تر لوگن کا یہی وچار ہے کہ راج بھون میں حکم جی کے کچھ ساتھی ناہیں چاہت ہیں کہ آپ جارج گورا سے دوبدو مقابلہ کریں۔ وہ یہ مقابلہ رکوانے کے لیے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ دوسری طرف راج بھون نے سختی کے ساتھ اس بات سے انکار کیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ دو تین لوگن کا ذاتی جرم ہے اور اس کا بوجھ دوسروں کے سر نہیں ڈالنا چاہیے۔ راج بھون کی طرف سے لوگن سے اور خاص طور سے مسلمان شہریوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ پرسکون رہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہووے گا، قانون قاعدے کے مطابق ہووے گا۔"

"مسلمانوں سے خاص اپیل کرنے کی ضرورت کیوں پڑی ہے؟" میں نے پوچھا۔

گیتا بولی۔ "سچی بات یہ ہے کہ جب سے جارج صاحب اور سلطانہ والا واقعہ ہوا ہے، مسلمان آبادی جارج صاحب کے خلاف ہے۔ اب انہیں پتا چلا ہے کہ سلطانہ کا پتی جارج صاحب سے دوبدو لڑائی کے لیے یہاں پہنچا ہے تو ان

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا جوش تازہ ہو گیا ہے اور پرانے زخم بھی ہرے ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں نے اس مقابلے کے ساتھ اپنی بہت سی آشائیں جوڑ لی ہیں۔ اگر تم یہاں زرگاں میں راتوں رات مشہور ہوئے ہو تو اس کا ایک کارن یہ بھی ہے۔ ان لوگوں کو پورا وشواس ہے کہ صورتِ حال میں ڈرامائی تبدیلیاں آنے والی ہیں۔ تمہارا جارج کے محافظوں کو ادھیڑ کر یہاں سے بھاگنا، پھر تل پانی میں پانڈے کو نیچا دکھانا، پھر یہاں آنا اور جارج صاحب کو للکارنا... اور آخر میں انہیں "مرد یا مارو" کا چیلنج دینا یہ ساری باتیں ان لوگوں کے لیے بڑے اچنبھے کی ہیں۔ ان کا یہ وچار پکا ہو رہا ہے کہ تمہارے کارن کوئی انہونی ہو گی۔"

"جارج گورا صاحب کیا فرماتے ہیں؟" عمران نے گیتا سے استفسار کیا۔

وہ عمران کو ناگواری سے دیکھ کر بولی۔ "گورا صاحب بہت غصے میں ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کی ساکھ خراب ہو رہی ہے۔ لوگ ان کو شکتی دیوتا کے نام سے یاد کرتے ہیں مگر اب اس طرح کی سوچ پھیل رہی ہے کہ شاید جارج صاحب خود بھی سامبر لڑنا نہیں چاہتے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ آج کا دن بہت اہم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شام سے پہلے جارج صاحب تمہارے چیلنج کے بارے میں کوئی واضح اعلان کر دیں۔"

"میرا چیلنج؟"

"ہاں، یہی مرد یا مارو والی بات۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسے قبول کر لیں اور اس شبھ گھڑی کا اعلان بھی کر دیں جو پنڈتوں نے نکالی ہے۔ اور بچی بات یہ ہے کہ جارج صاحب ایسے خطروں سے ڈرنے والے نہیں۔ تم وشواس رکھو کہ اگر تمہارا مقابلہ ہوا تو ایک دلیر آدمی سے ہوگا۔"

"دلیر نہیں گھمنڈی۔" میں نے کہا۔

"تم کچھ بھی کہہ لو لیکن یہ بات اپنی جگہ ٹھوس حقیقت ہے کہ یہاں جارج صاحب کے بے شمار پرستار بھی ہیں۔ اچھائیاں برائیاں تو ہر شخص میں ہوتی ہیں۔ جارج صاحب کی ایک بڑی اچھائی یہ ہے کہ وہ بڑے دل کے مالک ہیں۔ ان کے پاس دھن ہے اور وہ دھن کو خرچ کرنا بھی جانتے ہیں۔ زرگاں کے بے شمار لوگوں کو ان کی خیرات سے فائدہ پہنچتا ہے۔"

"تمہاری عقل کا ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے گیتا جی۔ تم جیسے ہندوستانی ہی ہیں جنہوں نے ہر دور میں باہر سے آنے والے زور آوروں کے سامنے سر جھکانے کی ریت نبھائی ہے۔

جس قوم کے پیر خیرات پہ زندہ ہو، یہ زنا کاریوں اور ہوس پرستیوں کا عوضانہ ہے اور یہ عوضانہ بھی تمہارے ہی خون پسینے کی کمائی سے دیا جاتا ہے۔ ان گوری چمڑی والوں کے لیے یہاں کے لوگ بھک منگوں اور بے غیرتوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ جو کچھ ان بھک منگوں اور بے غیرتوں کو دے رہا ہے، اس سے کہیں زیادہ وصول کرتا ہے اور اس کام میں تمہارا اکرم جی اس کا مددگار ہے۔"

میرے ان سخت ریمارکس پر گیتا جی نے ناراضی کا اظہار کیا لیکن نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس ناراضی کی تہہ میں کہیں میری دبی دبی تائید بھی موجود ہے۔

گیتا جی ایک چلتی پھرتی جہاندیدہ عورت تھی۔ اس نے جارج گورا کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ درست ثابت ہوا۔ شام سے پہلے ہی سرجن اسٹکل اپنے سالے جارج کی نمائندگی کرتے ہوئے لال بھون میں پہنچ گیا۔ وہ ہم سے انگلش میں بات کرتا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا۔ "جارج صاحب نے پنڈتوں سے مشورے کے بعد تمہارا چیلنج قبول کر لیا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ "مرد یا مارو" کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بہر حال، اس کے لیے چند چھوٹی چھوٹی شرطیں بھی ہیں۔"

"مجھے یہ شرطیں بغیر سنے منظور ہیں۔ مجھے بتاؤ مقابلہ کب ہے؟" میں نے اسٹکل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"پنڈت مہاراج نے دو شبھ گھڑیاں نکالی تھیں۔ ایک شبھ گھڑی تین ساتویں کے جشن کے روز آ رہی ہے۔ دوسری جشن کے تین دن بعد۔ مشورے سے فیصلہ ہوا ہے کہ تمہارے اور جارج صاحب کے درمیان سامبر کی رسم جشن کے بعد ہوگی۔ جشن کے تیسرے روز سورج ڈوبنے سے کوئی ڈیڑھ گھنٹا پہلے۔"

"یہ کس طرح کی لڑائی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"اس میں کوئی آتشیں ہتھیار استعمال نہیں ہوگا کیونکہ تمہاری خواہش کے مطابق یہ دست بدست لڑائی ہے۔ موقع پر تین یا چار تیز دھار آلے رکھے جائیں گے۔ جارج صاحب تمہیں پیشکش کریں گے کہ تم ان میں سے کوئی سا ایک آلہ لے کر ان سے لڑ سکتے ہو۔ تم جو آلہ چنو گے، جارج صاحب بھی اس جیسا آلہ استعمال کرنے کے حق دار ہوں گے۔" پھر سرجن اسٹکل نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ ان آلاتِ ضرب میں کٹاری، چاقو اور چھوٹے دستے کی کلہاڑی جسے مقامی زبان میں دتی کہا جاتا ہے، شامل ہوں گے۔

اسٹکل نے مجھے دیگر شرائط بھی بتائیں۔ ان میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ مرد یا مارو کی لڑائی کے باوجود جارج گورا کے پاس مجھے سزائے موت دینے یعنی سولی پر لٹکنے کا آپشن موجود رہے گا۔ اپنے جیتنے کی صورت میں جارج گورا مجھے موقع پر ختم کرنے کے بجائے سولی پر چڑھانے کا شوق پورا کر سکے گا۔

دیگر شرائط کی طرح میں نے یہ شرط بھی فوراً منظور کر لی... میں کشتیاں جلا چکا تھا، اب مجھے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا تھا۔ مجھے صرف جیتنا تھا اور جیتنا تھا... اور جب مجھے صرف جیتنا تھا تو پھر سزائے موت کا تذکرہ میرے نصاب سے باہر تھا۔ میں وجدانی جوش کے ایک ایسے دھارے میں بہا جا رہا تھا جس کے رخ اور بہاؤ کا خود مجھے بھی ٹھیک سے علم نہیں تھا۔ یہ ایک جنون تھا، دیوانہ پن تھا۔ یہ وہی ضد تھی جو شیشے کو پتھر سے ٹکراتی ہے اور پھر پتھر کو توڑنے کا عزم بھی رکھتی ہے۔

میں نے اسٹکل کی ساری باتوں کے جواب میں بس ایک ہی بات کہی۔ "میری صرف ایک ہی شرط ہے مسٹر اسٹکل اور یہ وہ شرط ہے جو جارج شروع میں ہی مان چکا ہے۔ میرے جیتنے کی صورت میں اسحاق کی بھاوج کو آزاد کر کے میرے حوالے کر دیا جائے گا اور مجھے تل پانی تک پہنچنے کا محفوظ راستہ دیا جائے گا۔"

"یہ بالکل طے ہے اور اس کی ضمانت اس تحریر میں بھی دی گئی ہے جو تمہارے اور جارج صاحب کے مقابلے کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔ اس پر اکرم جی، پنڈت مہاراج اور دیگر اہم لوگوں کی گواہی موجود ہوگی۔ مقابلے کے وقت اس تحریر پر تمہارے اور جارج صاحب کے دستخط بھی لیے جائیں گے۔"

ہماری اس گفتگو کے دوران میں میڈم صنوبر بھی موقع پر موجود رہی تھی۔ اسٹکل اور جارج کی موجودگی میں وہ بالکل مؤدب کھڑی رہتی تھی اور صرف اس وقت بولتی تھی جب اس سے کوئی سوال پوچھا جاتا تھا۔

رات کو میں سونے کے لیے لیٹا تو سلطانہ بڑی شدت سے یاد آنے لگی۔ اس کے گداز ہونٹ، اس کے گھنے بال اور سب سے بڑھ کر اس کی بڑی بڑی آنکھیں جن میں ہر وقت عجز و انکساری نظر آتی تھی اور میرے لیے غیر مشروط محبت و اطاعت چھلکتی رہتی تھی۔ میں اس سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ جارج گورا سے بدلہ لے کر آؤں گا یا پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ اور اس نے مجھے اشک بار آنکھوں سے رخصت کیا تھا اور کہا تھا... "میں تمہاری کامیابی کی دعا کروں گی میرو جی! اور یہ دعا بھی کروں گی کہ میری عمر تمہیں لگ جائے۔"

اب وہ یہاں سے طویل فاصلے پر اس مندر کے تہہ خانے میں تاؤ افضل، ہوشیار سنگھ اور آفتاب خاں وغیرہ کے ساتھ موجود تھی۔ مجھے معلوم تھا، وہ ہر گھڑی میرا انتظار کر رہی ہے۔ ہر آہٹ پر چونکتی ہے، ہر چاپ پر سراپا نگاہ بن جاتی ہے لیکن مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ میں سرخرو ہو سکوں گا یا نہیں... اور اگر سرخرو ہو گیا تو اس کے پاس جا سکوں گا یا نہیں... اور اگر چلا گیا تو کیا وہ مجھے اس مندر میں بخیر و عافیت مل پائے گی یا وہاں حالات بدل چکے ہوں گے؟ ان گنت سوالات تھے اور جواب کوئی نہیں تھا۔

مجھے نوری یاد آگئی۔ درحقیقت اس نے سلطانہ کو پھر سے میرے قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور اگر غور کیا جاتا تو یہ کردار بھی اصل میں عمران نے ہی ادا کیا تھا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے نوری کو میرے پیچھے لگایا تھا۔ وہ ہر گھڑی میرے اردگرد نظر آتی تھی اور اس کی وجہ سے سلطانہ کے اندر سوئی ہوئی عورت دھیرے دھیرے بیدار ہوئی تھی۔ بچے کی محبت نے اس عورت کو بیدار کرنے میں مزید مدد کی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا، ایک بار کم از کم ایک بار، سلطانہ کی آنکھوں کا سپنا ضرور پورا کر دوں۔ اس کی گود میں بالو ہو، اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہو۔ وہ میری طرف دیکھ کر شرمائے اور جب میں اسے چھوؤں تو اس پر وہ اذیت ناک کپکپی طاری نہ ہو جو اس کے جسم کا خون نچوڑ لیتی تھی۔

اس پر کیوں طاری ہوتی تھی وہ کپکپی؟ اس سوال کا جواب مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ اس کپکپی کا نقد جارج گورا تھا اور مجھے اسے مارنا تھا۔ اس کی خون آلود لاش کو اپنے پاؤں تلے روندنا تھا... اور پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر سلطانہ کو بتانا تھا کہ میں نے اس کی آن بان اور عزت کے ہتھیارے کے ساتھ کیا کیا ہے۔

ایک بار پھر میرے جسم میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ رگ پٹھوں میں ایک بے نام حرارت لہریں لینے لگی۔ میں ہمیشہ کی طرح بے چین ہو اٹھا۔ قالین سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر دروازے کی طرف بڑھا۔ آج سردی معمول سے بڑھ کر تھی۔ کبھی کبھی گرج چمک کا احساس بھی ہوتا تھا۔ میں راہداری میں پہنچا تو سینئر گارڈ جگ موہن نے مجھے روکا۔ "آپ کہاں جاوت ہیں سر؟"

"تم میری آیا مت بنو۔" میں پھنکارا۔ "مجھے اس چار دیواری میں گھومنے پھرنے کی آزادی ہے۔"

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یس سر... مدات تو اس سے؟

"میرے لیے رات دن برابر ہیں۔ تم پیچھے ہٹو۔ مجھے جم میں جانا ہے۔"

"جم میں؟ سر! یہ تو کوئی ٹائم نہیں ہے۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

یہی وقت تھا جب مجھے اپنے عقب میں عمران کی آواز سنائی دی۔ میرا یہ اندیشہ درست نکلا تھا کہ وہ سو نہیں رہا، بس یونہی آنکھیں بند کیے پڑا ہے۔ وہ گارڈ جگ موہن سے مخاطب ہو کر بولا۔ "دیکھو بھئی، آگ لگنے کا کوئی ٹائم نہیں ہوتا۔ بالکل جیسے زلزلہ کسی بھی وقت آسکتا ہے اور آندھی بھی چلنا شروع ہو جاتی ہے۔ تم ٹائم شائم کے چکر میں نہ پڑو۔ بڑے صاحب کو جانے دو جم میں۔"

"پیچھے ہٹو۔" میں نے گارڈ کو ایک طرف دھکیلا۔

"لیکن جناب! جم تو اس ٹائم بند ہے۔ تالے لگے ہوئے ہیں۔"

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

عمران بھی میرے ساتھ تھا۔ ہم نے دو دن پہلے پریکٹس کا ایک متبادل انتظام کر لیا تھا۔ پائیں باغ میں درختوں کے درمیان ایک کشادہ جگہ ہمارے کام آسکتی تھی۔ یہاں ہم نے ایک سینڈ بیگ لٹکوا دیا تھا اور کیکوس کا ایک بہت بڑا گدا بھی ڈلوا دیا تھا۔ اس گدے میں چاولوں کی چھال یعنی پرالی بھری ہوئی تھی۔

راہداری سے نکل کر ہم احاطے میں پہنچے اور پھر پائیں باغ میں داخل ہو گئے۔ کڑاکے کی سردی میں اس مصروفیت کا کوئی جواز تو نہیں بنتا تھا لیکن میں اپنے اندرونی اضطراب کا کیا کرتا۔ یہ مجھے کسی کروٹ چین لینے نہیں دے رہا تھا۔ کسی وقت تو مجھے لگتا تھا کہ اگر میرے اندر کی آگ کو کوئی ایندھن نہ ملا تو میں خود ہی اس میں جل کر بھسم ہو جاؤں گا۔

میں نے کہا۔ "یار عمران! مجھے تو اس ڈبل چارج کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے ہیں۔ تم پر کیا آفت آئی ہے؟ تم تو جا کر سو جاؤ۔"

"یہ تو وہی فلمی سچویشن ہے جگر! ستارو... تم تو سو جاؤ پریشان رات ساری ہے... اور جب رات پریشان ہے، تم پریشان ہو تو پھر میں کیسے آرام کر سکتا ہوں۔ لہٰذا جہاں گدھا وہیں رسی۔"

ہم دونوں باغ کے اس تنہا گنج میں چلے آئے۔ ہلکی دھند نے قرب و جوار کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ہوا تھمی ہوئی تھی مگر تاریک آسمان پر کالے بادل سے بجلی چمک جاتی تھی۔ ہماری حرکت کے ساتھ ہی گارڈز نے بھی حرکت کی تھی۔ وہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن یقینی بات تھی کہ وہ پائیں باغ کے ارد گرد منڈلا رہے ہیں۔ میں اور عمران پہلے شیڈو فائٹ کرتے رہے پھر سینڈ بیگ کے ساتھ مشغول ہو گئے۔ سینڈ بیگ کو قدرے نرم رکھنے کے لیے اس میں عموماً ریت کے ساتھ لکڑی کا باریک برادہ بھی بھرا جاتا ہے مگر اس بیگ میں صرف ریت ہی ریت تھی۔ یہ بہت ہارڈ تھا اور خالی ہاتھ اس پر مسلسل مکا بازی کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ہم لگے رہے۔ پھر عمران وقفہ لینے کے لیے بیٹھ گیا مگر میں بدستور مصروف رہا۔ دھم دھم کی آوازوں سے باغ کا وہ تنہا گوشہ گونجتا رہا۔ وہی جنون، وہی دیوانہ پن، وہی خواہش کہ جسم کو اتنی تکلیف پہنچے کہ وہ چیخ جائے۔ سانسوں کی کتار اتنی تیز ہو جائے کہ پھیپھڑے پھٹ جائیں اور برداشت کی وہ حد آئے کہ آنکھوں تلے اندھیرا چھا جائے۔ میں وقفہ نہ لوں بلکہ تھک کر گر جاؤں۔ جگی نے کہا تھا، پہلے اپنے آپ سے جنگ جیتنا پڑتی ہے اور جب یہ ہو جائے تو پھر کچھ بھی ناممکن نہیں رہتا۔ جو لوگ مجھے اس طرح اندھا دھند مشق کرتے دیکھتے تھے وہ کہتے تھے کہ میں بیمار پڑ جاؤں گا یا پھر کوئی ایسی چوٹ لگوا لوں گا کہ مجھے مارشل آرٹ وغیرہ سے کنارہ کشی اختیار کرنی پڑ جائے گی۔ ایسی باتوں میں یقیناً وزن تھا مگر میں جس راستے پر چل پڑا تھا، اس سے واپسی ممکن نہیں تھی۔ یہ ایک الگ راستہ تھا، یہ ایک جدا طرز تھی۔ اس میں وہ مزہ تھا جو کہیں نہیں تھا۔ اس میں سب سے پہلا حریف اپنا ہی نفس تھا۔ اس میں بہت تکلیف تھی لیکن اس تکلیف کو برداشت کرنے کے پیچھے ایک اسم اعظم بھی تھا اور وہ اسم اعظم یہ یقین تھا کہ اس تکلیف کا صلہ ملے گا... اس تکلیف کا صلہ ملے گا۔

ایک بار بادل زور سے گرجا اور پھر بارش ہونے لگی۔ میرے دہکتے ہوئے جسم پر یخ بستہ بوچھاڑ پڑی۔ "بس کر یار! باقی صبح سہی۔" عمران نے رائے دی۔

"تم نے جانا ہے تو جاؤ۔" میں نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔

عمران نے تکرار نہیں کی۔ وہ میرا مزاج شناس تھا۔ سمجھ گیا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ اس نے تیزی سے کانٹا بدلا۔ "اچھا ایسے تو ایسے ہی سہی۔" وہ اٹھا اور مجھ پر پل پڑا۔

ہم پرالی سے بھرے ہوئے گدے کے اوپر گرے اور ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی اندھا دھند کوشش کرنے لگے۔ بارش نے زور پکڑا۔ ہمیں سیکیورٹی گارڈز کے بھاگتے

قدموں کی آوازیں آئیں۔ وہ سایہ ڈھونڈنے کے لیے دائیں بائیں ہو رہے تھے۔ یہ بڑی مزے دار صورت حال تھی۔ جب سارا شہر گرم کپڑوں میں آتش دانوں اور انگیٹھیوں کے سامنے بھی سردی محسوس کر رہا تھا، ہم یخ بستہ بارش میں اپنا الگ ہی تماشا لگائے ہوئے تھے۔

میری اور عمران کی زور آزمائی میں پھر وہی فرق سامنے تھا۔ وہ مہارت اور تکنیک میں مجھ سے آگے تھا لیکن میں اپنی غیر معمولی برداشت اور اسٹیمنا کے سبب اس کو ٹف ٹائم دے رہا تھا۔ زوردار بارش میں ہماری یہ اندھا دھند کشتی دس پندرہ منٹ جاری رہی۔ ہماری قمیصیں تار تار ہو گئیں۔ اسی دوران میں اولے پڑنے لگے۔ فائبر کے قریبی شیڈ پر اولوں کے گرنے کی آواز بڑی زوردار تھی۔

عمران نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہم دونوں میں سے ایک ضرور شیطان ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے زور لگا کر اس کا "آرم لاک" توڑا اور اس کے اوپر آ گیا۔

"ہمیں کنکریاں ماری جا رہی ہیں۔" وہ بولا۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ "اور وہ دیکھو، اب ماجن بھی نظر آ رہی ہے۔"

میں نے عمران کو نیچے دبائے دبائے گھوم کر دیکھا۔ چند قدم کے فاصلے پر میڈم منور اپنی بڑے سائز کی کالی چھتری لیے کھڑی تھی۔ اس نے سفید گاؤن پہن رکھا تھا۔ وہ پکاری۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم لوگ اپنے ہوش میں تو ہو؟"

میں نے جو ایک سیکنڈ میڈم کو دیکھنے میں صرف کیا تھا، اس میں عمران نے اپنا کام دکھا دیا۔ اس نے جوڈو کی ایک فرشی تکنیک استعمال کرتے ہوئے ایک بار پھر مجھے اپنے بازو کے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا۔ اس بار بازو کے بجائے میری گردن گرفت میں آئی۔ اب وہ میرے نیچے ہونے کے باوجود مجھے بے بس کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ جب میں اس کی یہ غیر معمولی پھرتی اور مہارت دیکھتا تھا تو مجھے میڈم کی اس بات میں وزن محسوس ہونے لگتا تھا کہ میرے بجائے جارج کا مقابلہ عمران کو کرنا چاہیے تھا۔

میں اپنی گردن کو عمران کے بازو سے نکالنے کی تدبیر سوچ رہا تھا جب دفعتاً ژالہ باری تیز ہو گئی۔ ژالوں کا سائز بھی شاید بڑھ گیا تھا۔ اب کھلی جگہ پر ہونا خود کو زخمی کرنے کے مترادف تھا۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور بھاگتے ہوئے فائبر کے شیڈ کے نیچے آ گئے۔ ہمارے جسم کی خراشوں سے خون رس رہا تھا اور سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔

میڈم بھی چھتری سمیت شیڈ میں پہنچ گئی۔ کئی مسلح گارڈز بھی ہمارے ارد گرد آن موجود ہوئے۔ وہ بھیگے ہوئے تھے اور سردی میں نیلے پڑ رہے تھے۔ یقیناً دل ہی دل میں وہ ہمیں بددعاؤں سے نواز رہے ہوں گے۔

"یہ کیا حماقت ہے بھئی؟" میڈم نے غصے سے کہا۔ "تم لوگ مجھے مشکل میں ڈال دو گے۔ تمہاری سیکیورٹی اور صحت میری ذمے داری ہے اور تم لٹھ لے کر ان دونوں چیزوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ یہ کوئی بات ہے۔"

وہ غصے سے کانپ رہی تھی اور غالباً اس کپکپاہٹ میں کچھ عمل دخل سردی کا بھی تھا۔

"سوری۔" میں نے مختصراً کہا اور پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

عمران اور میڈم کچھ دیر وہاں کھڑے رہے پھر قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوا کہ وہ بھی میرے پیچھے آ رہے ہیں۔

کمرے میں پہنچ کر میڈم نے مجھے سیکیورٹی کے حوالے سے موجود خطرات سے آگاہ کیا اور تنبیہ کی کہ میں زیادہ سے زیادہ احتیاط برتوں۔ اس کی باتوں میں وزن تھا۔ اس گفتگو کے دوران میں عمران لباس تبدیل کر چکا تھا۔ میں نے بھی لباس تبدیل کیا۔ میڈم نے میرے منع کرنے کے باوجود آتش دان روشن کروایا اور ملازم سے کافی وغیرہ لانے کے لیے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم آتش دان کے سامنے بیٹھے کافی کی چسکیاں لے رہے تھے۔ اب رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ لگتا تھا کہ ہماری طرح ابھی میڈم بھی سوئی نہیں تھی۔ سلیپنگ گاؤن ضرور اس کے جسم پر تھا مگر چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک بستر سے دور تھی۔ اس نے بتایا کہ ساتویں کے جشن کے حوالے سے جو تیاریاں ہو رہی ہیں، وہ ان میں مصروف تھی اور ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے فارغ ہوئی ہے۔ ہم ساتویں کے جشن کے بارے میں بات کرتے رہے۔ پھر گفتگو کا رخ اس قدیم رسم ساہیر کی طرف مڑ گیا جس کے لیے شبھ گھڑی اب نکالی جا چکی تھی اور ہم دھیرے دھیرے اس شبھ گھڑی کی طرف سرک رہے تھے۔

میڈم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آؤ، میں تم دونوں کو کچھ دکھاؤں۔"

ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میڈم ہمیں لے کر ایک طویل قالین پوش راہداری سے گزری پھر لکڑی کے زینوں پر آ گئی۔ یہ زینے اوپر ایک گیلری میں

Digest Pakistan digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جا رہے تھے۔ شیشے کی رنگین کھڑکیوں سے باہر بارش اب ایک دھیمی ہموار رفتار سے برس رہی تھی اور گاہے بگاہے بجلی بھی چمک دکھا جاتی تھی۔ ہم ایک طویل گیلری میں پہنچے۔ گیلری کی چھت اونچی تھی اور یہاں اوپر تک لکڑی کی پالش شدہ الماریاں چنی ہوئی تھیں۔ یہ دراصل اس لال بھون کا شان دار کتب خانہ تھا۔

میڈم ایک الماری تک پہنچی اور اس نے کتابوں کے درمیان سے ایک بڑا سا البم نکال لیا۔ یہ دراصل سامبر کی مصور کہانی تھی۔ اس جہازی سائز کے البم میں ڈیڑھ دو سو تصویریں تھیں۔ اس میں سامبر کی تاریخ درج تھی اور پچھلے بیس پچیس سال میں جو اہم لڑائیاں ہوئی تھیں، ان کا باتصویر تذکرہ بھی تھا۔ زیادہ تر تصویریں کیمروں سے کھینچی گئی تھیں۔ کچھ ہاتھ کے بنے ہوئے اسکیچ بھی تھے۔ تصویروں کے ساتھ جو ٹیکسٹ تھا، وہ انگلش میں تھا اور وہ بھی ہر جگہ ہاتھ سے لکھا گیا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں راجواڑے کے اندر کتب یا اخبار وغیرہ چھاپنے کی سہولت موجود نہیں ہے۔

سویمبر اور سامبر کی تاریخ ہزاروں سال پرانی تھی۔ اس کے بارے میں اس البم کے اندر کافی کچھ لکھا گیا تھا۔ ماضی میں ہونے والے کئی سامبر مقابلوں کا ذکر بھی اس میں موجود تھا۔ شروع میں درج تھا۔ "کسی مطلوبہ شے کے لیے جانی کے درمیان زور آزمائی کرنے کا رواج اتنا ہی پرانا ہے جتنی اس زمین کی تاریخ۔ کہنے کو تو ہم سویمبر اور سامبر کو رسم کہتے ہیں لیکن یہ رسم نہیں ہے۔ یہ عین فطرت ہے... اور یہ فطرت انسان اور حیوان دونوں میں ایک جیسی ہے۔ مادہ کے حصول کے لیے نر جان دار ہمیشہ سے سویمبر رچاتے آئے ہیں۔ چرند، پرند، چوپائے درندے سب اس میں شامل ہیں۔ یہ جان دار اپنی مادہ کے حصول کے علاوہ علاقے اور خوراک وغیرہ کے لیے بھی دوبدو مقابلہ کرتے ہیں۔ زور آور اپنا مقصد پاتا ہے اور کمزور اپنی شکست تسلیم کر کے مزید نقصان اور خون خرابے سے بچتا ہے۔ یہ سب قدرت کے اصولوں کے مطابق ہے۔ اس تصویر کے نیچے پنسل سے بنا ہوا ایک اسکیچ تھا جس میں دو جوان بارہ سنگھوں کو ایک مادہ کے لیے اندھا دھند لڑتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔

اس طرح کی اور چھوٹی بڑی تصویریں اور تحریریں بھی البم میں موجود تھیں۔ ان میں سامبر کے مختلف طریقوں اور واقعات پر روشنی پڑتی تھی۔ کیمرے کی ایک بلیک اینڈ وائٹ فوٹو میں ٹھم کے ایک ماموں کو ایک مغویہ کے سلسلے میں ایک ڈکیت سے مقابلہ کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ یہ چھوٹی تلوار یعنی کٹاری کا مقابلہ تھا۔ دونوں حریفوں نے باقاعدہ زرہ بکتر پہنے ہوئے تھے۔ سروں کی حفاظت کے لیے آہنی ٹوپیاں تھیں۔ تصویر میں ٹھم کا گرانڈیل ماموں، ڈکیت کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا اور اس نے کٹاری اس کی گردن پر رکھی ہوئی تھی۔

میڈم نے بتایا۔ "یہ دیکھو، نیچے اس مقابلے کی تاریخ بھی درج ہے۔ 8 ستمبر 1938ء۔ ٹھم کا ماموں یہ "باؤٹ" جیت گیا تھا اور اس نے مغویہ لڑکی کو ڈکیت سے چھڑا کر اس سے باقاعدہ میرج کی تھی۔ اور یہ دیکھو، یہ تصویر۔" میڈم نے ایک اور فوٹو گراف کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں دو آدمی "ڈیول" کے انداز میں ایک دوسرے پر پستول سے گولی چلا رہے تھے۔ فوجی وردی والا شخص گولی چلانے میں پہل کر گیا تھا اور اس کا حریف زخمی ہو کر گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔

"یہ کون کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ٹھم جی کے والد رائے پرتاپ کا سیناپتی اشوکا اور ٹھم کا عسکری استاد اگنی راجپوت۔ دونوں کے درمیان ایک خوب صورت خانہ بدوش لڑکی کے لیے جھگڑا کھڑا ہوا تھا۔ اگنی اس لڑکی کی شادی اپنے چھوٹے بھائی سے کرانا چاہتا تھا جبکہ سیناپتی اسے خود اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ اس میں سیناپتی جیت گیا تھا۔"

"اور ٹھم کا استاد... اللہ کو پیارا ہو گیا؟" عمران نے پوچھا۔

"نہیں، وہ بھی زندہ بچ گیا تھا۔ دراصل سامبر میں اگر اس طرح کا مقابلہ ہو تو اس میں ربر کی گولیاں استعمال ہوتی ہیں۔ یہ صرف زخمی کرتی ہیں۔ سامبر اور سویمبر کی لڑائی عام طور پر حریف کو صرف زیر کرنے کے لیے لڑی جاتی ہے۔"

"سویمبر اور سامبر میں اصل فرق کیا ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"یہ پڑھو۔ یہ فرق یہاں لکھا ہے۔" میڈم نے تھوڑی سی ورق گردانی کر کے ایک تحریر عمران کو دکھائی۔

انگریزی میں لکھا تھا۔ "سویمبر کسی عورت کے لیے رچایا جاتا ہے۔ وہ کچھ خواہش مند لوگوں میں سے اپنے لیے شوہر چنتی ہے۔ یہ چناؤ عام طور پر جسمانی طاقت کے مقابلے سے ہوتا ہے۔ تاہم سامبر کا دائرہ وسیع ہے۔ اس میں عورت کے علاوہ جائداد، زیور یا کوئی بھی قیمتی چیز تنازعے کی وجہ ہو سکتی ہے اور اہم بات یہ ہے کہ سامبر کا مقابلہ صرف دو دعوے داروں کے درمیان نہیں ہوتا۔ دعوے داروں کی جانب سے کوئی بھی شخص اس رسم میں حصہ لے سکتا ہے۔ مثلاً ایک قیمتی

گھوڑے کی ملکیت پر کسی ادھیڑ عمر شخص کی طرف سے اس کا چھوٹا بھائی یا بیٹا سامبر میں حصہ لے سکتا ہے..."

تحریر میں اس حوالے سے اور بھی بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔

عمران نے پوچھا۔ "مرو یا مارو والی لڑائی اس سے پہلے بھی ہوتی رہی ہے؟"

"بالکل، ایسی مثالیں موجود ہیں۔ یہ دیکھو... یہ ایک تصویر۔" میڈم نے چند صفحات پلٹے۔

یہ ایک سنسنی خیز منظر تھا۔ رنگین تصویر تھی۔ نیچے تاریخ درج تھی۔ نو جنوری 1972ء۔ بڑی بڑی مونچھوں والا ایک انگریز، رقص کے انداز میں اچھل رہا تھا۔ اس کے قدموں میں ایک کالا بھجنگ مقامی پڑا تھا۔ اس تنومند مقامی شخص کے سینے میں دستے تک ایک خنجر پیوست تھا اور وہ جان کنی کے عالم میں تھا۔ میڈم بولی۔ "یہ پڑھو۔ مرنے والے کا ہم کمار ہے۔ یہ مقامی شکاری تھا۔ اس نے ٹھم جی کے والد کے مہمان مسٹر ڈی جون کو 'فائٹ ٹل ڈیتھ' کا چیلنج کیا۔ ڈی جون بھی ایک مشہور شکاری تھا اور گورشیروں پر ریسرچ کے لیے انڈیا آیا ہوا تھا۔ وہ اب بھی شاید زندہ ہے۔ دونوں میں ایک قیمتی باز کے حوالے سے جھگڑا ہوا تھا اور اس جھگڑے میں وقفے وقفے سے چار بندوں کا مرڈر بھی ہوا تھا۔ بالآخر بات سامبر تک پہنچی تھی۔ اس مقابلے نے بھی اسٹیٹ میں بہت شہرت پائی تھی۔ دراصل جب کبھی بھی کوئی 'مرو یا مارو' والا مقابلہ ہوتا ہے اس کو بہت شہرت مل جاتی ہے۔ اس مقابلے میں یہ انگریز شکاری ڈی جون جیت گیا۔ اس تصویر کے بعد بھی ڈی جون نے اپنے دم توڑتے حریف پر خنجر کے دس پندرہ وار کیے تھے اور اسے زخم زخم کر دیا تھا۔ وہ تصویر اس البم میں شامل نہیں ہے۔"

البم میں کچھ تصویریں چونکا دینے والی تھیں بلکہ ان کو شرمناک بھی کہا جا سکتا تھا۔ ان کی تعداد آٹھ دس ہو گی۔ "یہ تصویریں کیا ہیں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"اس کو راندی کہا جاتا ہے۔" میڈم نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"یہ مقامی زبان کا لفظ ہے۔ مطلب ہے لعنت بھیجنا۔ یہ سامبر کے طور طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔ یہ راندی ان لوگوں کے ساتھ کی جاتی ہے جو سامبر لڑتے ہیں اور اپنے مدمقابل سے بُری طرح ہار جاتے ہیں۔ بُری طرح ہارنے سے مطلب ایک خاص طریقے سے ہارنا ہے۔ یہ دیکھو، یہاں اس بارے میں تھوڑی سی تفصیل لکھی ہے... جب سامبر میں ایک حریف دوسرے کو اس طرح سے ہرائے کہ اس کے پورے بوجھ کو سر سے بلند کر کے اکھاڑے میں پٹخ دے تو وہ راندی کرنے کا حق دار ہوتا ہے اور یہ مقابلہ اس کے ساتھ ہی فوراً ختم بھی ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھو... میں تمہیں دکھاتی ہوں۔"

میڈم نے جلدی جلدی چند ورق پلٹے اور سامبر کا ایک منظر دکھایا۔ اس بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں ایک پہلوان نما شخص اپنے حریف کو باقاعدہ بازوؤں پر اٹھا کر زمین پر پٹخنے کی تیاری میں تھا۔

میڈم بولی۔ "سامبر میں اس داؤ کے چل جانے کو دوسرے حریف کی بدترین شکست سمجھا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف ہارتا ہے بلکہ راندی کا شکار بھی ہوتا ہے۔"

یہ اس ساری تفصیل کا ایک اور دلچسپ پہلو تھا اور کسی حد تک شرمناک بھی۔ ہم نے راندی زدہ افراد کی تصویریں دیکھیں۔ وہ مکمل برہنہ کر دیے گئے تھے اور جیتنے والا حریف ان کی پشت پر لات مار کر انہیں اکھاڑے سے باہر پھینک رہا تھا۔ دو چار تصویریں ایسی تھیں جنہیں دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ ہارنے والے کو گارڈز وغیرہ نے زبردستی برہنہ کیا ہے اور انہیں بازوؤں سے جکڑ رکھا ہے تاکہ جیتنے والا حریف ان کی ننگی پیٹھ پر لات رسید کرنے کی رسم ادا کر سکے۔

"زبردست۔" عمران نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ "میں جارج گورا کو اس حالت میں دیکھ کر بڑی خوشی محسوس کروں گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مرو اور مارو والی فائٹ میں بھی یہ رول لاگو ہوتا ہے؟"

"بالکل ہوتا ہے۔" میڈم نے کہا۔ "بلکہ اس سلسلے میں تمہیں مکمل معلومات ہونی چاہئیں۔ آئی تھنک، یہ ایک بہت خطرناک رول ہے۔ لڑائی کے کسی بھی مرحلے میں اگر تمہارا حریف تمہیں بازوؤں پر سیدھا اوپر اٹھا کر پٹخ دے تو سمجھو کھیل وہیں پر ختم ہو گیا۔ یعنی مرو یا مارو والی لڑائی بھی وہیں پر ختم ہو جائے گی اور پٹخا جانے والا حریف دفاع کے قابل بھی ہوا تو مکمل طور پر دوسرے حریف کے رحم و کرم پر آ جائے گا لیکن..." وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"لیکن کیا میڈم؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے مارشل آرٹ وغیرہ کی اتنی سمجھ بوجھ تو نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ حقیقی لڑائی میں کسی شخص کا اپنے جیسے مدمقابل کو بازوؤں پر اٹھا کر سر سے بلند کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ ایسا واقعہ شاذ و نادر ہی رونما ہوتا ہوگا۔" وہ سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھنے لگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

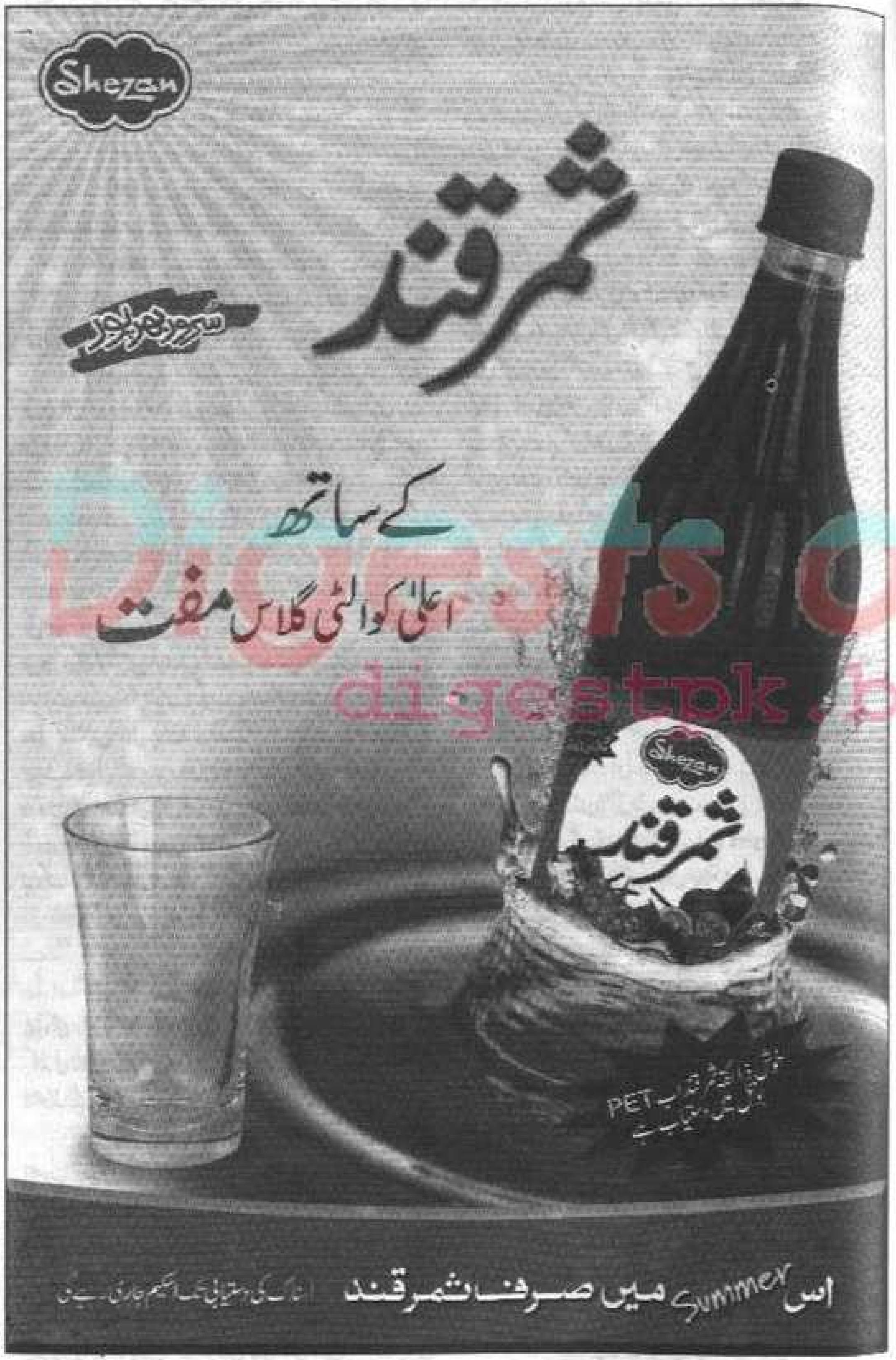

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' عمران نے تائید کی۔

''نورا کشتیوں کے سوا ایسا کبھی کبھار ہی ہو پاتا ہے… بہر حال، خطرہ تو خطرہ ہی ہوتا ہے اور اس خطرے کا ثبوت یہ آٹھ دس فوٹو گراف بھی ہیں۔''

''ہاں، میں تمہیں بتانا بھول گئی۔ جارج بھی کم از کم ایک بار تو یہ کارنامہ انجام دے ہی چکا ہے۔''

میڈم نے ورق گردانی کی اور ایک رنگین فوٹو گراف دکھایا۔ یہ قریباً تین برس پرانی تصویر تھی۔ اس لڑائی میں چھوٹے دستے کی کلہاڑیاں استعمال ہوئی تھیں۔ دونوں حریفوں نے زرہ بکتر جیسے لباس پہن رکھے تھے اور سروں پر آہنی ٹوپیاں تھیں۔ جارج نے اپنے مدِمقابل کو بازوؤں پر اٹھا کر سر سے بلند کر رکھا تھا اور اسے پٹخنے کے مرحلے میں تھا۔ ان کے اردگرد سیکڑوں پرجوش تماشائی نظر آ رہے تھے۔ جس کو اٹھایا گیا تھا، وہ تنومند شخص تھا۔ زرہ بکتر نما شے نے اسے مزید بوجھل کر رکھا تھا۔ اس منظر سے جارج کی غیر معمولی جسمانی طاقت کا سراغ بھی ملتا تھا۔ میڈم نے بتایا کہ اس شخص کو خاص طریقے سے ہرانے کے باوجود جارج نے اس کے ساتھ رذالت نہیں کی تھی۔ یعنی اسے کپڑے اتارنے پر مجبور نہیں کیا۔ ہاں، غصے کے اظہار کے لیے اس پر تھوکا تھا اور دھکا دے کر اکھاڑے سے باہر کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ یہاں نیچے درج ہے۔ ایسے ہی چھوٹے بڑے واقعات کی وجہ سے یہاں جارج کے پرستاروں کا حلقہ موجود ہے جو اسے شکتی دیوتا کا نام دیتا ہے۔''

لگتا تھا کہ میڈم نے اس ضخیم البم کے ٹیکسٹ کو کافی غور سے پڑھ رکھا تھا۔ اس نے ہمیں گراں قدر معلومات فراہم کیں۔

میڈم آج ہم دونوں کے ساتھ کافی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تو تمہارے اور جارج صاحب کے سامبر کے بارے میں سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ شبھ گھڑی بھی آ چکی ہے لیکن پتا نہیں کیوں کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ شاید یہ لڑائی نہ ہو سکے یا اس میں کوئی اور رکاوٹ آ جائے۔ بس ایک خیال سا ہے میرا۔''

''خیال کی کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہے میڈم؟'' عمران نے کہا۔

اس نے سگریٹ سلگایا اور عمران کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تمہیں اتنی انفارمیشن دیں، اتنا کچھ بتایا لیکن تم دونوں بہت کچھ چھپاتے ہو اور چھپا رہے ہو۔''

''آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں میڈم؟'' عمران نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر گہرا کش لے کر بولی۔ ''مجھے ایک بات سچ سچ بتانا… کیا اس دن تم کرتب دکھاتے ہوئے واقعی گرے تھے یا یہ ایک ڈراما تھا؟''

عمران ٹھٹکا پھر سنبھل کر بولا۔ ''آپ کے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا؟''

''ثمرین جو زخمی ہوئی ہے۔ سلطانہ کی بھابی بننے والی تھی۔ یقیناً تم دونوں کے دلوں میں اس کے لیے نرم گوشہ ہو گا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے ''فیری سلیکشن'' سے بچانے کے لیے تم نے اسے زخمی کیا ہے؟''

میڈم ایک نہایت جہاندیدہ عورت تھی۔ ہمیں پہلے ہی شبہ تھا کہ اس کا دھیان ضرور اس طرف جائے گا۔ اب اس بات کو چھپانا میڈم سے فاصلہ بڑھانے کے مترادف تھا اور ہم یہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ تھوڑے سے تذبذب کے بعد عمران نے یہ بات تسلیم کر لی۔ میڈم نے خفگی کا اظہار کیا۔ اس نے کہا۔ ''یہ بڑی خطرناک حرکت تھی۔ اگر کسی کو ذرا سا شبہ بھی ہو جاتا کہ جان بوجھ کر ایسا کیا گیا ہے تو تمہارے ساتھ ساتھ ثمرین بھی سخت مصیبت کا شکار ہوتی۔ اب بھی کیتا اور میجر مدن وغیرہ کو غفلت کا الزام دیا جا رہا ہے اور ان سے سخت باز پرس ہوئی ہے۔ یہاں کی سزائیں بڑی سخت ہیں۔ تمہیں وہ ورزن کے انجکشن والی بات یاد ہے نا؟ یہ ثمرین جیسی لڑکی تو اتنی دوا کی ہلکی سی ڈوز بھی برداشت نہیں کر سکتی۔''

کچھ دیر اس بارے میں بات ہوتی رہی۔ پھر میڈم کی ناراضی کم ہو گئی اور وہ نارمل نظر آنے لگی۔ وہ نارمل ہو گئی تو میں نے پوچھا۔ ''آپ ابھی یہ کیوں کہہ رہی تھیں کہ سامبر کی لڑائی میں اب بھی رکاوٹ ہے؟''

وہ چند لمحے توقف کر کے بولی۔ ''کل ایک بڑھیا حکم جی کی کچہری میں پیش ہوئی ہے۔ مجھے پوری بات کا تو پتا نہیں۔ سنا ہے، اس نے حکم جی کے سامنے واویلا کیا ہے اور کہا ہے کہ سلطانہ اور اس کا پتی دھرم ورودھی ہیں۔ ان مہاپاپیوں کو کسی بھی رسم یا شرط وغیرہ کی آڑ میں معاف نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کہتی ہے کہ میں نے ان دھرم ورودھیوں کی سزا کی خاطر اپنا بیٹا اور بہو قربان کیے ہیں۔ اپنے پوتے کے سہارے سے محروم ہوئی ہوں، وغیرہ وغیرہ۔''

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ دھیان فوراً مالا کی دادی ساس یعنی ستیش کی کھوسٹ دادی کی طرف چلا گیا جو

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دقیانوسیت اور توہم پرستی میں اپنی مثال آپ تھی۔ اس کے ساتھ ہی فتح پور کے مندر میں پیش آنے والے خونی واقعات بھی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ ان واقعات کے بعد تیشؔ مالا اور اس کی دادی ساس اچانک ہی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

”یہ بڑھیا کون ہے؟“ میں نے اپنی اندرونی کیفیت چھپاتے ہوئے میڈم سے پوچھا۔

”ابھی مجھے ٹھیک سے پتا نہیں لیکن سنا یہی ہے کہ تل پانی سے آئی ہے۔ میں صبح اس بارے میں انفارمیشن لوں گی۔“

ہم جب اپنے کمرے میں واپس پہنچے تو عمران گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”تابش! میں اپنی پہلے دن والی رائے پر قائم ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ تم نے راج بھون کے سامنے جا کر اور جارج کو للکار کر جلد بازی کی ہے۔ میں اسے بہادرانہ بے وقوفی کہوں گا۔ پہلے تو اس بات میں بھی ابھی تک شبہ موجود ہے کہ جارج کے ساتھ تمہارا ”مرو یا مارو“ والا دوبدو مقابلہ ہوگا لیکن اگر یہ مقابلہ ہو بھی گیا تو اس کے بعد کی صورتِ حال واضح نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم جیت گئے تو ہمیں خراماں خراماں واپس تل پانی جانے کی اجازت دے دی جائے گی... خدانخواستہ دوسری صورت ہوئی تو تمہیں سولی پر لٹکا کر قصہ ختم کر دیا جائے گا... لیکن میرے خیال میں یہ دونوں کام مشکل ہیں۔ ہار یا جیت، دونوں ہی صورتوں میں تمہارے لیے سلطانہ والا مسئلہ وہیں رہے گا۔ اس کے بارے میں تم سے معلومات حاصل کیے بغیر یہ لوگ تمہیں نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیں گے۔“

”لیکن جارج علی الاعلان یہ ”کمٹمنٹ“ کر چکا ہے۔“

”اس کمٹمنٹ کی چولیں ہلانے کے لیے یہ پنڈت پجاری وغیرہ جو موجود ہیں۔ جس طرح یہ اپنے مطلب کی کنڈلی نکال لیتے ہیں، اسی طرح ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل بھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔“

”لیکن ابھی تک پنڈت مہاراج نے تو کسی حد تک اصول پسندی دکھائی ہے۔ اس نے منصف کے طور پر ایک ایسا فیصلہ دیا ہے جو بہت سے لوگوں کو پسند نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے، میری اور جارج کی ”مرو یا مارو“ والی فائٹ کروانے کا فیصلہ۔“

”ہاں، یہ تو ہے لیکن ہو سکتا ہے اس میں وہ دیگر پنڈتوں اور پوتھیوں، شاستروں میں لکھی ہوئی تحریروں کی وجہ سے مجبور ہو گیا ہو۔ پھر بھی اس نے اندر خانے تمہیں تمہارے مطالبے سے ہٹانے کی کوشش تو کی۔“

ہمارا خیال تھا کہ اگلے روز میڈم راج بھون سے بڑھیا کے بارے میں کوئی خبر لائے گی لیکن ہوا یہ کہ خود ہمیں ہی راج بھون سے بلاوا آ گیا۔ میں اور عمران اس وقت ثمرین کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ وہ ابھی ہمارے سامنے سے گزر کر اندرونی پورشن کی طرف گئی تھی۔ وہ قدرے کمزور نظر آتی تھی۔ عمران کی تلوار سے لگنے والا زخم اس کی گردن سے شروع ہو کر کان کی لوتک چلا گیا تھا۔ سات آٹھ ٹانکے لگے تھے۔ اب پٹی کھل چکی تھی تاہم اب بھی زخم پر کوئی دوا لگی ہوئی تھی۔ اس زخم نے اس کے حسن کو گہنایا تھا مگر اس کی آبرو کو ایک فوری خطرے سے محفوظ کر دیا تھا... اور داغ تو چاند کے چہرے پر بھی ہوتے ہیں۔ مجھے اور عمران کو یقین تھا کہ ثمرین موجودہ صورتِ حال سے خوش ہو گی۔ ہمیں پتا چلا تھا کہ اسے ایک دو دن میں ہی اس کے گھر واپس بھیج دیا جائے گا۔ میں سوچنے لگا، کیا مستقبل قریب میں ایسا ہو سکے گا کہ ثمرین اور سلطانہ کے بھائی نبیل کو ان کی کھوئی ہوئی محبت مل سکے؟

ہم ثمرین کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے جب میڈم مظفری ہمارے کمرے میں آئی اور اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ تمہیں دربار میں بلایا گیا ہے۔“

”دربار میں؟“

”ہاں، حکم جی نے تمہیں راج بھون میں بلایا ہے۔ بس آدھ گھنٹے کے اندر ہمیں وہاں حاضر ہونا ہے۔“

”خیریت تو ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

”یہ تو وہاں جا کر پتا چلے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اسی برہمن بڑھیا والا معاملہ ہو یا کوئی اور پرابلم ہو سکتا ہے۔“

عمران نے پوچھا۔ ”کیا میں بھی ساتھ جا سکتا ہوں؟“

”تم کس حیثیت سے جاؤ گے؟“

”آپ کے گارڈ کے طور پر جا سکتا ہوں۔“

”دیکھو، کہیں مروا نہ دینا۔ مجھے سب سے بڑا اندیشہ یہی ہے کہ کہیں تمہارے اور تابش کے درمیان کسی طرح کا تعلق ثابت نہ ہو جائے۔“

”اس بارے میں آپ بالکل بے فکر رہیں۔“ اس نے میڈم کو یقین دہانی کرائی۔

☆☆☆

اور اب میں راج بھون کی عظیم الشان عمارت کے اندر حکم کے پُرشکوہ دربار میں تھا۔ یہ دربار جدید اور قدیم آرائش کا خوب صورت امتزاج تھا۔

مجھے ایک بند گھوڑا گاڑی میں محافظوں کے کڑے حصار میں یہاں تک لایا گیا تھا۔ میڈم اور عمران وغیرہ دوسری گھوڑا گاڑی میں یہاں تک پہنچے تھے۔ محافظوں کی ایک کھلی چھت والی جیپ ہمارے ساتھ ساتھ رہی تھی۔ بلند و بالا چھت والے شان دار دربار کے اندر کھڑے ہو کر میں خود کو کسی قدیم داستان کا حصہ محسوس کرنے لگا۔ سامنے ایک زرنگار چبوترے پر ایک بہت بڑی منقش کرسی رکھی تھی۔ اس پر سونے کے پترے جڑے تھے اور قیمتی پتھر دمک رہے تھے۔ یقیناً یہ حکم جی کی نشست تھی۔ اردگرد آٹھ دس مزید کرسیاں موجود تھیں۔ ان پر مصاحبین بیٹھتے ہوں گے۔ ابھی یہ ساری نشستیں خالی تھیں تاہم دربار میں کافی افراد نظر آ رہے تھے۔ مجھے بھی زرنگار چبوترے کی ایک جانب نشست پر بٹھا دیا گیا۔ دربار میں موجود اکثر افراد کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں ان کے لیے یقیناً ایک دلچسپ چیز تھا۔ ایک ایسا شخص جو کچھ عرصہ پہلے تک مفلوج و معذور سمجھا جاتا تھا، اب ایک نئے روپ میں ان کے سامنے آیا تھا۔ اس کی ساری ہیئت ہی تبدیل ہو چکی تھی۔ یہ سب کچھ داستانی نہیں محض حقیقت تھا اور پچھلے چند دنوں میں کئی جگہ اس کا ثبوت مہیا کر چکا تھا۔

کچھ دیر بعد زرنگار چبوترے کی اداسی ختم ہو گئی۔ ایک عقبی دروازے کا مخملی پردہ حرکت میں آیا اور حکم جی پورے کروفر کے ساتھ نمودار ہوا۔ میں پہلی بار اسے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ درمیانی عمر کا تھا۔ رنگ گندمی اور سر پر ایک تاج نما پگڑی تھی۔ ایک قیمتی کام دار چغا اس کے پاؤں تک پہنچ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے اپنے چہرے پر روحانیت طاری کرنے کی شعوری کوشش کر رکھی ہے۔ اس نے آنکھیں نیم وا کر رکھی تھیں اور ناپے تلے قدموں سے اپنی طلائی کرسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تمام درباری کھڑے ہو گئے اور رکوع کے بل جھک کر اسے تعظیم پیش کی۔ اس نے ہاتھ کے مدبرانہ اشاروں سے لوگوں کو بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں نے بھی بیٹھنا چاہا مگر ایک گارڈ نے مجھے کھڑا رہنے کی ہدایت کی۔

حکم جی کے ساتھ کوئی ایک درجن مصاحبین بھی تھے۔ ان میں سے کچھ چبوترے پر رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور کچھ چبوترے کے سامنے پہلی قطار میں۔ چبوترے پر بیٹھنے والوں میں حکم کی تین بیویاں یعنی رانیاں شامل تھیں۔ ان میں ایک مہارانی رتنا دیوی تھی۔ اس کا حسن آنکھیں چندھیا دینے والا تھا۔ یہی رتنا دیوی تھی جس سے جھگڑا کر کے سلطانہ زرگاں سے فرار ہو گئی تھی۔

حکم کے ساتھ جلوہ افروز ہونے والوں میں مجھے ایک جانی پہچانی صورت بھی دکھائی دی۔ یہ جارج کی بہن ماریا تھی۔ وہ ایک لمبے انگریزی اسکرٹ میں تھی۔ ہاتھوں پر سفید دستانے تھے۔ شاید یہ دستانے انگلی کا عیب چھپانے کے لیے پہنے گئے تھے۔ کٹی ہوئی انگلی کی جگہ نقلی یا کوئی ”پیکنگ“ وغیرہ رکھ کر اسے برابر کر لیا گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میری اور ماریا کی نظریں ملیں۔ ایک بجلی سی کوند گئی۔ وہ سارے منظر میرے ذہن میں بھی تازہ ہو گئے جن کا تعلق ماریا کے اغوا اور دیگر واقعات سے تھا۔

حکم جی دیگر حاضرین کی طرح مجھے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بارعب آواز میں کہا۔ ”کیا تم ہمارے ایک دو سوالوں کے جواب دینا پسند کرو گے؟“

”فرمائیں۔“

”کہا جا رہا ہے کہ جب تم جیل سے فرار ہو کر تل پانی پہنچے تو تمہارے ساتھ ایک قریب المرگ شخص بھی تھا جس کا ایک بازو اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی؟“

میں نے ٹھہرے ہوئے بے باک لہجے میں کہا۔ ”حضرت مآب! پہلی بات تو یہ ہے کہ میں جیل سے نہیں، جارج کے گھر سے فرار ہوا تھا۔ جیل میں تو مجھے ایک گھنٹے سے زیادہ رکھا ہی نہیں گیا تھا اور دوسری بات یہ کہ جس قریب المرگ شخص کی بات آپ کر رہے ہیں، آپ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس کا نام باروندا جنگلی تھا اور وہ ”قریب المرگ“ بھی آپ کے دوست جارج کی وجہ سے ہوا تھا۔“

”سر جارج کا نام احترام سے لو۔“ چبوترے پر براجمان ایک فربہ شخص نے گرج کر کہا۔

”میرے دل میں جس کے لیے احترام نہیں، میں اپنی زبان پر اس کے لیے احترام کیسے لا سکتا ہوں؟ اور دوسری بات یہ جناب عالی کہ اس وقت ہم دونوں کے درمیان سا ہبر کی لڑائی طے ہو چکی ہے۔ اس رو سے ہم دونوں صرف حریف ہیں اور حریفوں کا درجہ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔“

فربہ شخص نے مزید مشتعل ہو کر کچھ کہنا چاہا لیکن حکم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ”تم باروندا کے قریب المرگ ہونے کی بات تو کرتے ہو لیکن یہ نہیں جانتے کہ اس کا پاپ کتنا بڑا تھا۔ اس نے شاہی پریوار کی عزت پر ڈاکا ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ بہرحال، ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ ہم صرف یہ

Digest of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا واقعی تم باروندا جنگی کے شاگرد ہو؟ کیونکہ یہاں کچھ لوگ یہ بات بڑے وشواس کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "آپ کس حوالے سے شاگردی کی بات کر رہے ہیں؟"

"تمہارا رہن سہن... تمہارا برتاؤ... تمہارے لڑنے کا انداز... اور اس جیسی دوسری چیزیں۔"

"میں خود کو اس بہت بڑے شخص کا شاگرد کہلوانے کا حق دار تو نہیں سمجھتا لیکن میں مانتا ہوں کہ میں نے اس سے تھوڑا بہت سیکھا ضرور ہے۔"

"سنا ہے کہ درد کے حوالے سے تمہارا کوئی خاص فلسفہ ہے اور تم خود کو آرام و آسائش سے دور رکھ کر اور جسمانی اذیتیں دے کر خوش ہوتے ہو؟"

"اس میں خوش ہونے والی تو کوئی بات نہیں۔ بس میں برداشت بڑھانے کی اپنی سی کوشش کرتا ہوں۔"

"اس چکر میں بھی تمہیں باروندا نے ہی ڈالا ہے؟"

"آپ اسے چکر کہہ لیں لیکن میرے نزدیک یہ بھی جینے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے... ایک طرزِ حیات۔ میرا مذہب مجھے ایسے ہی سادہ اور پُرمشقت زندگی کی تلقین کرتا ہے۔ کم کھانا، کم سونا، خود کو زیادہ آسائشوں اور نفسانی لذتوں سے حتی الامکان دور رکھنا، یہ سب کچھ تو کوئی بھی شخص اپنا سکتا ہے۔ آپ بھی اپنا سکتے ہو لیکن اس کے لیے اندر کی جرأت درکار ہے۔"

"اپنا لہجہ درست رکھو۔" فربہ شخص ایک بار پھر گرجا۔

حکم نے اسے دوبارہ ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔

مجھے گھورتے ہوئے حکم نے اپنی بات جاری رکھی اور بولا۔ "اپنے مذہب پر بہت اتراتے ہو تم لوگ اور ہر جگہ اس کی مثالیں بھی دیتے ہو لیکن جب پڑھے لکھے لوگوں میں بیٹھ کر تمہیں اپنے وچاروں کا دفاع کرنا پڑتا ہے تو اکثر تم سپھل (کامیاب) نہیں ہو پاتے۔ خاص طور سے جب تم لوگوں کی انتہاپسندی اور دہشت گردی کی بات ہوتی ہے۔"

مجھے اپنے اندر آگ کی تپش محسوس ہوئی۔ میں نے جلتے لہجے میں کہا۔ "مسلمانوں پر انتہاپسندی کا لیبل لگانا آج کی دنیا کا فیشن بن چکا ہے اور آپ جیسے کچھ لوگ اس میں پیش پیش ہیں۔ ورنہ انتہاپسندی کس مذہب اور قوم میں موجود نہیں۔"

"یہ بڑا گھسا پٹا جملہ بولا ہے تم نے... یہ اپنی حیثیت کھو چکا ہے۔ اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں تمہاری انتہاپسندی کی ایک چھوٹی سی جھلک دکھا سکتا ہوں؟" حکم نے کہا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے استفسار کیا۔

حکم نے اپنی دائیں جانب دیکھ کر ایک سینئر گارڈ کو اشارہ کیا۔ وہ ادب سے سر جھکا کر الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور پھر گھوم کر باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور اس کے ساتھ مجھے دو جانے پہچانے چہرے دکھائی دیے۔ میں ششدر رہ گیا۔ ایک منحوس چہرہ تو رنجیت پانڈے کا تھا۔ وہ وردی میں ملبوس تھا۔ اس کے سیاہی مائل چہرے پر اس کی سرخی مائل آنکھیں دہکتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کی اور میری نگاہیں بس ایک ثانیے کے لیے ملیں۔ اس ایک ثانیے میں وہ ساری نفرت اور کدورت جاگ گئی جو میرے اور رنجیت کے درمیان موجود تھی۔ مجھے لگا جیسے اس نے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہا۔ "بچہ... آخر اونٹ پہاڑ کے نیچے آ گیا نا۔ اب تو ہمارے رحم و کرم پر آنے والا ہے۔ اگلی پچھلی ساری کسریں نکلنے والی ہیں۔"

رنجیت کے ساتھ جو دوسرا چہرہ تھا، اسے دیکھ کر مجھے زیادہ حیرانی ہوئی۔ مجھے اپنی نگاہ پر بھروسا نہیں ہوا۔ یہ سلطانہ کا گونگا ملازم ہاشم عرف ہاشو تھا۔ میں اسے گل پانی کی شاہی رہائش گاہ "دیوان" میں چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ ملازمہ صفیہ کے ساتھ مل کر ہمارے بچے بالو کی دیکھ بھال بھی کر رہا تھا۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ میں ہاشو کو یہاں دیکھوں گا اور وہ بھی اس حالت میں۔ ہاشو کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں اور اس کے ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے قدرے فربہ چہرے پر گہرے نیل نظر آ رہے تھے۔ سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پینتیس چالیس سالہ ہاشو لاچاری کی تصویر نظر آتا تھا۔ ایسے شخص کے ساتھ یہ سلوک سمجھ سے باہر تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے تقریباً چلّا کر پوچھا۔

"یہ تم لوگوں کی امن پسندی، شانتی اور پریم کا شاہکار ہے۔" حکم کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"کیا جرم کیا ہے اس نے؟"

"کوئی ایک جرم ہو تو تمہیں بتایا جاوے۔ یہ ایک لمبی لسٹ ہے اور اگر یہ دو دن پہلے گل پانی سے پکڑا نہ جاتا تو یہ لسٹ اور بھی لمبی ہو جانی تھی۔"

حکم نے رنجیت کو اشارہ کیا کہ وہ ہاشو کے بارے میں بتائے۔ رنجیت نے کہا۔ "یہ شخص بہت پرانا ہندو دشمن ہے۔ آج کل بھی یہ ایک بہت بڑے جرم کا تانا بانا بُن رہا تھا۔ اگر

ہمارے مخبر بروقت کھوج نہیں لگا لیتے تو بہت جیادہ نقصان ہو جاتا تھا...."

حکم نے گونگے ہاشو سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا تم خود اپنے اس شان دار ارادے کے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گے؟"

ہاشو کچھ دیر تک جلتی نظروں سے حکم کو گھورتا رہا پھر گرج کر بولا۔ "اگر خدا کے دشمنوں کو مارنا ارادہ ہے تو ہم یہ ارادہ کرتے رہیں گے۔ اپنی آخری سانس تک... خون کے آخری قطرے تک۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ ہاشو بول رہا تھا۔ اس کی غضب ناک آواز دربار میں گونجی اور بجلی سی چمک گئی۔ "خدا کی اس زمین سے ناپاک لوگوں کے وجود کو ختم کرنا ایک ایسا کام ہے جس کے لیے میرے جیسی سیکڑوں زندگیاں خوشی سے قربان کی جا سکتی ہیں۔ مجھے اگر سو بار بھی زندگی ملے تو میں سو بار اسی کام پر نثار کر دوں گا۔"

ہاشو کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور اس کا سینہ پھیل کر چوڑا ہو گیا تھا۔

حکم بولا۔ "کیا تمہیں جانکاری ہے کہ تم جو کام کرنے جا رہے تھے، اس میں سیکڑوں لوگ مارے جاتے؟ ان میں عورتیں، بوڑھے اور معصوم بچے بھی شامل ہوتے اور ہو سکتا ہے کہ کچھ مسلمانوں کے پران بھی چلے جاتے۔"

ہاشو نے پلٹ کر رنجیت پانڈے کی طرف دیکھا اور گرجا۔ "اور اس کتے نے کچھ دن پہلے دیوان میں جو بم پھوڑا تھا، کیا اس میں بے گناہ لوگوں کی جانیں نہیں گئی تھیں؟"

پانڈے نے ایک زوردار تھپڑ ہاشو کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر اگلی نشستوں پر جا گرا۔ دو تین محافظ اس پر ٹوٹ پڑے اور بے دریغ اسے مارنے لگے۔ چند ہی لمحوں میں ہاشو کے ناک منہ سے خون چھوٹ گیا اور وہ نیم جان ہو گیا۔

اس حالت میں بھی وہ پکار رہا تھا۔ "کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔ ہر کافر کو مار دیں گے۔ پورے راجواڑے کو آگ لگا دیں گے...."

پانڈے اور اس کے ساتھیوں نے فرش پر گرے ہوئے ہاشو کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تاکہ وہ بدزبانی نہ کر سکے۔ حکم جی نے پانڈے کو اپنے قریب بلا کر کچھ کہا۔ وہ تیزی سے باہر گیا اور پھر پولی تھین کا ایک لفافہ لے کر واپس آیا۔ اس میں ایک نیلگوں پاؤڈر سا تھا۔ اس کا وزن آدھ کلو سے کچھ ہی کم ہوگا۔ یہ ویسا ہی پاؤڈر تھا جیسا سلطانہ کے پاس سے نکلا تھا۔ اس پاؤڈر میں نیلے تھوتھے کی آمیزش تھی اور

نظمِ راشد

ایک روز منٹو صاحب بڑی تیزی سے ریڈیو اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہو رہے تھے کہ وہاں برآمدے میں مڈگارڈوں کے بغیر ایک سائیکل دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے رک گئے اور پھر دوسرے ہی لمحہ ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں مسکراہٹ کی ایک چمک دوڑ گئی اور وہ چیخ کر کہنے لگے۔

"راشد صاحب! راشد صاحب! ذرا باہر تشریف لائیے۔" شور سن کر ن م راشد کے علاوہ کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک اور ریڈیو اسٹیشن کے دوسرے کارکن بھی ان کے گرد جمع ہو جائے۔

"راشد صاحب! آپ دیکھ رہے ہیں اسے۔" منٹو نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بغیر مڈگارڈوں کی سائیکل، خدا کی قسم! سائیکل نہیں بلکہ حقیقت میں آپ کی کوئی نظم ہے۔"

عمیر احمد، لاہور

پاؤڈر کی وہ پڑیا اب بھی میرے سامان میں موجود تھی۔

حکم کے اشارے پر پانڈے نے وہ پاؤڈر مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ "جب ہمارے مخبروں نے اسے گل پانی کے ایک مندر کے پاس سے پکڑا تو اس پیکٹ جیسے تین پیکٹ اس کے پاس موجود تھے۔ یہ کالی کے مندر میں بٹنے والے پرشاد کے اندر یہ جہر ملا چکا تھا۔ ابھی اسے کم از کم دو اور بڑے مندروں میں جانا تھا۔ ایک مندر میں اس نے بھینٹ چڑھائے جانے والے دودھ کے اندر یہ جہر ملانا تھا اور دوسرے مندر میں حلوے کے پرشاد کے اندر۔ یہ اتنا تیج جہر ہے کہ اس کی ایک چٹکی تین چار بندوں کی ہتھیا کرنے کے لیے کافی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اگر یہ اپنے ارادے میں سپھل ہو جاتا تو گل پانی میں کم از کم ایک ہزار ہندو موت کے منہ میں چلے جاتے اور ہو سکتا ہے کہ کئی مسلمان بھی مرتے کیونکہ کئی جگہوں پر یہ لوگ بھی پرشاد کھا لیوت ہیں۔"

حکم نے جلتی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ "اور... یہ بندہ ایسے شبھ کام اب سے نہیں، کئی برس سے کر رہا ہے۔ اس کا اصل نام ہاشم رازی ہے۔ یہ ایک بہت کٹر مسلا ہے۔ اب اس نے سب کچھ اپنی زبان سے بتایا ہے۔ یہ کئی برس سے گونگا بن کر مختار راجپوت کے گھر میں رہ رہا تھا۔ ابھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk
digestpk.blogspot.com

یہ کھوج لگانا باقی ہے کہ مختار راجپوت اور اس کے پریوار کو اس کی اصل حقیقت کا پتا تھا یا نہیں... اور اگر پتا تھا تو پھر وہ کس حد تک اس کے کاموں میں شریک تھے۔ اس شخص کی حقیقت ایک خطرناک خفیہ دشمن کی ہے۔ یہ زرگاں کے اندر کی خبریں اپنے پیرومرشد مراد شاہ تک پہنچاتا تھا اور مراد شاہ کا پتا کے نا ہیں؟ بس وہ شخص ہے جو تل پانی میں راج پاٹ حاصل کرنے کے سپنے دیکھ رہا ہے۔ اس نے ہمارے چھوٹے بھائی کو ہم سے دور کیا ہے، دھرم اور سنسار کی ساری سچائیوں سے دور کیا ہے...'' حکم نے ایک گہری سانس لی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہاں بات مراد شاہ کی نا ہیں، اس زبان دراز گونگے کی ہو رہی ہے۔ یہ ابھی جنونی لوگن میں سے ہے جن کے ذہن تنگ ہو کر سوکھے اخروٹوں جیسے ہو گئے ہیں۔ ان کی نظریں کیول اپنے سامنے تک ہی دیکھ سکت ہیں۔ اب اس جانور کو کون سمجھائے کہ اس طرح بے گناہ معصوم لوگن کی جانیں لے کر یہ اپنے خدا کو خوش نا ہیں کر سکتا۔''

حکم کے پہلو میں شاہانہ ٹھاٹ سے بیٹھی رتنا دیوی نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ صرف ہندو جاتی کا ہی نا ہیں، اپنی جاتی کا بھی دشمن ہے۔ اس نے دو تین سال پہلے ایک مسلمان لڑکے کو صرف اس لیے گھونزا گاڑی تلے دے کر مار دیا کہ وہ بانسری بجاتا تھا... بانسری بجانا اس کے نزدیک بہت بڑا پاپ تھا۔ پچھلے سے پچھلے سال اس نے مسلمان بچیوں کے ایک اسکول میں آگ لگائی۔ اس آگ میں تین بچیاں جھلس کر ہلاک ہو گئیں۔ ان بچیوں کا دوش یہ تھا کہ وہ انگریزی پڑھتی تھیں۔ اپنے ان پاپوں کا یہ شخص اعتراف کر چکا ہے۔ تم چاہو تو اس سے پوچھ سکت ہو۔''

میں ششدر کھڑا تھا۔ رنجیت نے رتنا دیوی کے اشارے پر ہاشو کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ وہ گرجا اور ایک بار پھر ان لوگوں کو بے نقط سنانے لگا جن کے خیالات اس کے خیالات سے نہیں ملتے تھے۔ اس کی پُرطیش باتوں سے اندازہ ہوا کہ ابھی رتنا نے اس پر جو الزامات لگائے ہیں، وہ انہیں قبول کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنے فعل کو پورے یقین کے ساتھ درست بھی سمجھتا ہے۔

وہ جب زیادہ آگ بگولا ہونے لگا تو اس کے منہ میں پھر کپڑا ٹھونس دیا گیا۔ رنجیت پانڈے اور حکم کے دیگر گارڈز اسے کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔

حکم بے حد طنزیہ انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''کیا وچار ہے تمہارا اس طرز کے بھائی بندوں کے بارے میں؟''

''چند لوگوں کے سخت رویے کی وجہ سے آپ کسی طبقے یا پوری قوم کو الزام نہیں دے سکتے۔''

''لیکن تم لوگن نے تو اپنی شناخت ہی اس گندے رویے کو بنا رکھا ہے۔''

اچانک عمران کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''عالی جناب! کیا آپ کے اس سوال کا جواب میں دے سکتا ہوں؟''

میں نے مڑ کر عمران کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی تھی جس نے مجھے چونکا دیا۔ ایسی بے پناہ سنجیدگی میں نے اس سے پہلے کبھی اس کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

''تم کون ہو؟'' حکم کی پاٹ دار آواز دربار میں گونجی۔

''عزت مآب! اگر آپ اجازت دیں تو میں بتاؤں؟'' میڈم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں بتاؤ۔''

''جناب! یہ پاکستان میں سیالکوٹ شہر کا رہنے والا ہے۔ عمران دانش نام ہے۔ پناہ کے لیے بھاگ کر انڈیا میں آیا اور پھر یہاں تک پہنچ گیا۔ لڑائی بھڑائی والے کام خوب کر لیتا ہے۔ میں نے چھان بین کر کے اسے اپنے سیکیورٹی گارڈز میں شامل کیا ہے۔''

حکم کی تیز نظروں نے کچھ دیر عمران کو گھورا پھر وہ بولا۔ ''کہو، کیا کہنا چاہت ہو؟''

''میں حضور کو اس کا جواب تفصیل سے دوں گا لیکن میری ایک گزارش ہے۔ اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو پہلے وہ معاملہ نمٹا لیجیے جس کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔ میرا مطلب ہے جناب اٹل پانی کی عمر رسیدہ خاتون والا معاملہ۔''

حکم کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں آئیں، تاہم وہ بولا کچھ نہیں۔ اس نے اپنے سامنے والے کلاک کی طرف دیکھ کر پہلو میں بیٹھے پنڈت مہاراج سے تھوڑی سی کھسر پھسر کی پھر رنجیت پانڈے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بزرگ خاتون کو لایا جائے۔''

حکم کے اس حکم کی تعمیل ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم نے بزرگ خاتون کو دیکھا۔ یہ وہی ہٹ دھرم، کھوسٹ بڑھیا تھی جس کے کہنے پر اس کے پچاس سالہ بیٹے رام پرشاد نے مندر میں پرکھشا کی خوفناک رسم ادا کی تھی اور جان سے گیا تھا۔ بڑھیا ساڑی میں تھی۔ کندھوں پر موٹی شال اور پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں تھیں۔ اسے حکم کے زرنگار چبوترے کے سامنے ہی ایک آرام دہ نشست پر بٹھا دیا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد بڑھیا کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جھریوں بھرے چہرے پر نفرت اور طیش کی یلغار ہوئی۔ اس نے اپنی ٹیڑھی میڑھی انگلی سے میری طرف اشارہ کیا اور چلا اٹھی۔ اس کے منہ میں بس دو چار دانت ہی تھے۔ اس کی بات مشکل سے ہی سمجھ میں آتی تھی۔ خاص طور سے جب وہ غصے میں تیز تیز بولتی تھی۔ وہ ہاتھ نچا نچا کر پتا نہیں کیا کچھ کہنے لگی۔ جو جملے سمجھ میں آئے، وہ اس طرح تھے۔ ''تم راکھشس ہو... تمہاری پتنی راکھشس ہے۔ ہم کو کیا خبر تھی ہم نے جس کو اتنے بڑے پُن کام کے لیے چنا ہے، وہ اتنا بڑا پاپی نکلے گا۔ تم دونوں کی سزا موت ہے۔ اس کے سوا کچھ نا ہیں... وغیرہ وغیرہ۔''

مجھ پر اس زبانی حملے کے دوران میں بڑھیا نے اپنی نشست سے اٹھنے کی کوشش بھی کی لیکن گارڈز نے اس کے کندھوں پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر اسے بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا۔

بڑھیا قدرے پُرسکون ہوئی تو حکم کا فربہ اندام مشیر چبوترے سے اتر کر بڑھیا کی نشست کے قریب آیا اور بولا۔ ''ماتا جی! حکم جی چاہت ہیں کہ آپ نوتاریخ کو ہونے والے ساہبر کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہت ہیں، تفصیل سے کہیں۔''

وہ فوراً بولی۔ ''تفصیل سے کیا کہوں۔ کچھ وکون بھی چوڑی بات نا ہیں کرنی ہے۔ میں بس یہ کہوں گی کہ اس راکھشس اور اس کی اپرادھن پتنی کی سزا موت کے سوا اور کچھ نا ہیں۔ اس کتے کو الٹا لٹکا کر اس سے اس کی پتنی کا ناپتا پوچھا جاوے اور پھر دونوں کو فوراً جوتے مار مار کر مار دیا جاوے یا سولی چڑھا دیا جاوے۔ بس... بس اس کے سوا ہم جو کچھ بھی کریں گے، وہ ہمارا پاپ ہووے گا۔ ہم اپنے بے زرگ کی گتی کا اپمان کریں گے۔''

بڑھیا فرطِ جذبات سے سرتاپا کانپ رہی تھی۔

حکم نے شاہانہ انداز میں پنڈت مہاراج کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''پنڈت جی! آپ اس بارے میں کیا کہنا چاہت ہو؟''

ادھیڑ عمر پنڈت نے اپنے دراز گیسوؤں کو کندھوں پر پھیلایا اور مودب انداز میں بولا۔ ''جناب! میں نے ماتا جی کی پوری کتھا سنی ہے۔ ماتا جی کے پریوار سے ایک جرم تو ضرور ہوا ہے۔ ان لوگن نے مختار راجپوت کی لونڈیا کو ہم سے چھپایا اور پھر اپنے استھان میں لے گئے۔ ان لوگن کا خیال تھا کہ زرگاں میں مختار کی لونڈیا کو مناسب سزا نا ہیں مل سکے گی۔ ان لوگن نے استھان میں مختار کی لونڈیا کی ارتھی جلانا چاہی تھی مگر یہ کام ہو نہ سکا۔ بہرحال مختار کی لونڈیا کو چھپا کر لے جانے کی سزا اس پریوار کو مل گئی۔ ماتا کا بڑا بیٹا رام پرشاد اپنے ہی ساتھیوں کے درمیان ہونے والی لڑائی میں ہلاک ہوا۔ رام پرشاد کی پتنی کا دیہانت دل کے دورے سے ہو گیا۔ ماتا کا پوتا اور پوتے کی پتنی اس کو چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ میں یہ کہوں گا کہ ماتا اور اس کے پریوار نے جو کچھ کیا یہ غلط تھا... لیکن اس کے پیچھے جو کارن تھا، وہ یہی تھا کہ یہ لوگن اپنی سمجھ کے مطابق دھرم کا نام اونچا کرنا چاہت تھے اور اپرادھن کو سزا دینے کی اچھا رکھتے تھے۔''

حکم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب تو ٹھیک ہے پنڈت جی... ہم آپ سے یہ جانکاری چاہت ہیں کہ کیا موجودہ حالت میں ماتا جی کی بات ماننا چاہیے کہ ساہبر کی ترائی روک دی جاوے اور سلطانہ کے پتی کو مجبور کیا جاوے کہ وہ سلطانہ کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لیے اسٹیٹ کی مدد کرے؟''

پنڈت کے بولنے سے پہلے ہی بڑھیا پھر چلا اٹھی۔ ''آپ کو یہ کرنا پڑے گا۔ اس کام کے لیے میرا بیٹا قربان ہوا ہے۔ میں نے اپنی بہو کا بلیدان دیا ہے۔ میرا پوتا اور اس کی پتنی مجھ سے دور ہوئے ہیں۔ میں سنسار میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ اگر میرے یہ سارے بلیدان بیکار ہیں اور اس راکھشس نے ساہبر کی آڑ میں چھوٹ کر یہاں سے چلے جانا ہے یا اسے آسان موت مل جانی ہے تو پھر مجھے بھی زندہ نا ہیں رہنا۔ مجھے نا ہیں چاہیے ایسا جیون۔ میں سوگند کھاوت ہوں، میں آتم ہتیا کر لوں گی۔ میں سب کے سامنے خود کو زندہ جلا لوں گی...''

بڑھیا کے سوکھے سڑے جسم میں نہ جانے اتنا زور کہاں سے آ گیا تھا۔ وہ پکڑنے والوں کی گرفت سے نکل نکل جا رہی تھی۔

اسی دوران میں عمران آگے آیا۔ اس نے حکم کے سامنے ادب سے جھک کر کہا۔ ''اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں ماتا جی سے ایک دو سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔''

حکم نے چند لمحے توقف کر کے کہا۔ ''پوچھو۔''

عمران بڑھیا کے سامنے جا کر بولا۔ ''کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ کے بیٹے کی موت کس طرح ہوئی اور آپ کے پوتے اور اس کی پتنی نے آپ کا ساتھ کیوں چھوڑا؟''

وہ کڑک کر بولی۔ ''کون ہو تم؟ میں تمہاری باندی نا ہیں کہ تمہارے سوالوں کے جواب دوں۔ میں نے جن کو

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بتاتا تھا، انہیں سب بتا چکی ہوں۔"

فربہ اندام مشیر آگے آیا اور عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ "جو پوچھ رہے ہو، میں بتا دیتا ہوں۔ ماتا جی کے بیٹے رام پرشاد کی ہتھیا آپس کی لڑائی کے کارن ہوئی۔ استھان کے لوگن "دھرمی اختلاف" کے کارن دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ نے رام پرشاد کو مار دیا۔ رام پرشاد کی پتنی دل کے دورے سے سورگ باشی ہوئی۔"

"اور ماتا جی کا پوتا ستیش... اور اس کی بیوی مالا؟" عمران نے پوچھا۔

"وہ دونوں مخالف گروہ سے ڈر گئے۔ ویسے بھی ستیش کی پتنی امید سے تھی۔ ستیش اس کی اور اپنی جان بچانے کے لیے کہیں نکل گیا۔"

"یہ باتیں آپ کو ماتا جی نے بتائی ہیں؟" عمران نے تصدیق چاہی۔

فربہ اندام شاہی مشیر نے اثبات میں جواب دیا۔

عمران نے اطمینان سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے جناب! یہ جھوٹ بول رہی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" مشیر خاص نے آنکھیں نکالیں۔ حکم جی نے بھی تیوری چڑھالی۔

عمران اپنی ٹھوڑی کا گڑھا کھجاتے ہوئے بولا۔ "ماتا جی کی عمر ایسی ہے کہ ہمیں ہر صورت ان کی عزت کرنی چاہیے لیکن یہ اس معاملے میں جھوٹ بول رہی ہیں اور کئی باتیں چھپا رہی ہیں۔"

"کتے! میں جھوٹی ہوں۔ میں ادھرمی ہوں۔ ترا انجا دے... نیچ بدجات! میں تیرا منہ نوچ لوں گی۔" بڑھیا چلائی اور اس نے ایک بار پھر نشست سے اٹھنے کی کوشش کی۔

گارڈز نے اسے سنبھال لیا۔ وہ پوپلے منہ سے پتا نہیں کیا اول فول بکتی چلی گئی۔ جو ایک فقرہ سمجھ میں آ رہا تھا اور وہ بار بار دُہرا رہی تھی وہ یہ تھا کہ "تم ہو کون؟ تم ہو کون؟"

وہ مجھے تو جانتی تھی لیکن عمران اس کے لیے یکسر اجنبی تھا۔

اسے پتا نہیں تھا کہ ہم دونوں اس سارے خونی واقعے کے چشم دید گواہ ہیں جو فتح پور کے اس چھوٹے سے گاؤں کے مندر میں رونما ہوا۔ جس میں گرو سوبھاش کا کٹا ہوا سر تھال میں سجایا گیا اور رام پرشاد نے جلتے تیل کے کڑاہے میں ہاتھ ڈالے۔

بڑھیا ذرا شانت ہوئی تو عمران نے بڑے ہموار اور اثر انگیز لہجے میں کہا۔ "عزت مآب! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ میں کچھ ایسے واقعات کا چشم دید گواہ ہوں جو ماتا جی آپ سے چھپا رہی ہیں۔ میں حلفاً کہتا ہوں کہ یہ واقعات سچے ہیں اور اگر جھوٹ ثابت ہوں تو میں ہر بڑی سے بڑی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔"

"مختصر شبدوں میں بتاؤ، کیا بتانا چاہتے ہو؟" حکم نے کہا۔

"جیسا کہ میڈم صاحبہ نے آپ کو بتایا ہے، میں پناہ کے لیے اس راجواڑے میں داخل ہوا ہوں۔ مجھے آپ کی عنایتوں کا آسرا ہے۔ آج سے چند روز پہلے تک میں زرگاں پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں ٹل پانی سے آگے نکل آیا تھا اور فتح پور نام کی بستی کے قریب ایک ساتھی چرواہے کے جھونپڑے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میرا وہاں فتح پور میں ہونا زبردست اتفاق تھا۔ اس اتفاق کی وجہ سے مجھے وہ مناظر دیکھنے کا موقع ملا جن کا تعلق فتح پور کے مندر سے ہے اور ساتھ ہی آپ کے سامنے کھڑی اس بڑی بی سے بھی۔"

بڑھیا نے پھر واویلا شروع کر دیا۔ گارڈز نے بہ مشکل اسے چپ کرایا۔ حکم نے عمران کو بات جاری رکھنے کا اشارہ دیا۔

عمران نے کہا۔ "اس روز چرواہے کو بکریوں کا دودھ بیچنے بستی کے اندر جانا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ بستی میں بہت ہلچل نظر آ رہی تھی۔ آس پاس کی چھوٹی بستیوں کے کئی لوگ بھی وہاں جمع تھے۔ بڑی پگڑیوں والے کئی پنچ بھی تھے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ یہاں مندر میں آج کوئی شخص جلتے تیل کے کڑاہے میں اپنے ہاتھ ڈال کر پرکھشا دے رہا ہے۔ میرے میزبان چرواہے صدیق نے تفصیل معلوم کی تو پتا چلا کہ یہ کٹر ہندوؤں کے دو گروہ ہیں۔ کسی لڑکی کا معاملہ ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ لڑکی کو دوسرے گروہ والوں نے غائب کیا ہے۔ دوسرا گروہ یہ ماننے سے انکار کر رہا ہے۔ اب پرکھشا سے فیصلہ ہونا ہے کہ سچ کیا ہے۔ مندر کے اردگرد بھی خوب رونق تھی۔ اندر سنکھ بج رہے تھے اور اشلوک پڑھے جا رہے تھے۔ پھر میں نے آپ کے سامنے کھڑی اس بزرگ خاتون کو دیکھا۔ یہ زور زور سے اشلوک پڑھ رہی تھی اور اپنے پچاس پچپن سالہ بیٹے رام پرشاد کو پرکھشا کے لیے مندر کے اندر لے جا رہی تھی۔ رام پرشاد بھی نشے کی سی حالت میں تھا۔ یہ لوگ ایک چھوٹے سے جلوس کی شکل میں اندر چلے گئے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد مندر کے اندر ہاہاکار مچ گئی۔ بہت سے لوگ ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ آوازیں آنے لگیں کہ بھگوان نے فیصلہ کر دیا... دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو گیا۔ چند ہی لمحے بعد پتا چلا کہ مندر کے اندر بڑھیا اور اس کا ادھیڑ عمر بیٹا پرکھشا میں ناکام ہو گئے ہیں اور لوگوں نے بڑھیا کے بیٹے کو جان سے مار دیا ہے۔"

عمران نے چند لمحے توقف کیا۔ دربار میں سناٹا طاری تھا۔ لوگ توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔ صرف بڑھیا کبھی کبھی اپنے پوپلے منہ سے بول رہی تھی مگر اب اس کی آواز میں تن تن نہیں تھی۔ اس کے الفاظ بھی کسی کے پلے نہیں پڑ رہے تھے۔ عمران نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جناب! اس کے کچھ ہی دیر بعد میں نے ایک جواں سال لڑکی کو دیکھا۔ وہ شاید حاملہ بھی تھی۔ کچھ لوگ اسے بیدردی سے کھینچتے ہوئے مندر کے اندر لے جا رہے تھے۔ مجھے لوگوں سے پتا چلا کہ بڑھیا اس لڑکی کی دادی ساس ہے... کیونکہ پرکھشا ناکام ہو گئی ہے اس لیے اس لڑکی کو بھی مار دیا جائے گا۔ اس کے بعد ہی مندر کے اندر زبردست ہنگامہ ہوا۔ گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ مندر کا بڑا دروازہ اس ہنگامے میں ٹوٹ گیا۔ میں ہمت کر کے اس دروازے کے قریب چلا گیا۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے اندر کے خونی منظر دیکھے۔ بہت سے لوگ ایک دوسرے پر کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے حملہ کر رہے تھے۔ گاہے بگاہے گولی بھی چل رہی تھی۔ کم از کم تین لاشیں تو میں نے خود دیکھیں۔ ان میں سے ایک لاش بڑھیا کے ادھیڑ عمر بیٹے کی تھی۔ پھر تیل کا ابلتا ہوا کڑاہا الٹ گیا اور مندر میں آگ لگ گئی۔ میرا دوست چرواہا مجھے کھینچ کر مندر کے قریب سے پیچھے لے آیا اور ہم کسی مصیبت سے بچنے کے لیے اپنے جھونپڑوں کی طرف چلے گئے۔

"اگلے روز مجھے معلوم ہوا کہ مندر کے خونی ہنگامے میں نو دس بندے مرے اور درجنوں بُری طرح زخمی ہوئے ہیں۔ یہ بھی پتا چلا کہ اس واقعے کی زیادہ تر ذمے داری اسی بزرگ خاتون پر ہے۔ اسی نے اپنے بیٹے کو ایک خطرناک پرکھشا دینے پر مجبور کیا۔ اس سے دو چار دن پہلے یہ ایک اور خطرناک کام بھی کر چکی تھی۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں اور اس کا پورا ثبوت بھی دے سکتا ہوں۔"

"یہ بات جاری رکھو۔" حکم نے ہدایت کی۔

عمران نے کہا۔ "اسی بزرگ خاتون اور اس کے کٹر ساتھیوں نے ایک گرو کو قتل کیا اور اس کا کٹا ہوا سر ایک تھال میں سجا کر کالی ماتا کے چرنوں میں رکھا۔ آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ انہوں نے ایسا کیا یا نہیں؟"

دربار میں سناٹا تھا۔ بس بڑھیا ہی اول فول بول رہی تھی۔ فربہ اندام مشیر نے اسے بہ مشکل چپ کرایا اور پوچھا کہ کیا فتح پور بستی کے مندر میں کسی گرو کا سر کاٹا گیا تھا؟ بڑھیا اب بوکھلا چکی تھی۔ طیش کے سبب اس کے منہ میں جو آ رہا تھا، بولتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے اپنے پوپلے منہ سے پھس پھس کی غصیلی آوازیں نکالتے اور ہاتھ نچاتے ہوئے جو واویلا کیا، اس کا خلاصہ یہ تھا... "وہ گرو اپرادھی تھا۔ اس کے مرنے میں ہی اس کی مکتی تھی۔ اپرادھی کو اس کی سزا ملنی چاہیے۔ نہ ملے تو اس کا وبال ساری ہندو جاتی پر پڑتا ہے۔ کھیت سوکھ جاتے ہیں، ناریاں بانجھ ہو جاتی ہیں... بیماریاں آتی ہیں اور خون خرابے ہوتے ہیں۔ اگر اس اپرادھی سلطانہ کو سزا نہ ملی تو بھی یہی کچھ ہوگا..." وہ بولتی چلی جا رہی تھی۔

عمران کی خوب صورت آنکھوں میں ایک تیز چمک تھی۔ چہرے پر چھائی ہوئی بے پناہ سنجیدگی نے اس چمک کو کچھ اور بھی گہرا کر دیا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "عزت مآب! میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کے سوال کا جواب دے دیا ہے۔ انتہا پسند ہر جگہ موجود ہیں اور جہاں بھی ہیں، قابلِ مذمت ہیں۔"

عمران کا یہ ایک فقرہ لاتعداد دلیلوں اور تاویلوں سے زیادہ وزنی تھا۔ کچھ دیر کے لیے کوئی کچھ بھی نہیں بولا۔ عمران نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں کوئی سیاست دان یا دانشور نہیں ہوں جناب عالی... مگر اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں شدت پسندی اور انتہا پسندی سے نفرت کرنی چاہیے، کسی خاص قوم، مذہب یا فرقے سے نہیں۔ انتہا پسندی انسان کو جنونی بناتی ہے۔ انسان ایسے ایسے کام کر گزرتا ہے جو شاید وہ عام حالت میں کبھی نہ کرتا۔ اب آپ اس بزرگ خاتون کو ہی دیکھیے۔ یہ عمر کے اس حصے میں ہیں جب انسان جھوٹ بولنے جیسی غلطیوں کو بھی بہت بڑے گناہوں میں شمار کرنے لگتا ہے۔ لیکن یہ پورے وشواس اور زور و شور سے جھوٹ بول رہی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ ان کا پوتا ستیش اور اس کی پتنی مالا اس لیے ان سے جدا ہو گئے کہ وہ مخالف گروہ سے خوف زدہ ہو گئے تھے لیکن ایسا نہیں ہے عزت مآب۔"

"تو پھر کیا ہے؟" حکم نے دریافت کیا۔

"اب تک میں نے جو کچھ بتایا ہے، میں اس کا چشم دید گواہ ہوں لیکن جو بات میں اب بتاؤں گا، وہ میں اندازے سے بتا رہا ہوں۔ مجھے ننانوے فیصد یقین ہے کہ

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرا یہ اندازہ درست ہے۔ بزرگ خاتون کی تو ہم پرستی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ یہ اپنے عقیدے کی اتنی پکی ہیں کہ اس کے سوا کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتیں۔ جلتے کڑاہے میں ہاتھ ڈالنے والا امتحان اس لیے دیا گیا تھا تاکہ بزرگ خاتون کے پوتے اور اس کی پتنی مالا کی بے گناہی ثابت ہو سکے۔ ہاتھ ڈالنے والے کے ہاتھ جل گئے کیونکہ انہیں جلنا ہی تھا لیکن یہ بزرگ خاتون پھر بھی اپنی بے مثال دقیانوسیت پر قائم ہے۔ پرکھشا کے طریقے پر نظرِ ثانی کرنے کے بجائے اب یہ اپنے پوتے اور اس کی بے گناہ پتنی کے خلاف ہو چکی ہے۔ یہ سمجھتی ہے کہ وہ واقعی مجرم تھے، اگر مجرم نہ ہوتے تو رام پرشاد کے ہاتھ کیوں جلتے۔ اسی بات پر پوتا اور اس کی پتنی مالا اسے چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ عزت مآب! شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انتہا پسند دن بہ دن محدود اور تنہا ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ زیادہ زہریلے بھی۔"

بڑھیا پوپلے منہ سے پھنکاری۔ "یہ بچ کمینہ جھوٹ بولت ہے، بکواس کرت ہے... ایسا... کچھ نا ہیں ہوا..."

اس کا لہجہ ہی گواہی دے رہا تھا کہ وہ غلط بیانی کر رہی ہے۔ اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔ وہ زیادہ واویلا کرنے لگی تو حکم کے اشارے پر پہرے دار اسے بہلاتے اور سنبھالتے ہوئے باہر لے گئے۔

میں حیرت سے عمران کو تک رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں کسی عدالت میں ہوں اور کسی بہت بڑے وکیل نے بڑی مہارت اور خوب صورتی سے آنا فانا جیوری کو لاجواب کیا ہے۔ میرے لیے سب سے بڑی حیرت وہ خاص قسم کی سنجیدگی تھی جو میں نے آج پہلی بار عمران کے چہرے پر طاری دیکھی تھی۔

میں ابھی تک عمران کے ماضی میں نہیں جھانک سکا تھا۔ یقیناً وہاں کوئی خاص کہانی موجود تھی... کہیں... ایسا تو نہیں تھا کہ عمران بھی کسی ایسی ہی انتہا پسندی اور جنونیت کا ڈسا ہوا ہو؟ ان مہلک رویوں نے کوئی گہرا زخم لگایا ہوا ہے؟

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ بڑھیا کے جنونی رویے کی وجہ سے بڑھیا کا کیس کافی حد تک کمزور ہو گیا ہے۔ وہ سامبر کا مقابلہ رکوانا چاہتی تھی اور اس کی دلیل یہ تھی کہ میری سزا دردناک موت کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔ بہرحال، اب یہ معاملہ پنڈت مہاراج اور اس کے ساتھیوں کے سامنے پیش تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ حکم دل ہی دل میں اب بھی یہی چاہتا ہے کہ یہ مقابلہ نہ ہو لیکن وہ لکھے ہوئے قانون اور پنڈتوں کی رائے کی اہمیت سے بھی آگاہ تھا۔

لمبے بالوں والے پنڈت اور اس کے درجن بھر ساتھیوں کے درمیان تادیر مشورہ ہوا۔ چند سال خوردہ کتابوں اور پوتھیوں سے بھی استفادہ کیا گیا۔ آخر پنڈت مہاراج نے سب کے سامنے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ "عزت مآب! ہمارے پاس سامبر کے بارے میں بہت کھلی اور واضح جانکاریاں موجود ہیں۔ اگر کوئی منش کسی دوسرے منش کو سامبر کی دعوت دے دیوت ہے اور دوسرا اسے قبول بھی کر لیوت ہے اور سامبر کی شبھ گھڑی بھی نکل آوت ہے تو پھر واپسی کی گنجائش نا ہیں رہتی۔ اگر کوئی دوسرا معاملہ ہو بھی تو پہلے سامبر رچنا کا ہونا ضروری ہو جاوت ہے۔"

پنڈت مہاراج نے سنسکرت کی ایک قدیم کتاب کا اقتباس پڑھتے ہوئے کہا۔ "سن 512 ب، مہینا میسا کھ، تاریخ 30۔ راجستھان کے راجواڑے وشو کے مشہور راجا کرشن کمار سہائے کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا تھا۔ ایک شخص آنند لال پر چوری اور ہتھیا کا الزام تھا لیکن اس کے پکڑے جانے سے پہلے ہی اس کا سامبر اپنے سوتیلے بھائی سے طے ہو چکا تھا۔ راجا نے ہتھیارے کو سزا دینے سے پہلے اس کا سامبر کرانے کا حکم دیا تھا اور کہا تھا کہ ہو سکتا ہے سامبر کے مقابلے میں ہی انصاف ہو جاوے۔ یہ مرد و مردا کا مقابلہ تھا۔ اس میں ملزم آنند لال بچ گیا اور اس کا سوتیلا بھائی مارا گیا۔ بعد میں یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ ملزم بے گناہ تھا اور اصل دوشی اس کا سوتیلا بھائی ہی تھا... اور عزت مآب! ایسی اور بھی کئی مثالیں ہمارے پاس موجود ہیں۔"

حکم نے کہا۔ "پنڈت جی! کیا آپ یہ چاہت ہیں کہ سلطانہ کے پتی کو سامبر کی آگیا دی جاوے اور اگر یہ اس یدھ (لڑائی) میں کامیاب ہو جاوے تو پھر اسے مظلوبہ عورت کے ساتھ غل پانی جانے دیا جاوے؟"

"بالکل سرکار! ہم کو ایک مرتبہ تو ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ بھگوان نہ کرے اگر یہ شخص سامبر جیت جاوت ہے تو پھر اسے کم از کم ایک بار تو زرگاں کی حدوں سے نکل جانے کی آگیا دینی ہوگی۔"

اس موقع پر میں نے پھر مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "گستاخی کی معافی چاہتا ہوں لیکن میں آپ کے لفظوں کو درست نہیں سمجھتا۔ مجھے زرگاں کی حد سے نکلنے کی نہیں بلکہ پانی پہنچنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ یہ تو سراسر مذاق ہوگا کہ آپ مجھے زرگاں سے تو نکلنے دیں لیکن آپ کے اہل کار میرے ساتھ ساتھ رہیں اور زرگاں کی حد ختم ہوتے ہی مجھے پھر دھر لیا جائے۔"

"تم بال کی کھال مت اتارو۔" حکم نے پہلی بار برہم ہوتے ہوئے کہا۔ "ہم خوب اچھی طرح سمجھت ہیں کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟ اور یہ مت سمجھو کہ ہم تمہیں اور تمہاری پتنی کو غل پانی سے واپس نا ہیں لا سکتے۔ اگر ہم چاہیں تو تمہیں زمین کی ساتویں پرت سے بھی کھینچ لیا جاوے گا۔"

پنڈت مہاراج نے اپنے لمبے بالوں کو کندھوں پر سنوارتے ہوئے کہا۔ "اور مجھے بھگوان سے پوری آشا ہے جناب کہ اس سب کی نوبت ہی نا ہیں آوے گی۔ اس پاپی کے پاپوں کا گھڑا سامبر کے مقابلے میں ہی پھوٹ جاوے گا۔"

جارج کی بہن ماریا اپنی جگہ سے اٹھی اور پہلی بار اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی۔ "میں اس موقع پر پنڈت مہاراج، حکم جی اور دیگر معزز ارکان سے بس ایک ہی بات کہنا چاہوں گی۔ یہ شخص جرم وار ہے اور خدا نے چاہا تو یہ سامبر میں ضرور شکست کھائے گا لیکن اس کو کمرے میں ہی مار دیا گیا تو یہ ان سب لوگوں کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہوگی جو مختار راجپوت کی بیٹی کو انصاف کے کٹہرے میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ میری پُرزور درخواست ہے کہ سامبر کے بعد اس شخص سے اس کی بیوی کا اتا پتا دریافت کیا جائے اور اسے برآمد کیا جائے۔" پنڈت مہاراج نے ماریا کی باتوں کی تائید کی۔

چند منٹ مزید گفتگو جاری رہی اور پھر وہیں دربار میں سب کچھ طے پا گیا۔ دو روز بعد ساتویں کا جشن تھا اور اس سے دو روز بعد یعنی نو تاریخ کو میرا اور جارج کا مقابلہ دن کے تیسرے پہر میں ہونا تھا۔

آخر میں حکم جی نے مجھے پیشکش کی کہ اگر میں راج بھون کی سیر کرنا چاہوں تو کر سکتا ہوں۔ اس نے متعلقہ لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ مجھے راج بھون میں گھما پھرا دیں۔

ساتویں کا جشن دو روز بعد تھا لیکن اصل میں یہ جشن شروع ہو چکا تھا۔ گارڈز کے نرغے میں حکم کے قریبا اندام شیر خاص اوم پرکاش نے ہمیں راج بھون کے مختلف حصے دکھائے۔ ہمارے ساتھ میڈم صفورا، رنجیت پانڈے اور اس کے ایک درجن ساتھی بھی تھے۔ مجھے پانڈے کی نگاہوں میں اپنے لیے طیش اور کینہ صاف نظر آ رہا تھا۔

راج بھون کے مختلف حصوں کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ یہ سب کچھ آنکھیں چندھیا دینے والا تھا۔ شاید مجھے سیر کرانے کا مقصد مجھ پر اپنی شان و شوکت کا رعب ڈالنا بھی تھا۔

ساتویں کے جشن کی سب سے اہم خوب صورتی و رنگینی

کیا آپ
لبوب مقوی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟
کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مقوی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک
المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ ایک بہت بڑا قطعہ تھا جسے جنت ارضی کی طرح سجایا گیا تھا۔ دراصل یہ ایک بہت بڑا بے ستون کا ہال تھا۔ اس کی چھت گنبد نما تھی۔ اس گنبد نما چھت کو اس طرح پینٹ کیا گیا تھا کہ دن میں بھی رات کا سماں ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہزاروں ستارے ٹمٹما رہے ہیں اور ان کے درمیان چاند کی خوب صورت ٹکیا روشن ہے۔ یہ چاندنی فرش تک پہنچتی تھی اور نشیب و فراز کو عجب کیفیت میں رنگ رہی تھی۔ یہاں تین بڑی آبشاریں تھیں جن کا پانی موسیقی بکھیرتا چھوٹے چھوٹے جھرنوں میں تبدیل ہوتا تھا اور پھر ایک بڑے حوض میں گرتا تھا۔ یہ حوض طول میں کم و بیش پچاس میٹر اور عرض میں چالیس میٹر ہوگا۔ اس میں چھوٹی چھوٹی خوب صورت کشتیاں تیر رہی تھیں۔ ان کشتیوں میں شراب کی صراحیاں، جام اور دیگر لوازمات سجے ہوئے تھے۔ ہر کشتی میں خلوت فراہم کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا کاٹیج بھی تھا۔ اس طرح کا ہر کاٹیج تازہ پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ان میں سے کچھ کشتیوں پر راج بھون کے خواص اپنی بیگمات کے ساتھ موجود تھے اور خوش فعلیاں کر رہے تھے۔ حوض کے کنارے موجود خوش لباس سازندے موسیقی کی تانیں بکھیر رہے تھے اور چند خوبرو لڑکیاں حوض کے اردگرد رقص فرما تھیں۔ کھلی جگہ کے مقابلے میں اندر کا ماحول نیم گرم تھا۔ یہی حرارت تھی جس کے سبب رقاصاؤں نے نہایت مختصر لباس پہن رکھے تھے اور پھر بھی خوش و خرم تھیں۔ اس وسیع و عریض کمپاؤنڈ کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا فوارہ نصب تھا۔ فوارے میں سے سات رنگوں کا شفاف پانی چھوٹتا تھا اور فوارے کے اردگرد بنے ہوئے ایک گول حوض میں جمع ہوتا تھا۔ شیشے کے اس گول حوض کی چاروں طرف آرام دہ نشستیں بنی ہوئی تھیں۔ ان نشستوں پر کچھ لوگ بیٹھے کھا پی رہے تھے اور رقاصاؤں کے تھرکتے جسموں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ لطف اندوزی صرف دیکھنے تک محدود نہیں تھی۔ گاہے بگاہے کوئی شخص اپنے اردگرد ناچتی رقاصہ کو چھوتا تھا یا آغوش میں کھینچ لیتا تھا۔ گل پوش کشتیوں میں بیٹھی بیگمات ان مناظر سے صرف نظر کرتی تھیں۔ غالباً یہ ساری رعایتیں اور گنجائشیں ساتویں کے جشن سے نسبت رکھتی تھیں۔

میڈم نے مجھے بتایا۔ ”جشن کے دن اس فوارے میں یہ سات رنگوں والا پانی نہیں ہوگا۔“

”پھر کیا ہوگا؟“

”مہنگی ترین امپورٹڈ شراب۔ اس شراب سے یہ گول حوض لبالب بھر جائے گا۔ لوگ اس کے اردگرد بیٹھ کر رقص دیکھیں گے اور ساتھ ساتھ مے نوشی کریں گے۔ رقاصائیں بھی یہ نہیں ہوں گی۔ یہ وہی چالیس لڑکیاں ہوں گی جن میں سے سات رنگوں کی سات پریاں چنی جاتی ہیں۔“

”وہ کیا ہے میڈم؟“ میں نے شیشے کے ایک بڑے چوکور ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کے اندر کوئی سنہری چیز ہلکورے لے رہی تھی۔

”لیکوئیڈ گولڈ... سیال سونا۔“ میڈم نے بتایا۔

”کیا مطلب؟“

میڈم کے بجائے ایک فوجی افسر بولا۔ ”یہ پگھلا ہوا سونا ہے۔“

میں اور عمران دنگ رہ گئے۔ اگر یہ واقعی سونا تھا تو پھر ڈیڑھ دو من تو رہا ہوگا۔ اس سیال سونے کے بیچوں بیچ ایک برہنہ لڑکی کی دو فٹ اونچی مورتی نظر آ رہی تھی۔ یہ مسکراتی ہوئی مورتی کسی بہت سخت شیشے سے بنی ہوئی تھی لیکن لگتا تھا کہ یہ موم کی ہے۔ یعنی پگھلے ہوئے سونے کے اندر موم کی لڑکی۔ لڑکی کا صرف بالائی دھڑ نظر آتا تھا پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے لڑکی سیال سونے میں اوجھل ہو گئی۔ چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد وہ دوبارہ ابھری تو سیال سونے میں تھرتھری ہوئی نظر آئی۔ لیکن شیشے کے باکس کے اندر اس قدر درجۂ حرارت تھا کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے پگھلا ہوا سونا پانی کی طرح اس کے بلوری جسم سے ڈھلک کر واپس گر گیا۔ وہ بدستور مسکرا رہی تھی... پگھلے ہوئے سونے میں مسکراتی لڑکی کا برہنہ جسم۔ یہ چھوٹا سا تماشا ایک طرح کی علامتی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ سونا، دولت اور اختیار کی علامت تھا... دولت اور اختیار جو عورت کے برہنہ جسم کو عیش و عشرت کی آگ میں جھلساتے تھے۔ وہ جھلستی تھی لیکن پھر بھی سب کچھ جھیلتی اور مسکراتی رہتی تھی۔

لڑکی کی مورتی کو پگھلے ہوئے سونے میں ڈبونے اور پھر ابھارنے کے لیے کوئی مشینی تکنیک استعمال کی گئی تھی۔ ہر بیس پچیس سیکنڈ کے وقفے کے بعد وہ سیال سونے میں غوطہ زن ہوتی تھی اور پھر باہر نکل آتی تھی۔ اس تماشے کا سب سے بہترین منظر وہ تھا جب پگھلا ہوا سونا پانی کی دھاروں کی طرح اس کے بلوری جسم سے جدا ہوتا تھا۔

ہماری چاروں جانب بجتے ہوئے ساز رکے تو رقص بھی تھم گیا۔ رقاص لڑکیاں مختلف گوشوں میں اوجھل ہو گئیں۔ ایک خوبرو لڑکی اپنی ساڑی کو چٹکیوں میں ٹخنوں سے اوپر اٹھائے دوڑتی ہوئی آئی... وہ ہنس رہی تھی اور اس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ اس کے عقب میں نشے میں دھت ایک امیر زادہ تھا۔ وہ غالباً پریمی جوڑا تھا۔ لڑکا، لڑکی کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لڑکی بل کھا کر لہرائی اور چکما دے کر اس کی زد سے نکل گئی۔ دونوں ہنستے ہوئے ایک جانب اوجھل ہو گئے۔

یہاں ہر طرف سرمستی اور مدہوشی کا ماحول نظر آ رہا تھا۔ ابھی یک دو دن میں اس ماحول کو مزید پروان چڑھنا تھا اور جشن کے دن کلائمکس تک پہنچنا تھا۔

مجھے اس وسیع و عریض کمپاؤنڈ کی کھڑکیوں کے نیلے شیشوں میں سے راج بھون کے وسیع لان کا منظر نظر آیا۔ باہر دن اور اندر رات تھی۔ راج بھون کی بیرونی دیوار پر خاردار باڑ تھی۔ اس فصیل نما دیوار کے اوپر باڑ کے ساتھ ساتھ مسلح پہرے دار گشت کر رہے تھے۔ ان میں سے دو پہرے داروں کے ہاتھوں میں مجھے رکھوالی کے کتے بھی دکھائی دیے۔

چند روز پہلے ہم اسی دیوار کی طرف سے راج بھون میں گھسے تھے اور تہلکہ مچایا تھا۔ اب یہاں سخت نگرانی تھی اور چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی لیکن اس ساری نگرانی کے باوجود ہم کسی اور روپ میں راج بھون کے اندر موجود تھے۔

...رقص اب ختم ہو چکا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر گانے والی سپید چاندی بال چمکاتی ہوئی سازندوں کے قریب جا بیٹھی اور ایک ہندی گیت گانے لگی۔ مغنیہ کی آواز پُرسوز تھی۔ لے بھی اچھی تھی۔ رقص کی دھنا دھن سے یہ موسیقی کہیں بہتر تھی۔ گیت کے بولوں کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔

رنگ و بو کے دھاروں میں
روز و شب کے پُرشور ہنگاموں میں
گرجتی برستی بارشوں میں اور تیز آندھیوں میں
غرض زندگی کے کسی بھی تیز بہاؤ میں
میں تجھے بھول نہیں پاتا
تیری یاد میرے ساتھ رہتی ہے، سردیوں کی دھوپ کی طرح
اور صحرا کی رم جھم کے مانند
باغوں کی چاندنی کی مثال
اور جلتے راستوں پر ملنے والے گھنے پیڑوں کی طرح

گیت کے بول میرے دل میں سرایت کرنے لگے۔ مجھے محسوس ہوا، میں بھی کسی کو یاد کرتا ہوں۔ کوئی ہر وقت میرے ساتھ بھی رہتا ہے۔ وہ کون ہے؟ شاید سلطانہ جو میری زندگی کا لازمی جزو بن گئی تھی۔ جس کی دل نواز محبت مدھم بارش کی طرح میرے دل کی زمین میں اندر تک سرایت کر گئی تھی۔ میں اس کے پاس واپس جانا چاہتا تھا۔ آنکھوں میں فتح مندی اور کامیابی کی چمک بھر کر۔ پھر اسے اپنی باہوں میں سمیٹ لینا چاہتا تھا اور اس کی شفاف آنکھوں سے نکلنے والے سارے آنسو اپنے ہونٹوں سے چن لینا چاہتا تھا۔ ہاں، وہ ایک سائے کی طرح میرے ساتھ تھی... لیکن... لیکن اس سائے کے پیچھے ایک اور سایہ بھی تو تھا۔ ایک اور مدھم سا ہیولا بھی، ایک لڑکی... جو ایک سہانی شام کی راہ تکا کرتی تھی۔ جو ڈائری پر لکیریں کھینچ کر انتظار کی تاریخیں کاٹا کرتی تھی اور جو شہنائیوں کی گونج سے پہلے ہی کہیں گم ہو گئی تھی... کبھی نہ ملنے کے لیے۔ سلطانہ کے سائے کے پیچھے اس کا سایہ بھی تو تھا۔ میں ایک بار... زندگی میں بس ایک بار اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اس کو دیکھنا چاہتا تھا اور اگر وہ سننا پسند کرتی تو اس سے صرف معذرت کہنا چاہتا تھا۔

ہاں، سلطانہ کے سائے کے پیچھے وہ سایہ بھی تو تھا۔ کیا میں اب بھی اس سے محبت کرتا تھا؟ کیا یہ ممکن تھا کہ میں ایک ہی وقت میں سلطانہ کو چاہوں اور ثروت کو دیکھنے کی حسرت بھی دل میں رکھوں؟ کیا سلطانہ سے میری محبت جسمانی رخ اختیار کر چکی تھی اور ثروت سے روحانی؟ سلطانہ کے لیے میرے اندر طلب تھی کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ میں اپنی بے خبری کے زمانے میں اس کے بہت قریب رہا ہوں۔ اس کے جسم کی ساری حرارت اور رعنائی میرے اندر جذب ہوتی رہی ہے۔ اب میں اس حرارت اور رعنائی کا خلا محسوس کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بیوی کی حیثیت سے سلطانہ کی بے پناہ قربانیاں بھی مجھے اس کی طرف کشش کرتی تھیں۔ لیکن ثروت کی محبت اس کانٹے کی طرح تھی جو جسم کے اندر ٹوٹ چکا تھا۔ ایک بار تکلیف برداشت کر کے اس کانٹے کو نکالا جانا ضروری تھا۔

لیکن یہ سب کچھ تو تب ہوتا جب میں اپنے مہلک حالات کے گھیرے سے نکل سکتا۔ ابھی مجھ پر صرف موت کا پہرا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ آنے والے چار پانچ دنوں میں میرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر جارج کے ساتھ میرا مقابلہ ہوا تو یہ یادگار اور بہت خوفناک ہوگا۔ مغنیہ کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ گیت کے آخری مرحلے میں تھی۔

ہمارے آنسو بھی تمہارے دامن پہ نہ بہہ سکے
افسوس یہ ہے کہ تمہیں الوداع بھی نہ کہہ سکے
اور دل میں بے شمار باتیں لیے
کچھ دکھی برساتیں اور بے چین راتیں لیے

digestpk.blogspot.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یادوں کی جھولی میں چند ادھوری ملاقاتیں لیے
ہم تم سے دور جانے پر مجبور ہوئے
ہاں بہت دور ہوئے

... بہت جلد اس گنبد نما وسیع و عریض چیمبر میں مجھے پہچان لیا گیا۔ بیشتر لوگ اپنی دلچسپ مصروفیات چھوڑ کر میری طرف آگئے۔ ان میں راج بھون کے حکام تھے۔ شاہی مہمان اور ان کی بیگمات و ساتھی خواتین تھیں۔ حتیٰ کہ رقاصائیں اور ملازمین وغیرہ بھی مجھے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور میرے گرد اکٹھے ہونے لگے تھے۔

یہ صورتِ حال پانڈے کو بالکل پسند نہیں آئی۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ لوگ میرے گرد اکٹھے نہ ہوں لیکن وہ کوئی عام لوگ نہیں تھے۔ سب کے سب معززین میں سے تھے۔ پانڈے انہیں تو کچھ نہ کہہ سکا مگر رقاصاؤں اور دیگر ملازمین پر بگڑنے لگا۔ ''آپ لوگ کیا کرتے ہو، یہ تماشا نہیں۔ چلیں اپنے اپنے کام کریں۔ پیچھے ہٹ جائیں۔''

میرے ہاتھوں کی جلد سینڈ بیگ کی مار سے سیاہ ہو چکی تھی۔ سوکھے چمڑے کی طرح کھردری اور سخت۔ ایک گورا چٹا چودھری نما شخص آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں کا معائنہ کرنے لگا۔ پھر ہولے سے بولا۔ ''سنا ہے تم خالی ہاتھ سے بندے کی کھوپڑی توڑ سکتے ہو؟''

اس کا ساتھی بولا۔ ''مجھے پتا ہے، تم اس سے کس کی کھوپڑی تڑوانا چاہتے ہو۔''

''کیا بکواس ہے؟'' پہلا شخص بولا۔

دوسرے نے کہا۔ ''معشوقہ کے لیے پتنی کو مروانا بڑا پرانا رواج ہے اور پتنی کھوپڑی ٹوٹنے سے مرے، یہ تو اور بھی مزے کی بات ہے۔''

''مجھ کو لگتا ہے کہ تم اپنے گھریلو حالات یہاں بیان کررہے ہو۔'' پہلے شخص نے کہا اور بھناتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

رنجیت پانڈے جھلا کر مشیر خاص اوم پرکاش سے بولا۔ ''میں اسی لیے کہتا ہوں جناب! یہ سراپ ختم کیجیے۔''

اس سے پہلے کہ مشیر خاص جواب میں کچھ کہتا، ایک نوجوان امیر زادہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے کیمرے سے کھٹا کھٹ میری دو تین تصویریں اتار لیں۔ ایک تصویر اس نے خاص طور سے میرے ہاتھوں کی اتاری تھی۔

بڑی بڑی مونچھوں والا ایک شخص جو کوئی امیر کبیر مراٹھی سیٹھ لگتا تھا، آگے بڑھا اور شرابی لہجے میں کیمرے والے کو ڈانٹ کر بولا۔ ''یہ کیا ناٹک ہے بھئی۔ یہ سالا کوئی قومی ہیرو ہے جس کے فوٹو اتار رہے ہو؟ یہ اپرادھی ہے اور جوتوں کا حق دار ہے۔ اگر اس کی فوٹو ہی اتارنی ہے تو تب اتارنا جب سولی پر ٹانک کر اس کی ہڈیوں کا چورا کیا جاوے گا۔ کتا... ذلیل۔''

''اپنا منہ سنبھال کر بات کرو۔'' میں نے پھنکارتے لہجے میں کہا۔

سیٹھ نما شخص آگے بڑھا اور اس نے بالکل غیر متوقع طور پر ایک زور کا مکا میرے منہ پر رسید کیا۔ میں بے خبر تھا۔ اچھی خاصی چوٹ لگی۔ میرے دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ بے ساختہ میرا دایاں ہاتھ گھوما۔ غالباً سیٹھ کو بھی امید نہیں تھی کہ اتنا فوری اور ایسا سخت جواب ملے گا۔ حالانکہ میں نے زیادہ زور کا ہاتھ نہیں مارا تھا پھر بھی وہ شخص ڈکراتا ہوا پیچھے کی طرف گیا اور حوض میں گر گیا۔ وہ تیرنا نہیں جانتا تھا۔ ایک دم غوطے کھانے لگا۔ دو گارڈز نے پانی میں چھلانگیں لگائیں اور اسے سنبھالا۔ اس کے ہونٹوں سے خون جاری تھا۔ وہ گالیاں بکنے لگا۔ گارڈز نے مجھے گھیر ڈال لیا اور شرابی سیٹھ کو بھی سنبھال کر مجھ سے دور لے گئے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ میرے اس جچے تلے مکے نے سیٹھ کا دم خم گروا لیا تھا اور ساتھ ہی اس کا نشہ بھی ہرن ہوا تھا۔ اسی دوران میں ایک شخص پکار کر بولا۔ ''جارج گورا صاحب اس طرف آرہے ہیں۔'' یہ سن کر میڈم صنوبرا کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر سرگوشی میں بولی۔ ''یہ شخص جسے تم نے گھونسا مارا ہے، جارج صاحب کے کلوز فرینڈز میں سے ہے۔ جارج کو پتا چلا تو وہ پھڈا کرے گا۔''

رنجیت پانڈے نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ مشیر خاص اوم پرکاش مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب تمہیں یہاں سے نکلنا چاہیے ورنہ معاملہ خراب ہو جاوے گا۔ چلو اس طرف سے آجاؤ۔''

اس نے ایک بغلی دروازہ کھولا اور مجھے وہاں سے نکلنے کو کہا۔

ہم ''جنت ارضی'' کی خوش گوار حرارت سے نکل کر دروازے میں داخل ہوئے اور ایک طویل راہداری سے گزر کر سیدھے اس جگہ پہنچ گئے جہاں ہماری گھوڑا گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کھلی جگہ پر پہنچ کر عجیب سا احساس ہوا۔ یہاں سرما کی زرد دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا جبکہ ابھی ہم جنت ارضی والے کمپاؤنڈ کے اوپر تاروں بھرا آسمان دیکھ رہے تھے اور چاند کی چاندنی گنگناتی آبشاروں کو منور کررہی تھی۔ یوں لگا جیسے پچھلے آدھ گھنٹے سے ہم جاگتی آنکھوں کے

ساتھ خواب دیکھ رہے تھے۔ ہمیں فوراً گھوڑا گاڑیوں میں بٹھایا گیا اور وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔

جارج کے ساتھ ایک ممکنہ ٹکراؤ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ جیسا کہ ہمیں بعد میں پتا چلا، جارج بہت غصے میں وہاں پہنچا تھا اور اس نے مسلح گارڈز کو سخت برا بھلا کہا تھا جن کے ہوتے ہوئے سیٹھ کے ساتھ میرا جھگڑا ہوا اور میں اسے ایک شدید ضرب لگانے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ گھوڑا گاڑیاں راج بھون کا وسیع احاطہ پار کر کے مین گیٹ کی طرف بڑھیں۔ دور بائیں طرف ہمیں وہ بلند بالکونی نظر آرہی تھی جہاں چند دن پہلے رتنا دیوی کے ہاں بچے کی پیدائش کا جشن منایا جارہا تھا اور میں نے عمران کے ہمراہ، اس بالکونی پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے جشن کو درہم برہم کیا تھا۔ وہاں شاید ہماری چلائی ہوئی گولیوں کے نشان ابھی تک موجود تھے۔

پھر وہ مین دروازہ دکھائی دیا جہاں سے میں اور عمران اندھادھند بھاگتے ہوئے فرار ہوئے تھے اور پانڈے کا ہم شکل ''چچازاد'' ہمارے پیچھے آیا تھا۔ ہم گیٹ سے باہر نکلے تو یہاں ایک اور ہی منظر دکھائی دیا۔ گیٹ کے باہر راستے کی دونوں جانب سیکڑوں لوگ جمع تھے۔ یہ زیادہ تر مسلمان نظر آتے تھے۔

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ سب لوگ مجھے یہاں دیکھنے کے لیے جمع ہیں۔ میڈم میرے ساتھ ہی گاڑی میں موجود تھی، وہ بولی۔ ''یہ دیکھو، تمہاری للکار نے کام دکھایا ہے۔ زرگاں کے ایک بڑے طبقے نے تمہیں اپنے خیالوں کا مرکز بنا لیا ہے۔ یہ لوگ تمہاری ایک جھلک دیکھنا چاہتے ہیں۔''

پانڈے کے چہرے پر برہمی تھی۔ اس نے جھلاہٹ کے عالم میں گاڑی کی کھڑکیوں کے پردے نیچے گرا دیے۔

باہر لوگوں کا شور تھا۔ اندازہ ہورہا تھا کہ انہوں نے گاڑی کا راستہ روک رکھا ہے۔ گارڈز انہیں راستے سے ہٹانے کی کوشش کررہے تھے۔ گرج برس رہے تھے اور سیٹیاں بجا رہے تھے۔ شور بڑھتا جارہا تھا۔ پھر اچانک گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا اور ایک سفید ریش بوڑھے شخص کا سرخ و سپید تمتمایا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ جوش کے سبب اس کے گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں... وہ چلا کر بولا۔ ''ہم تمہارے ساتھ ہیں... فتح تمہاری ہوگی۔ اللہ مدد کرے گا۔ تم جیتو گے...'' وہ ہیجانی لہجے میں بولتا چلا جارہا تھا۔

اس کے عقب میں ایک گارڈ نمودار ہوا۔ اس نے بوڑھے شخص کو کالر سے پکڑ کر زور سے کھینچا اور پیچھے گھسیٹ لیا۔ تب مزید دو افراد کے چہرے نمودار ہوئے۔ وہ بھی شکلوں سے مسلمان ہی لگتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے محبت اور خیرخواہی کی بلند لہریں تھیں، اس کے ساتھ ساتھ ایک جوشیلا رنگ تھا۔ ان افراد کو بھی گارڈز نے عقب سے کھینچ کر گاڑی سے دور ہٹا دیا۔

اس کے بعد شاید کچھ لاٹھیاں وغیرہ بھی چلیں۔ بھگدڑ کے آثار نظر آئے اور گاڑی متحرک ہو کر آگے بڑھی۔ ''تیز چلاؤ۔'' گاڑی کے اندر سے رنجیت نے کرخت لہجے میں کوچبان کو حکم دیا۔ گاڑی نے رفتار پکڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے راج بھون سے دور آگئی۔ اب وہ تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔ میڈم صنوبرا نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ رنجیت پانڈے کے سامنے اس نے کچھ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ پانڈے طیش سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ شاید وہ مجھے اسی جگہ شوٹ کر دیتا اور شوٹ کرنے کے بعد بھی میری لاش پر گولیاں برساتا رہتا۔ یہ بات وہ بھی اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اگر مجھے یہاں آناً فاناً شہرت ملی ہے اور لوگوں نے مجھے جارج کا خطرناک مدمقابل سمجھنا شروع کیا ہے تو اس کی وجہ بھی ہے کہ میں نے نیل پانی کی لڑائی میں اسے نیچا دکھایا ہے۔ یہ بات اب شاید کسی سے بھی چھپی نہیں رہی تھی کہ دیوان کے اندر ہونے والی لڑائی میں رنجیت پانڈے نے ہوشیاری سے مین سوئچ آف کر کے اندھیرا کیا تھا اور موقع سے کھسک کر اپنی جان بچائی تھی۔

میڈم کی رہائش گاہ لال بھون میں واپس پہنچ کر میں عجیب الجھن کا شکار ہو گیا۔ میرے ذہن میں بار بار ہاشو کی شبیہ ابھر رہی تھی۔ اس کا کردار عجیب ڈھنگ سے سامنے آیا تھا۔ وہ گونگا نہیں تھا اور گونگے کے طور پر ایک مدت سے مختار راجپوت کے گھر میں مقیم تھا۔ اس پر راج بھون کی طرف سے بہت سے الزامات لگائے جارہے تھے اور یہ نہایت سنگین الزام تھے۔ ہاشم عرف ہاشو خود اعتراف کر رہا تھا کہ جو زہر کے پیکٹ ہمیں دکھائے گئے، وہ اسی کے تھے اور وہ ان سے بہت سے لوگوں کو ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سب کے سامنے برملا کہا تھا کہ اگر ابھی اس کی زندگی باقی ہوئی اور اسے آزاد فضا میں پہنچنا نصیب ہوا تو وہ پھر یہی کچھ کرے گا جو اس نے اب کیا ہے۔

میری گہری سوچ اور فکرمندی عمران کو بھی متاثر کررہی تھی۔ وہ بولا۔ ''کس فکر میں کھو گئے ہو جگر؟''

''وہی ہاشو والا معاملہ...'' میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بھی دیکھ لیا ہوگا... اس پیکٹ میں ویسا ہی

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زہر تھا جیسا سلطانہ کے پاس پڑیا میں تھا۔"
"ہاں... یہ بات تو واقعی غور کرنے والی ہے مگر اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ سلطانہ کے پاس وہ پڑیا ملنے کا مطلب خدانخواستہ یہ تو ہرگز نہیں ہوسکتا کہ وہ ہاشو کے کاموں میں شریک ہے یا اس کے مقصد سے جڑی ہوئی ہے۔"
"پھر بھی ذہن میں وسوسہ تو پیدا ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔
"اور وسوسوں کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو وسوسہ ہی رہتا تھا کہ ہے یا نہیں۔ ویسے یار! مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ حکیم لقمان کی وجہ شہرت اس کی قابلیت تھی یا پھر یہ محاورہ تھا۔"
میں نے قالین پر لیٹ کر اپنا سر بازو کے تکیے پر رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ فکرمندی دل و دماغ میں سرایت کر رہی تھی۔ کہیں سلطانہ کا تعلق سچ مچ تو ایسے لوگوں سے نہیں تھا جن کا مذہب اور عقیدہ صرف اور صرف خوں ریزی ہوتا ہے۔ کیا وہ اس طرح کی سوچ ذہن میں پال سکتی تھی؟ ذہن نے فوراً جواب دیا... نہیں، وہ ایسی نہیں ہوسکتی۔
لیکن یہ تو ہوسکتا تھا کہ وہ اپنی نا سمجھی کے سبب کسی کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی ہو۔ کسی ان چاہے دھارے میں بہہ گئی ہو۔ ایسا ہونا ناممکن بھی نہیں تھا۔ شاید میں واقعی ایک شوہر کی حیثیت سے اسے پیار کرنے لگا تھا۔ اس کے اچھے بھلے کی فکر کرنے لگا تھا۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر تشویش کی یہ لہریں کیوں میرے رگ و پے میں ہلچل مچا رہی تھیں۔
ہاشو کا کردار کسی طور بھی قابلِ تعریف نہیں تھا، بالکل جیسے مالا کی دادی ساس کا کردار قابلِ تعریف نہیں تھا۔ بہرحال، جو کچھ بھی تھا آج عمران نے بھرے دربار میں حکم، اس کے مصاحبوں، پنڈتوں اور عاملوں کا منہ بڑی خوب صورتی سے بند کیا تھا۔ انتہا پسند کس جگہ موجود نہیں ہیں... ہاں کس جگہ موجود نہیں ہیں۔
میں وہیں لیٹے لیٹے اونگھنے لگا۔ کچھ دیر بعد میرے کانوں میں عمران اور ایک لڑکی کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ گوری نامی یہ لڑکی ہماری دو خادماؤں میں سے تھی۔ پارسن ہونے کے باوجود یہ گوری چٹی اور قبول صورت تھی۔ عمران اکثر اس سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ عمران کسی لڑکی کی طرف متوجہ ہو اور وہ توجہ نہ دے... وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا اور یہی نہیں، اس کی گفتگو کی مقناطیسی طاقت کسی کو اپنے جال سے نکلنے نہیں دیتی تھی۔ یہ گوری نامی لڑکی ان بے دام کی کنیزوں میں سے تھی جو اپنے مالکوں کی ہر "قسم" کی خدمت کے لیے ہر وقت اور ہر جگہ تیار رہتی ہیں... عمران اشارہ بھی کرتا تو وہ اس کی ہر بات ماننے کو تیار ہو جاتی اور اسے خوش قسمتی بھی سمجھتی۔ لیکن وہ تو صرف وقت گزاری کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ بڑے خلوص سے لڑکی کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی تعریف کر رہا تھا اور اسے بتا رہا تھا کہ ایسی آنکھیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ پچھلے زمانے میں ایک امراؤ جان ادا ہوئی تھی یا پھر اب وہ ہے جو ایسی دھانسو آنکھیں رکھتی ہے۔
پھر وہ بولا۔ "لیکن گوری! ایسی بڑی بڑی لاجواب آنکھیں رکھنے کے باوجود تم کپڑے ٹھیک سے استری نہیں کرتی ہو۔ اب دیکھو، تم یہ جو پینٹ استری کر کے لائی ہو، یہ اوپر سے اب بھی سلوٹوں والی ہے۔"
وہ ہکلائی۔ "دراصل... اوپر سے... اوپر سے... آپ کا پتلون استری کرتے ہوئے ہام کو شرم آتا ہے..."
"ہائیں، یہ کیا بات ہوئی؟"
"بس جی... پہلے ایسا نہیں تھا، پر اب ایسا ہوتا ہے۔"
"یہ کیا پہیلی ہے... کیا کوئی بھی پتلون استری کرتے ہوئے ایسا ہوتا ہے؟"
"نہیں جی نہیں... بس آپ کا پتلون۔" وہ کسی دوشیزہ کے انداز میں ہنسنے لگی۔
"پھر کیا کرتی ہو؟"
"ہام آنکھیں بند کر کے استری پھیرتا ہے۔"
"وہ تو پتلون دیکھ کر ہی پتا چل رہا ہے۔"
"آپ ہام کو بہت اچھا لگتا، ہام آپ کے لیے یہ گلاب کلی لایا۔" پھر اس نے شاید اپنے لباس کے اندر سے کوئی کلی نکال کر عمران کو دی۔
عمران نے کہا۔ "یہی بات ہے کہ تم بھی ہام کو بہت اچھا لگتا۔ ہام تم سے شادی کرنا مانگتا۔ لیکن اگر ہام شادی کرنا مانگتا تو ہمارا پپا اور وہ انکل ہمارا سر توڑنا مانگتا۔"
"لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ آپ نے شادی نہیں بنائی۔"
"ہام نے کہاں بنائی، ہام سے زبردستی بنائی گئی اور ایک بار نہیں دوبار۔"
وہ ہنس کر بولی۔ "ہام کا اتنا قسمت کہاں کہ ہام آپ سے شادی بنانے کا سوچے۔ ہام تو بس آپ کا خوشبو سونگھ کر پی ہو جاتا۔" اس کے لہجے میں نوخیزی اور الھڑپن کی جھلک

تھی۔
"اوہ، خوشبو سے یاد آیا کہ کل غسل خانہ ٹھیک سے صاف نہیں ہوا تھا۔" عمران نے کہا۔
"اوہ سوری! ہام ابھی کرتا، بالکل شیشہ بنا دیتا۔" اس نے کہا۔
اس کے قدموں کی آواز آئی۔ یقیناً وہ عمران کو اپنی چال کی دل ربائی دکھاتی ہوئی غسل خانے کی طرف چلی گئی تھی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ عمران میرے قریب آ کر لیٹ گیا۔ دو تین منٹ بعد میں نے کروٹ بدلی تو میری نگاہ غسل خانے کے ادھ کھلے دروازے پر پڑی۔ میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے تیزی سے اٹھنا پڑا۔ مجھے غسل خانے میں گوری فرش پر گری نظر آئی تھی۔
"کیا ہوا؟" میں نے پکار کر پوچھا اور تیزی سے غسل خانے کی طرف بڑھا۔
عمران بھی اٹھ بیٹھا تھا۔ "رک جاؤ۔" مجھے اپنے عقب سے عمران کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔
میں اس وقت تک غسل خانے کے دروازے کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ یکایک میرے پاؤں کے نیچے سے قالین نکل گیا۔ قالین کو زور سے پیچھے کی طرف کھینچا گیا تھا۔ میں اوندھے منہ عین دروازے کے سامنے گرا۔ قالین کھینچنے والا عمران تھا۔
عمران لپکتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔ اب ہم دونوں باتھ روم میں دیکھ رہے تھے۔ یہ ایک تکلیف دہ منظر تھا۔ گوری گیلے فرش پر پڑی تھی... اور مر چکی تھی... اسے غسل خانے کی ٹونٹی سے بجلی کا زوردار جھٹکا لگا تھا۔ اس کا گورا چٹا ہاتھ ابھی تک ٹونٹی پر تھا اور عجیب انداز سے مڑا ہوا تھا۔
"آگے نہ جانا۔" عمران نے ایک بار پھر وارننگ دی۔ "نلکوں میں کرنٹ دوڑ رہا ہے۔"
عمران کی زوردار آوازیں سن کر دو گارڈز کھڑکی کے سامنے آ گئے تھے۔ "کیا ہوا سر؟" ایک نے بلند آواز میں پوچھا۔
"یہاں کرنٹ ہے۔ مین سوئچ بند کرو۔"
گارڈز دوڑتے ہوئے ایک طرف اوجھل ہو گئے۔ چند سیکنڈ بعد بجلی کی رو منقطع ہو گئی۔ ہم غسل خانے میں گئے۔ گوری کو اٹھا کر کمرے میں لائے۔ اس میں زندگی کے آثار نہیں تھے۔ پھر بھی ہم دونوں نے اسے فرسٹ ایڈ دینے کی کوشش کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے میجر مدن اور درجن بھر گارڈز کمرے میں پہنچ گئے۔

برنارڈ شا

ایک صحافی نے جارج برنارڈ شا سے انٹرویو کے دوران پوچھا۔ "آپ کی طویل العمری کا راز کیا ہے؟" برنارڈ شا نے جواب دیا۔ "میں ہمیشہ سر ٹھنڈا اور پاؤں گرم رکھتا ہوں۔" انٹرویو شائع ہوا تو برنارڈ شا کے لاکھوں مداحوں نے پڑھا اور پھر ہزاروں لوگوں نے سر پر برف رکھنا شروع کر دی اور پاؤں بھی سینکنے شروع کر دیے۔ نتیجہ میں کسی کو سرسام ہو گیا تو کسی کو بخار۔ چنانچہ ایک ہفتے کے بعد لوگوں کا ایک بہت بڑا جلوس مظاہرہ کرتا ہوا برنارڈ شا کے دروازے پر پہنچا تو برنارڈ شا نے مظاہرین سے کہا۔ "بیوقوفو! تم نے جو سمجھا غلط ہے۔ میرا مطلب وہ نہ تھا جو تم سمجھ بیٹھے ہو۔ دراصل سر ٹھنڈا رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ میں کبھی غصہ میں نہیں آتا اور پاؤں گرم رکھنے سے میری مراد یہ تھی کہ میں ہمیشہ پیدل چلتا ہوں۔ یہی میری طویل العمری کا راز ہے۔"

حنیہ عمران، سیالکوٹ

میجر مدن نے گوری کو طبی امداد کے لیے لے جانا چاہا مگر جلد ہی اسے بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ مر چکی ہے۔ صرف چند منٹ پہلے عمران کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں کرنے والی اور دلنشیں انداز میں مسکرانے والی یہ نوخیز ملازمہ اب مٹی کا ڈھیر بن چکی تھی۔
"یہ سب کیسے ہوا؟" میجر مدن نے ہکلا کر پوچھا۔
"یہ ہوا نہیں، کیا گیا ہے۔ نلکوں میں جان بوجھ کر کرنٹ چھوڑا گیا ہے۔" عمران نے پورے وثوق سے کہا۔
"ہوسکتا ہے کہ دوسرے غسل خانوں میں بھی کرنٹ آ رہا ہو۔" مدن بولا۔
"بالکل نہیں۔ تم چیک کر کے دیکھ لو۔"
میں اور عمران میجر مدن کے ساتھ دوبارہ غسل خانے میں آئے۔ ایک منٹ کے اندر اندر ساری صورتِ حال سمجھ میں آ گئی۔ غسل خانے کے بلب کے پیچھے سے ایک تار نکالا گیا تھا اور اسے ایک پائپ کے پیچھے پیچھے چھپا کر نہانے والی ٹونٹی تک پہنچایا گیا تھا۔
"یہ اس لمبے گارڈ کا کام ہے جسے تم لوگ لیبو کہتے ہو۔" میں نے پورے یقین سے کہا۔
"وہ کیسے؟" مدن نے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کل میں نے نہانا تھا مگر پانی نہیں آرہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ پانی نہیں آرہا۔۔۔ وہ دو تین اوزار لے کر غسل خانے میں گیا اور چار پانچ منٹ وہاں رہا۔ بعد میں دیر ہو جانے کی وجہ سے میں نے نہانے کا پروگرام کینسل کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اسی بندے کا کام ہے بلکہ اس نے پانی بھی جان بوجھ کر بند کیا ہوگا۔"

منیجر مدن تین چار گارڈز کو لے کر بگولے کی طرح باہر نکل گیا۔

گوری کی نیلگوں لاش کمرے کے وسط میں پڑی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی سراسیمگی تیرنے لگی تھی۔ اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ یہ ہم پر دوسرا قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ ہم دونوں اور بالخصوص "میں" اس حملے کا نشانہ تھا۔ کچھ لوگ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ میں ان کے آقا و مربی جارج گورا کے سامنے آؤں اور اس سے "مرو یا مارو" کی فائٹ کروں۔۔۔ کچھ ہی دیر بعد میڈم صفورا بھی ہانپی کانپی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ اسے سارے واقعے کا علم ہو چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ دو تین گارڈز اپنی ڈیوٹی پر موجود نہیں اور ان میں وہ دراز قد گارڈ بھی شامل ہے۔

یہ بڑی سنگین صورتِ حال تھی۔ میڈم صفورا کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ وہ بولی۔ "میں اسی لیے تم سے بار بار کہہ رہی ہوں کہ تمہیں اپنی سیکیورٹی کی طرف سے بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔ خاص طور سے فائٹ کے روز تک۔"

منیجر مدن، میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اگر یہ خبر باہر نکلی تو لوگوں میں بڑا غم و غصہ پیدا ہووے گا۔ عام لوگوں میں پہلے ہی یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ کچھ بڑے لوگ ہرگز نہیں چاہتے کہ سامبر کا مقابلہ ہو۔ وہ تابش صاحب کو راستے سے ہٹانے کا جتن کریں گے۔"

میں نے کہا۔ "یہاں بھون کے معاملات کا مجھے زیادہ تجربہ نہیں لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ خبر باہر نہ پھیلے تو پھر یہاں موجود گارڈز اور ملازموں کو کسی صورت باہر جانے کی اجازت نہ دیں۔ خاص طور سے لڑکیوں کی ٹریز گیتا لکھی کو۔"

"یہ سب کچھ میرے ذہن میں بھی آرہا ہے۔ میں اس بارے میں کچھ کرتی ہوں۔" میڈم صفورا نے کہا اور تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

چوکس گارڈز ہمارے اردگرد آموجود ہوئے۔ یہ سب کے سب میڈم صفورا اور منیجر مدن کے انتہائی قابلِ اعتماد لوگ تھے۔ لیکن کسی کے دل میں کس نے جھانک کر دیکھا ہوتا ہے؟ ان لوگوں کے ہاتھوں میں بھری ہوئی رائفلیں تھیں اور انہوں نے انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی تھیں۔ واقعی ایک محافظ کے لیے قاتل بننا کتنا آسان ہوتا ہے۔

میں نے عمران سے کہا۔ "میرا تو دل چاہتا ہے ان سارے خدائی فوجداروں کو اپنے اردگرد سے ہٹا دوں۔ یہ سیکیورٹی دے رہے ہیں اور سیکیورٹی رسک بھی۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر تو ہمارا خون ویسے ہی خشک ہو جائے گا اور خون خشک ہو گیا تو ہمارا پسٹن یعنی دل جام ہو جائے گا۔"

میں اور عمران کمرے میں آگئے اور دھات کا بنا ہوا سلائیڈنگ دروازہ بند کر دیا۔ میں نے عمران کو تشکر کی نظروں سے دیکھا۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ بولا۔

"ایک بار پھر تم نے مجھے خودکشی کرنے سے بچایا ہے۔"

"خودکشی؟"

"ہاں۔۔۔ آج گندم میں رکھنے والی گولیاں نہیں تھیں۔۔۔ بجلی کا کرنٹ تھا۔ میں تو بھاگا جا رہا تھا گوری کو تھامنے کے لیے۔ تم نے میرے نیچے سے قالین کھینچا اور مجھے گرا دیا۔ بڑی بروقت کارروائی تھی۔ آئی رئیلی اپریشیٹ یو۔"

"لگتا ہے تم پر میڈم کا اثر ہوتا جا رہا ہے۔ ورنہ تم اردو میں بھی شکریہ ادا کر سکتے تھے۔ شکریہ اردو میں ادا کیا جائے تو خوشی بھی اردو میں ہوتی ہے۔۔۔" وہ ادھر اُدھر کی ہانکنے لگا اور مجھے اپنے موضوع سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ شام کے بعد کا ذکر ہے۔ ہمارے لیے کھانا آیا۔ حسبِ معمول یہ کھانا آٹھ بجے کے قریب آیا۔ سیکیورٹی کے نکتۂ نظر سے ہمیں کھانا پہنچانے کا کام ملازمین کے سپرد نہیں کیا گیا تھا۔ منیجر مدن خود ہمارے لیے کھانا لاتا تھا۔ اس کھانے کو باقاعدہ چیک بھی کیا جاتا تھا۔ آج اس حوالے سے مزید احتیاط نظر آئی۔ میڈم صفورا خود کھانا لائی۔ ایک ملازمہ نے بڑی ٹرے اٹھا رکھی تھی اور میڈم اس کے ساتھ چلی آرہی تھی۔

کھانے کے دوران میں میڈم ہمارے پاس ہی موجود رہی۔ اس نے کہا کہ دراز قد گارڈز کی تلاش میں مختلف جگہوں پر چھاپے مارے جا رہے ہیں اور ایک دو بندوں کو گرفتار بھی کیا گیا ہے۔ اس نے ہمیں شہر کی صورتِ حال سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ نو تاریخ کو ہونے والے مقابلے کے حوالے سے لوگوں میں زبردست جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ "یوں لگتا ہے کہ سارا زرگاں دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک

طرف جارج گورا کے حمایتی ہیں اور دوسری طرف تمہارے۔ چھوٹے بڑے جلوس نکالے جا رہے ہیں۔ دیواروں پر چاکنگ کی گئی ہے اور گلیوں میں کپڑے کے بڑے بڑے بینرز آویزاں کیے جا رہے ہیں۔"

"کون کس کی حمایت کر رہا ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"یہ غیر واضح ڈویژن ہے۔" میڈم نے جواب دیا۔ "اوور آل یہ کہا جا سکتا ہے کہ پچانوے فیصد مسلمان تمہاری سائڈ پر ہیں۔ اس کے علاوہ نچلا طبقہ اور ہندوؤں کی نیچ ذاتوں کے لوگ بھی تمہاری حمایت کر رہے ہیں۔ دراصل یہ نفسیاتی قسم کی صورتِ حال ہے۔ ایسے موقعوں پر اکثر ایسی چویشن بن جایا کرتی ہے۔ لوگوں کی دبی ہوئی نفرت اور محرومی مناسب موقع دیکھ کر ابھر آتی ہے اور انہیں اپنے آقاؤں کے خلاف کھڑا کر دیتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن یہ ماحول خطرناک بھی تو ہے۔ یہ کوئی حق و باطل کی جنگ تو نہیں ہے۔ یہ دو بندوں کے درمیان ایک انفرادی مقابلہ ہے۔ اس میں کسی کی پیٹھ بھی لگ سکتی ہے۔ اگر کسی ایسے مقابلے کے ساتھ بہت زیادہ جذبات اور عقیدے وابستہ کر لیے جائیں تو پھر فرسٹریشن بھی بڑی گمبھیر ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن رائے عامہ کا ایک اپنا بہاؤ ہوتا ہے۔ یہ بہاؤ اپنا راستہ خود سلیکٹ کرتا ہے۔ اس کا رخ موڑنا یا اس میں کمی بیشی کرنا بہت جان جوکھم کا کام ہے۔"

کھانا مزے دار تھا۔ لکھنوی طرز کی چٹ پٹی بریانی کے ساتھ دہی پودینے اور ٹماٹر کا رائتا تھا۔ ساتھ میں کھڑے مسالے والا چکن، ماش کی دال اور گرما گرم روٹیاں تھیں۔۔۔ ہم نے سیر ہو کر کھایا۔ میڈم کے جانے کے بعد بھی ہم گپ شپ میں مصروف رہے۔۔۔ ہماری گفتگو کا اہم موضوع آج پیش آنے والا حادثہ ہی تھا۔ کھڑکیوں سے باہر ایک تاریک سرد رات گلی کوچوں کو اپنے نرغے میں لے چکی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی خاموشی اور تنہائی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ شہر کے باسی شاید آج جلدی سو گئے ہیں۔

۔۔۔ اچانک یوں لگا کہ خاموشی کی اس جھیل میں زبردست شور کے ساتھ سیکڑوں پتھر آگرے ہیں۔ یکایک یک تارے کی آواز آئی، اس کے ساتھ ہی بے شمار دھماکے ہوئے اور مختلف رنگوں کی ان گنت روشن لکیریں فضا میں بلند ہوئیں۔ کچھ بلندی پر جا کر ان لکیروں میں سے پٹاخے پھوٹے اور آتش بازی کے ہزار ہا رنگ زرگاں کی فضاؤں میں بکھر گئے۔

"اوہ گاڈ! لگتا ہے ساتویں کا جشن شروع ہو گیا ہے۔" عمران نے کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، یہ ساتویں کے جشن کا آغاز تھا۔ زرگاں کا آسمان لاتعداد رنگوں سے جگمگایا اور اس کے گلی کوچوں میں شورِ محشر برپا ہو گیا۔ اس شور میں باجا گاجا تھا، نعرہ زنی تھی اور آتش بازی کے دھماکے تھے۔ ہمارے کمرے کی کھڑکی میں سے دور کچھ فاصلے پر کسی گھر کی بلند چھت نظر آرہی تھی۔ اس چھت پر ایک ساتھ کئی انار چلائے گئے۔ ان اناروں میں سے شرارے فواروں کی طرح چھوٹے اور قرب و جوار کو منور کر گئے۔ ان شراروں کی روشنی میں چھت پر مرد و زن رقص کرتے نظر آئے۔

ایک بار یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر اس نے رکنے کا نام نہیں لیا۔ شدید ترین آتش بازی تو قریباً آدھ گھنٹے تک رہی لیکن اس کے بعد بھی یہ کام رکا نہیں۔ ہم کمرے میں آرام دہ نشستوں پر بیٹھے رہے اور یہ مناظر دیکھتے رہے۔ ایسے ہی مناظر میں نے کچھ عرصہ پہلے قل پانی میں دیکھے تھے۔ اس وقت عمران میرے ساتھ نہیں تھا۔ میں اس کی یاد میں تڑپ رہا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ میں اسے ہمیشہ کے لیے کھو چکا ہوں۔ لیکن آج وہ میرے ساتھ تھا۔ ہم ایک دوسرے کا بازو تھے۔ ایک اور ایک گیارہ کی زندہ مثال کی طرح۔ بے شک ہم دشمنوں کے گھیرے میں تھے اور کل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن آج ہمارا تھا۔۔۔ اور ہم اس "آج" کو اس کی ساری خطرناکیوں کے ساتھ انجوائے کر رہے تھے۔ ایک میٹھا میٹھا درد بھی تھا، کچھ تیز تیکھے اندیشے بھی تھے۔ کھڑکی سے باہر کوریڈور کی دیوار پر فلمسٹار ریکھا کی تصویر ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمک رہی تھی۔

ہمارے سامنے چائے کے مگ تھے۔ عمران سگریٹ کے چھوٹے چھوٹے کش لے رہا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر شعلے دکھائی دیے، ان شعلوں کے درمیان ایک بندر اچھل کود کر رہا تھا۔۔۔ اس کی دُم میں آگ لگی تھی۔ دراصل یہ ایک تنومند شخص تھا جس نے ہنومان کا روپ دھارا ہوا تھا اور جو شعلے نظر آرہے تھے، وہ راون کی لنکا کے جلنے کے تھے۔ بھون کے وسیع و عریض گراسی لان میں یہ ناٹک رچایا جا رہا تھا۔ یہ ہندو دیومالا کے واقعات میں سے ایک اہم واقعہ تھا۔

عمران نے ایک آہ بھری اور کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ "کل منیجر مدن کہہ رہا تھا، دیومالا کے واقعات کو ناٹک کے طور پر پیش کرنے سے بلائیں ٹلتی ہیں اور بھگوان کی طرف سے روزی میں برکت ہوتی ہے۔ اور منیجر مدن ایک تعلیم یافتہ

digestpk.blogspot.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شخص ہے۔" میں سمجھ گیا کہ عمران کیا کہنا چاہ رہا ہے..... وہ دقیانوسیت اور توہم پرستی کی بات کر رہا تھا۔ اچانک مجھے آج سے پہلے والا سارا واقعہ یاد آ گیا۔ عمران نے جس طرح بھری محفل میں حکم اور اس کے مصاحبوں کو لاجواب کیا، وہ یادگار تھا...... اس کے علاوہ اس موقع پر عمران کے شوخ چہرے پر جو بے پناہ سنجیدگی دکھائی دی، وہ بھی ایک خاص الخاص چیز تھی۔ میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "عمران! کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ تم بھی کسی ایسی ہی دقیانوسیت کے ڈسے ہوئے ہو جس کے مظہر آج حکم کے دربار میں نظر آئے... اور ہاشو اور مالا کی دادی ساس جیسے لوگ جس کے نمائندے ہیں۔"

"میں تو سمجھتا ہوں جگر کہ ساری انسانیت ہی ایسے مہلک واہموں کی ڈسی ہوئی ہے۔ کوئی تھوڑا متاثر ہے، کوئی زیادہ اور کوئی بہت زیادہ۔"

میں نے بغور عمران کی طرف دیکھا۔ اس نے نشست سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ خوب صورت آنکھوں میں کھوئی کھوئی کیفیت تھی۔ زرگاں میں ہونے والی آتش بازی کے رنگ اس کے چہرے پر منعکس ہو رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "عمران! ہماری دوستی کو کئی سال ہو گئے ہیں لیکن تم آج بھی میرے لیے ایک پہیلی ہو۔ تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو لیکن میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ایسا کیوں ہے یار؟"

"تم اکیلے ہی تو میرے بارے میں بے خبر نہیں ہو۔" وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔

"لیکن تم مجھے اپنا قریبی دوست اور ہمدم کہتے ہو۔ کیا قریبی دوست اور ہمدم اسی طرح بے خبر ہوتے ہیں؟"

"یار! کیوں گڑے مردے اکھاڑنا چاہ رہے ہو؟ بہت سے زخم چھل جائیں گے، مہینوں تک خون رستا رہے گا۔" وہ پھر مسکرایا۔ اب اس کی مسکراہٹ میں حزن کی آمیزش تھی۔

میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "عمران! صرف چار دن بعد میری زندگی میں ایک بہت اہم واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ میں ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی موت کی لڑائی لڑنے والا ہوں جسے یہاں شکتی کا دیوتا کہا جاتا ہے...... وہ دیوتا ہے یا نہیں، یہ علیحدہ بات ہے لیکن یہ بات تو تم بھی مانو گے کہ وہ ایک نہایت خطرناک حریف ہے۔ چار دن بعد میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے یار! اور اگر واقعی میرے ساتھ کچھ ہو گیا تو کیا میں تمہارے بارے میں کچھ جاننے کی حسرت دل میں لے کر ہی چلا جاؤں گا؟ کیا تمہیں یہ سب اچھا لگے گا؟"

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ کچھ بولے گا لیکن وہ بولا نہیں۔ کتنی ہی دیر تک کمرے میں گمبھیر خاموشی رہی۔ کھڑکیوں سے باہر آتش بازی کے رنگ بکھرتے رہے اور باجے گاجے کا مدھم شور ہمارے کانوں تک پہنچتا رہا۔ پھر عمران نے نیا سگریٹ سلگایا اور بغیر کسی تمہید کے ایکا ایکی بولنا شروع کر دیا۔ اس کی آواز گم گشتہ یادوں کے بوجھ سے لدی ہوئی تھی۔ اس کے الفاظ دھیرے دھیرے میرے سامنے ایک کہانی کی پرتیں کھولنے لگے۔ ایک گداز روداد کے پیچ و خم میرے سامنے نمایاں ہوتے چلے گئے۔ واقعات کا ایک جہاں سا آباد ہو گیا۔ میں عمران کی اس روداد کو اپنے الفاظ میں قارئین کے سامنے بیان کر رہا ہوں۔ اس میں پچانوے فیصد باتیں عمران کی کہی ہوئی ہیں۔ جہاں جہاں خلا تھا، وہ میں نے اپنے تصور سے پُر کیا ہے۔ اس میں جو انوکھا پن ہے، وہ غیر حقیقی نہیں۔ اس کی سائنسی بنیاد موجود ہے۔ نفسیات کے ماہر بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی ذہن کی کیمسٹری کے بارے میں ابھی بہت کچھ جاننا باقی ہے۔ عمران کی کہانی کچھ یوں ہے۔

وہ شمالی پنجاب کا ایک گاؤں تھا۔ برسات کی ایک طوفانی رات تھی۔ رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی اور پھر گھن گرج سے در و دیوار لرز جاتے تھے۔ ہر جاندار و بے جان شے سہمی ہوئی نظر آتی تھی اور ان سب سے زیادہ سہمے ہوئے وہ دو نفوس تھے۔ ایک تنہا کچے گھر میں ایک ماں اور اس کا بیٹا۔ چاندی بالوں والی ماں کی عمر قریباً پچاس سال رہی ہو گی۔ بیٹا قریباً سولہ سال کا تھا۔ اس خوفناک طوفانی رات میں ماں نے بیٹے کو یوں بازوؤں میں چھپایا ہوا تھا جیسے مرغی چوزے کو پروں سے ڈھانپتی ہے۔

یہ واقعی بہت خوفناک رات تھی۔ یوں لگتا تھا کہ مکان مسمار ہو جائیں گے اور درخت جڑوں سے اکھڑ جائیں گے۔ آسمان اپنے ذخیروں کا سارا پانی زمین پر الٹ دینا چاہتا تھا اور ہوائیں اپنی ساری سرکشی آزما لینا چاہتی تھیں۔ اچانک بڑے زور سے بجلی چمکی۔ اس کا لشکارا گھروں کے اندر تک آیا پھر ایسا کڑاکا سنائی دیا کہ سینوں میں دل دہل گئے۔ عورت نے چلا کر اپنے جواں سال بچے کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

"یا اللہ خیر... یا اللہ خیر... لگتا ہے بجلی پنڈ میں گری ہے۔" اس نے بے تاب ہو کر کہا۔

"نہیں امی، کہیں کھیتوں میں گری ہو گی۔" لڑکا بولا۔

"کھیتوں میں نہیں پنڈ میں گری ہے۔ مجھے پتا ہے سارے لوگ کہتے ہیں کہ بجلی چودھری کے پتر نیاز پر عاشق ہے۔"

"نہیں امی ایسی باتیں ہوتی ہیں۔ ماسٹر جی کہتے ہیں کہ ایسی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ بجلی تو اس لیے چمکتی ہے کہ ایک بادل پر جمع کا چارج ہوتا ہے، دوسرے پر تفریق کا... جب یہ دونوں بادل..."

"اچھا... اچھا بس کر... اب اپنی تقریر شروع نہ کر دینا... کچھ اللہ توبہ کر... آیت الکرسی آتی ہے نا... بس وہ پڑھتا رہ..."

لڑکے کے لیے ماں کا کہا حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا اور اس نے منہ میں ورد شروع کر دیا۔

بجلی تڑپتی رہی، بادل دہاڑتے رہے اور پانی برستا رہا۔ ماں بیٹا دیے کی لو میں ایک دوسرے سے لپٹے بیٹھے رہے۔ یہ ایک طوفانی رات تھی اور طوفانی راتوں کی ہلاکت خیزیاں صبح کے وقت عیاں ہوتی ہیں۔ اس طوفانی رات کی صبح بھی اس ماں بیٹے کے لیے ایک بڑی مصیبت لے کر آ رہی تھی۔

بیٹے کا نام عمران تھا۔ اسے پیار سے عمو کہا جاتا تھا۔ وہ اپنی بیوہ ماں کا اکلوتا تھا۔ اس سے پہلے اس کے چار بہن بھائی ایک سال کی عمر کے اندر ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اس کی ماں بس اسے پروان چڑھا سکی تھی اور اب وہ اس کا واحد سہارا تھا۔ پانچ چھ سال پہلے عمو کا والد بھی ایک حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا کاشت کار تھا۔ اس کے پاس بہت تھوڑی سی زمین تھی تاہم اس زمین کو اس نے اتنے اچھے طریقے سے استعمال کیا تھا کہ اس چھوٹے سے کنبے کی گزر بسر آسانی سے ہو جاتی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ یعنی عمو کی والدہ اس زمین کو سنبھال نہیں سکی تھی۔ اس نے گھر چلانے کے لیے یہ زمین ٹھیکے پر دے دی تھی۔ کچھ اناج اور کچھ پیسے مل جاتے تھے جس سے وہ جیسے تیسے زندگی کی گاڑی چلا رہی تھی۔ اس کی بس ایک ہی خواہش تھی۔ اس کا عمران پڑھ لکھ کر ایک بڑا آدمی بن جائے... ایک افسر، ایک ڈاکٹر یا پھر ایسا ہی کوئی قابل عزت شخص۔ وہ اسے اپنا پیٹ کاٹ کر پڑھا رہی تھی۔ وہ ایک مثالی ماں تھی۔ ایثار، شفقت اور وفا کا پیکر۔ عمو کے لیے وہ ایک ایسے شجر سایہ دار کی طرح تھی جس کے تلے وہ دنیا کے ہر رنج و غم سے دور تھا۔ اس کی زندگی کا محور صرف اور صرف اس کی ماں تھی۔

اس طوفانی شب کی صبح بھی ماں اسے اسکول بھیجنے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کی کتابیں سنبھالنے کے بعد رومال میں اس کا کھانا باندھ رہی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر جا کر عمو نے ہی دروازہ کھولا۔ وہ اپنے سامنے اونچی پگڑی والے چودھری سجاول اور اس کے منشی اکبر کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

چودھری سجاول نے عمو کے سر پر پیار دیا اور پھر کھنگورے مارتا ہوا اندر آ گیا۔ عمو کی ماں نے گاؤں کے چودھری کو اپنے سامنے دیکھ کر جلدی سے اوڑھنی درست کی اور ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔

"چودھری جی! ہمارے اتنے بھاگ کہ آپ ہمارے گھر میں آئے۔ یہاں تو ایسی کرسی بھی نہیں کہ آپ کو بٹھا سکیں۔"

چودھری چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "بہین شریفاں! میں آج یہاں چودھری نہیں سوالی بن کر آیا ہوں۔"

"ہائے میں مرگئی چودھری جی... یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ ہم غریبوں کی اتنی حیثیت کہاں کہ آپ ہم کو کوئی ضرورت بتائیں۔"

"بس آج کوئی ایسی ہی بات ہے بہین شریفاں۔" چودھری نے خلاف معمول عجز کے لہجے میں کہا پھر ذرا توقف کر کے بولا۔ "تمہیں پتا ہے رات کو کیا ہوا ہے؟"

"کیا ہوا ہے چودھری جی۔" عمو کی ماں نے چونک کر پوچھا۔ یقیناً اسے رات کو سنائی دینے والا بجلی کا زبردست کڑاکا یاد آ گیا تھا۔

چودھری نے بتایا۔ "حویلی کے پچھواڑے، باہر والی دیوار کے بالکل پاس بجلی گری ہے۔ دو بھینسیں مر گئی ہیں، بوڑھ کا درخت بھی جل کر کوئلہ ہو گیا ہے۔"

"ہائے میں مرگئی۔" عمو کی والدہ نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "مجھے رات کو ہی لگا تھا کہ بجلی پنڈ کے اندر ہی کہیں گری ہے۔"

"بس بہین شریفاں! بال بال بچے ہیں۔ ایویں آٹھ دس قدموں کا فرق رہ گیا۔ ساتھ ہی تو وہ کمرے ہیں جہاں سوتے ہیں ہم.... بس یہ سب وہی پتر نیاز والا معاملہ ہے۔ پچھلے مہینے میں اسے گجرات کے قریب شہنشاہ پیر کے مزار پر بھی لے کر گیا تھا۔ وہاں کے گدی نشین پیر صادق شاہ نے بھی یہی کہا ہے۔ نیاز پہلوٹی کا بچہ ہے اور بجلی اس پر عاشق ہے۔ یہ اس کو کسی بھی وقت نقصان پہنچا دے گی۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو، نیاز کے بڑے تایا کی جان بھی اسی طرح گئی تھی۔ اللہ نہ کرے... اللہ نہ کرے اس کی زندگی کو بھی..." چودھری کی

Digest of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آواز بھرا گئی اور وہ پگڑی کے پلو سے نادیدہ آنسو خشک کرنے لگا۔

''آپ ایسی بات منہ سے کیوں نکال رہے ہیں چودھری جی؟ رب نہ کرے چھوٹے چودھری پر کوئی آنچ آئے۔ ہماری جندگی، ہمارے بچوں کی جندگی چھوٹے چودھری کو لگ جائے۔''

چودھری کچھ دیر خاموش رہا پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ ''بھین شریفاں! اللہ تمہاری اور تمہارے بچے کی حیاتی لمبی کرے... میں تم سے بس ایک چھوٹی سی منت کرنے آیا ہوں اگر تم مان لو تو۔''

''آپ حکم کریں چودھری جی۔'' عمو کی والدہ نے کہا۔ ''لیکن پہلے آپ بتائیں آپ کی کیا خدمت کروں... کوئی لسی پانی، دودھ وغیرہ؟''

چودھری نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''بھین شریفاں! میں نے تمہیں بتایا ہے نا، پچھلے مہینے کی دوسری جمعرات میں پیر صادق شاہ کے آستانے پر گیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ پتر نیاز پر سے یہ مصیبت ٹالنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اس کا سر منڈوا کر اسے چولا پہنایا جائے اور کم از کم ایک سال کے لیے مزار کی خدمت کے لیے بھیج دیا جائے۔ اس کا کھانا پینا، سونا سب کچھ وہیں مزار کے اندر ہو۔ میں اس کام کے لیے بالکل تیار تھا لیکن یہاں مصیبت یہ آپڑی ہے کہ پتر نیاز کو مسلسل بخار چڑھا ہوا ہے۔ ایک مہینا ہو گیا ہے، بخار ٹوٹنے کا نام نہیں لیتا۔ ڈاکٹر بتا رہا تھا کہ نیاز کو مکمل علاج اور آرام کی لوڑ ہے۔ میں نے اس بارے میں پیر صادق شاہ سے بات کی تھی۔ انہوں نے اس کا ایک حل بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کوئی ایسا بچہ جو نیاز کی عمر کا ہو اور اپنے ماں پیو کی آخری اولاد ہو، نیاز کی جگہ مزار پر خدمت کر سکتا ہے۔ اس کے لیے پیر صاحب نے ایک دو شرطیں بتائی ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ دس ہزار روپے کا نذرانہ مزار کو دینا پڑے گا۔ یہ سب کچھ تو اتنا مشکل نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ بچہ مل جائے جو نیاز کی جگہ ایک سال کے لیے اپنے گھر والوں سے دور رہ سکے۔''

عمو کی والدہ نے ایک دم چونک کر چودھری سجاول کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں یکایک ان گنت اندیشے جاگ اٹھے۔

منشی نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''وڈی آپا! اگر تمہارا بیٹا عمو، پتر نیاز کی جگہ لے سکے تو چودھری صاحب اور ہم سب تمہارے بڑے احسان مند ہوں گے۔ پتر عمو کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہم اس کا وہاں پورا پورا خیال رکھیں گے۔ تم دو ڈھائی مہینے میں ایک بار وہاں جا کر اس سے مل بھی سکو گی۔''

چودھری نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اگر خود چاہو تو حویلی میں ہمارے مہمان کی طرح رہ سکو گی۔ تمہیں ہر طرح کا آرام ہوگا۔ زمین کی طرف سے بھی فکر کرنے کی کوئی لوڑ نہیں ہوگی۔''

''لل... لیکن چودھری جی! عمو کے تو دسویں کے امتحان ہونے والے ہیں؟''

''اس کی فکر نہ کرو بھین! اگلے سال اس کو دو جماعتیں اکٹھی پاس کرا دیں گے۔''

''پر چودھری جی! یہ تو... یہ تو میرے بغیر رہ ہی نہیں سکتا... کملا ہو جاتا ہے میرے بغیر۔ یہ کیسے رہ سکے گا ایک سال تک گجرات میں؟''

''بھین شریفاں! تم سے کہا تو ہے کہ تم ڈیڑھ دو مہینے بعد جا کر اس سے مل سکو گی۔ ہم بھی پورا دھیان رکھیں گے اس کا۔'' چودھری سجاول کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آ گئی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ عمو کو اپنے بیٹے نیاز کی جگہ گجرات کے اس دور دراز دیہہ میں بھیجنے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکا ہے، اب عمو کو وہاں جانا ہی جانا ہے، پیار محبت سے یا پھر دباؤ سے۔

عمو کی والدہ کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس اچانک آفت کا مقابلہ کیسے کرے اور گاؤں کے چودھری کو کیا جواب دے۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ یہ آسان معاملہ نہیں ہے اور اسے ٹالنا بھی نہایت مشکل ہوگا۔ چودھری کو اپنے لاڈلے بیٹے پر سے بلا ٹالنے کے لیے کسی کی قربانی کی ضرورت تھی۔ اسے نیاز کا ایک ہم عمر لڑکا چاہیے تھا اور وہ بھی ایسا جو اپنے والدین کی آخری اولاد ہو اور وہ مزار کا خادم بننے کے لیے رضامند بھی ہو جائے۔ یہ ساری شرطیں گاؤں میں کہیں اور پوری ہونے کا امکان نہیں تھا۔

عمو کی والدہ، چودھری سجاول اور منشی اکبر میں بات چیت جاری رہی۔ عمو کو کچھ دیر کے لیے کمرے سے باہر بھیج دیا گیا۔ مدھم آوازیں عمو کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ ان آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بات چیت میں تلخی آ چکی ہے۔ چودھری سجاول کا لہجہ اب واضح ناراضی لیے ہوئے تھا۔ وہ گاہے بگاہے ان احسانوں کا ذکر بھی کر رہا تھا جو ماضی میں حویلی والوں کی طرف سے عمو کے گھرانے پر کیے گئے تھے۔

عمو کے سینے میں کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ وہ ماں کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کراچی
ماہنامہ
پاکیزہ

جولائی 2011ء
کے دلہن نمبر
کی ایک جھلک

اگر ملنا نہیں ہمدم
ذکیہ بلگرامی کے ناول کی آخری قسط

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
شیریں حیدر کے قلم سے

خوشبو کا سفر
عالیہ بخاری کا ناول ایک نئی مہک کے ساتھ

راحت وفا کا ناول ایک تھی نیناں
نفسیاتی احساسات و خیالات سے مزین

میمونہ خورشید اور رضوانہ پرنس
کے پُر تاثر ناولٹ سچے جذبوں سے مزین

عطیہ عمر، عالیہ حرا،
سلمیٰ غزل، تحسین اختر،
راحت راجپوت اور دیگر مصنفات کے
دلہن نمبر کے حوالے سے تحریر کردہ خاص افسانے

آپ کی آراء و گزارشات کے سبب مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ [illegible]

بغیر چند گھنٹے مشکل سے گزارتا تھا۔ اسکول کے بعد گھر کی طرف یوں لپکتا تھا جیسے لوہا چون، مقناطیس کی طرف۔ اگر کسی دن کسی مجبوری کے سبب ماں گھر میں نہ ہوتی تو اسے سب کچھ خالی خالی لگتا، بھوک مر جاتی اور اسے محسوس ہوتا کہ چھٹی ہو کر بھی چھٹی نہیں ہوئی ہے۔

کچھ دیر بعد عمو نے دیکھا کہ چودھری سجاول غصے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گھر سے باہر جا رہا ہے۔ چھوٹے قد کا منشی اکبر بھی اس کے ساتھ تھا۔ عمو نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی میں سے ماں کو دیکھا، وہ دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ ابھی عمو سوچ ہی رہا تھا کہ ماں کے پاس جائے یا نہیں کہ گھر کے دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ ماں نے جلدی جلدی آنسو پونچھتے ہوئے عمو کو آواز دی۔ ''دیکھو ذرا باہر کون ہے؟''

عمو نے صحن میں جا کر دروازہ کھولا۔ منشی اکبر پھر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ منشی اکبر نے عمو کے سر پر پیار دیا اور اندر آ گیا۔ وہ کمرے میں آ کر عمو کی ماں کے قریب ہی پیڑھی پر بیٹھ گیا اور نرم لہجے میں اسے سمجھانے بجھانے لگا۔ ''وڈی آپا! چودھری جی مشکل میں ہیں۔ چودھرانی جی کا بھی رو رو کر برا حال ہے۔ دیکھو وڈی آپا! میں تمہیں اندر خانے کی بات بتاتا ہوں۔ چودھری جی مجبور ہیں۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی رستہ ہی نہیں ہے کہ نیاز کی جگہ عمو کو مزار کی خدمت کے لیے بھیجیں۔ ہمارے پنڈ میں اور ارد گرد کے پنڈوں میں کوئی اور ایسا لڑکا ملا ہی نہیں جو پیر جی کی بتائی ہوئی شرطوں پر پورا اتر سکے۔ صرف میاں پور میں ایک ملا تھا مگر وہ لوہار برادری کا ہے۔ پیر جی کی یہ شرط بھی ہے کہ لڑکا کمی ذات کا نہ ہو۔ وڈی آپا! اب یہ بات تو صاف ہے کہ عمو کو گجرات جانا ہی پڑے گا۔ تمہاری رضامندی سے چلا جائے گا تو اس میں اس کا فائدہ ہوگا اور تمہارا بھی۔ چودھری جی تمہیں خوش کر دیں گے۔ دوسری صورت میں تمہارے لیے مسئلے پیدا ہو جائیں گے۔ تمہیں پتا ہی ہے تمہارے زمین والے کاغذوں میں تھوڑی سی گڑبڑ ہے۔ پٹواری عاشق بڑا کمینہ بندہ ہے۔ اگر وہ اب تک چپ بیٹھا ہوا ہے تو یہ چودھری جی کی ہی مہربانی ہے۔ نہیں تو اس نے ضرور کوئی نہ کوئی پنگا ڈال دینا تھا...''

عمو کی والدہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''پر بھائی اکبر، کاغذوں میں وہ ہیرا پھیری کی بھی تو پٹواری نے ہی ہے... پورا پنڈ جانتا ہے کہ یہ زمین اللہ بخشے عمو کے پیو کے حصے میں آئی تھی۔ سارے بھائیوں کے انگوٹھے ہیں اور...''

''وڈی آپا! یہ قانونی چکر ہیں، تم نہیں سمجھو گی۔'' اکبر نے تیزی سے بات کاٹی پھر مزید دھیمے لہجے میں بولا۔ ''اور

digestpk.blogspot.com

سچی بات یہ ہے وڈی آپا کہ یہ چودھری لوگ اگر کسی کو تنگ کرنے پر آجائیں تو پھر ان کے پاس سو طریقے ہوتے ہیں۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ اگر چودھری جی بڑے ماسٹر صاحب کو کہہ دیں کہ اسکول میں سے عمو کا نام کٹ جائے تو کیا کوئی ایسا بندہ ہے جو عمو کی پڑھائی چالو کرا سکے؟ میں بس تمہیں ایک مثال دے رہا ہوں۔"

عمو کی والدہ سسکنے لگیں۔

... ٹھیک پانچ دن بعد چودھری سجاول کی حویلی میں عمو کے سر کے بال مونڈ دیے گئے اور اسے ایک لمبا چغہ پہنایا گیا۔ کلائیوں میں تانبے کے دو کڑے ڈالے گئے اور ایک ایسے تانگے میں بٹھا کر جس کی چاروں طرف کپڑے سے پردہ کیا گیا تھا، اسے گجرات کے اس دور دراز گاؤں کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ وقتِ رخصت ماں اسے دیر تک اپنے ساتھ لپٹا کر روتی رہی تھی اور عمو کو بھی یوں لگا تھا جیسے اس کا دل سینے میں سو ٹکڑے ہو گیا ہے لیکن اس نے کوشش کر کے اپنے آنسو روک کر رکھے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ماں اس کے آنسو دیکھے گی تو اور دکھی ہوگی اور وہ اسے دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

شخو پورہ کے مضافاتی گاؤں سے تانگے کے ذریعے عمران کو پکی سڑک تک پہنچایا گیا۔ وہاں سے بس کا سفر شروع ہوا جو گجرات پر ختم ہوا۔ یہاں سے ایک کھٹارا کار میں نہایت مشکل اور ناہموار راستوں پر سفر کر کے وہ قریباً دو گھنٹے میں ایک دیہہ تک پہنچے۔ اس دیہہ کا نام مرشد وال تھا۔ دیہہ کا بہت بڑے گنبد والا مزار کافی فاصلے سے ہی نظر آ جاتا تھا۔ عمو کے ساتھ یہاں تک آنے والوں میں منشی اکبر کے علاوہ چودھری کے دو دیگر ملازم بھی تھے۔ وہ عمو کو مزار کے خدمت گاروں کے پاس چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

مزار میں پہنچنے سے پہلے ہی عمو کو معلوم ہو چکا تھا کہ اسے یہاں ایک سال نہیں بلکہ تیرہ چاند وں تک رہنا ہے اور یہ قریباً ڈیڑھ سال بنتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی درست نہیں تھی کہ اس کی ماں ہر ڈیڑھ دو مہینے بعد آ کر اس سے ملاقات کر سکے گی۔ یہ پیر صاحب کی مرضی پر تھا کہ وہ عمو کے کسی رشتے دار کو کب اس سے ملنے کی اجازت دیتے ہیں۔

مزار کا کرتا دھرتا پیر مخدوم صادق شاہ تھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی۔ اچھی صحت اور خوراک کی وجہ سے وہ پینتیس کے لگ بھگ نظر آتا تھا۔ رنگ سرخ و سپید تھا، لمبے بال تیل میں چپڑے رہتے تھے اور آنکھیں ہر وقت سرمے کی دکان نظر آتی تھیں۔ اس کے چار خاص ماتحت تھے جنہیں درویش کہا جاتا تھا۔ یہ بات تسلیم کی جاتی تھی کہ مخدوم صادق شاہ نے ان چاروں مریدوں کو "اثر" دیا ہوا ہے۔ یہ لوگ پیر صاحب کی جگہ لوگوں کو تعویذ دیتے تھے، جھاڑ پھونک کرتے تھے اور اس طرح کے دیگر فرائض انجام دیتے تھے۔ اردگرد کے دیہات سے لوگ کثیر تعداد میں یہاں آتے تھے۔ پیر صادق شاہ سے فیض یاب ہونے کا شرف بس خاص خاص لوگوں کو ہی حاصل ہوتا تھا۔ مزار کافی بڑے رقبے پر واقع تھا۔ درویشوں، خاص مریدوں اور ملازمین کے کمرے تھے۔ روزانہ دو طرح کے لنگر بھی یہاں پکائے جاتے تھے۔ قریباً بیس مرد خادم اور اتنی ہی خادمائیں مزار کے انتظام و انصرام میں مصروف رہتے تھے۔

عمران عرف عمو صبح سویرے سے رات تک صفائی ستھرائی کے کاموں میں مصروف رہتا اور پھر اپنی کوٹھری میں دیر تک آنسو بہانے کے بعد سو جاتا۔ ماں کی یاد ایک کانٹے کی طرح اس کے دل میں چبھی ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت سوچتا رہتا، ماں کیا کر رہی ہوگی؟ کیا سوچ رہی ہوگی؟ اس نے کھانا کھایا ہوگا یا نہیں؟ اس نے آرام کیا ہوگا یا نہیں؟

قریباً ایک ماہ بعد جب وہ بہت بے تاب ہوا تو اس نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اسے پتا چلا کہ یہاں نگرانی کا کافی سخت انتظام ہے۔ پہرے داروں نے اسے روک لیا اور واپس مزار میں پہنچا دیا۔

اس رات وہ ماں کے لیے بہت رویا تھا۔ اس کے ساتھی لڑکے قاضی نے اسے بمشکل چپ کرایا اور تھوڑا بہت کھانے پر مجبور کیا۔ قاضی کئی دوسرے لڑکوں کی طرح دو تین سال سے یہاں خدمت انجام دے رہا تھا اور یہاں کی اونچ نیچ کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔

اس نے کہا۔ "عمو! اس دفعہ تو تمہیں کچھ نہیں کہا گیا اور پیار محبت سے سمجھا دیا گیا ہے لیکن اگلی دفعہ ایسا نہیں ہوگا۔ یہ لوگ سختی کریں گے اور پھر نوبت زنجیروں تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ یہاں دو تین لڑکے اب بھی ایسے ہیں جنہیں زنجیریں ڈالی جاتی ہیں اور پھر سوچو کہ بھاگ کر جاؤ گے بھی کہاں؟ ماں کے پاس... اور ماں تمہیں پھر یہاں بھیج دے گی۔ وہ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہے۔"

"میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ میرے بغیر نہیں۔" عمو سسکا۔

"لیکن یار سوچو یہ ہمیشہ کی بات تو نہیں ہے۔ سال ڈیڑھ سال کی بات ہے۔ تم دیکھنا، دو تین مہینوں میں تمہارا دل یہاں لگ جائے گا۔ پھر باقی کے دن کاٹنا تمہارے لیے زیادہ مشکل نہیں رہے گا..."

بات عمو کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ یہاں سے بھاگ کر بھی اگر جاتا تو ماں کے پاس ہی تھا۔ ماں چودھری کے حکم سے مجبور تھی، وہ اسے پھر یہاں بھیج دیتی۔ ماں کی جدائی کے علاوہ عمو کو یہاں مزار میں کوئی زیادہ تکلیف بھی نہیں تھی۔ بس مشقت تھی جو اسے دوسرے خادموں کے ساتھ مل کر کرنا پڑتی تھی۔ وہ صفائی اور جھاڑ پونچھ کرتا تھا۔ فرش دھوتا تھا۔ دستی نلکوں سے پانی بھرتا تھا اور کبھی کبھی درویشوں کی مٹھی چاپی بھی کرتا تھا... وہ لڑکوں میں سب سے خوب صورت تھا۔ قد کاٹھ بھی دلکش تھا۔ ایک درویش ارباب علی اس سے بہت لگاؤ رکھتا تھا اور اسے بیٹا کہہ کر بلاتا تھا۔ ارباب علی کی کوشش سے ہی عمو کو شام کے وقت کچھ دیر کھیل کود کی اجازت بھی مل گئی۔ عصر کے بعد مزار کے پچھواڑے احاطے میں والی بال اور گلی ڈنڈا وغیرہ کھیلا جاتا تھا۔ ارباب کی کوشش سے ہی عمو کو کسی وقت اچھے والے لنگر سے کھانا بھی ملنے لگا۔

تین مہینے بعد عمو کی ماں اس سے ملنے کے لیے آئی۔ منشی اکبر اور چودھری کا ایک کارندہ منظور بھی اس کے ساتھ تھا۔ ماں بیٹا مل کر خوب روئے۔ ماں اس کے لیے گاؤں سے کئی سوغاتیں لے کر آئی تھی۔ ماں نے عمو کو اور عمو نے ماں کو تسلی دی۔ ماں نے انگلیوں پر گن کر عمو کو بتایا کہ تین مہینے گزر گئے ہیں، اب بس تیرہ چودہ مہینے باقی ہیں۔

ماں سے ملاقات کے دس بارہ روز بعد تک عمو بہت دکھی رہا لیکن پھر دھیرے دھیرے اس نے اپنا دل ٹھکانے پر کر لیا اور ماں سے اگلی ملاقات کے لیے دن گننے شروع کر دیے۔ ارباب علی نے عمو کو یقین دلایا تھا کہ اگلی ملاقات تین مہینے کے وقفے سے ہوگی اور ضرور ہوگی۔

قاضی کی باتوں سے عمو کو... صادق شاہ کے بارے میں کافی کچھ پتا چلتا رہتا تھا۔ صادق شاہ اپنے مرحوم والد کے برعکس کافی خوش خوراک شخص تھا۔ اس کی تین بیویاں تھیں۔ ایک بیوی کو طلاق دے چکا تھا اور ایک کو طلاق دے کر اس سے دوبارہ شادی بھی کی تھی۔ صادق شاہ کو گھوڑوں اور بندوقوں وغیرہ کا بھی شوق تھا۔ اس کے زمیندار مرید اکثر اس کے شوق کے مطابق تحفوں کا انتظام کرتے رہتے تھے۔

ایک دن درویش عطا محمد نے عمو اور قاضی کو صادق صاحب کے حجرے سے دستر خوان اٹھانے کے لیے بھیجا۔ عمو اور قاضی پیر صاحب کے وسیع و عریض حجرے میں داخل ہوئے۔ یہاں گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے اور قالین پر ایک خوب صورت دستر خوان بچھا تھا۔ بھنے ہوئے تیتر، مچھلی، دیسی مرغ کا گوشت، سندھی بریانی اور پتا نہیں کیا کچھ یہاں موجود تھا۔ پلیٹیں ہڈیوں سے بھری ہوئی تھیں اور روغنی نانوں کے ٹکڑے بکھرے تھے۔

جن تین چار مہمانوں نے یہ دعوت اڑائی تھی، ان میں سب سے نمایاں ایک عورت تھی... اسے بلاشبہ ایک گرانڈیل عورت کہا جا سکتا تھا۔ عمر پینتیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کا چہرہ بہت بڑا تھا، رنگ سانولا، نقوش سخت اور ناک بالکل چپٹی تھی۔ اس کی دبنگ شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو اس کا لباس تھا۔ اس نے مردوں کی طرح کالی دھوتی اور کڑھائی والی کالی قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ مردوں ہی کی طرح آلتی پالتی مارے پیر صادق کے قریب بیٹھی تھی۔

اس نے غور سے عمو کو دیکھا اور بھاری آواز میں بولی۔

"یہ منڈا کون ہے؟"

صادق شاہ بولا۔ "شخو پورہ کا رہنے والا ہے۔ خدمت کے لیے آیا ہوا ہے۔"

"صادق شاہ! تم نے بڑے ملائم منڈے رکھے ہوئے ہیں اپنے پاس۔" وہ ہنس کر بولی۔ اس کے دانت پان سے متاثر تھے۔ پھر وہ عمو سے مخاطب ہو کر بولی۔ "کیا نام ہے تیرا کاکا؟"

"عمو جی۔"

"میرے ساتھ چلو گے؟"

"کک... کہاں جی؟" وہ ڈر کر بولا۔

اس کے ڈرنے کے انداز نے عورت اور اس کے ساتھیوں کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ عورت کا ایک سنگلی آنکھوں والا ساتھی عمو کی پیٹھ پر ہلکا سا دھپ مار کر بولا۔ "اوئے ڈر

بینک بیلنس

لڑکی نے شرما کر لڑکے سے پوچھا۔ "تم نے ابو سے بات کی؟"

"ہاں۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"پھر انہوں نے کیا کہا؟"

"انہوں نے پوچھا کہ میرا بینک بیلنس کتنا ہے، میں نے کہا دس ہزار۔"

"پھر کیا ہوا؟" لڑکی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا، انہوں نے وہ رقم مجھ سے ادھار لی اور کہا کہ تم تو دو کوڑی کے آدمی بھی نہیں ہو۔"

شوکت علی قریشی، جیکب آباد، سندھ

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیوں رہا ہے۔ تُو کوئی لڑکی ہے جو تجھے لے جا کر بازار میں بیچ دیں گے۔"

عمو نے بے بسی سے صادق شاہ کی طرف دیکھا۔ صادق شاہ کے چہرے پر ہلکا پھلکا تاثر تھا۔ وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔ "اچھا اچھا، تم پلیٹیں اٹھاؤ اور جاؤ۔"

عمو پلیٹیں وغیرہ اٹھا کر باہر نکل آیا۔ قاضی دسترخوان کو صاف کرنے اور سمیٹنے لگا۔

عمو کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اگلے روز صبح سویرے کیا ہونے والا ہے۔۔۔ عمو کو خلافِ معمول منہ اندھیرے ہی اٹھا دیا گیا۔ ایک خادم نے اسے بتایا کہ عطا محمد نے اسے حجرے میں بلایا ہے۔ وہ منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر حجرے میں پہنچا تو وہاں۔۔۔۔۔۔ ارباب علی بھی موجود تھا۔ ارباب کی آنکھوں میں دکھ تھا اور اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے تک عطا اور ارباب میں کسی بات پر زوردار بحث ہوتی رہی ہے۔

عطا محمد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "عمو! تجھے کچھ دنوں کے لیے یہاں سے باہر جانا ہوگا۔ صادق صاحب کی مہمان جو کل یہاں آئی ہیں، انہیں اپنے ڈیرے پر ایک کامے کی لوڑ ہے۔ ان کا پرانا کاما کہیں گیا ہوا ہے۔ وہ جیسے ہی آئے گا، تم یہاں واپس آجاؤ گے۔"

ایک دم عمو کی آنکھوں کے سامنے کل والی عورت کا کرخت چہرہ گھوم گیا۔ وہ کوئی اچھی عورت نہیں تھی۔ پھر اس کا لہجہ، اس کے دیکھنے کا انداز۔ بچپن میں اس نے اپنی ماں سے ایک ایسی خطرناک عورت کی کہانی سنی تھی جو گھروں کی ڈیوڑھیوں سے معصوم بچے اٹھا کر فروخت کر دیتی تھی۔ پتا نہیں کیوں، اس عورت کو دیکھ کر عمو کے ذہن میں وہ کہانی گھومنے لگی تھی۔

وہ کچھ بول نہ سکا۔ بس خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ عطا محمد بولا۔ "گھبرانے کی لوڑ نہیں۔ زیادہ کام نہیں کرنا پڑے گا بلکہ یہاں سے بھی ہلکا کام ہوگا۔"

"پپ۔۔۔ پر۔۔۔ مم۔۔۔ میری۔" وہ ہکلا کر رہ گیا۔ آواز گلے میں اٹک گئی۔

"بولو۔۔۔ بولو کیا بات ہے؟" عطا نے تحمل کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

وہ بمشکل بولا۔ "مم۔۔۔ میری امی۔۔۔ آ رہی ہے۔۔۔ اگلے ہفتے۔"

عطا محمد کے چہرے پر ناگواری کی شکن ابھری لیکن اس نے اپنی آواز ہموار ہی رکھی اور بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ اگلے ہفتے تم واپس ہی آجاؤ۔ اور دیکھو، یہ صادق صاحب کا حکم ہے۔ ہم اس میں کسی طرح کی چوں چراں نہیں کر سکتے۔ چلو جا کر تیار ہو جاؤ۔ ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ان لوگوں نے یہاں سے جانا ہے۔"

عمو نے ارباب کی طرف دیکھا۔ وہ یکسر خاموش تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات نے عمو کو مزید پریشان کیا۔ عمو چاہتا تھا کہ ارباب کچھ بولے لیکن وہ بولا نہیں۔ عمو اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتا ہوا حجرے سے باہر آگیا۔

وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس کا سارا سامان باندھا جا چکا ہے۔ جستی ٹرنک کے پاس ہی اس کا بستر بھی گول کیا ہوا پڑا تھا۔ عطا تو کہہ رہا تھا کہ اسے چند دن کے لیے جانا ہے۔ اگر چند دن کی بات تھی تو پھر سارے سامان کی کیا ضرورت تھی؟ بہرحال سوالات کی گنجائش یہاں نہیں تھی۔

وہ لوگ گھوڑوں پر سوار وہاں سے روانہ ہوئے۔ وہ کل آٹھ افراد تھے۔ ان میں گرانڈیل عورت بھی شامل تھی جس کا نام عمو کو بعد میں ماجھاں معلوم ہوا۔ ان سب نے کچے راستے کے گرد و غبار سے بچنے کے لیے منہ سر کپڑوں میں لپیٹ رکھے تھے۔ چار افراد کے پاس پکی رائفلیں موجود تھیں۔ دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے ڈاکوؤں یا وارداتیوں کا گروہ کہیں کارروائی ڈالنے کے لیے جا رہا ہو۔

عمو کو گھڑسواری کا زیادہ تجربہ نہیں تھا اس لیے اسے ایک صحت مند گھوڑے پر ایک دوسرے شخص کے ساتھ بٹھایا گیا تھا۔ یہ خاردار داڑھی والا شخص تھا اور اس کے جسم سے مردار کی سی بو اٹھ رہی تھی۔ وہ عمو کے پیچھے بیٹھا تھا۔ جب گھوڑا بھاگتا اور عمو دائیں بائیں کھسکتا تو وہ شخص مذاق کے انداز میں کہتا۔ "اوئے، سنبھل کر بیٹھ کاکا۔ کیا صابن کی ٹاکی کی طرح پھسل رہا ہے۔"

ایک بار اس نے عمو کی کمر پر بہت زور سے چٹکی بھی کاٹی۔ عمو کی آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔

یہ سفر کافی طویل ثابت ہوا۔ گرمی اور دھوپ نے اسے مزید مشکل بنا دیا۔۔۔ راستے میں کہیں کہیں اکا دکا لوگ ملے۔ ماجھاں اور اس کے ساتھیوں کی ان سے مختصر بات چیت بھی ہوئی۔ اس بات چیت سے عمو کو معلوم ہوا کہ گرانڈیل عورت کا نام ماجھاں ہے اور اسے مالکن یا چودھرانی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ کسی موضع "ککراں" کے رہنے والے تھے اور وہیں جا رہے تھے۔

تپتے دن میں نہایت دشوار راستوں پر سفر کر کے وہ لوگ شام سے کچھ ہی پہلے ایک گاؤں میں پہنچے۔ یہاں سو فیصد مکان کچے تھے۔ گاؤں کی مسجد اور حویلی بھی کچی تھی۔ حویلی کا احاطہ بہت بڑا تھا اور اس کے اردگرد بہت سے درخت لگے تھے۔ ان درختوں میں زیادہ تر کیکر ہی نظر آتے تھے۔ اس جگہ کیکروں کی بہتات تھی، شاید اسی لیے اس گاؤں کا نام ککراں تھا۔۔۔ حویلی کے احاطے میں ایک جگہ بہت سی بیل گاڑیاں اور گھوڑے خچر وغیرہ دکھائی دے رہے تھے۔ عمو کو حویلی سے ملحقہ ایک ڈیرہ نما جگہ پر پہنچا دیا گیا۔

☆☆☆

اگلے تین چار روز میں عمران عرف عمو کو یہاں کے حالات کے بارے میں بہت کچھ پتا چلا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ جرائم پیشہ لوگوں کا گاؤں تھا۔ بارڈر اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہاں شراب کی بھٹیاں تھیں۔ یہاں کی شراب اردگرد کے دیہات میں بھی بھیجی جاتی تھی۔ یہاں اسمگلنگ کا سامان بھی آتا تھا۔ یہاں جوئے کی ایک بڑی بیٹھک بھی تھی جسے عرفِ عام میں سراں کہا جاتا تھا۔ علاقے کی پولیس کو ان غیر قانونی کاموں میں مداخلت کی ہمت کم ہی ہوتی تھی۔ اس کی وجہ ماجھاں تھی۔ وہ بڑے دھڑلے کی عورت تھی۔ وہ دو مشہور ڈکیتوں سائے اور تاجے کی سگی بہن تھی۔ سائیا تو کوئی دو سال پہلے مارا گیا تھا مگر تاجا زندہ تھا۔ وہ پچھلے قریباً ایک سال سے روپوش تھا۔ ماجھاں خود بھی بہت دراڑی تھی۔ اس کی آتشیں طبع کا ایک ثبوت وہ گہرا زخم بھی تھا جو اس کی پیشانی سے رخسار تک چلا گیا تھا اور جس کی وجہ سے اس کی ناک ضرورت سے زیادہ چپٹی نظر آتی تھی۔

ابھی تک عمو کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے اور اس سے کیا کام لیا جائے گا۔ اس سے کہا گیا تھا کہ ماجھاں کو "کامے" کی ضرورت ہے کیونکہ اس کا کاما کہیں گیا ہوا ہے لیکن یہاں تو کئی کامے موجود تھے اور ان میں عمو کے ہم عمر تین چار لڑکے بھی تھے۔

یہ تیسرے چوتھے روز کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا، کچھ دیر پہلے ہلکی بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے گرمی کا زور ذرا ٹوٹ گیا تھا۔ ایک ملازمہ شہناز عمو کے پاس آئی۔ وہ عمو کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی اور بولی۔ "وے تجھے مالکن بلا رہی ہے۔"

"کون مالکن؟"

"وے چودھرانی جی اور کون؟ یہاں تیری ماں تو مالکن نہیں ہے۔"

عمو ملازمہ کے ساتھ ہو لیا۔ ڈیرے اور حویلی کا درمیانی دروازہ پار کر کے وہ حویلی میں آگئے۔ ملازمہ شہناز اسے اندر لے گئی۔ یہاں ایک کمرے میں رنگین پایوں والا شاندار پلنگ بچھا ہوا تھا۔ چھت پر کوئی چھ فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا جھالر والا پنکھا حرکت کر رہا تھا۔ اس پنکھے کو کسی ساتھ والے کمرے سے ڈوری کے ذریعے حرکت دی جا رہی تھی۔ پلنگ پر مالکن ماجھاں موجود تھی۔ عمو کو دیکھ کر وہ پلنگ سے اٹھی اور رنگین پایوں والی، بان کی ایک کرسی پر آبیٹھی۔ اس کے بوجھ سے جیسے کرسی چرچرا اٹھی۔

اس نے عمو کو تنقیدی نظروں سے دیکھا اور بھاری بھرکم آواز میں بولی۔ "اوئے منڈیا! کچھ کھاتا پیتا بھی ہے یا نہیں۔ کیا بوتھی نکالی ہوئی ہے۔ رنگ بھی پیلا ہو گیا ہے۔"

"کھاتا ہوں جی۔" وہ تھوک نگل کر بولا۔

"زور ہے تیرے میں؟" اس نے پوچھا۔

عمو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اچھا، چل دیکھ لیتی ہوں۔ ذرا مونڈھے دبا میرے۔"

عمو سکتہ زدہ سا کھڑا رہا۔ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں عمو کو ماں کی گالی دی اور بولی۔ "اوئے۔۔۔ ایسے کیا تک رہا ہے بٹر بٹر؟ کیا کبھی کسی کا جثہ نہیں دبایا؟"

عمو جلدی سے اس کے عقب میں آگیا اور اس کے چربی دار مونڈھوں کو اپنے ہاتھوں سے دبانے لگا۔

اسی دوران میں سانولے رنگ کا ایک غریب صورت شخص اندر آیا۔ اس نے پہلے زمین کو دونوں ہاتھ لگا کر اس بات کا اشارہ دیا کہ وہ ماجھاں کے پاؤں چھو رہا ہے پھر وہ کمرے کی دہلیز پر پڑی جوتیوں کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے عاجزی سے دانت نکالے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "مالکن! میرے پتر نے چوری نہیں کی۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا جی۔ وہ پڑھا لکھا ہے۔ وہ بھلا کسی کی بھینس چوری کرے گا؟ میں آپ کے سامنے ہتھ جوڑتا ہوں۔ آپ کو خدا کا واسطہ ہے۔ اس کی جان بچا لیں۔۔۔ پلس والے مار مار کر اس کی چمڑی ادھیڑ دیں گے۔"

ماجھاں نے اطمینان سے کہا۔ "پر تھانے دار قادر کہتا

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے کہ اس نے لوٹا فال نکالی ہے اور فال میں تیرا پتر امین ہی سامنے آیا ہے۔"

غریب صورت شخص روتے ہوئے بولا۔ "آہو جی، انہوں نے لوٹا گھمایا تھا... پر لوٹا غلط بھی تو گھوم سکتا ہے نا۔ میرا امین چور نہیں ہے۔"

ماجھاں نے بلاتردد غریب صورت شخص کو گالی دی اور بولی۔ "پچھلے سال جب تیری دھی کا داج (جہیز) چوری ہو گیا تھا تو تُو نے خود دہائی مچائی تھی اور کہا تھا کہ لوٹا گھما کر چور کا پتا لگایا جائے۔ تُو نے کہا تھا یا نہیں؟"

غریب صورت شخص کا سر مزید جھک گیا۔ وہ روتے ہوئے بولا۔ "مالکن! میں اتنا جانتا ہوں، میرے پتر نے رسا گیری نہیں کی۔ اس پر الزام لگایا گیا ہے..."

"اچھا، دوسروں کی واری لوٹا سچا اور اپنی واری جھوٹا۔" ماجھاں نے طنزیہ انداز میں کہا اور غریب صورت شخص کی نامعلوم بہن کا رشتہ ایک پلید جانور سے جوڑا۔

اس شخص نے ایک بار پھر زمین پر دونوں ہاتھ لگا کر اپنی عاجزی کا اظہار کیا اور بولا۔

"مالکن! تم مائی باپ ہو۔ تمہارے سوا کسی کا آسرا نہیں۔ میرے بچے کی جان بچاؤ۔ وہ پلس کی مار کھانے جوگا نہیں۔" اس نے اپنا سر زمین سے لگایا اور بھوں بھوں رونے لگا۔

ماجھاں کچھ دیر چپ رہی پھر گمبھیر آواز میں بولی۔

"چل اٹھ۔ کیا زنانیوں کی طرح اتھرو ڈگا رہا ہے۔"

غریب صورت شخص سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی چھدری داڑھی آنسوؤں سے تر ہو رہی تھی۔ ماجھاں نے اسے چند سخت باتیں سنائیں پھر کہا۔ "چل جا، میں کچھ کرتی ہوں اس کے لیے۔"

وہ شخص سلامیں کرتا ہوا چلا گیا۔ ماجھاں نے نوکرانی شہناز کو آواز دے کر بلایا اور اسے اپنے پاؤں کے ناخن کاٹنے کا حکم دیا۔ نوکرانی شہناز، اس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور ایک چھوٹی قینچی سے اس کے پاؤں کے ناخن کترنے لگی۔

عمو بدستور اس کے سخت کندھے دبا رہا تھا۔ نوکرانی ناخن کاٹ کر چلی گئی تو خضاب لگے سر اور گھنی مونچھوں والا ایک شخص اندر آیا۔ اس کے کندھے سے ہولسٹر لٹک رہا تھا۔ اس نے ماجھاں کو سلام کیا اور بولا۔ "مالکن! وہ دیناں سلی میرے پاس بیٹھا زنانیوں کی طرح رو رہا ہے۔ اس کا کیا کرنا ہے؟"

"کرنا کیا ہے؟" ماجھاں نے پوچھا۔

"وہ کہتا ہے کہ آپ نے اس کے پتر کو پلس سے چھڑانے کا وعدہ کیا ہے... ابھی تھوڑی دیر پہلے۔"

"ہاں، وعدہ تو کیا ہے۔" ماجھاں بولی۔

"تو پھر... اگر آپ کا حکم ہو تو میں اس کے ساتھ چلا جاؤں تھانے؟" گھنی مونچھوں والے نے پوچھا۔

"ہاں چلے جاؤ۔ تھانے دار قادر سے مل لینا... دینے کے سامنے اس کے پتر کو چھوڑنے کی بات کرنا۔ پر ابھی اس ذلیل کو چھڑانا نہیں ہے۔ چار پانچ روز ابھی اس کو رگڑے لگنے دینے ہیں۔ اس کو ہیضہ ہو گیا ہے اپنی پڑھائی کا۔ الو کا پتر، خود کو لاٹ صاحب سمجھنے لگا ہے۔"

گھنی مونچھوں والے نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور سلام کر کے باہر چلا گیا۔ عمو حیرانی سے سوچتا رہا۔ یہ کتنی دغاباز عورت تھی۔

کندھے دبا دبا کر عمو کے ہاتھ شل ہو چکے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا بلکہ پچھلے آدھ گھنٹے سے سوچ رہا تھا کہ وہ ابھی اسے بس کرنے کا کہے گی لیکن وہ تو جیسے اسے آرڈر کر کے بھول ہی چکی تھی۔ عمو کی عمر سولہ سال سے تھوڑی ہی زیادہ ہو گی۔ اس نے تھوڑا قد کاٹھ نکال لیا تھا لیکن ابھی اس کے جسم میں وہ مردوں والا زور کہاں آیا تھا۔ اس کے ہاتھ اور بازو شل ہو گئے۔ جسم ہولے ہولے لرزنے لگا۔ وہ مست بیٹھی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ اذیت پسند طبع رکھتی ہے۔ جانتی بھی تھی کہ عمو بُری طرح تھک چکا ہے پھر بھی اسے رکنے کے لیے نہیں کہہ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد جب عمو کے ہاتھوں میں بالکل جان نہ رہی تو اس نے گھوم کر اسے دیکھا اور بولی۔ "اوئے لکڑی دے باندرا! تُو تو کہتا تھا کہ زور ہے تیرے اندر۔ یہ چرخا کات رہا ہے کہ مونڈھے دبا رہا ہے؟"

عمو کچھ نہیں بولا۔ اس کے ماتھے پر پسینا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو ماجھاں کے کندھوں پر حرکت دیتا رہا۔

چند سیکنڈ بعد وہ بولی۔ "اچھا چل چھوڑ۔ وہ سامنے الماری میں سے پانی کی بوتل پکڑ کر لا۔"

عمو اس کے اشارے پر الماری کی طرف گیا۔ اس نے الماری کھولی اور بوتل تلاش کرنے لگا۔ پانی کی بوتل تو نظر نہیں آئی لیکن شراب کی سیاہی مائل بوتل وہاں موجود تھی۔ ماجھاں کی بھاری آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ "اوئے بتر بتر کیا دیکھ رہا ہے، یہی بوتل لانی ہے۔"

عمو نے لرزتے ہاتھوں سے بوتل تھامی اور اسے ماجھاں کے سامنے تین ٹانگوں والی گول میز پر رکھ دیا۔

یہاں گلاس پڑا تھا اور ایک جگ میں تھوڑا سا پانی بھی رکھا تھا۔ ماجھاں نے ملازمہ شہناز کو اپنی بھاری بھرکم آواز میں پکارا۔ وہ چند سیکنڈ میں اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی۔ ٹرے کے اندر پلیٹ میں برف کے ٹکڑے رکھے تھے اور کچھ نمکو وغیرہ تھی۔ عمو کو عجیب الجھن ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ عورت کیا کر رہی ہے۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ شراب بہت بُری چیز ہے۔ اسے بدمعاش لوگ پیتے ہیں اور پینے کے بعد زیادہ خبیث ہو جاتے ہیں۔ اسے ہرگز پتا نہیں تھا کہ کچھ عورتیں بھی شراب پیتی ہیں۔

ماجھاں کی آنکھوں میں عجیب سی سرخی اترتی جا رہی تھی۔ اس نے جگ میں برف کے ٹکڑے ڈال کر جگ کو ہلایا پھر عمو سے مخاطب ہو کر بولی۔ "چل، یہ کالا پانی ڈال۔"

"کک... کس میں؟"

"اپنی بے بے کے سر میں۔ اوئے اس گلاس میں ڈال... یہ جو تیرے سامنے رکھا ہے۔"

عمو نے لرزتے ہاتھوں سے بدبودار سیال گلاس میں انڈیلنا شروع کیا۔ گلاس ایک تہائی بھر گیا تو ماجھاں نے عمو کا ہاتھ روک دیا۔ پھر اس نے اپنے حساب سے اس میں ٹھنڈا پانی مکس کیا اور غٹاغٹ چڑھا گئی۔

اس کمرے میں اس نے یہی عمل دو تین بار دہرایا اور اس کا چہرہ تمتما گیا۔ آنکھیں سرخ نظر آنے لگیں... بالکل انگاروں کی طرح۔ عمو کو اس سے ڈر لگنے لگا۔ اسے لگا کہ وہ کہیں اسے مارنا نہ شروع کر دے۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی اٹھی۔ اس نے عمو کے گال پر ایک سخت چٹکی لی اور کمرے کے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

عمو کے سینے میں دل کبوتر کی طرح پھڑک گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ کچھ غلط ہونے والا ہے۔ یک دم کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اب کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فقط بجلی کی سرسراہٹ اور چرخی کی مدھم آواز سے پتا چلتا تھا کہ چھت پر جہازی سائز کا جھالروں والا پنکھا حرکت کر رہا ہے۔

یکا یک عمو نے سخت جسم والی ماجھاں کو اپنے بالکل پاس محسوس کیا۔ اس کی سانسوں سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ اس کے بازو عمو کے اردگرد تھے۔ عمو کو گھن محسوس ہوئی۔ وہ مرد و عورت کے تعلق کے بارے میں جانتا تھا لیکن یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اتنی بڑی عمر کی اور ایسی بھدی عورت اس سے کوئی تعلق بنائے گی۔

"مم... میں نے باہر جانا ہے۔" وہ ہکلایا۔

"باہر چلے جانا۔ ابھی تو ادھر چل۔"

"کہاں... جی؟"

"اوئے ادھر۔" اس نے اسے بستر پر دھکیلتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت اب پہلے سے سخت تھی۔

چند ہی لمحے بعد عمو نے خود کو ایک بے پناہ بوجھ تلے محسوس کیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس بدبودار عورت کے چہرے پر زوردار دو چٹر مارے اور یہاں سے بھاگ نکلے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یہاں بڑے کرخت قسم کے پہرے دار موجود ہیں اور ان کے کندھوں سے ہر وقت بندوقیں جھولتی رہتی ہیں۔ شہنشاہ کے مزار کے پہرے دار ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے۔

وہ بڑے مکروہ اور اذیت ناک لمحے تھے۔ وہ خود کو کسی شکاری جانور کے پنجوں میں محسوس کر رہا تھا۔ کراہ رہا تھا اور کسمسا رہا تھا۔ ماجھاں جب مطلب برآری میں ناکام ہوئی تو ایک دم جھلا اٹھی۔ اس نے عمو کو اس کی گردن سے پکڑ کر زوردار جھٹکے دیے اور پھر اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ پہلے وہ اسے خالی ہاتھوں سے مارتی رہی پھر اس نے چمڑے کا ایک دیسی جوتا پکڑ لیا۔ یہ بڑے ذلت ناک لمحے تھے۔ وہ بے دردی سے اس کے جسم پر ضربیں لگاتی رہی اور گالیاں بکتی رہی۔ کوئی عمو کو چھڑانے نہیں آیا۔ کسی نے مداخلت نہیں کی۔ عمو کراہتا رہا اور بستر پر لوٹتا رہا۔ پھر اس نے دروازہ کھولا اور عمو کی پشت پر لات رسید کر کے اسے باہر پھینک دیا۔ ایک سیکنڈ بعد عمو اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی زوردار آواز سن رہا تھا۔

ایک گوشے سے ملازمہ شہناز نمودار ہوئی۔ "چل اٹھ جا۔" اس نے ترس آمیز اور کسی حد تک طنز آمیز لہجے میں سرگوشی کی۔

عمو کراہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

اس رات اپنے کمرے میں جا کر عمو خوب رویا تھا۔ اس نے آج رات عورت کا ایک نیا روپ دیکھا تھا۔ ان گھڑیوں میں شاید اسے عورت ذات سے ہی نفرت ہو جاتی اگر اس کے تصور میں چاندی بالوں والے ایک مقدس چہرے کی شبیہ نہ ابھر آتی۔ یہ اس کی پیاری ماں کا چہرہ تھا۔ وہ روتا رہا اور سوچتا رہا کہ کتنا فرق ہے ان دو عورتوں میں۔ اسے اپنی ماں ٹوٹ کر یاد آئی۔ آج سے سات آٹھ روز بعد اس کی ماں کو اس سے ملنے شہنشاہ پیر کے مزار پر آنا تھا۔ یقیناً وہ دن گن گن کر اس وقت کا انتظار کر رہی تھی لیکن وہ مزار پر نہیں تھا۔ خبر نہیں کہ عمو کو وہاں نہ پا کر اس کی جان پر کیا گزر رہی تھی۔

اس نے اپنی ماں کی ویران آنکھیں اور اس کا زرد چہرہ

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھا۔ اس کا دل سینے میں ٹوٹ کر سو ٹکڑے ہو گیا۔ وہ ساری رات سسکتا رہا اور اپنی چوٹوں کو سہلاتا رہا۔ اسے بے پناہ توہین کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت جب ہر طرف چلچلاتی دھوپ پھیلی تھی، ملازمہ شہناز پھر مالکن ماجھاں کا بلاوا لے کر پہنچ گئی۔ عمو اندر تک لرز گیا۔ کل والے سارے کراہت انگیز واقعات اسے پھر یاد آ گئے تھے۔ وہ چاروناچار پھر شہناز کے ساتھ ماجھاں کے پاس پہنچا۔ آج وہ ذرا مختلف موڈ میں تھی۔ آج وہ برآمدے میں تھی اور سُوتر کی بنی ہوئی ایک رنگین چارپائی پر پھیل کر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے سر کے نیچے گاؤ تکیہ تھا۔ پندرہ سولہ سال کی ایک لڑکی اس کے سرہانے کھڑی ایک بڑا پنکھا دونوں ہاتھوں سے جھل رہی تھی۔ اٹھارہ انیس سال کا ایک گورا چٹا لڑکا اس کے لیے حقہ تازہ کر رہا تھا۔ حقہ تازہ کر کے اس نے ماجھاں کے قریب رکھا اور اس کی لمبی نے ماجھاں کے ہاتھ میں تھمائی۔ اس کے بعد وہ باہر چلا گیا۔ ماجھاں نے پنکھا جھلتی ہوئی لڑکی کو بھی صحن میں بھیج دیا اور عمو کو ایک موڑھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا... عمو بیٹھ گیا۔

وہ بولی۔ ”کل پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں تمہیں مار بیٹھی۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ پر اس میں تمہارا بھی تھوڑا بہت قصور ہے۔ میرے کہنے پر چلو گے تو بہت خوش رہو گے۔ ہر طرح کا آرام ملے گا۔ لیکن اپنی مرضی دکھاؤ گے تو پھر میں بڑی سخت بھی ہوں۔ ابھی تم نے کچھ نہیں دیکھا۔“ اس کا لہجہ آخر میں دھمکی آمیز ہو گیا۔

عمو بس سر جھکا کر رہ گیا۔ اس کے ہونٹوں نے ایک بے ساختہ حرکت ضرور کی مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔

”کیا کہنا چاہتا ہے؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”کک... کچھ نہیں جی۔“

”میں بتاتی ہوں۔ تو واپس جانا چاہتا ہے اور تیرے دل میں یہاں سے بھاگنے کا فتور بھی ہے۔ یہ بھاگنے والا فتور اپنے دل دماغ سے بالکل نکال دے۔ جب تک میں نہ چاہوں گی، تیرے فرشتے بھی یہاں سے نکل نہیں سکتے... اگر آزمانا چاہتا ہے تو آزما کر بھی دیکھ لے۔ اور اگر نہ ہی آزمائے تو چنگا ہے۔“ ماجھاں کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کہتی ہے، کر کے بھی دکھاتی ہے۔

عمو اثبات میں سر ہلانے پر مجبور ہو گیا۔ کہیں پاس ہی طویلے کی طرف رکھوالی کے بڑے بڑے کتے پُرہول آواز میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ وہ عجیب شکل صورت کی عورت تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر دہشت آتی تھی۔ وہ گاؤ تکیے پر سیدھی ہو کر بیٹھی تو تکیہ تھوڑا سا ایک طرف کھسک گیا۔ تکیے کے نیچے سیاہ رنگ کے پستول کی جھلک نظر آئی۔

ماجھاں نے حسبِ سابق کالا تہبند پہن رکھا تھا۔ وِیل کی سفید قمیص تھی جس کے بازو اس نے مردوں کی طرح اڑس رکھے تھے۔ اس کے جسم کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ خاصی خوش خوراک بھی ہے۔ عمو کی موجودگی میں ہی اس نے پکی لسی کی ایک بڑی گڑوی ایک ہی ڈیک میں خالی کر دی اور پھر مردوں کے انداز میں زوردار ڈکار لی۔

اسی دوران میں اچانک احاطے کے پھاٹک پر کھڑے پہرے داروں میں ہلچل سی نظر آئی پھر ایک تازی گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کی رکاب میں کسی شخص کا پاؤں بُری طرح پھنسا ہوا تھا۔ وہ شخص گھوڑے کے ساتھ ساتھ ہی گھسٹتا چلا آ رہا تھا۔ گھوڑے کے عقب میں کئی افراد تھے۔ وہ شاید اسے روکنا چاہ رہے تھے لیکن وہ ان کی پہنچ سے دور تھا اور اگر پاس بھی ہوتا تو شاید اس کی سرکشی کے سبب وہ اسے روک نہ سکتے۔ ایسا جوان اور قد کاٹھ والا گھوڑا عمو کی نظروں سے پہلے کبھی نہیں گزرا تھا۔ وہ دیوانی رفتار سے وسیع احاطے کے اندر دوڑ رہا تھا۔ زخمی سوار کسی ہلکی پھلکی چیز کی طرح اس کے ساتھ گھسٹتا اور پٹختا چلا آ رہا تھا۔ سامنے سے لپکنے والے دو افراد نے گھوڑے کے راستے میں آنے کی کوشش کی۔ وہ بلاخیز تیزی کے ساتھ انہیں پچھاڑ گیا اور شمالی حصے کی طرف بڑھا۔

اور یہی وقت تھا جب عمو کی نگاہ گھوڑے کے پیچھے گھسٹتے ہوئے شخص پر پڑی۔ عمو لرز گیا۔ اس سے پہلے اس نے اپنے گاؤں میں اڑوس پڑوس میں مرنے والوں کے مُردہ جسم دیکھے تھے مگر ایسی بھیانک لاش کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بدنصیب شخص نہ جانے کتنی دور سے گھوڑے کے پیچھے رِپٹتا چلا آ رہا تھا اور کہاں کہاں ٹکرایا تھا۔ اس کا سر تربوز کی طرح پھٹ چکا تھا اور سامنے کی طرف سے سینے کی کھال مکمل طور پر اتر چکی تھی۔ ایک سائیس نما شخص نے گھوڑے کی لگام تھامنا چاہی مگر اس نے گھوم کر ایسی دولتی چلائی کہ وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ایک شخص نے اضطراب کے عالم میں گھوڑے پر رائفل تانی۔

”اوئے... اوئے۔ گولی نہیں چلانا۔“ ماجھاں دہاڑی اور گھوڑے کی طرف بڑھی۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

جادوگر

جمال دستی

اپنے مفادات کو حاصل کرنے کے لیے سادہ لوح لوگوں کے جذبات کو بطور ہتھیار استعمال کرنا کوئی نئی بات نہیں... صدیوں سے یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ کا قصہ جب کچھ لوگوں کو یہ باور کرایا گیا کہ ہوا، پانی اور موت و زندگی پر جادوگر قابض ہیں۔

توہم پرستی اور مافوق الفطرت واقعات کے گرد گھومتی ایک سحر انگیز کہانی

اُن دنوں آئس لینڈ میں اکثر لوگ جادو جانتے تھے۔ کچھ لوگ سائی فن بھی بہت اچھا جانتے تھے جس کی مدد سے وہ لوگوں کو گمشدہ اشیا کی تلاش میں مدد دیا کرتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے منتر جانتے تھے جس کے جاپ سے وہ بھوتوں اور جنوں پر قابو پانے کا دعویٰ کرتے تھے۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو جاپ جپنے کے بعد پتھر پر پھونک مارتے تو اُن سے دیر تک موسیقی کی گونج سنائی دیا کرتی۔ آئس لینڈ میں رہنے والے ان جادوگروں میں کچھ نیک دل تھے جو جادو کی مدد سے شیطانی قوتوں کو انسانی بستیوں سے دور رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اپنے جادو کو شیطانی مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ شیطانی مقاصد کے لیے جادو کو استعمال کرنے والوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ایک ایسا ہی جوڑا ہیلگا فیلڈ کے تراں فارم میں رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ جوڑا کالا جادو جانتا تھا۔ ان کا نام ایگمنڈ اور ایگنڈیز تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی کافی بوڑھے، بدصورت اور بے اولاد تھے۔ ان کی عمر اتنی زیادہ تھی کہ کمر دوہری ہو چکی تھی اور وہ کبڑے لگتے تھے۔ اُن کے چہرے پر بے شمار مسے تھے۔ اُن کے چہرے پر نظر پڑتے ہی کراہت محسوس ہوتی تھی۔ اُن دونوں کی ناکیں بہت لمبی اور چونچ دار تھیں۔ منہ پوپلا ہو چکا تھا اور منہ میں صرف دو چار دانت ہی باقی رہ گئے تھے۔ جب وہ منہ بند کرتے تو اُن کی لمبی چونچ دار ناک ٹھوڑی سے ٹکرانے لگتی۔

ہیلگا فیلڈ کے جادوگر جوڑے سے قصبے کے لوگ بہت نفرت کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ شیطان کے چیلے ہیں۔ ان کے گھر اور کھیت کے سامنے سے کوئی بھی مقامی باشندہ نہیں گزرتا تھا۔ اگر بہ حالتِ مجبوری کسی کو وہاں سے گزرنا بھی پڑ جاتا تو وہ گلے میں پڑی ہوئی صلیب کو تھام کر نیک کلمات کا ورد کرتے ہوئے وہاں سے گزرتا تاکہ اس جوڑے کی شیطانی قوتوں سے محفوظ رہ سکے۔

یہ اس کے سال بھر بعد کی بات ہے جب ناروے کے خونی کردار بربرک کی موت کے ساتھ ہی پورے ملک پر چھائی ہوئی اس کی ہیبت کا خاتمہ ہوا۔ موسمِ بہار آ چکا تھا۔ پہاڑوں پر برف پگھلنے لگی تھی۔ خزاں رسیدہ درختوں پر نئی کونپلیں نکلنے لگی تھیں اور ندی نالوں میں ایک بار پھر شفاف ٹھنڈا پانی گنگناتے ہوئے گزرنے لگا تھا۔

یہ موسمِ بہار کے وسط کی بات ہے۔ اچانک ایک روز گاؤں والوں کے چند گھوڑے مُردہ پائے گئے۔ ایک کسان کی تین گائیں اچانک مر گئیں۔ ایک مقامی...... باشندہ پہاڑی تودے کے نیچے دب کر ہلاک ہو گیا۔ اس نوجوان کی موت کو ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ اُس کی ماں بھی پُراسرار طور پر چل بسی۔ یکے بعد دیگرے ہونے والے ان واقعات نے لوگوں کو دہلا دیا۔ بات موسمِ بہار تک ہی محدود نہیں رہی۔ عجیب و غریب واقعات کا یہ سلسلہ اس کے بعد بھی چلتا رہا۔ اس سال پہلی بار گاؤں میں بھیڑوں نے نامکمل اعضا والے بچوں کو جنم دیا۔ گاؤں کے ایک کسان کی گائے نے جب بچھڑے کو جنم دیا تو اُس کے دو سر تھے۔ یہ سب باتیں غیر معمولی تھیں۔ قصبے کے باشندے ان واقعات کو نہایت سنجیدگی سے لے رہے تھے۔

موسمِ بہار کے اوائل سے شروع ہو جانے والے مافوق الفطرت واقعات نے پورے قصبے کے مکینوں کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ اب یہ بات قصبے تک ہی محدود نہیں رہی۔ قرب و جوار کے علاقوں میں بھی ان پُراسرار واقعات کا چرچا ہونے لگا تھا۔ گاؤں والوں کے پاس تو اس کے سوا بات کرنے کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں بچا تھا۔ سوچ بچار کے باوجود انہیں یکے بعد دیگرے ہونے والے ان پریشان کن واقعات کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

ایک دن قصبے کی چوپال میں یہی واقعہ زیرِ بحث تھا۔ وجہ یہ تھی کہ نارسن کی گائے بچھڑے کو جنم دینے والی تھی۔ اس کی ایک گائے پہلے بھی دو سر والے بچھڑے کو پیدا کر چکی تھی۔ اُس دن چوپال میں یہی موضوع چھڑا ہوا تھا جب کسی نے بے ساختہ کہہ دیا۔ "ان تمام واقعات کے پیچھے وہ جادوگر ہیں جو کالا جادو جانتے ہیں۔ اُنہی لوگوں نے قصبے پر کالا جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے یہ منحوس واقعات رونما ہو رہے ہیں۔"

بس... بات کا منہ سے نکلنا تھا کہ قصبے میں رونما ہونے والے تمام تر پُراسرار واقعات کا سِرا کالے جادو سے جوڑا جانے لگا اور پھر سب نے متفقہ طور پر فیصلہ دے دیا کہ یہ سب کالے جادو کا کیا دھرا ہے۔ کالے جادو کی اس بحث نے پہلے سے ہی ڈرے ہوئے ان باشندوں کو اور بھی خوف زدہ کر دیا۔ سب اپنے دل میں ان مصیبتوں اور کالے جادو کا ذمے دار ہیلگا فیلڈ کے بوڑھے جادوگر جوڑے کو ٹھہرا رہے تھے۔ یہ بات سرگوشیوں میں کی جا رہی تھی۔ کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ جادوگر میاں بیوی کا نام علی الاعلان اپنی زبان پر لا سکے۔ کافی دیر کی بحث کے بعد، آخر کار یہ طے پایا کہ قصبے کے سربراہ تھورفل کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا جائے۔ تھورفل کو یہ بتانے کے لیے کہ قصبے والے کیا سوچ رہے ہیں، ذمے داری کیلیے پر عائد کی گئی۔ بربرک نے ایک بار یہاں حملہ کیا تھا۔ کیلیے بھی اس کے قہر کا نشانہ بنا۔ بربرک نے اپنی بھاری اور تیز دھار تلوار سے اُس کی ایک ٹانگ کاٹ دی تھی۔ اس وجہ سے وہ بیساکھی کے سہارے چلتا تھا۔ سب گاؤں والے اسے 'درخت کی ٹانگ' کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔ جب کیلیے کو کہا گیا کہ وہ گاؤں کے سربراہ کو جا کر سارے حالات بتائے تو اس نے دوسرے دن اُس کے پاس جانے کا وعدہ کر لیا۔

دوسرے دن صبح سویرے اُس نے قصبے کے چند معتبر افراد کو ساتھ لیا اور تھورفل کے گھر پہنچ گیا۔ یہ گھر اس کے کھیت کے بیچوں بیچ بنا ہوا تھا۔ تھورفل قصبے کے اتنے سارے باشندوں کو اپنے گھر پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے نہایت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عزت سے سب کو اپنے گھر کے اندر بلایا۔ وِسکی بیئر اور گوشت کے بھنے ہوئے پارچوں سے اُن سب کی تواضع کی۔ وہ حیران تھا کہ یہاں آنے والے نہایت اہتمام سے تیار ہو کر آئے تھے۔ اُنہوں نے اپنی بہترین پوشاکیں زیبِ تن کی ہوئی تھیں۔ تھورفل کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ قصبے کے یہ معززین اتنے اہتمام سے تیار ہو کر اُس کے پاس کس مقصد سے آئے ہیں۔

کچھ دیر بعد جب تواضع کا دور ختم ہو گیا تو سارے مہمان سنبھل کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تھورفل سمجھ گیا کہ وہ خاص بات جو اُن کے یہاں آنے کا سبب بنی ہے، بس اب اُن کے لبوں پر آنے والی ہے۔ تھورفل نہایت سکون سے بیٹھا ہوا تھا لیکن اس کے اندر بھی تشویش کا سمندر موجیں مار رہا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ گزشتہ چند مہینوں سے قصبے میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس سے آپ اچھی طرح واقف ہوں گے۔" کیلیے نے چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ تھورفل پورے دھیان سے اس کی بات سن رہا تھا۔ "قصبے والے سمجھتے ہیں کہ یہ تمام واقعات اس لیے رونما ہو رہے ہیں کہ ان پر کسی جادوگر نے کالا جادو کر دیا ہے۔ یوں پورا قصبہ اور ہمارے مال مویشی شیطانی قوتوں کے زیرِ اثر آ گئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا۔ جب کیلیے بول رہا تھا تو اس کے ساتھ آنے والے بھی لوگ سر ہلا کر اس کی بات کی تائید کر رہے تھے۔

"تم لوگ یہ کیوں سمجھ رہے ہو کہ ان تمام مصیبتوں اور اموات کا تعلق کالے جادو سے ہے؟" تھورفل نے کیلیے کی بات کا جواب دیتے ہوئے سوال کر ڈالا۔ اس پر کئی لوگوں کے منہ بن گئے۔

"اگر یہ واقعات کالے جادو کا نتیجہ نہیں ہیں تو پھر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس سے پہلے تو کبھی بھی اس طرح کے واقعات رونما نہیں ہوئے۔" کیلیے نے تھورفل کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اُلٹا سوال کر ڈالا۔

"ان واقعات کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ ہر واقعے کے پیچھے جادو کار فرما ہو۔" تھورفل نے نہایت اعتماد سے کیلیے کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "ہو سکتا ہے کہ ٹھنڈ لگنے کے باعث گھوڑے مر گئے ہوں۔ وہ نوجوان اپنی بے احتیاطی کے سبب پہاڑی تودے کی زد میں آ کر ہلاک ہوا ہو۔ اس کی ماں اپنے جوان بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکی اور چل بسی۔" تھورفل جب کیلیے کی بات کا جواب دے رہا تھا تو گاؤں والوں کے چہروں پر ناگواری کے تاثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ "ویسے بددعا، نحوست یا کالا جادو حقیقت تو ہیں لیکن جس پس منظر میں آپ بات کر رہے ہیں، غور کرنے پر اُس کی کئی اور وجوہات بھی سامنے آ سکتی ہیں۔" تھورفل کی بات دلیل پر مبنی تھی اور وہ گاؤں والوں کی بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تمہاری بات میں وزن ہے۔" تھورفل کی بات سن کر کیلیے ایک بار پھر گویا ہوا۔ "اگر ہم تمہاری بات درست مان لیں تو وہ رات کو اکثر نظر آنے والی دودھیا روشنی، وہ دو سر والے بچھڑے کی پیدائش... ذرا یہ بھی تو بتاؤ کہ پھر وہ سب کیا ہے؟"

"یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا ہے۔" تھورفل نے جواب دیا۔

"اگر ایسا پہلے بھی کئی بار ہوا ہے تو پھر ہو سکتا ہے کہ اب بھی یہ سب بددعا یا جادو کا اثر ہو۔" کیلیے کسی بھی قیمت پر اپنے خیالات بدلنے پر تیار نہیں تھا۔

"میرے خیال میں تو...." تھورفل کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن گاؤں والوں سے صبر نہیں ہو سکا۔ انہوں نے اس کی بات بیچ میں کاٹ دی۔

"اگر یہ بددعا یا کالا جادو نہیں تو پھر آپ کے خیال میں آئندہ بھی ایسا ہوتا رہے گا۔" اُن کے لہجے سے ناگواری کی بو آ رہی تھی۔ اُن کا لہجہ ایسا تھا کہ جیسے انہیں یہاں آ کر مایوسی ہوئی ہے۔ "ویسے بھی اس بار ہماری فصل ٹھیک نہیں ہوئی ہے۔ اب اگر آپ کی بات مان لیں تو...."

"خوش نصیبی اور بدقسمتی صرف دو لفظ ہیں۔ انسان کی زندگی میں ان دونوں کا تعلق صرف محنت اور بدحرامی کے باعث بنتا ہے اور کچھ نہیں۔" تھورفل کے لہجے میں بھی ناراضی کی جھلک نمایاں تھی۔

"تو تمہارا مطلب ہے کہ قصبے پر کالا جادو نہیں کیا گیا ہے؟" ایک شخص نے قدرے درشت لہجے میں اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں...." تھورفل کا لہجہ قطعی تھا۔ "برائے مہربانی تم لوگ اپنی اس توہم پرستی کا اظہار میرے گھر پر نہ کرو۔ اگر تمہیں بھی باتیں کرنی ہیں تو برائے مہربانی یہاں سے تشریف لے جاؤ اور وہاں بیٹھ کر یہ گفتگو کرو، جہاں لوگ تمہاری ہاں میں ہاں ملائیں۔ میں بددعا اور جادو وغیرہ جیسی بکواس چیزوں پر یقین نہیں رکھتا۔" تھورفل بھی طیش میں آ چکا تھا۔

"اس وقت قصبے کے لوگ پریشان ہیں اور ہم اس مصیبت سے چھٹکارے کے لیے کوئی راستہ نکالنے کے لیے تمہارے پاس آئے ہیں۔" کیطلے نے صورت حال کی نزاکت کو بھانپ لیا اور ماحول پر چھایا ہوا تناؤ کم کرنے کے لیے نرم لہجے میں تھورفل سے مخاطب ہوا۔ "یقین کرو، ہم سب خطرے میں ہیں۔" اس کا لہجہ رقت آمیز ہوگیا۔

"تمہیں کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ تم خود ہی اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ ہو۔ میرا مشورہ ہے کہ حقیقت پسندی سے کام لو اور منطقی وجوہات کو جاننے کی کوشش کرو۔" تھورفل نے کیطلے کی بات سن کر سب کے چہروں پر نظر ڈالی...... "اگر تم اسی طرح توہم پرستی میں پھنسے رہے تو مجھے ڈر ہے کہ مزید نقصان اٹھاؤ گے۔ ویسے میرے خیال میں تم کولہو کے بیل کی طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر دائرے میں گھوم رہے ہو اور سمجھ رہے ہو کہ سفر کٹ رہا ہے۔ اپنی آنکھوں سے پٹی اتارو اور عقل سے کام لو۔" تھورفل نے بات ختم کی اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہمیں لگتا ہے کہ یہ سب اُن جادوگروں کی وجہ سے ہورہا ہے۔" بورجن نے ماحول پر چھائی ہوئی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"اگر ایسا ہے تو میں ابھی تم سب کے سامنے گھوڑے پر سوار ہوکر جادوگروں کے گھر کے سامنے سے گزروں گا اور پھر سامنے والی پہاڑی تک پہنچ کر واپس پلٹوں گا۔ اگر اس راستے پر کسی جادو کا اثر ہے یا وہ راستہ بددعائیہ ہے تو اس کا اثر مجھ پر بھی ہوگا۔ اگر میں خیریت سے لوٹ آیا تو پھر مان لینا کہ یہ سب تم لوگوں کا وہم ہے۔" بورجن کی بات سن کر تھورفل نے سب کے سامنے تجویز رکھ دی۔

"ہمیں منظور ہے۔" تھورفل کی پیشکش پر کچھ دیر تک تو وہ لوگ باہم سرگوشیاں کرتے رہے اور پھر سب نے یک زبان ہوکر کہا۔

کچھ ہی دیر بعد گھوڑے پر سوار تھورفل ہیلگا فیلڈ کے ٹراں فارم کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ لگ بھگ آدھے گھنٹے کے بعد وہ واپس لوٹا اور نہایت پرجوش انداز میں جست مار کر گھوڑے سے اترا اور بانہیں تھامے فاتحانہ مسکراہٹ سے اُن سب لوگوں کو دیکھتا ہوا آکر چپ چاپ کھڑا ہوگیا۔ سب لوگوں کے چہروں پر حیرت کے آثار تھے، صرف تھورفل وہ واحد شخص تھا جو مسکرائے جا رہا تھا۔

"دیکھ لو، میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔" اس نے جب دیکھا کہ ہر شخص بولنے سے کترا رہا ہے تو اس نے خود ہی اس خاموشی کے طلسم کو توڑا۔ "مجھے چھو کر اچھی طرح تسلی کرلو، مجھے کچھ نہیں ہوا۔ جادو اور بددعا اگر ہیں تو وہ مجھ پر بے اثر ثابت ہوئے۔ اب تو میری بات کا یقین کرو اور توہم پرستی سے باہر نکل آؤ۔"

انگمنڈ اور ایگڈیز نے اپنا گھر فارم کے ایک کنارے پر، پہاڑی کی ڈھلوانی چٹان کے عین نیچے بنایا تھا۔ یہ گھر غیر معمولی انداز میں تعمیر کیا گیا تھا۔ ایسا گھر عام طور پر کوئی نہیں بناتا۔ اگر خدانخواستہ پہاڑ سے کوئی بڑا سا پتھر لڑھک جاتا یا چٹان کا کوئی حصہ ٹوٹ کر نیچے گرتا تو وہ سیدھا اس گھر کی چھت پر گرتا۔ اس کے نتیجے میں چھت ٹوٹ سکتی تھی، مکان منہدم ہوسکتا تھا جس کے باعث گھر میں رہنے والے ملبے کے دب کر مر سکتے تھے۔ شاید گھر کے مکین اس خطرے سے بے خبر تھے یا ان جادوگر میاں بیوی کو زعم تھا کہ ان کے جادو کے سبب ان کا گھر ہر طرح کے خطرے سے محفوظ ہے ورنہ تو ایسی خطرناک جگہ پر گھر بنانے کی وہی ہمت کرسکتا ہے جو بہت زیادہ بہادر ہو یا پھر حد سے زیادہ بے وقوف۔ ان کا فارم بھی اجڑا ہوا تھا۔ ہر طرف خودرو جھاڑیاں اُگ چکی تھیں اور وہ قدآدم حد تک بڑھ چکی تھیں۔ ان کو دیکھ کر لگتا تھا کہ گھر کے مکینوں کو اس جھاڑ جھنکاڑ سے کوئی پریشانی نہیں۔ گھر میں کوئی کتا بھی نہیں تھا کہ جو کسی اجنبی کو دیکھ کر بھونکتا اور اس کی آمد سے اپنے مالکان کو خبر کر دیتا۔

اُس دن چند گاؤں والے تھورفل کے ہمراہ انگمنڈ اور اُس کی بیوی ایگڈیز سے ملنے کے لیے یہاں پہنچے تھے۔ معاملہ وہی تھا کہ گاؤں پر جادو کر دیا گیا ہے۔ تھورفل کو تو اس بات پر یقین نہیں تھا لیکن گاؤں والوں کی تسلی کے لیے وہ اُن کے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ گاؤں کے لوگ جو یہاں آئے تھے، اگر تھورفل اُن کے ساتھ نہ ہوتا تو کبھی بھی اس جگہ پر نہیں آتے۔ وہ تو سمجھتے تھے کہ اس گھر کے سامنے سے گزرنے پر انسان شیطانی قوتوں کے زیر اثر آجاتا ہے۔ وہ تو جب تھورفل نے یہاں سے گزر کر یہ ثابت کر دیا کہ یہ جگہ کسی بھی قسم کے جادو کے زیر اثر نہیں، تب وہ یہاں آنے پر رضامند ہوئے۔ ان میں کئی ایسے تھے جو کہنے کو تو یہاں چلے آئے تھے لیکن اب دل ہی دل میں خود کو کوس رہے تھے کہ وہ یہاں کیوں چلے آئے۔ کئی تو دل ہی دل میں مقدس کلمات کا ورد کررہے تھے تاکہ کسی بھی قسم کے آسیب اور جادو کے اثر سے محفوظ رہ سکیں۔

"مسٹر انگمنڈ...." تھورفل اپنے ہمراہ آنے والوں کو لے کر اس کے دروازے پر پہنچا اور آواز دے کر جواب کا

انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر تک جب اندر سے کوئی جواب نہیں ملا تو ایک بار پھر اُس نے اپنی پاٹ دار آواز میں زور سے پکارا۔ "مسٹر انگمنڈ.... کیا تم گھر پر ہو؟"

"کون ہے؟" اس بار اندر سے فوراً جواب ملا۔ یہ انگمنڈ کی آواز تھی۔

"میں ہوں تھورفل.... قصبے کا سربراہ۔"

"کیا چاہتے ہو؟" انگمنڈ نے سوال کیا۔

"میں تم سے کچھ بات کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔" تھورفل کے جواب میں کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور انگمنڈ باہر نکلا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اسے اُن لوگوں کا یہاں آنا پسند نہیں آیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے ایگڈیز بھی باہر نکلی اور اپنے شوہر کے برابر آکر کھڑی ہوگئی۔ دونوں کی عمریں یکساں تھیں۔ چہرہ بھی لگ بھگ ایک جیسا جھریوں بھرا تھا۔ اگر اُن دونوں کے لباس میں فرق نہ ہوتا تو بتانا بہت مشکل تھا کہ ان دونوں میں سے مرد کون ہے اور عورت کون۔

"میں بطور دوست تمہارے پاس آیا ہوں۔" تھورفل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے پیچھے قصبے کے چند معزز لوگ کھڑے تھے۔ تھورفل نے اُن لوگوں کی طرف اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "آج کل سارے گاؤں میں تمہارے متعلق کچھ افواہیں پھیلی ہوئی ہیں۔ میں یہ جاننے کے لیے آیا ہوں کہ تم خود اس بارے میں کیا کہتے ہو۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا اور انگمنڈ کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہم جانتے ہیں...." انگمنڈ نے درشت لہجے میں جواب دینا شروع کیا۔ "کچھ بے وقوفوں نے یہ افواہیں پھیلائی ہیں کہ ہم کالا جادو کرتے ہیں۔ ایسا کچھ بھی نہیں۔ کوئی حقیقت نہیں ہے اس افواہ کے پیچھے۔ ہم جو کچھ ہیں صرف اپنے لیے ہیں۔ ہمیں کسی اور سے کچھ لینا دینا نہیں۔"

"ممکن ہے تم درست کہہ رہے ہو مگر شاید یہی اصل مسئلہ ہے۔" تھورفل نے انگمنڈ کی بات سن کر کہنا شروع کیا۔ "ممکن ہے کہ قصبے والوں سے عدم تعلق کی بنا پر یہ افواہیں پھیلی ہوں۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ میرے فارم ہاؤس پر چلے آؤ۔ میں سب کو وہیں بلوا لیتا ہوں۔ تم اُن سے اور وہ تم سے ملیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ تم سے مل کر اس بات کو سمجھ لیں کہ تم مافوق الفطرت نہیں بلکہ اُن جیسے ہی ایک عام انسان اور اس قصبے کے پرانے باشندے ہو۔" اس کی بات میں وزن تھا۔ وہ دلیل کی بنیاد پر لوگوں کے اس شک کو دور کرنا چاہتا تھا کہ اس جوڑے نے قصبے پر کالا جادو کر دیا ہے۔

"مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ ہمارے بارے میں گاؤں والے کیا بکواس کررہے ہیں۔" اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ مشتعل ہوچکا ہے۔ "میں کسی سے ملنے کے لیے یہاں سے باہر ہرگز نہیں جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور کینہ توز نگاہوں سے آنے والے لوگوں کو گھورنے لگا۔

"ہم دونوں ہمسائے ہیں اور اسی قصبے کے باشندے ہیں۔ یہ تو اخلاقی فرض بھی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے ملیں۔ میں نہیں جانتا کہ تم ہم لوگوں سے کیوں خائف ہو؟" اگرچہ وہ انگمنڈ کی بات سن کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا مگر جانتا تھا کہ یہ وقت مشتعل ہونے کا نہیں ہے۔ وہ کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ تم پر لعنت ہو مگر مصلحت سے کام لیتے ہوئے گویا ہوا۔ "اگر تم لوگ مل لو گے تو اس سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہوسکتی ہیں۔"

"مجھے ان فضول بکواس کرنے والوں سے ملنے میں کوئی دلچسپی نہیں جو میرے خلاف باتیں بناتے ہیں۔" انگمنڈ نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"ویسے اگر تم اُن سے مل لو تو شاید تمہارے خلاف باتیں کرنے والوں کے منہ بند ہوجائیں۔ بہرحال، ایک نہ ایک دن تمہیں بھی اُن کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"کیا کہا تم نے...." تھورفل کی بات سنتے ہی وہ آگ بگولا ہوگیا۔ "مسٹر! یہ دنیا ہم جیسے تنہا اور بوڑھے لوگوں کے لیے ویسے ہی بہت ظالم بن جاتی ہے۔ خیر چھوڑو.... مجھے تم سے اور تمہارے قصبے والوں سے کیا لینا دینا۔ میں جیسا بھی ہوں، اپنے گھر میں بہت خوش ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی نظریں تھورفل کے چہرے پر گاڑ دیں اور کہنے لگا۔ "بہتر ہے کہ تم میری فکر کرنا چھوڑ دو۔ اپنا خیال رکھو۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ ویسے مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر نہایت خباثت زدہ مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

"میں نے مدد کی بات نہیں کی، میں تو کہہ رہا تھا کہ ضرورت...."

"بات وہی ہے۔ چاہے مدد کہہ لو یا ضرورت۔" انگمنڈ نے تھورفل کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی تم نے جو الفاظ استعمال کیے تھے، یہ بوڑھے اور تنہا لوگوں کے اوپر گراں ثابت ہوتے ہیں.... مجھے...."

تھورفل خاموش کھڑا انگمنڈ کی بات سنتا رہا۔ وہ سمجھ گیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ اس سے بات کرنے کا کچھ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اب اس کے پاس واپس جانے کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں تھا۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر خاموشی سے پلٹا۔ اس کی دیکھا دیکھی جو لوگ اس کے ساتھ آئے تھے، وہ بھی واپسی کے لیے پلٹ گئے۔ فارم سے باہر نکلے تو تھورفل نے ٹھنڈی سانس بھری اور زیرِ لب بڑبڑایا۔ ”دنیا بھر میں عام طور پر دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں... بے وقوف اور بہت زیادہ بے وقوف۔“

”کیا کہا تم نے؟“ جورن جو اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، یہ سن کر پوچھنے لگا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”ایک بات محسوس کی ہے تم نے؟“

”کیا۔“ تھورفل نے جورن کی بات سن کر پوچھا۔

”جب ہم یہاں آئے تو اس وقت ہوا مغرب کے رخ پر چل رہی تھی۔ اب اس کا رخ بدل چکا ہے۔“ جورن نے تشویش بھرے لہجے میں بتایا۔

”اگر ہوا کا رخ بدل گیا ہے تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ تھورفل کے خیال میں جورن نے نہایت احمقانہ بات کی تھی اس لیے اس نے جھلا کر جواب دیا۔

”میں نے تو بس یونہی کہہ دیا تھا۔“ جورن نے خفت مٹاتے ہوئے کہا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ توہم پرستی کے زیرِ اثر نامعقول بات کہہ گیا ہے اور وہ بھی تھورفل کے سامنے جو حقیقت پسندانہ سوچ رکھتا ہے۔ تھورفل کے چہرے پر بدستور ناگواری کے تاثرات چھائے ہوئے تھے۔

تھورفل اور گاؤں کے دیگر چند سرکردہ لوگ اینگمنڈ سے ناخوش گوار ملاقات کے بعد اب پیدل ہی واپس گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ ان کی پشت کے رخ پر ہوا چل رہی تھی۔ تیز ہوا چلنے کی وجہ سے انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے پیچھے سے انہیں کوئی دھکیل رہا ہے۔ کچھ ہی دیر میں وہ دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ جب وہ دریا کے قریب پہنچے، جسے عبور کر کے وہ قصبے کے مرکزی حصے میں داخل ہو جاتے تو ایک بار پھر اچانک ہوا کا رخ تبدیل ہو گیا۔ ہوا ایک بار پھر مغرب کی سمت سے چلنے لگی۔ ہوا کا رخ بدلتا دیکھ کر جورن کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا۔

”ان لوگوں سے ملاقات خوش گوار ثابت نہیں ہوئی لیکن ہمیں ان سے ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔“ تھورفل نے اپنے ساتھ ساتھ چلنے والے جورن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس کے چہرے پر چھائے ہوئے خوف کے سائے کو بھانپ چکا تھا۔ اس لیے اس نے جورن کے اندرونی خوف کو دور کرنے کی غرض سے کہا مگر وہ شدید خوف کا شکار ہو چکا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ ہوا کا اتنی جلدی بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نادیدہ قوت ان کے پیچھے پیچھے چل رہی ہے اور ہوا کے بدلتے ہوئے رخ سے اپنی موجودگی کا احساس کروانا چاہ رہی ہے۔

کچھ ہی دیر میں وہ لوگ دریا پر بنے پل کو عبور کر چکے تھے۔ تھورفل کا گھر قریب تھا۔ وہ ان سے اجازت لے کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ اس کے جاتے ہی جورن نے ہوا کا رخ بدلنے کی بات اپنے ساتھیوں سے کی۔ وہ سب بھی اس کی طرح توہم پرست تھے۔ انہوں نے جورن کی ہاں میں ہاں ملائی اور وہ لوگ اینگمنڈ کی باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ان سب کا خیال تھا کہ اینگمنڈ اور اس کی بیوی ایسا جادو جانتے ہیں جس کی وجہ سے وہ موسموں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے گھر سے باہر نکلتے ہی ہوا کے بدلتے رخ سے اس جوڑے نے اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ لوگ اب فکر مند تھے کہ اگر ان کا خیال درست ہے تو پھر یہ جادوگر جوڑا بارشوں پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے۔ ایسا ہوا تو پھر جب فصل کو بارش کی ضرورت ہوتی ہے، اس وقت وہ بارش کو برسنے سے روک سکتے تھے اور جب بارش کا ہونا فصل کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے، اس وقت وہ بارش برسا سکتے تھے۔ وہ لوگ پریشان تھے اور سوچ رہے تھے کہ اگر ایسا ہوا تو پھر یہ جادوگر جوڑا قصبے والوں کو قحط کا شکار بنا کر انہیں یہاں سے نکل جانے پر مجبور کر سکتا ہے۔

اسی طرح کی قیاس آرائیاں کرتے ہوئے وہ قصبے کی چوپال میں پہنچ گئے۔ چوپال میں لوگ ان کے منتظر تھے اور اینگمنڈ سے ہونے والی ملاقات کا احوال جاننا چاہتے تھے۔

”اس کا مطلب ہے کہ ہم لوگ بدستور خطرے میں ہیں۔“ جورن کی تفصیلی روداد سن کر ایرن نے تشویش سے کہا تو سب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”تشویش کی بات تو یہ ہے کہ وہ جادوگر میاں بیوی اچھی طرح جان چکے ہیں کہ اب تک جو کچھ ہو چکا ہے، اس کی وجہ سے ہم اتنے پریشان ہوئے کہ گھٹنے ٹیکنے کے لیے ان کے پاس چلے آئے۔“ جورن نے اپنے خیالات کا مزید اظہار کیا تو سب کے چہروں پر خوف کی لہر دوڑ گئی۔

اینگمنڈ اور اس کی بیوی کو قصبے کے اکثر لوگوں نے نہیں دیکھا تھا۔ آج سے پہلے اگر کوئی ان کا نام لیے بغیر بھی ان کا ذکر کر بیٹھتا تو یہ لوگ برا سا منہ بنا لیتے تھے لیکن جب سے گاؤں میں یکے بعد دیگرے آنے والی آفات کا سلسلہ شروع

ہوا تھا، تب سے تو یہ لوگ ان کا تصور کر کے ہی کانپ جاتے تھے۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ لوگ اس جوڑے سے ملنے گئے ہوں۔ یہ پہلا موقع تھا جب تھورفل کی سربراہی میں گاؤں کے چند باشندے ان دونوں سے مل کر آئے تھے۔

”ویسے وہ دونوں کیسے دکھائی دیتے ہیں؟“ کسان جان نے نہایت اشتیاق سے پوچھا۔

”بظاہر تو وہ ہم جیسے ہی انسان ہیں۔ ایسے ہی دکھائی دیتے ہیں جیسے ہم میں سے کوئی بھی ستر اسی برس کی عمر میں دکھائی دے سکتا ہے۔“ جورن نے جان کی بات سن کر تفصیل سے بتانا شروع کیا۔ گاؤں کے سارے لوگ دم سادھے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کا پورا دھیان جورن کے الفاظ پر تھا۔ ”ویسے ایک بات مجھے بہت خراب محسوس ہوئی۔ ان کا رویہ غیر دوستانہ تھا اور وہ ایسے بات کر رہا تھا جیسے ابھی ہمیں کچا چبا جائے گا۔“ یہ کہہ کر وہ سانس لینے کو رکا اور مجمع پر اس طرح جائزانہ نظر ڈالی جیسے پیشہ ور قصہ گو اپنے سامعین کے تاثرات جاننا چاہتا ہو۔

”یہ دونوں پوری زندگی دوسروں سے الگ تھلگ رہے ہیں۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ بڑھاپے میں انہیں اپنی تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہو۔ اسی وجہ سے وہ نفسیاتی اور جذباتی دباؤ کا شکار ہو چکے ہوں۔“ جان نے یہ سن کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ کم گو جان نے عقل کی بات کی تھی۔ اس کی بات سن کر کئی لوگوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہم نے تو یہ بھی سنا تھا کہ ان کی کوئی اولاد بھی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ عمر کے اس آخری حصے میں انہیں اپنی تنہائی اس لیے بھی زیادہ اداس کر دیتی ہو کہ بڑھاپے میں ان کا کوئی سہارا نہیں۔“ گاؤں کے ایک اور باشندے نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”بڑھاپے میں اگر دل جوئی کرنے والی اولاد اور غمگسار دوست نہ ہوں تو انسان بیزار اور چڑچڑا تو ہو ہی جائے گا نا۔“ اس نے اپنی بات مکمل کی اور ردعمل جاننے کے لیے سب کے چہروں کی طرف دیکھنے لگا۔ سارا مجمع خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ ان کے دل میں بوڑھے اینگمنڈ اور اس کی بیوی کا تصور اب ایک جادوگر کے بجائے ہمدردی کے مستحق بوڑھے جوڑے میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ گاؤں والے اس جوڑے سے متعلق اپنی پہلی رائے سے کچھ کچھ پیچھے ہٹنا شروع ہو گئے تھے۔

”میرے خیال میں ہمیں ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اگر ہم ان سے دوستانہ طور پر ملیں تو شاید ان کا رویہ بدل جائے۔“ بوڑھے کمہار گاتھم نے نہایت پتے کی بات کی۔ ”یہ پہلا موقع تھا کہ جب ان سے قصبے کے لوگ ملنے کے لیے گئے تھے، وہ بھی شکایت کرنے کے لیے۔ میرے خیال میں اگر ہم ان سے بغیر کسی وجہ کے صرف بطور دوست ملنے کے لیے جائیں تو ممکن ہے کہ ہمارے لیے ان کے دل میں ہمدردی کا جذبہ بیدار ہو جائے۔ ویسے بھی وہ ہم جیسے ہی انسان ہیں تو پھر ان سے ڈرنا کیسا۔“ گاتھم کا شمار گاؤں کے چند عمر رسیدہ دانش مندوں میں ہوتا تھا اس لیے جب اس نے ٹھوس مشورہ دیا تو کئی لوگ سوچ میں ڈوب گئے۔

ذرا ہی دیر میں گھوڑے پر سوار تھورفل بھی وہاں پہنچ گیا۔ جب اسے لوگوں نے بتایا کہ ہم اینگمنڈ سے دوستانہ تعلق استوار کرنے کے بارے میں بات کر رہے ہیں تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”بہت اچھا... ہمیں عقل مند انسانوں کی طرح سوچنا چاہیے۔ ویسے بھی وہ لوگ ہمارے قصبے کے ہی باشندے ہیں۔ ہم سے الگ تھلگ رہتے ہیں، ان کا گھر کافی دور ہے تو پھر کیا ہوا... ہیں تو وہ ہمارے اپنے علاقے کے لوگ۔“ جب جورن نے اب تک ہونے والی ساری گفتگو کا خلاصہ تھورفل کے گوش گزار کیا تو وہ کہنے لگا۔

”میرے خیال میں ہم عورتوں کو اینگمنڈ کی بیوی کے پاس بھیجتے ہیں۔ عورتیں نرم دل ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح اس کی بیوی کا دل پسیج جائے اور وہ ہم سے دوستانہ تعلق استوار کرنے پر سوچنے لگیں۔“ تھورفل نے تجویز پیش کی۔

”بالکل ٹھیک ہے۔“ گاتھم نے فوراً سر ہلا کر کہا۔

”لیکن اس کے پاس جو عورتیں جائیں گی، ان کی سربراہ کون ہوگی؟“ تھورفل نے سوال کیا۔

”انگ ریڈ سب سے مناسب رہے گی۔“ گاتھم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”وہ بڑی سنجیدہ اور معاملہ شناس عورت ہے۔ میرے خیال میں وہ اینگمنڈ کی بیوی سے بات کرنے کے لیے مناسب رہے گی۔“

”یہ بات ٹھیک ہے۔“ جورن نے سر ہلا کر تائید کی۔

”ٹھیک ہے مگر اس سے بات کون کرے گا؟“ تھورفل نے پھر سوال کیا۔

”میں جاؤں گا اس کے پاس۔ مجھے امید ہے کہ وہ منع نہیں کرے گی۔“ گاتھم نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ تم اس سے بات کرو اور کہو کہ اپنے ساتھ قصبے کی چند اور عورتوں کو بھی وہاں جانے پر رضا مند کرے۔ ویسے یہ عورتیں مردوں سے زیادہ توہم پرست ہوتی ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہیں ایسا نہ ہو کہ انگ ویلڈ تو راضی ہو جائے مگر دوسری عورتیں...“

”ایسا نہیں ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ انگ ویلڈ اپنے ساتھ جانے کے لیے چند عورتوں کو رضامند کرلے گی۔“ گاتھو کے لہجے میں امید تھی۔

تھورفل کو اس کی یہ حقیقت پسندی اور عقل سے معاملہ سلجھانے کا طریقہ بہت پسند آیا تھا۔ ”ٹھیک ہے۔ تو ابھی جا کر اس سے بات کرو۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ابھی انگ ویلڈ کے گھر جاتا ہوں۔“ تھورفل کی بات سن کر گاتھو نے اٹھتے ہوئے کہا۔

انگ ویلڈ سمجھ دار خاتون تھی۔ اس کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ دس برس سے بیوگی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ وہ خود اپنے کھیت پر کاشت کرتی، گائے کا دودھ دوہتی اور ان کی رکھوالی کیا کرتی تھی۔ پورے گاؤں میں اس کی بہت عزت تھی۔ جب گاتھو نے جا کر اس سے معاملہ بیان کر کے مدد چاہی تو وہ فوراً قصبے والوں کی بھلائی کی خاطر وہاں جانے پر نہ صرف خود تیار ہو گئی بلکہ اپنے ساتھ چند اور عورتوں کو لے جانے کی ذمے داری بھی قبول کرلی۔

دوسرے روز دن چڑھے انگ ویلڈ کی سرکردگی میں گاؤں کی چند عورتیں خیر سگالی کے طور پر ایگنڈ یز سے ملنے کے لیے اُن کے فارم پر جارہی تھیں۔ اُن کا گھر قصبے سے بہت زیادہ دور نہیں تھا لیکن پھر بھی گاتھو نے اُن کے لیے اپنی بگھی پیش کردی تھی۔ انہوں نے چیری، خوبانی اور پنیر سے بھری ہوئی دو باسکٹیں بھی رکھ لی تھیں۔ ان باسکٹوں کو جنگلی پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ جب ایگنڈ یز سے ملیں تو اسے خیر سگالی کے طور پر یہ تحفہ پیش کریں۔

یہ دوپہر کا وقت تھا جب انگ ویلڈ تھورفل کے گھر پہنچی۔ اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔

”کیا ہوا... سب خیریت تو ہے نا؟“ تھورفل نے اس کو پریشان دیکھا تو گھبرا کر سوال کیا۔ اُس وقت وہ جورن، گاتھو اور قصبے کے چند دوسرے لوگوں کے ہمراہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا انہی عورتوں کی واپسی کا منتظر تھا مگر جب انگ ویلڈ تنہا واپس پہنچی تو اس کو تشویش لاحق ہو گئی۔

”ہم وہاں گئے تھے مگر ایگنڈ یز نے ہماری بہت..... بے عزتی کی۔“ بدحواس انگ ویلڈ کرسی پر بیٹھ گئی اور پانی پینے کے بعد روداد بیان کرنا شروع کی۔

”جب ہم وہاں پہنچے تو وہ ہمیں دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئی۔ اُس کا شوہر بھی اُس کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ منہ سے تو کچھ نہیں بولا لیکن لال لال آنکھوں سے ہمیں گھورتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے ہمیں بہت خوف آ رہا تھا۔ ہم خاموشی سے کھڑے سنتے رہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لے تو میں کچھ کہوں۔ کافی دیر بعد جب وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی تو ہم نے اسے تحفے پیش کرتے ہوئے کہا کہ ناراض مت ہو۔ ہم تو دوستوں کی طرح تم سے ملنے آئے ہیں۔ پھولوں سے سجی باسکٹ دیکھ کر وہ اور بپھر گئی۔ اس نے باسکٹ میرے ہاتھوں سے لی اور غصے سے زمین پر پھینک دی۔ ساری چیزیں زمین پر گر گئیں اور پھر اس نے چیختے چلاتے ہوئے اپنے پاؤں سے انہیں کچلنا شروع کر دیا۔ خوبصورت جنگلی پھول، رسیلی چیری، میٹھی خوبانی، تازہ پنیر... اُن سب چیزوں کو اس نے اپنے پاؤں سے کچل کچل کر بالکل چٹنی کر دیا۔ یہ دیکھ کر تو میں ششدر رہ گئی۔ پھر اس نے نہایت بدتمیزی سے ہمیں اپنے فارم سے نکل جانے کو کہا۔ ویسے بھی اتنا کچھ ہو جانے کے بعد وہاں ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ سو ہم واپس آ گئے۔“

”تمہارے ساتھ تو کچھ اور عورتیں بھی گئی تھیں مگر...“ تھورفل نے ساری روداد سن کر انگ ویلڈ سے پوچھا۔

”وہ سب خوف زدہ ہو گئیں اور ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگیں۔ میں نے پہلے انہیں اُن کے گھروں پر چھوڑا اور پھر تمہیں یہ بتانے کے لیے یہاں آ گئی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”ویسے خدا معاف کرے، بڑے کمینہ خصلت اور بدصورت ہیں وہ دونوں۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی ایسے آگ بگولا ہوئی کہ جیسے ہم نے اس کے ہاتھوں پر دہکتا ہوا انگارہ رکھ دیا ہو۔“

انگ ویلڈ نے جو داستان سنائی، اسے سن کر تھورفل جیسے ٹھنڈے مزاج شخص کو بھی بہت غصہ آیا۔

”میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ یہ میری ہی تجویز تھی، جس کی وجہ سے آپ کو اتنی بے عزتی اٹھانا پڑی۔“ گاتھو نے شرمندہ لہجے میں انگ ویلڈ سے کہا۔ وہ اس عورت کی بہت عزت کرتا تھا لیکن اس کی تجویز پر عمل کرنے سے اُس بے چاری کو خواہ مخواہ میں جو شرمندگی اٹھانا پڑی تھی، اس کے باعث اب وہ انگ ویلڈ سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔

”نہیں... اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تم نے جو کچھ کہا اور کیا، وہ قصبے کے مفاد کو مدِنظر رکھ کر کیا۔“ انگ ویلڈ نے بھی اس کی شرمندگی کو محسوس کر لیا تھا، لہٰذا اس نے اُس کی خفت کو کم کرنے کے لیے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ جورن تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہے۔ سوچتے ہیں کہ اب کیا کرنا ہے؟“ تھورفل کی بات سن کر جورن اٹھا اور انگ ویلڈ کو اس کے گھر پہنچانے کے لیے چل دیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد تھورفل اور گاتھو تنہا رہ گئے۔ وہ ساری صورت حال پر غور کرتے رہے مگر کسی حل پر نہ پہنچ سکے۔ کچھ دیر بعد جورن بھی واپس آ گیا۔ وہ بھی خاصا پریشان تھا۔ سہ پہر تک یہ تینوں اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ کس طرح ایگنڈ اور اس کی بیوی کو یہ احساس دلایا جائے کہ گاؤں والے اُن کے دشمن نہیں بلکہ ہمدرد ہیں مگر انہیں کوئی راستہ نہ سوجھا۔

کچھ اور دن اسی اُدھیڑ بُن میں گزر گئے۔ لوگ اب کھلم کھلا کہنے لگے تھے کہ جو غیر معمولی واقعات رونما ہو رہے ہیں، اُن کے پیچھے وہی جادوگر جوڑا ہے۔ انگ ویلڈ کی بے عزتی کے بعد لوگ اُن دونوں بوڑھے میاں بیوی سے سخت نالاں تھے۔ چند روز پہلے اُس جوڑے سے ہمدردی کے جو جذبات ان کے دلوں میں پیدا ہو چکے تھے، وہ ایسے غائب ہو گئے جیسے خزاں کے موسم میں درختوں سے پتے۔

چند روز اسی طرح گزر گئے۔

جب سے یہ لوگ ایگنڈ کے فارم سے واپس آئے تھے تب سے کر اب تک کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا مگر ایک دن... اچانک نہایت عجیب واقعہ ہوا جس نے پورے گاؤں کو دہلا کر رکھ دیا۔

یہ ایگنڈ اور اس کی بیوی سے گاؤں والوں کی ملاقات کے لگ بھگ ایک ہفتے کے بعد کا ذکر ہے۔ اس روز سورج حسبِ معمول طلوع ہوا تھا مگر دن کے آغاز کے ساتھ ہی گاؤں میں عجیب واقعہ ہوا۔

جب دن چڑھا تو نیلا آسمان بالکل شفاف تھا۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اچانک دریا والی وادی کی پہاڑیوں کی اوٹ سے زرد بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ پھیلتا چلا گیا۔ کچھ ہی دیر میں کیلیے کے فارم کے اوپر یہ بادل چھا گئے۔ اس وقت کیلیے کی بھیڑیں فارم پر چر رہی تھیں۔ جیسے ہی بادلوں کا سایہ اس کے فارم پر چھایا، اس کے کچھ ہی دیر بعد وہاں چرنے والی بھیڑیں ایک ایک کر کے مرنے لگیں۔ ذرا سی دیر میں کئی بھیڑیں مر چکی تھیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ بادل صرف اس کے فارم اور دریا کی سمت والے وادی کے کچھ علاقے پر ہی چھائے ہوئے تھے۔ باقی سارا آسمان بادلوں سے خالی تھا۔ ہر جگہ دھوپ نکلی ہوئی تھی، صرف اس تھوڑے سے علاقے کو چھوڑ کر۔

تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر پورے قصبے میں پھیل چکی تھی۔ ہر طرف عجیب سا خوف چھایا ہوا تھا۔ گاتھو اس وقت اپنے کھیتوں پر کام کر رہا تھا۔ یہ عجیب و غریب خبر سن کر وہ بھی دوڑتا ہوا کیلیے کے فارم پر پہنچا۔ جب وہ پہنچا تو تھورفل اور جورن پہلے سے ہی وہاں پر موجود تھے۔ اُس نے دیکھا کہ سامنے چھ بھیڑیں مری ہوئی پڑی تھیں۔ چند ایک کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے جن میں خون کی سرخی صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے عجیب بات محسوس کی۔ گھاس چمک رہی تھی۔ اس سے آنکھوں میں چبھنے والی ہلکی مگر تیز روشنی پھوٹ رہی تھی۔ گاتھو کی نظر بھی جب گھاس پر پڑی تو اس نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا۔ وہ اکڑوں بیٹھ گیا اور چند پتیاں توڑ کر انہیں دیکھنے لگا۔ گھاس کی پتیاں کرسٹل کی طرح چمک رہی تھیں۔ یہ بہت ہی انہونی بات تھی۔ وہ اس عجیب و غریب گھاس کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک اور بات اسے حیران کر رہی تھی۔ یہ بہار کا موسم تھا۔ اس موسم میں گھاس کا رنگ نہایت سبز ہوتا ہے مگر یہ گھاس زردی مائل نظر آ رہی تھی۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ تھورفل نے کہا۔

”چھوڑو ذرا چشمے پر چل کر دیکھتے ہیں کہ وہاں کیا صورت حال ہے۔“ یہ سن کر گاتھو کھڑا ہو گیا اور پھر تھورفل، جورن اور کیلیے کے ہمراہ چشمے کی طرف چل پڑا۔

کیلیے کے فارم کے قریب قدرتی چشمہ بہتا تھا جس کا پانی نہایت خوش ذائقہ دار، ٹھنڈا اور صحت بخش تھا۔ اسی چشمے سے کیلیے اپنے کھیت کو سیراب کیا کرتا تھا۔ جس پہاڑی چٹان سے چشمہ پھوٹتا تھا، اس کے نیچے ایک قدرتی نالا موجود تھا جس کے ذریعے چشمے کا شفاف پانی کافی دور تک بہتا ہوا چلا جاتا اور پھر دریا میں مل جاتا تھا۔ اس نالے میں کافی مچھلیاں تھیں۔ مچھلیوں کے شکار کے شوقین اکثر یہاں مچھلیاں پکڑنے آتے تھے۔ چشمے سے پانی نکلتا نہیں بلکہ ابلتا تھا اور چٹانوں پر سے جھرنے کی طرح بہتا ہوا نالے میں گرتا تھا۔ پانی گرنے کی مسلسل آواز سے فضا میں ہر وقت جلترنگ بجتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

کیلیے جب اپنے ساتھیوں کے ساتھ چشمے پر پہنچا تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ڈھیروں مچھلیاں مُردہ حالت میں سطحِ آب پر موجود تھیں۔ چشمے کے برابر میں کیلیے نے ایک تالاب بنایا ہوا تھا جس میں پانی ذخیرہ کر کے وہ اس سے کھیتوں میں آب پاشی کیا کرتا تھا۔ چشمے سے پانی نالے میں گر تو رہا تھا لیکن اس کی رفتار بہت کم تھی۔ اتنی کم کہ اونچائی سے نالے میں گرنے والے پانی کی آواز بھی خلافِ معمول سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اُن سب کی آنکھیں اس وقت پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب انہوں نے دیکھا کہ نالے کا شفاف پانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زرد ہو چکا ہے۔ نالے کا پانی اتنا شفاف تھا کہ اُس کی تہ میں پڑے ہوئے پتھر بھی صاف نظر آتے تھے لیکن اس وقت یہ گندے پانی کا نالا لگ رہا تھا۔

"یہ کیا ہوا؟" پورے ماحول کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد تھورفل نے حیرت سے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی عقل کام نہیں کررہی تھی کہ یہ سب کیا ہورہا ہے۔

"مجھے خود سمجھ نہیں آرہا۔" کیطلے نے خوف زدہ لہجے میں جواب دیا۔ "پتا نہیں کیا ہورہا ہے۔" وہ روہانسا ہورہا تھا۔

"اب وقت آگیا ہے کہ ہمیں کچھ کرنا پڑے گا۔" اس نے تھورفل کی طرف دیکھتے ہوئے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"ہاں واقعی..." گانتھو نے مختصر سا جواب دیا۔ اب تک وہ خاموش تھا لیکن جو کچھ اس نے دیکھا تھا، اس کے بعد اب وہ بھی سوچ رہا تھا کہ یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اب انہیں ہمت سے کام لیتے ہوئے تدارک کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا پڑے گا۔

کافی دیر تک وہ چاروں وہیں کھڑے رہے اور اس بات پر غور کرتے رہے کہ جو صورتِ حال درپیش ہے، اس کی وجہ کیا ہے۔ گاؤں پر ٹوٹنے والی تمام تر آفات کا ذمے دار کون ہوسکتا ہے اور اُن کی شیطانیوں سے کیسے بچا جائے۔ کافی دیر تک غور و خوض کے بعد بھی اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

گانتھو کے ہاتھوں میں اس گھاس کی پتیاں بدستور موجود تھیں جو اس نے وہاں سے توڑی تھیں جہاں پر بھیڑیں مُردہ حالت میں پڑی ہوئی تھیں۔

"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟" اچانک تھورفل کی نظر گانتھو کے اس ہاتھ پر پڑی جس میں گھاس کی پتیاں موجود تھیں۔

"تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟" کافی دیر تک گھاس کی اُن پتیوں کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد تھورفل نے اُن سے سوال کیا۔

"گھاس ہے۔" تینوں نے یک زبان جواب دیا۔

"اس گھاس کی رنگت دیکھو۔ ایسا لگتا ہے کہ خزاں کے موسم میں سردی سے جلی ہوئی گھاس ہے۔ یہ زرد گھاس ہے۔ یہ آتش فشانی علاقوں میں پیدا ہوتی ہے اسی لیے اس گھاس کا رنگ زرد ہوتا ہے۔ آتش فشاں سے اُڑنے والی راکھ کی بدولت اردگرد کی زمین بھی آلودہ ہوجاتی ہے۔ اس لیے انہی آلودہ مادوں کی وجہ سے گھاس کا رنگ زرد ہوجاتا ہے۔" تھورفل کی بات ان کے لیے ایک نئی منطق کا بیان تھا۔ وہ

تینوں نہایت حیرت سے اس کی بات سن رہے تھے۔ "یہ گھاس زہریلی ہے۔ اس کے کھانے سے جانور فوراً مرسکتا ہے... بالکل ایسے جیسے زہر کھلا دینے سے کوئی بھی جان دار فوراً مرسکتا ہے۔"

"یہ زہریلی گھاس یہاں کہاں سے آئی۔ اردگرد تو کوئی بھی آتش فشاں نہیں۔ مانو یا نہ مانو، یہ سب جادو کا اثر ہے۔ یہ سب جادو ہے۔" اس نے تھورفل کی بات سن کر تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ تھورفل خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔

"ہمیں ہیلگا فیلڈ جانا ہوگا۔" جورن نے کہا۔ "ہمیں اُن جادوگروں کو بتانا ہوگا کہ اُن کے سحر سے ہم پر کیا کیا مصیبتیں ٹوٹ رہی ہیں۔ ہمیں اب سختی سے کام لینا ہوگا۔" کیطلے کا لہجہ سخت تھا۔

"جو تمہارا دل چاہتا ہے، وہ کرو۔" تھورفل نے یہ سن کر ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے لہجے سے مایوسی جھلک رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں ہیلگا فیلڈ جا رہا ہوں تاکہ اُن جادوگروں سے بات کرسکوں۔" یہ کہہ کر جورن پلٹا اور اُس طرف بڑھ گیا جہاں پر درخت کے تنے سے اُس نے اپنا گھوڑا باندھ رکھا تھا۔

جورن دریا کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ وہ کافی دور پہنچ چکا تھا جب اس نے ہیلگا فیلڈ کے قریب پہاڑی کے اوپر فضا میں زرد ذرات اُڑتے ہوئے محسوس کیے۔

وہ پہاڑیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ جب وہ اُن پہاڑیوں کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ چٹان میں متعدد دراڑیں پڑچکی ہیں۔ اُن دراڑوں سے گرم گرم سیاہی مائل گاڑھا مادہ اُبل اُبل کر باہر نکل رہا ہے اور اردگرد پھیلتا جارہا ہے۔ اُبلتے ہوئے گرم مادے سے زرد رنگ کا دھواں اُٹھ رہا تھا جو اوپر کی طرف جاکر پھیلتا جارہا تھا۔ چٹانی علاقے کے اطراف میں مُردہ پرندوں کے جسم بکھرے ہوئے پڑے تھے۔ ماحول خاصا گھٹن زدہ ہورہا تھا۔ یہ دیکھ کر جورن بہت پریشان ہوا۔ اگرچہ وہ چٹانی علاقے سے کافی دوری پر تھا لیکن جو کچھ ہورہا تھا، وہ صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ خوف زدہ ہوگیا۔ "یہ سب اس جادوگر کی وجہ سے ہورہا ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ اُس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس جگہ کے اور قریب جاسکتا۔ اگرچہ وہ بہت خوف زدہ ہوچکا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے ہیلگا فیلڈ کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ ہیلگا فیلڈ پہنچ چکا تھا اور ایگمنڈ کے گھر کے سامنے کھڑا ہوکر اُسے پکار رہا تھا۔ "باہر آؤ... مجھے تم

سے بات کرنی ہے۔"

"کیا بکواس ہے۔ دفع ہوجاؤ یہاں سے۔" جورن کے کئی بار پکارنے پر اندر سے آواز آئی۔ "مجھے تم سے بات نہیں کرنی۔ دفع ہوجاؤ یہاں سے اپنی منحوس صورت لے کر۔"

"تمہیں مجھ سے بات کرنا ہی ہوگی۔" جورن نے پھر چلا کر کہا۔

"تم مر کیوں نہیں جاتے منحوس۔" اس بار کسی عورت نے جواب دیا۔ اُن دونوں کی آواز پر لرزہ طاری تھا اور اس دوران کئی بار جورن کو محسوس ہوا کہ بڑھاپے کے باعث چلاتے ہوئے اُن کی آواز بیچ میں ٹوٹ رہی تھی۔

جورن ان دونوں سے بات کیے بنا واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ گھوڑے سے اُترا اور برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔ اسی دوران میں اچانک گھر کا دروازہ کھلا اور ایگمنڈ باہر آیا۔ اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے ہیڈ بیچ بھی باہر نکل آئی۔ جورن اپنے گھوڑے پر سوار تھا اور اُن میاں بیوی سے صرف چند گز کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ جورن کا پالتو گھوڑا بہت وفادار تھا لیکن جیسے ہی ایگمنڈ اور اس کی بیوی باہر آئی، گھوڑے نے بے چینی سے ہنہنانا شروع کردیا اور دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہوگیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی ایسی شے کو دیکھ کر ڈر گیا ہے جو شاید جورن کو نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے مضبوطی سے لگام تھامی ہوئی تھی۔ اچانک گھوڑے نے اپنے دونوں اگلے پاؤں زمین پر مارنے شروع کردیے اور تیزی سے دائرے میں چکر لگانے لگا۔ جورن نے لگام اور سختی سے تھام لی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے۔ وہ اور بھی خوف زدہ ہوچکا تھا لیکن اس کے باوجود جو کچھ ہورہا تھا، اس معاملے پر ایگمنڈ سے بات کیے بغیر واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اچانک گھوڑے نے دوڑنا شروع کیا اور ایگمنڈ کے گھر سے تقریباً پچاس گز آگے جاکر کھڑا ہوگیا۔ وہ اب بھی گھبرایا ہوا لگ رہا تھا اور وقفے وقفے سے ہنہنا رہا تھا... جورن سمجھ گیا کہ اردگرد کوئی ایسی مافوق الفطرت شے ضرور موجود ہے جسے یہ جانور دیکھ چکا ہے اور اسے اپنے لیے خطرہ محسوس کررہا ہے۔

گھوڑا آگے جاکر رکا تو جورن نے سامنے سے کچھ لوگوں کو آتے ہوئے دیکھا۔ وہ گھوڑوں پر سوار اس طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر اس میں اور ہمت آگئی۔ اس نے گھوڑے کو موڑا اور گھر کی طرف دیکھا۔ ایگمنڈ اور اس کی بیوی اب بھی برآمدے میں کھڑے ہوئے تھے۔ وہ اسے گھور رہے تھے لیکن خلافِ توقع خاموش تھے۔

"لوگ آرہے ہیں۔ تم چھپ سکتے ہو تو چھپ جاؤ۔" وہ چلایا۔ "اب تم نہیں بچ سکتے۔ بہت مصیبت اٹھائی ہے ہم نے تمہاری وجہ سے۔" مگر اُن دونوں میاں نے کوئی جواب نہیں دیا اور گھر کے اندر چلے گئے۔

اتنی دیر میں وہ گھڑسوار بھی اس کے قریب پہنچ گئے۔ سب سے آگے تھورفل تھا۔ وہ جورن کے قریب پہنچا۔ "کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"سب مصیبت کی جڑ یہ دونوں میاں بیوی ہیں۔ اس بار ہمیں ان کا کام تمام کرنا ہی پڑے گا۔" جورن خاصا جذباتی ہورہا تھا۔

"یہاں آتے ہوئے تم نے اُدھر چٹانوں پر سے زرد دھواں اُٹھتے ہوئے اور لاوا بہتے ہوئے دیکھا؟" تھورفل نے اس سے پوچھا۔

"ہاں دیکھا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔" تھورفل نے کہا۔

"جسے تم معمول کی بات کہہ رہے ہو، وہ نہایت غیر معمولی بات ہے۔" جورن نے تشویش بھرے لہجے میں کہا

خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۂ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یمنی، عقیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہوجائے گا۔ افسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مرد و عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورۂ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826,021-32446647

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شروع کیا۔ ”یہ سب کچھ ان جادوگر میاں بیوی کا کیا دھرا ہے۔ یہ مصیبت کی جڑ ہیں۔ ہم انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ جورن نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

”کیا بکواس کررہے ہو تم۔“ تھورفل چلّایا۔

”بکواس نہیں، حقیقت ہے۔ اگر ایک ڈاڑھ خراب ہو تو پورے جبڑے میں درد کردیتی ہے۔ درد سے بچنے کے لیے خراب ڈاڑھ کو منہ سے نکالنا ہی پڑتا ہے۔“ جورن کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ ان میاں بیوی کی جان کے درپے ہو چکا تھا۔ ”یہ جادوگر ہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ ہماری جان لیں، ہم ان کو مار دیتے ہیں۔“ جورن چیختے جارہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس پر دورہ پڑ چکا ہے۔

”ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے تم درست ہو، میں غلط تھا۔“ آخرکار تھورفل نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ ”پورے جبڑے میں درد کرنے والی خراب ڈاڑھ کا نکال دینا ہی ضروری ہے۔“ یہ سنتے ہی جورن بڑی حد تک نارمل ہوگیا۔

”تم قصبے میں اطلاع کردو۔ انہیں کہو کہ سب مرد اور عورتیں یہاں پہنچیں۔ اگر یہ مصیبت کی جڑ ہیں تو پھر آج اس جڑ کو ہی کاٹ ڈالتے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک۔ میں اور جورن قصبے کی طرف جارہے ہیں۔ تم ان پر نظر رکھو۔“ گاتھو نے جواب دیا اور اگلے ہی لمحے وہ دونوں اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگاتے ہوئے قصبے کو جانے والے راستے کی طرف بڑھ چکے تھے۔ تھورفل نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ آسمان کی طرف دیکھا اور بڑبڑایا۔ ”یہ سب سے بہترین وقت ہے اس کام کو نمٹانے کا۔“ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور تفصیل سے اینگمنڈ کی اس زرعی زمین کی طرف دیکھنے لگا جس پر قد آدم جنگلی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ ”اگر اس زرخیز زمین کی ذرا سی دیکھ بھال کی جاتی تو یہاں سرسبز و شاداب کھیت اور پھل دار درخت ہوتے مگر افسوس کہ اینگمنڈ بہت ہی بے عقل نکلا۔ کم بخت یہ سمجھ نہیں سکا کہ آسائش کے لیے جادو نہیں زمین ضروری ہے۔ بے چارہ اینگمنڈ اور اینگلڈیز... انہیں تو اب عزت کی موت بھی نصیب نہیں ہوسکتی۔“ وہ بڑبڑائے جارہا تھا۔

☆☆☆

شام ڈھلنے والی تھی۔ ہیگا فیلڈ میں پہاڑی کے بنے اینگمنڈ اور اینگلڈیز کے گھر کے سامنے بہت سارے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ سب اس جادوگر جوڑے کا قصہ پاک کرنے کے لیے یہاں پہنچے تھے۔ گاؤں کے تقریباً تمام ہی مرد یہاں پہنچ چکے تھے۔ عورتوں کی آمد کا انتظار کیا جارہا تھا۔ انہیں لانے کی ذمے داری گاتھو پر عائد کی گئی تھی۔ قصبے کی جو عورتیں یہاں پہنچنے والی تھیں، اُن کی سربراہی تھورفل کی بیوی کو سونپی گئی تھی۔ قصبے کے باشندوں کو یقین آچکا تھا کہ جب تک اس جوڑے کو موت کی نیند نہیں سلادیا جاتا، تب تک قصبے پر چھائے مصیبت کے بادل نہیں چھٹ سکتے۔ اس سارے واقعے میں جورن نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس نے قصبے میں جاکر سارا قصہ اس انداز سے بیان کیا کہ لوگ فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور اس نیک کام کو سرانجام دینے کے لیے یہاں پہنچ گئے۔ اب انہیں صرف قصبے کی عورتوں کی آمد کا انتظار تھا۔

تھورفل کی رضامندی سے یہ طے پایا تھا کہ مرد اینگمنڈ کو پکڑ کر پہلے تشدد کا نشانہ بنائیں گے اور پھر اسے اس کے گھر کے سامنے پھانسی پر لٹکادیں گے جبکہ اس کی بیوی کو عورتیں سنگسار کردیں گی۔ بعد میں ان دونوں کی لاشوں کو یہاں سے کافی دور لے جاکر جلادیا جائے گا تاکہ ان کے مُردہ جسموں سے کوئی ممکنہ بدروح جنم لے کر انہیں پریشان نہ کرسکے۔ سب لوگوں نے اس منصوبے کی حمایت کی۔ وہ سب بہت خوش تھے کہ تھورفل نے اپنی رائے بدل دی تھی۔ پہلے اُسے جادوگر جوڑے کا ہمدرد سمجھا جاتا تھا لیکن آج وہ خود اس سارے قصے کو نمٹانے میں ان کی قیادت کررہا تھا۔

”واقعی... تھورفل بہت ہمدرد، سچا اور بہادر انسان ہے۔“ گاؤں کے باشندے ایڈورڈ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”اگر وہ منظوری نہ دیتا تو اس جوڑے کا قصہ نہیں نمٹ سکتا تھا۔ شکر ہے اسے بات سمجھ آگئی۔ ورنہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جادوگر جوڑے کے ہاتھوں ہمیں اور کتنی مصیبتیں اٹھانا پڑتیں۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ اس کے ساتھیوں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

مجمع نہایت جوش میں تھا۔ لوگ ٹولیوں کی شکل میں کھڑے ہوئے تھے اور وقت گزاری کے لیے...... اپنے اجداد کی بہادری کے قصے بیان کررہے تھے۔ لکڑی کی ٹانگ کے سہارے کھڑا ہوا کیبلے لوگوں کو اس معرکے کی داستان سنا رہا تھا جس میں اس کی ایک ٹانگ ضائع ہوگئی تھی۔ غرضیکہ ہر کوئی بہادری کے ایسے ایسے قصے سنا رہا تھا جس سے ہجوم کا جوشِ انتقام تیز ہوتا جارہا تھا۔

دوسری طرف چند نوجوان کھڑے تھے۔ یہ گھر پر نظر

رکھے ہوئے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ ہجوم کو دیکھ کر وہ دونوں فرار ہوسکتے ہیں اس لیے ہر طرف سے اُن کے گھر کی نگرانی کی جارہی تھی۔ اینگمنڈ اور اینگلڈیز کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ دونوں گھر کے اندر کیا کررہے ہیں۔

اچانک ہجوم نے پرجوش نعرے لگانا شروع کردیے۔ سامنے سے اُڑتی ہوئی دھول سے انہیں پتا چل گیا کہ بگھیاں عورتوں کو لے کر پہنچ چکی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں قصبے کی عورتیں بگھیوں سے اتر رہی تھیں۔ مردوں نے پتھر جمع کرکے اُن کی کئی چھوٹی بڑی ڈھیریاں لگادی تھیں۔ ان پتھروں سے بوڑھی اینگلڈیز کو سنگسار کیا جانا تھا۔ عورتوں کی سربراہی تھورفل کی بیوی کررہی تھی۔ اس نے سب عورتوں کو سمجھانا شروع کیا کہ کس طرح اس جادوگرنی کو پتھر مار مار کر ہلاک کرنا ہے۔ عورتیں دھیان سے اس کی بات سن رہی تھیں۔

شام ڈھلنے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ اندھیرا چھا جاتا، لوگوں نے مشعلیں روشن کردیں۔

”تم سب تیار ہو؟“

”تیار ہیں۔“ تھورفل کی بات سن کر عورتیں ایک طرف اور مرد ایک طرف کھڑے ہوگئے۔

”ٹھیک ہے... میں سب سے پہلے احاطے میں جاؤں گا۔ میرے پیچھے جورن، گاتھو اور کیبلے ہوں گے۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں ہوں گی۔“ تھورفل نے سب لوگوں کو تفصیل سے حملے کا منصوبہ سمجھانا شروع کیا۔ ”ہم سب کے پیچھے دس بارہ نوجوان ہوں گے۔ میں برآمدے میں جاکر انہیں پکاروں گا۔ اگر وہ باہر نہ آئے تو ہم اندر جاکر انہیں پکڑنے کی کوشش کریں گے۔“

”اندر...؟“ جورن نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے، ہم اندر نہیں جائیں گے بلکہ انہیں باہر آنے کا کہیں گے۔ اگر وہ باہر نہ آئے تو ان کی چھت کو آگ لگادیں گے۔ آگ لگنے پر وہ خود ہی باہر نکلیں گے۔“ تھورفل نے حملے کے منصوبے میں ترمیم کی۔

”یہ زیادہ مناسب ہے۔“ سب نے یک زبان ہوکر تائید کی۔

”جب ہم اینگمنڈ کو پھندے پر لٹکادیں گے، تب اینگلڈیز کو عورتیں سنگسار کرنا شروع کریں گی۔“ تھورفل نے یہ کہہ کر چند لمحوں کی خاموشی اختیار کی اور پھر سب کے چہروں پر نظر ڈالتے ہوئے زوردار آواز میں کہا۔ ”سمجھ گئے؟“

”بالکل۔“

”تو پھر آگے بڑھو۔“

پروفیسر

باہر موسلادھار بارش ہورہی تھی۔ اندر پروفیسر صاحب ایک کتاب پڑھنے میں مستغرق تھے۔ اچانک بیوی نے ان کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بلی تو یہیں گھوم رہی ہے۔“

”ایں؟“ انہوں نے کتاب سے نظریں ہٹا کر پوچھا۔

”میں نے کہا تھا کہ بلی کو باہر پھینک آئیے۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے میری بات نہیں سنی۔ بلی ابھی تک کمرے میں موجود ہے۔“

”بلی ابھی تک کمرے میں موجود ہے؟ تعجب ہے میں تو اسے باہر پھینک آیا تھا۔“ پھر مضطرب ہوکر بولے۔ ”ذرا دیکھنا تو بے بی پنگھوڑے میں ہے یا نہیں؟“

فائزہ جاوید، خانپور

تھورفل کے پیچھے پیچھے سب لوگ بوڑھے جادوگر اور اس کی بیوی کو انجام تک پہنچانے کے لیے اس گھر کی طرف بڑھنے لگے جو کب سے اُن میاں بیوی کے لیے قید خانہ بن چکا تھا۔

”اینگمنڈ! باہر آؤ۔“ تھورفل گھر کے برآمدے کے سامنے پہنچ کر چلّایا مگر اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ ”میں کہتا ہوں باہر آجاؤ ورنہ ہم تمہارے گھر کو آگ لگادیں گے۔“

کئی بار پکارنے کے باوجود اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو کیبلے نے چھت کی طرف جلتی ہوئی مشعل اچھال دی۔ نشانہ درست لگا۔ جلتی ہوئی مشعل چمنی کے راستے اندر جاگری۔ تھوڑی دیر میں چمنی سے دھواں نکلنے لگا۔ یہ دیکھ کر تھورفل دروازے کی طرف بڑھا اور دروازہ پیٹنا شروع کردیا۔ دروازے کی جھریوں سے بھی دھواں باہر آرہا تھا۔

”اندر دھواں بھر چکا ہے۔“ گاتھو خوشی سے چلّایا۔ تھورفل بدستور دروازہ پیٹ رہا تھا۔

اچانک اینگمنڈ نے دروازہ کھولا۔ وہ بُری طرح کھانس رہا تھا۔ اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑچکا تھا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ اینگمنڈ کو باہر آتے دیکھ کر تھورفل کے سوا سب لوگ گھبرا گئے۔ کئی تو اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ کئی قدم پیچھے ہٹ گئے۔ تھورفل نہایت... بے دردی سے اینگمنڈ کو کھینچتے ہوئے باہر لایا اور اس کے پیٹ میں زوردار گھونسا مارا۔ بوڑھا اینگمنڈ گھونسا کھاتے ہی زمین پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گر پڑا۔ تھورفل نیچے جھکا اور اس نے آہستگی سے کچھ کہا۔ بوڑھے جادوگر نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں اور پورا زور لگا کر اس کے منہ پر تھوک دیا۔ تھورفل کو غصہ آ گیا۔ وہ نہایت بے دردی سے اسے لاتوں سے مارنے لگا۔ سب لوگ کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ اسی دوران میں ایگنڈیز بھی باہر نکل آئی۔ وہ اپنے بوڑھے شوہر کو بچانا چاہتی تھی لیکن تھورفل کی بیوی اور اس کے ساتھ آئی ہوئی چند عورتوں نے اسے اپنے قابو میں کر لیا۔

تھورفل کافی دیر تک اسے تشدد کا نشانہ بناتا رہا۔ جب ایگمنڈ مار کھاتے کھاتے نیم بے ہوش ہو گیا تب اس نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور گھسیٹتا ہوا برآمدے کے کنارے تک لے آیا۔ جس وقت وہ بوڑھے کو مار رہا تھا، اس دوران میں قصبے کے نوجوانوں نے پھانسی کا پھندا تیار کر لیا تھا۔ تھورفل بوڑھے کو گھسیٹتا ہوا یہاں تک لایا اور پھر چند ساتھیوں کی مدد سے اسے پکڑ کر اونچا کیا۔ اس کے گلے میں پھندا ڈالا اور پھر اپنے ہاتھ چھوڑ دیے۔ ایک جھٹکا لگا۔ بوڑھے کا کمزور جسم چند ساعت تک تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔ ایگنڈیز اپنے شوہر کو مرتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ وہ چلا رہی تھی لیکن اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بوڑھے کے جسم کو ساکت دیکھ کر وہ ایگنڈیز کی طرف متوجہ ہوئے۔ عورتوں نے اس بڑھیا کو گھسیٹ کر برآمدے سے باہر نکالا اور اس پر پتھر برسانے لگے۔ وہ شوہر کی موت کو دیکھ کر پہلے ہی ادھ موئی ہو چکی تھی۔ پہلا پتھر اس کی پیشانی پر لگا اور وہ سر پکڑ کر زمین پر گر گئی۔ پندرہ بیس منٹ تک مسلسل عورتیں اس پر سنگ باری کرتی رہیں۔ مرد خاموشی سے کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ تھورفل اس طرح سینہ چوڑا کیے ہوئے سب سے آگے کھڑا تھا جیسے وہ جنگ فتح کر چکا ہو۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ بڑھیا بھی اب مر چکی ہے تو اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

"یہاں آگ سلگ رہی ہے، اسی لیے دھواں پھیل رہا ہے۔ فوراً آگ بجھانے کا بندوبست کرو۔" یہ سنتے ہی اس کے ساتھی آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگے۔ اگرچہ وہ سب اس گھر کے اندر داخل ہونے سے بہت ڈر رہے تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ تھورفل بے خوف ہے تو انہیں بھی ہمت ملی۔ اندر آگ بجھائی جا رہی تھی۔ تھورفل باہر نکل آیا۔ اس وقت تک بوڑھی عورت کی موت کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ تھورفل لاش کا جائزہ لینے کے لیے زمین پر بیٹھ گیا۔ عورتوں نے اس بری طرح سنگ باری کی تھی کہ اس کی کھوپڑی ٹوٹ چکی تھی اور چہرہ کچل کر ناقابلِ شناخت ہو چکا تھا۔

مہم مکمل ہوئی تو عورتوں کو واپس گھر بھیجنے کا حکم دیا گیا۔ تھورفل، جورن، گانتھ، کیتلے اور چند دوسرے لوگ وہیں ٹھہر گئے۔ انہیں لاشوں کو ٹھکانے لگانا تھا۔ باقی سارے مرد بھی قصبے میں لوٹ گئے۔ دونوں میاں بیوی کی لاشوں کو دریا پار کر کے پہاڑیوں کی اوٹ میں لے جایا گیا اور پھر ان لاشوں کو خشک لکڑیوں کے ڈھیر پر رکھ کر آگ لگا دی گئی۔ لکڑیاں اتنی زیادہ تھیں کہ ان کے کوئلہ بننے کے بعد لاشوں کی کوئی بھی قابلِ شناخت شے کا ملنا ممکن نہ تھا۔

چاندنی رات تھی۔ پوری وادی چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ وہ سب واپس جا رہے تھے۔ دریا کا پل پار کرتے ہوئے تھورفل نے گہری گہری سانسیں لیں۔ اسے فضا خاصی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ ہوا بھی کسی بھی قسم کے گرد و غبار سے پاک تھی۔ "شکر ہے خدا کا... لاوا بہنا تھم گیا ہے۔" وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، اب حالات ٹھیک ہو جائیں گے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ انہوں نے مرتے ہوئے ہمیں کوئی بددعا دی ہو۔" جورن گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کے قریب آ کر بولا۔

"نہیں... جب ایگمنڈ مر رہا تھا، تب میں اس کے پاس کھڑا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ رہی ایگنڈیز... تو اس کو تو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا ہماری عورتوں نے۔" تھورفل نے مسکرا کر جواب دیا اور ایک بار پھر گہری سانسیں لیں۔ "دیکھنا، کچھ دن میں ایک بار پھر سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا۔"

"ایسا ہی ہو۔" جورن نے خوش ہو کر کہا۔ "بہت مصیبتیں اٹھائی ہیں ہم نے۔ اب سب ٹھیک ہو جائے تو پھر ہم نے جو تکلیفیں سہی ہیں، سب بھول جائیں گے۔"

دوسرے دن علی الصباح تھورفل گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا اور دریا پار کر کے ان پہاڑی چٹانوں کی طرف گیا جہاں سے آتش فشانی چٹانوں نے کئی سو سال بعد لاوا اگلنا شروع کیا تھا۔ ماحول پر خاموشی طاری تھی۔ اس نے دور سے چٹانوں کا جائزہ لیا۔ لاوا ٹھنڈا ہو کر جم چکا تھا۔ زرد دھوئیں کے بادل بھی غائب تھے۔ البتہ ہوا میں ہلکی ہلکی گندھک کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ "خدا کا شکر ہے کہ آتش فشاں خاموش ہو گیا۔ اب مدتوں سکون رہے گا۔" تھورفل بڑبڑایا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر واپسی کے لیے چل دیا۔ وہ دوپہر کے قریب واپس گھر پہنچ چکا تھا۔

"سب ٹھیک رہا؟" جب تھورفل گھوڑے سے اترا تو اس کی بیوی نے لگام تھامتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں، سب ٹھیک ہے۔"

"چلو اچھا ہوا۔"

☆☆☆

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ قصبے کے سرکردہ لوگ تھورفل کے گھر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ گوشت کے پارچوں اور دیسی بیئر سے ان کی تواضع کی جا رہی تھی۔ سب کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔

"تم نے دیکھا، جیسے ہی ہم نے جادوگروں کے گھر کا محاصرہ کیا، زرد بادل چھٹنے لگے۔ ہوا میں جو بدبو تھی، وہ بھی کم ہونے لگی تھی۔" جورن نے بوٹی نگلتے ہوئے کہا۔

"ہاں، یہ تو ہوا ہے۔ تم نے دیکھا آج آسمان کتنا شفاف اور فضا کتنی صاف تھی۔ ذرا بھی بدبو نہیں تھی ہوا میں۔" گانتھ نے جورن کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"ویسے اب ان کے گھر کا کیا کیا جائے گا؟" ایڈورڈ نے سوال کیا۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ گھر اور فارم میں لے لوں گا اور وہیں رہوں گا۔" تھورفل نے کہنا شروع کیا۔ "ویسے بھی میں بہادر ہوں اور مجھے جادو سے ڈر نہیں لگتا... اور سنا ہے کہ جو لوگ جادو پر یقین نہیں رکھتے، انہیں جادو سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔" یہ کہہ کر اس نے سب کے چہروں پر نظر ڈالی۔ سب دم سادھے اس کی بات سن رہے تھے۔ "ویسے بھی میرا خیال ہے کہ اگر اس جگہ کو ویران چھوڑ دیں گے تو بھوت پریت وہاں ڈیرا ڈال سکتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی اور نئی مصیبت جنم لے لے۔"

"یہ فیصلہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہمیں تم جیسے بہادر آدمی سے یہی امید تھی۔" جورن نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

"یہ مناسب فیصلہ کیا ہے تم نے۔ قصبے کا سربراہ تم جیسے بہادر آدمی کو ہی ہونا چاہیے۔" ایڈورڈ نے اس کی تعریف کی۔

"لیکن اس گھر اور کھیت کا کیا کرو گے؟" جورن نے سوال کیا۔

"میں نے اسے فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" تھورفل نے کہا۔ "میں یہ کھیت اور گھر ایلڈس کو فروخت کر رہا ہوں۔ اس نے حال ہی میں ایک بیوہ سے شادی کی ہے۔ اب اس کے پاس نہ تو رہنے کے لیے مکان ہے اور نہ ہی کھیت۔ اس لیے میں یہ گھر اور کھیت اس کو فروخت کر رہا ہوں، وہ بھی قسطوں پر۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔" جورن نے لقمہ دیا۔ "اس بے چارے کی بھی زندگی سدھر جائے گی۔"

سیر کو سوا سیر

ایک دن مُلّا نصیر الدین کے پاس ایک ہندو چل کر آیا تاکہ مولانا کو نیچا دکھایا جائے۔ اس نے کہا۔ "آپ ہر شخص کا مسئلہ حل کر دیتے ہیں، لہٰذا میرا بھی مسئلہ حل کریں۔" مولانا نے کہا۔ "کیوں نہیں۔" ہندو بنیے نے کہا۔ "مجھے ایک گھوڑا دلا دیں جس کا رنگ نہ لال نہ پیلا نہ کالا نہ سفید اور نہ ہی کستئی ہو۔" مولانا یکدم گویا ہوئے۔ "مل جائے گا مبلغ سو اشرفیاں جمع کرواتے جائیں۔" بنیے نے اشرفیاں دیں اور پوچھا۔ "مولانا! کس دن لے جاؤں؟" مولانا نے کہا۔ "جس دن نہ جمعہ ہو نہ ہفتہ نہ اتوار نہ سوموار نہ منگل نہ بدھ نہ جمعرات۔"

وحید عزیز، راولپنڈی

"اسی لیے تو..." تھورفل بولا۔ "اور ہاں... جب تک ہیگا فیلڈ کے مکان کی مرمت نہیں ہو جاتی اور وہاں کے کھیت کاشت کے قابل نہیں بنا لیے جاتے، تب تک ایلڈس میری مدد کرے گا اور اپنی بیوی سمیت میرے گھر پر رہے گا۔ جب میں وہاں منتقل ہو جاؤں گا تو یہ کھیت اور گھر اس کا ہو جائے گا۔ آخر اس بے چارے کے پاس سر چھپانے کا آسرا جو نہیں ہے۔"

"کچھ رقم نقد دے رہا ہے وہ؟" جورن نے سوال کیا۔

"ہاں، آدھی رقم نقد اور آدھی قسطوں میں۔ ویسے جب تک اس کی قسط پوری نہیں ہو جاتی، تب تک فصل میں آدھا حصہ میرا ہوگا۔ ویسے اس نے مجھے بیعانہ تو دے دیا تھا، باقی رقم آج شام ڈھلنے سے پہلے پہلے پہنچانے کا وعدہ کیا ہے اس نے۔"

"بہت اچھا فیصلہ ہے تمہارا۔" سب نے یک زبان ہو کر تائید کی۔

"اب ہمیں ہیگا فیلڈ سے بچ کر گزرنے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ جس گھر میں تم رہو گے، وہاں بھوت پریت کا کیا کام۔" جورن نے خوشامدی انداز میں کہا تو تھورفل مسکرا دیا۔

"میں نے یہ فیصلہ اسی لیے کیا ہے۔"

"تم قصبے کی بھلائی کے لیے کتنا درد رکھتے ہو اپنے جی میں۔" جورن نے یہ سن کر کہا۔ "میں آج ہی قصبے میں اعلان کروا دیتا ہوں کہ ہیگا فیلڈ کی زمین کو قابلِ کاشت بنانے کے لیے سارے لوگ رضاکارانہ طور پر تمہاری مدد کریں۔ تم

digestpk.blogspot.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے ہماری اتنی مدد کی ہے، کیا ہم تمہارے گھر کی مرمت اور کھیت کو قابلِ کاشت بنانے میں تمہاری مدد نہیں کر سکتے۔'' اس کے لہجے میں جہاں بھر کی اپنائیت اُمڈ آئی تھی۔

''یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ اب دیکھو، میرے پاس اتنے پیسے کہاں ہیں کہ یہ کام مزدوروں سے کروا سکوں۔'' تھورفل نے یہ سن کر معصومیت سے جواب دیا۔

''یہ اب ہماری ذمے داری ہے۔ چند روز میں گھر کی مرمت ہو جائے گی اور کھیت بھی کاشت کے قابل ہو جائیں گے۔'' جورن پُرجوش ہو رہا تھا۔

کچھ دیر تک وہ لوگ بیٹھے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور پھر اگلے روز سے ہیلگا فیلڈ پر صفائی اور مرمت کے کام کی منصوبہ بندی کر کے تھورفل کے گھر سے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

رات کا کھانا کھانے کے بعد تھورفل اور اس کی بیوی جیرڈا آتش دان کے سامنے بیٹھے ہوئے آنے والے دنوں کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اصل میں انہیں ایلڈس کی آمد کا انتظار تھا اس لیے گھر کے دروازے بھی کھلے چھوڑ دیے تھے۔ وقت گزاری کے لیے وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کیے جا رہے تھے۔

''یہ بہت اچھا ہو گیا۔'' جیرڈا نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں... کافی بڑی زمین ہے، ہمارے کھیتوں سے تو کئی گنا بڑا رقبہ ہے اس کا۔'' تھورفل نے جواب دیا۔

''ویسے یہ بتاؤ، جب اس دن ایگمنڈ تمہارا گھونسا کھا کر زمین پر گرا تھا تو تم اس کے کان میں کیا کہہ رہے تھے؟'' جیرڈا نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔ یہ بات سنتے ہی تھورفل کو اُس کا اپنے منہ پر تھوکنا یاد آ گیا۔ اس کے ہاتھ خودبخود اپنے چہرے کی طرف اٹھ گئے۔

''کچھ خاص نہیں...'' تھورفل نے کہنا شروع کیا۔ ''میں نے اس سے کہا تھا کہ تمہیں کتنا سمجھایا اگر میری بات مان لیتے تو آج عیش اور عزت سے رہتے لیکن کم بخت کو تو ہیلگا فیلڈ چھوڑنا منظور ہی نہیں تھا... خیر، اس میں سارا قصور اُس کی بیوی کا ہی تھا۔ وہ بے چارہ مان بھی جاتا۔ ایک بار تو وہ تقریباً مان ہی چکا تھا مگر ایگڈیز...''

''افسوس صد افسوس... کتنی بے عزتی کی موت مارے گئے وہ دونوں۔'' جیرڈا نے سر ہلا کر کہا۔

''ہاں... ذلت کی موت۔ ویسے سچ ہے وہ اس کے مستحق نہیں تھے۔'' تھورفل کا لہجہ افسردہ تھا۔ ''کاش ان کی کوئی اولاد ہوتی تو پھر شاید انہیں اپنی زمین سے اتنی زیادہ محبت نہ ہوتی۔

''ویسے قصبے والے تو اُن سے بھی زیادہ بے وقوف نکلے۔ وہ تو اُس دن اگر آتش فشاں سے لاوا نہ اُبلتا اور گندھک کے دھوئیں کے بادل نہ اُٹھتے تو پتا نہیں کب تک مجھے اس معاملے میں جان کھپانا پڑتی۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' جیرڈا نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ دونوں باتیں کیے جا رہے تھے کہ عقب سے ایک سایہ نہایت خاموشی سے کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی دو دھاری تلوار تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ میاں بیوی اُس کی آمد سے باخبر ہوتے، اس پُراسرار نقاب پوش نے تلوار والا ہاتھ اٹھایا اور عقب سے تھورفل کی گردن پر وار کیا۔ اگلے ہی لمحے جیرڈا کا سر بھی تن سے جدا ہو چکا تھا۔ نقاب پوش نے کٹے ہوئے سر دیکھے۔ منہ پر سے نقاب اتارا اور اس سے تلوار پر لگا خون صاف کیا اور زمین پر بیٹھ کر تھورفل کے کٹے ہوئے سر کو دیکھنے لگا۔

''معاف کرنا مہربان دوست... خود ہی سوچو، میں تمہارے کھیت خریدنے کے لیے آدھی رقم نقد کہاں سے دیتا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ تم نے قصبے کے معززین کے سامنے بیعانے کی وصولی اور بقایا رقم کی شام سے پہلے ادائگی کا اعتراف کر لیا، ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ کیسے تم سے نمٹوں گا۔ اب یہ کھیت بھی میرا اور گھر بھی۔ مجھے معاف کر دینا مہربان انسان۔'' پھر وہ اٹھا اور جس خاموشی سے اندر داخل ہوا تھا، اسی طرح یہاں سے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن پورے قصبے میں تھورفل اور اس کی بیوی کی پُراسرار موت کا چرچا تھا۔ مدتوں تک آئس لینڈ میں یہ قصہ دہرایا جاتا رہا کہ ایگمنڈ اور اس کی بیوی ایگڈیز کی روح نے جادو کے زور پر تھورفل اور اس کی بیوی سے اپنی موت کا انتقام لیا تھا۔ رہا ایلڈس... تو تھورفل کا کھیت اور گھر اسے مل گیا۔ مرحوم تھورفل خود ہی تو اعتراف کر چکا تھا کہ وہ آدھی رقم نقد لے کر کھیت اور گھر ایلڈس کو بیچ رہا ہے۔ ایلڈس نے قصبے کے نئے سربراہ کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ آدھی رقم ادا کر چکا ہے۔ جورن، ہاگمھ اور دیگر نے بھی اُس کے بیان کی تصدیق کی... یوں تھورفل کی جائداد اُسے مل گئی۔ رہا اُس جادوگر جوڑے کا مکان اور کھیت تو وہ ویسے ہی ویران رہا۔ تھورفل کی موت کے بعد کسی شخص میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ وہاں سے گزر سکے، وہاں قبضہ کر کے رہنا تو دور کی بات تھی۔

اشارہ

آصف ملک

جرم کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے معمولی سے معمولی بات کو نظر انداز نہیں کیا جاتا... اس گروہ نے بھی اپنے مشاہدے اور تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے تمام تر جزئیات کو پیش نظر رکھا تھا... مگر آخری لمحوں میں ان سے ایک چوک ہو گئی۔

قانون اور مجرموں کے درمیان آنکھ مچولی کا کھیل ایک اشارہ خاص جسے سمجھنے کی دیر تھی

بلی ہیز شاپ کے کاؤنٹر کے اوپر لگا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ نیوز کاسٹر گزشتہ دن فلاڈلفیا میں پولیس کی حراست سے فرار ہونے والے تین خطرناک مجرموں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ یہ تینوں قتل، ڈاکے اور تشدد کی متعدد کارروائیوں میں ملوث تھے اور ان کو عدالت سے اتنی لمبی سزائیں سنائی گئی تھیں کہ ان کا جیتے جی جیل سے باہر آنا ناممکن تھا۔ ایک موقع پر جب انہیں ایک درجن دوسرے قیدیوں کے ہمراہ ایک اور جیل میں منتقل کیا جا رہا تھا تو انہوں نے وین میں گارڈ پر قابو پا کر ان کا اسلحہ چھین لیا اور فرار ہو

Digests of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئے۔ اس کاروائی کے دوران میں انہوں نے دوگارڈز کو ہلاک اور دو کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ اب پولیس ان کو فلاڈلفیا کے علاقے میں تلاش کر رہی تھی۔ عوام الناس کو ان خطرناک مجرموں سے خبردار کیا جا رہا تھا۔ ان کی تصویریں بار بار دکھائی جا رہی تھیں۔ ان میں ایک بریڈ نامی سیاہ فام تھا اور دو سفید فام سنگدل اور جیوش تھے۔ میئر نے بذاتِ خود ٹی وی پر آ کر ان خطرناک مجرموں کی گرفتاری میں مدد دینے کی اپیل کی تھی اور گرفتار کرانے والے کو ایک لاکھ ڈالرز انعام دینے کا اعلان کیا تھا۔

"ایک لاکھ ڈالرز۔" بلی کے پاس بیٹھے ایک موٹے شخص نے طنزیہ انداز میں کہا۔ وہ لارج پیزا کھا چکا تھا اور ابھی مزید کھانے کے موڈ میں تھا۔ "کسی کی زندگی اتنی سستی نہیں ہے کہ ایک لاکھ ڈالرز کے بدلے ان لوگوں سے دشمنی مول لے۔"

لیکن بلی ایک لاکھ ڈالرز کے لیے یہ خطرہ مول لینے کو تیار تھا۔ وہ گریجویشن کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے رقم جمع کر رہا تھا اور ابھی اسے دو سال تک مزید ملازمت کرنی تھی۔ اس کے بعد ہی وہ کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے سکتا تھا اور کوئی پیشہ ور ڈگری حاصل کر کے اچھی ملازمت حاصل کر سکتا تھا۔ ایسا کرنا اس کی خواہش نہیں تھی۔ وہ تو گریجویشن کر کے بھی خوش تھا لیکن اس کی گرل فرینڈ کیرول اور مستقبل کی بیوی نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اس طرح کی زندگی نہیں گزارنا چاہتی جیسی کہ وہ آج کل گزار رہی تھی... یعنی کی بندھی تنخواہ کے ساتھ معمولی سا گزارہ۔ اس نے بلی پر واضح کیا۔

"اس سے بہتر ہے ہم ایسے ہی رہیں۔"

"کیسے؟" بلی نے سادگی سے پوچھا۔ وہ اس وقت کیرول کے ہوش ربا وجود میں کھویا ہوا تھا۔

"جیسے ہم رہ رہے ہیں۔" کیرول نے جھنجلا کر اسے پیچھے دھکیلا۔ "معمولی سا فلیٹ، کھٹارا گاڑی اور بس اتنی تنخواہ جس میں گھر کا سامان آ جائے۔"

کیرول نے یہ سب اپنے بارے میں بتایا تھا جبکہ بلی کے پاس تو یہ بھی نہیں تھا۔ اگرچہ اس کے باپ کے پاس خاصی رقم تھی لیکن بلی خود مختاری کا قائل تھا اس لیے گریجویشن کے بعد اس نے جاب کا سوچنا شروع کر دیا۔ کیرول چاہتی تھی کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرے اور کوئی ڈگری لے کر اچھا کیریئر اپنائے۔ اس میں کچھ سال مشکل تو ہوتی لیکن اس کے بعد وہ ساری عمر سکون سے رہ سکتے تھے۔ اس کے برعکس بلی کے عزائم محدود تھے۔

"تو تم کیا چاہتی ہو؟" بلی نے بادلِ ناخواستہ اس کی بات پر غور کیا۔

"میرے خواب بہت زیادہ اونچے نہیں ہیں۔" کیرول نے تکیہ گود میں رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک خوب صورت سا گھر ہو... کم سے کم تین بیڈ روم کا تاکہ مستقبل میں ہمارے بچوں کو مسئلہ نہ ہو۔ ہمارے پاس دو گاڑیاں ہونی چاہئیں ایک تمہاری اور دوسری جو گھر کے کاموں کے لیے یا لانگ ڈرائیو پر استعمال کی جا سکے۔ تمہارے پاس ایسی جاب ہو کہ تم تمام اخراجات پورے کر کے بھی مستقبل کے لیے کچھ بچا سکو۔"

بلی حیران ہوا۔ "یہ خواب اونچے نہیں ہیں؟"

کیرول بُرا مان گئی۔ "بالکل بھی نہیں کیونکہ تم انہیں حاصل کر سکتے ہو لیکن اس کے لیے ہمیں قربانی دینا ہوگی۔"

"کیسی قربانی؟"

"تمہیں کوئی پیشہ ور بزنس ڈگری حاصل کرنا ہوگی۔"

"تمام پیشہ ور بزنس ڈگری بہت مہنگی ہیں اور میں ان کی فیسیں برداشت نہیں کر سکتا۔" بلی نے صاف گوئی سے کہا۔ "اور تم یہ توقع بھی مت رکھو کہ میں پاپا سے مدد مانگوں گا۔"

"اگر وہ تمہاری مدد کریں تو اس میں کوئی بُرائی نہیں ہے آخر تم ان کی اولاد ہو۔" کیرول نے ٹھنڈی سانس لی۔ "بہرحال مجھے تمہاری خودداری عزیز ہے۔ اگر تم دو سال تک کوئی فل ٹائم جاب کرو جس میں محنت ہو لیکن آمدنی بھی اچھی ہو تو تم اتنی رقم جمع کر سکتے ہو کہ فیس ادا کر سکو۔"

"اور یہ جو ہم ہفتے میں ایک بار ڈنر کرتے ہیں اور میں تمہارے لیے تحفے لاتا ہوں؟"

"دو سال تک ہم باہر ڈنر نہیں کریں گے اور تم میرے لیے تحفے بھی نہیں لاؤ گے۔" کیرول قربانی دینے کے لیے تیار ہو گئی تو بلی بھی اس کی بات مان گیا۔ یوں انہوں نے مستقبل کا پروگرام طے کر لیا۔ مجبوراً اس نے اس پیزا شاپ میں ملازمت کر لی۔ یہاں وہ کوریئر تھا اور پیزا پارسل گھروں پر پہنچاتا تھا۔ اس کام میں بھاگ دوڑ بہت تھی لیکن اسے معاوضہ اچھا مل جاتا تھا۔ یہاں ملازمت آسانی سے نہیں ملتی تھی کیونکہ جانسن کی ایک ساکھ تھی لیکن اسے ملازمت مل گئی۔

جانسن پیزا شاپ کا مالک جانسن اسے فی پارسل دو ڈالر دیتا تھا اور وہ دن بھر میں کوئی ساٹھ سے ستر پارسل پہنچاتا تھا۔ اس طرح اسے اوسطاً ایک دن میں ایک سو تیس ڈالرز کی معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ اتنی رقم وہ کسی اور کام میں ہرگز نہیں کما سکتا تھا۔ اسے یہاں کام کرتے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا اور اس نے کوئی تیس ہزار ڈالرز کی رقم جمع کر لی تھی لیکن اسے مزید چالیس ہزار ڈالرز کی ضرورت تھی، تب کہیں جا کر وہ فیس ادا کرنے کے قابل ہو سکتا تھا۔ یعنی اسے مزید کم سے کم ایک سال

جاب کرنا تھی۔ اس کا ایک آسان راستہ تھا کہ وہ اپنے باپ سے کہہ دیتا اور وہ بہت آسانی سے اس کی فیس کا انتظام کر دیتا بلکہ اس کے باپ نے کئی بار کہا بھی لیکن بلی نے انکار کر دیا۔

"پاپا! میں اپنے بل بوتے پر آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔"

"تمہاری مرضی لیکن جب بھی تمہیں محسوس ہو کہ تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے تو تم بلا جھجک کہہ سکتے ہو۔"

اس بات کو ایک سال ہو گیا تھا۔ بلی نے باپ سے مدد حاصل کرنے کا سوچا تک نہیں تھا اور اب تو وہ نصف کے قریب رقم جمع بھی کر چکا تھا۔ ایک سال بعد وہ فیس کا تو ے فی صد جمع کر لیتا تو یونیورسٹی میں داخلہ لے سکتا تھا اور باقی دس فی صد رہ جانے والی رقم وہ عارضی ملازمت کر کے بھی جمع کر سکتا تھا۔ جانسن نے اس سے کہا تھا کہ جب وہ یونیورسٹی چلا جائے، تب بھی اس کے پاس جز وقتی ملازمت کر سکتا ہے۔ اسے شام کے اوقات میں کوریئرز کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ بلی کا اندازہ تھا کہ وہ روزانہ تین گھنٹے کی جاب کر کے پچاس ساٹھ ڈالرز کما سکتا ہے جو اس کے اخراجات کے لیے کافی تھے۔ وہ ابھی پارسل ڈیلیور کر کے آیا تھا اور نئے پارسل تیار ہونے تک ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

"ہے بلی۔" جانسن نے اسے پکارا۔ "بہت آرام کر لیا... تمہارے پارسل تیار ہیں۔"

بلی کے پاس شمالی فلاڈلفیا کا علاقہ تھا اور وہ کوئی دس مربع میل کے علاقے میں پارسل پہنچاتا تھا۔ یہ بہت بڑا علاقہ تھا۔ شروع میں بلی کو بہت مشکل پیش آئی اور اکثر پارسل پہنچانے میں اسے تاخیر ہو جاتی لیکن اس نے جلد اس علاقے کو سمجھ لیا اور اب وہ بہت تیزی سے اور مقررہ وقت کے اندر پارسل پہنچا دیتا تھا۔ اس وجہ سے جانسن اب اسے زیادہ کام دینے لگا تھا۔ جانسن کی شاپ شہر کے مرکز میں تھی اور یہاں سے چاروں طرف رسائی آسان تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا کاروبار خوب چل رہا تھا اور صبح بھی خاصا کام ہوتا تھا۔ لیکن لنچ کے وقت اور اس کے بعد شام کو اس کے پاس سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ہوتی تھی۔

کاؤنٹر پر بلی کے لیے دس عدد پارسل منتظر تھے۔ ان سب پر ان پتوں کی چٹیں بھی لگی تھیں جہاں یہ پارسل پہنچانے تھے۔ اس نے پتے دیکھ کر انہیں مطلوبہ ترتیب سے رکھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ پارسل کس ترتیب سے پہنچانے ہیں۔ بلی سڑکوں پر ٹریفک اور رسائی کے لحاظ سے پتوں کی درجہ بندی کر لیتا تھا۔ وہ پارسل لے کر نکلنے لگا تو اسی موٹے آدمی نے پکار کر کہا۔

"ہے بلی... احتیاط سے جانا، بھاگے ہوئے مجرم ابھی فلاڈلفیا میں ہیں۔" بلی نے ایک نظر اسے دیکھا اور باہر آ گیا۔ اس نے پارسل رکھے اور روانہ ہو گیا۔ یہ علاقہ بڑا تھا لیکن یہاں

طبقۂ عالیہ

سچی بات یہ ہے کہ میں جس طبقے سے پھسل کر جس طبقے کی طرف جانا چاہتا ہوں، اس کے بارے میں ایک بات تو میں نے سوچی ہی نہیں... اور وہ یہ کہ ان تمام آسائشوں اور پروٹوکول میں جو میں نے کالم کے شروع میں بیان کیں، وہ سب کچھ موجود ہے جس کی میں نے خواہش کی ہے۔ لیکن اس میں میری فیملی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اس طبقے میں داخل ہونے کے بعد ایک بیٹا امریکا میں تعلیم حاصل کر رہا ہوتا ہے، دوسرا بیٹا آسٹریلیا میں ہوتا ہے، بیٹی لندن میں ہوتی ہے اور بیوی نوکر چاکروں میں گھری سماجی خدمات میں مشغول دکھائی دیتی ہے۔ اس طبقے میں دوست بھی نہیں ہوتے، مصاحب ہوتے ہیں یا باس ہوتے ہیں۔ رات کو واٹر بیڈ پر بچھونے لگانے کے باوجود وہ نیند میسر نہیں ہوتی جو دن بھر کی مشقت کے بعد سر کے نیچے بازو کو سرہانہ بنا کر میسر ہوتی ہے۔ شیف اور بٹلر، ڈائننگ روم کی زیبائش اور کراکری کا سامان بھی معدے کو اس قابل نہیں بناتا کہ دنیا جہان کی نعمتیں اس کے لیے قابلِ قبول ہو سکیں۔ اس طبقے میں بے شمار لوگ عزت کرنے والے ہوتے ہیں لیکن محبت کرنے والا کوئی نہیں ہوتا بلکہ اس طبقے میں شمولیت کے بعد خود اپنی عزت کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ انسان دوسروں کی نسبت خود کو زیادہ جانتا ہے۔ مرنے پر جنازے میں لوگ شامل ہوتے ہیں مگر رونے والا کوئی نہیں ہوتا۔ امریکا، آسٹریلیا اور برطانیہ میں مقیم بچے فون پر ہی سے تعزیت کرتے ہیں اور پھر چند دنوں بعد وطن واپس آ کر جائیداد کے مسئلے حل کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

حالات کا تقاضا

ایک بیوی نے اپنے شوہر سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔ "میں حیران ہوں کہ شادی سے پہلے تم کہا کرتے تھے کہ ڈارلنگ! تم میری دنیا ہو۔"

شوہر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "جب میں تمہیں اپنی دنیا کہتا تھا تو اس وقت میں نے جغرافیہ نہیں پڑھا تھا اور اب تو میں کئی دنیائیں دریافت کر چکا ہوں۔"

احمر جاوید، اسلام آباد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زیادہ تر گھر تھے اور بڑی عمارتیں کم تھیں اس لیے بلی کا کام آسان تھا۔ ورنہ عمارتوں میں چڑھنے اور اترنے میں بہت وقت لگتا تھا۔ دس میں سے نو پارسل گھروں کے تھے اور صرف ایک کسی فلیٹ کا تھا۔ پہلے فلیٹ ہی آیا اور یہ دوسری منزل پر تھا اس لیے وہ فوراً دے کر فارغ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے تین گھروں کو نمٹایا جو اتفاق سے ایک ہی لائن میں تھے۔ وہ بہت خوش تھا۔ عام طور سے ایک بار پارسل نمٹانے میں اسے ایک سے ڈیڑھ گھنٹا لگ جاتا لیکن آج وہ بیس منٹ میں نصف پارسل اپنی منزلوں پر پہنچا چکا تھا۔

آخری دو پارسل ایک نئی آبادی میں تھے اور اس نے انہیں سب سے آخر میں رکھا تھا۔ یہاں زیادہ تر ڈچ اسٹائل بنگلوز تھے اور یہاں پوش طبقے کے لوگ رہتے تھے۔ سڑکوں اور گلیوں میں وہی مخصوص ویرانی تھی جو ایسے علاقوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ اس نے نویں پارسل کے لیے مطلوبہ پتے پر بائیک روکی۔ یہ ایک بڑے لان والا مکان تھا۔ اس کے گیراج کے سامنے ایک سیاہ وین کھڑی تھی۔ وہ بائیک سے اتر کر داخلی دروازے پر پہنچا اور کال بیل بجائی۔ پیزا کی ادائیگی کریڈٹ کارڈ کی مدد سے کی جا چکی تھی اس لیے اسے رسید پر صرف سائن لینے تھے۔ کال بیل بجا کر وہ انتظار کرتا رہا کہ کوئی جواب آئے لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے دوبارہ زیادہ دیر تک بٹن پر انگلی رکھی۔ اندر گھنٹی بجنے کی آواز آرہی تھی۔ اس بار بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ اسے مایوسی ہونے لگی کیونکہ اس کا کمیشن صرف ڈیلیوری سے مشروط تھا۔ اگر کسی وجہ سے وہ پارسل پہنچا کر رسید پر سائن حاصل نہیں کر پاتا تو جانسن اس کا کمیشن بھی نہیں دیتا تھا کیونکہ اسے بھی پیزا کی قیمت واپس کرنا پڑتی تھی۔

اصولاً تو اسے واپس چلے جانا چاہیے تھا لیکن اس کے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو وہ کھل گیا۔ اس نے دروازہ ذرا سا کھولا اور زور سے بولا۔ ”کوئی ہے؟ میں پیزا ڈلیور کرنے آیا ہوں۔“

اس بار بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے اندر آگیا۔ دروازے کے سامنے ایک چھوٹا سا حصہ تھا۔ اس میں دائیں طرف اور سامنے مکان کے اندر کے دروازے تھے جبکہ بائیں جانب اوپر جانے والی سیڑھیاں تھیں۔ دروازے بند تھے لیکن نہیں... ان میں سے ایک دروازہ کسی قدر کھلا ہوا تھا، وہ اس کی طرف بڑھا اور پھر آواز دی۔ ”کوئی ہے؟“

اس بار بھی جواب نہیں آیا۔ اس نے نیم وا دروازے کو دھکیلا۔ اندر کمرے کی حالت دیکھتے ہی اسے گڑبڑ کا احساس ہو گیا۔ پورا کمرا الٹا پلٹا پڑا تھا، تکیے اور بستر کی چادر تک نیچے پڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کمرے میں شدید لڑائی ہوئی ہو لیکن وہاں کوئی انسان نظر نہیں آرہا تھا۔ ابھی بلی کمرے میں جھانک رہا تھا کہ کوئی سرد سی چیز آکر اس کی گردن سے لگ گئی۔ کسی نے اس سے بھی زیادہ سرد لہجے میں کہا۔ ”کوئی حرکت مت کرنا، اندر چلو۔“

بلی کے ہاتھ بے ساختہ اوپر اٹھ گئے۔ گردن پر کسی آتشیں ہتھیار کی نال کا دباؤ بڑھا تو وہ بے ساختہ آگے بڑھا اور تب اسے بستر کے دوسری طرف لاش نظر آئی۔ ایک مرد اوندھے منہ پڑا تھا اور اس کی گردن میں سوراخ تھا۔ اس کے آس پاس خون پھیلا ہوا تھا۔ لاش دیکھ کر بلی کو چکر سا آگیا اور وہ لڑکھڑایا تو پیچھے موجود شخص نے اسے آگے دھکا دیا۔ وہ منہ کے بل فرش پر گرا۔ فرش پر گرنے کے باعث اس کی قمیص سامنے سے سرخ ہوگئی۔ وہ بے ساختہ اٹھا اور اس نے الٹی کر دی۔ اس دوران میں اس نے اس شخص کو دیکھ لیا اور اسے پہچاننے میں ایک لمحہ لگا۔ یہ سفید فام جیوش تھا اور اس کے عریاں بازو مکمل طور پر ٹیٹوز سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی جیل کی قمیص اتار دی تھی تاکہ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ ہو اور صرف سیاہ پتلون اور سفید بنیان میں تھا۔ گویا وہ جیل سے بھاگے مجرموں کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔ گرتے ہوئے بلی کے ہاتھ سے پیزے کے پارسل گر گئے تھے۔ جیوش نے بلند آواز سے کہا۔ ”خطرے کی بات نہیں ہے... یہ پیزا دینے آیا تھا۔“

فوراً ہی اندر سے میگوار آیا اور اس نے بلی کی طرف توجہ دیے بغیر پارسل اٹھا لیے۔ بلی کا دہشت سے بُرا حال تھا۔ اس موٹے آدمی نے روانگی کے وقت اسے ان مجرموں سے ہوشیار رہنے کو کہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کا ان لوگوں سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔ اس گھر کا پارسل کسی کیوروسل نامی لڑکی کا تھا۔ یہ لوگ یقیناً زبردستی اس گھر میں گھسے تھے اور انہوں نے مزاحمت کرنے پر ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ بلی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی نظر مارے جانے والے آدمی پر مرکوز تھی۔ وہ اوندھے منہ پڑا تھا لیکن اس کی کن پٹی کے سفید بال بتا رہے تھے کہ وہ کم سے کم پچپن برس کا تھا۔

”تم نے اسے کیوں مار دیا؟“ اس نے جیوش سے پوچھا۔

”اس نے مزاحمت کی تھی۔“ جیوش بے پروائی سے بولا۔ ”اندر چلو ورنہ تمہارا بھی یہی حال ہوگا۔“

بلی نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا لیکن ساتھ ہی اسے احساس تھا کہ اس کے لیے صورت حال نہایت سنگین ہے۔ جیوش اسے ایک بیڈ روم میں لایا جہاں بیڈ پر ایک

بڑی عمر کی عورت، نوجوان لڑکی اور ایک تیرہ چودہ سال کا لڑکا آپس میں جڑے بیٹھے تھے۔ ان کے سر پر بریڈ سوار تھا۔ یہ سب شاٹ گنز اور پستولوں سے مسلح تھے۔ عورت رو رہی تھی۔ لڑکی اور لڑکے کے چہرے ستے ہوئے تھے۔ بلی نے اندازہ لگایا کہ عورت اس مرد کی بیوی تھی جس کی لاش دوسرے کمرے میں پڑی تھی بلکہ تکنیکی لحاظ سے وہ اس کی بیوہ تھی... جبکہ لڑکی اور لڑکا اس کی اولاد تھے۔ بریڈ نے ناپسندیدہ نظروں سے بلی کی طرف دیکھا اور غرا کر بولا۔

”کون ہو تم... یہاں کیوں آمرے؟“

”میں بلی ہوں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”یہاں پیزا پہنچانے آیا ہوں۔“

”گڈ اب تم بھی ادھر بیٹھ جاؤ۔“ بریڈ نے اسے حکم دیا۔ وہ بستر پر ٹک گیا اور خشک ہو جانے والے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

”تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“

اس پر بریڈ نے استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”سارا ملک ہمیں جان گیا ہے اور تمہیں ابھی تک نہیں پتا؟“

”ہم فرار ہونے والے قیدی ہیں۔“ جیوش نے اسے آگاہ کیا۔

”اور فی الحال تمہیں خاموش دیکھنا چاہتے ہیں۔“ میگوار بولا۔ وہ تینوں ہی پیزا کے ڈبے کھولنے میں مصروف تھے۔ بلی ذرا پیچھے ہوا اور اس نے لڑکی سے آہستہ سے کہا۔

”یہ کیا چکر ہے؟“

لڑکی سسک اٹھی۔ ”انہوں نے ڈیڈ کو مار دیا ہے۔“

بلی کا اندازہ درست نکلا۔ مرنے والا اس خاندان کا سربراہ تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھا تو اس نے پھر کہا۔ ”ڈیڈ نے مزاحمت کی تھی اور پولیس کو کال کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے شوٹ کر دیا۔“

وہ تینوں ان کی باتیں سن رہے تھے لیکن انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ دو گھنٹے پہلے پولیس کی حراست سے فرار ہوئے تھے۔ انہیں ایک ایسی جیل میں منتقل کیا جا رہا تھا جو خاص طور سے خطرناک قیدیوں کے لیے بنائی گئی تھی اور وہ ایک بار اس جیل تک پہنچ جاتے تو مر کر ہی وہاں سے نکل سکتے تھے اس لیے انہوں نے فرار کا منصوبہ بنایا۔ جیوش اور میگوار ساتھی تھے اور انہیں ایک ہی مسلح ڈکیتی کے سلسلے میں عمر قید کی سزا ہوئی تھی۔ بریڈ ایک منشیات فروش مافیا کا رکن تھا اور درحقیقت فرار کا منصوبہ اسی کا تھا۔ اس کے آدمی باہر موجود تھے اور وہ اسے چھڑانے کے لیے کوشاں تھے۔

بریڈ کے آدمیوں نے اس کی معاونت کی تھی اور اس بس کو راستے میں ایک حادثے سے دوچار کیا گیا جو قیدیوں کو لے کر جا رہی تھی۔ بریڈ نے ہتھکڑی کھولنے والی ایک چابی کا بندوبست کر لیا تھا۔ اس نے حادثے سے پہلے ہی اپنی ہتھکڑی کھول لی تھی۔ حادثہ ہوتے ہی وہ تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے ایک گارڈ کی شاٹ گن چھین کر اسے اور اس کے ساتھی کو شوٹ کر دیا۔ پھر اس نے جیوش اور میگوار کی ہتھکڑیاں بھی کھول دیں۔ انہوں نے اگلے حصے میں موجود گارڈز کو بھی زخمی کر دیا اور بس کا دروازہ توڑ کر

صبح کی سیر

میرا سیر کا تجربہ کچھ زیادہ نہیں ہے، بس یوں سمجھیں کہ رنگروٹ بھرتی ہوا ہوں چنانچہ جب کوئی صاحب پارک میں اچانک نظر پڑتے ہیں اور اس عالم میں کہ ان کی ٹانگیں اوپر اور سر نیچے ہے اور وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہے ہیں تو میں دبک سا جاتا ہوں، اخباروں کی وہ سرخیاں یاد آجاتی ہیں جو نارچ سیلوں کے بارے میں شائع ہوتی رہتی ہیں یا کسی معزز آدمی کو فون فون کرتے ہوئے یا یوں کہہ لیں کہ پھنکارتے ہوئے دوڑتے دیکھتا ہوں تو اللہ کی قدرت یاد آجاتی ہے کہ وہ جسے چاہے عزت بخشتا ہے اور جسے چاہے ذلت دیتا ہے۔ گزشتہ روز میں نے ایک بزرگ کو رسی ناچتے دیکھا بلکہ غور سے دیکھا تو ان کے چہرے پر حیا کی سرخی بھی تھی، میں نے ”غضِ بصر“ سے کام لیا اور ان کے قریب سے نظریں چرا کر اس طرح گزرتا گیا جیسے نامحرموں کو گزرنا چاہیے۔

ویسے صبح کی سیر میں خواتین کسی سے پیچھے نہیں چنانچہ وہ بھی مردوں کے شانہ بشانہ سیر کرتی نظر آتی ہیں تاہم علی الصبح، چونکہ بیوٹی پارلر کھلے نہیں ہوتے لہٰذا وہ بغیر کسی اہتمام کے آتی ہیں۔ ایک خاتون نے مجھ سے گلہ کیا کہ وہ روزانہ میرے پاس سے گزرتے ہوئے سلام کرتی ہیں مگر میں بے رخی سے وعلیکم السلام کہہ دیتا ہوں، حالانکہ گزشتہ دس برسوں سے ہمارا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا ہے، میں نے انہیں غور سے دیکھا تو پہچان لیا اور معذرت کی۔ کچھ بیوٹی پارلر چوبیس گھنٹے بھی کھلے رہنے چاہئیں جس طرح شہر میں بعض کیمسٹوں کی دکانیں کھلی ہوتی ہیں!

(”ہنسنا رونا منع ہے“ عطاء الحق قاسمی کی کتاب سے اقتباس۔ ولید بلال کی عرق ریزی)

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فرار ہو گئے۔ بریڈ کے آدمیوں نے ایک چوری کی گاڑی کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ وہ اسی میں نکلے تھے لیکن پولیس نے بہت تیزی سے اس پورے علاقے کی ناکا بندی کر دی تھی۔ اس لیے مجبوراً انہوں نے چوری کی گاڑی چھوڑ دی اور ایک شخص کو روک لیا جو سیاہ وین میں جا رہا تھا۔ وہ اسے یرغمال بنا کر اس کے گھر آ گئے۔ یہ شخص میڈ رسل تھا اور جب وہ اس کے گھر میں آئے تو اس نے مزاحمت کی اور پولیس کو کال کرنے کی کوشش کی... اس پر انہوں نے اسے شوٹ کر دیا۔

میڈ کو جیوش نے شوٹ کیا تھا اور بریڈ اس سے بالکل خوش نہیں تھا کیونکہ اگر پولیس انہیں گھیر لیتی تو یہ یرغمالی ہی ان کی جان بچانے کا سبب بنتے۔ اگر وہ یرغمالیوں کو مار دیتے تو پولیس ان کے خلاف حرکت میں آ جاتی۔ البتہ جیوش اور میگوار کو اس بات کی پروا نہیں تھی۔ وہ ویسے بھی کم تر درجے کے مجرم تھے جو سوچنے کی زحمت کم ہی کرتے ہیں۔ بریڈ ایک طرف کھڑا کسی سوچ میں گم تھا۔ اس کے آدمی اسے حالات معمول پر آتے ہی اس علاقے سے نکال لے جاتے۔ اس وقت تک اسے خود کو پولیس کی گرفت سے محفوظ رکھنا تھا۔ ایک بار وہ یہاں سے نکل جاتا تو اسے پھر کوئی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ لیکن ایک عدد ٹل اور پھر لِلی کی آمد نے اسے فکر مند کر دیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ پھنس گیا ہے۔

"ان کا کیا کرنا ہے؟" میگوار نے اچانک بریڈ سے کہا۔ وہ چاروں سہمے بیٹھے تھے۔

"کچھ نہیں۔" بریڈ نے جواب دیا۔ "یہ شرافت سے بیٹھے ہیں اس لیے انہیں کچھ نہیں کہنا۔"

"تم لوگ یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے؟" بیوہ ہو جانے والی عورت نے التجا کی۔ وہ تقریباً پینتیس برس کی خوب صورت اور متناسب جسامت کی حامل عورت تھی۔ اس نے موسم کی مناسبت سے نیکر اور مختصر سا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ کچھ اسی قسم کا لباس لڑکی نے بھی پہن رکھا تھا اور لِلی نے محسوس کیا کہ میگوار اور جیوش حریص نظروں سے ماں بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔ لڑکی شاید سترہ اٹھارہ برس کی تھی لیکن اپنی جسامت کی وجہ سے بیس کی نظر آتی تھی۔ خوب صورتی میں وہ کسی طرح ماں سے کم نہیں تھی۔ لِلی نے کہا۔ "تم میں سے کیور کون ہے؟"

"میں ہوں۔" لڑکی نے کہا۔

"یعنی میں تمہاری وجہ سے اس چکر میں پھنسا ہوں۔" لِلی نے سرد آہ بھری... اس نے اپنی ابتدائی دہشت پر قابو پا لیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کسی طرح پولیس کو پتا چل جائے کہ اس کے مطلوبہ مجرم یہاں ہیں تو ان کی جان بچ سکتی ہے ورنہ ان خطرناک لوگوں سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ انہیں صرف رازداری رکھنے کے لیے بھی مار سکتے تھے۔ اس گھر میں پہلے سے موجود لاش ان کی سفاکی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ کیور، لِلی کی بات نہیں سمجھی اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ لِلی نے وضاحت کی۔

"تم نے پیزا آرڈر کیا تھا، میں وہی لے کر آیا تھا۔" لڑکی نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ "تم اندر کیوں آئے؟"

"پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا، میں دروازہ کھلا پا کر اندر آ گیا۔" لِلی اب پچھتا رہا تھا۔ "بس ذرا سا اندر آیا اور انہوں نے گھیر لیا۔"

لِلی کے آنے سے پہلے شاید یہ لوگ ان ماں، بیٹی اور بیٹے کو اس کمرے تک محدود کر چکے تھے۔ یہاں سے وہ نہ تو کہیں باہر جا سکتے تھے اور نہ ہی کسی سے رابطہ کر سکتے تھے۔ بریڈ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "آؤ باہر چلتے ہیں۔"

لیکن جیوش اور میگوار ان ماں بیٹی کے سامنے سے نہیں ہٹنا چاہتے تھے۔ "یہاں کیا برائی ہے؟"

"باہر چلو۔" بریڈ کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "ہم یہاں تفریح کرنے نہیں آئے ہیں۔"

جیوش اور میگوار نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر نکل گئے۔ بریڈ نے ان کی طرف دیکھا اور تنبیہ کرنے والے انداز میں بولا۔ "کوئی غلط حرکت کرنے سے پہلے اس لاش کے بارے میں سوچ لینا جو برابر والے کمرے میں پڑی ہے۔"

جیسے ہی بریڈ دروازہ بند کر کے گیا، عورت بلند آواز سے رونے لگی۔ "اوہ... میڈ! یہ تم نے کیا کیا؟"

کیور کو باپ کی موت کا صدمہ تھا لیکن وہ ظاہر نہیں کر رہی تھی... ان کی اپنی جان خطرے میں تھی۔ اس نے سرگوشی میں لِلی سے کہا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"لِلی۔" اس نے جواب دیا۔

"لِلی! تمہارے پاس کوئی موبائل ہے؟" کیور کے سوال پر وہ اچھل پڑا۔ موبائل اس کی جیب میں تھا اور اسے خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اسے کیا، ان مجرموں کو بھی خیال نہیں آیا تھا۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا تو اسے یاد آیا کہ اس نے بل نہیں ادا کیا تھا اور دو دن سے اس کی آؤٹ گوئنگ بند تھی، وہ صرف فون ریسیو کر سکتا تھا۔ اصل میں اس کا کریڈٹ کارڈ ایکسپائر ہو گیا تھا اور اس وجہ سے وہ ادائیگی نہیں کر پا رہا تھا۔ کارڈ میں کچھ ایسا مسئلہ ہوا تھا کہ اسے خود بینک جانا ضروری تھا اور مصروفیت کی وجہ سے بالکل وقت نہیں ملا تھا۔ اس نے موبائل کیور کو دکھایا اور شرمندگی سے بولا۔

"اس سے کال نہیں کی جا سکتی، میں نے بل ادا نہیں کیا تھا اس لیے آؤٹ گوئنگ بند ہے۔"

کیور جو موبائل دیکھ کر خوش ہو گئی تھی، اس کی بات سن کر مایوس نظر آنے لگی۔ "پھر اس کا فائدہ؟"

"اس پر کال آ سکتی ہے اور میں مقررہ وقت پر واپس نہیں پہنچا تو میرے باس کی کال آ جائے گی۔"

"ہاں، یہ ایک چانس ہے۔" کیور پُر امید ہو گئی۔ "اس کی بیل آف کر دو ورنہ ان تک آواز جا سکتی ہے۔"

لِلی کے خیال میں صرف بیل آف کرنا ضروری نہیں تھا بلکہ موبائل چھپانا بھی لازمی تھا کیونکہ ان لوگوں کو کسی وقت بھی موبائل کا خیال آ سکتا تھا، وہ اس کی تلاشی لے کر آرام سے اسے برآمد کر لیتے مگر وہ اسے کہیں اور رکھتا تو اسے کیا پتا چلتا کہ کال آ رہی ہے؟ لِلی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کیور کو اپنی مشکل بتائی۔ لِلی نے موبائل آف کیا اور دونوں سر جوڑ کر اس مشکل کا حل سوچنے لگے۔

اس دوران میں بریڈ گھر کے فون سے کسی کو کال کر رہا تھا جبکہ جیوش اور میگوار بیئر پیتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ اس پر انہی کے بارے میں خبر چل رہی تھی۔ پولیس نے شہر کے اس حصے کی مکمل ناکا بندی کر دی تھی جہاں وہ موجود تھے اور یہاں سے نکلنے والی ہر گاڑی کی مکمل تلاشی لی جا رہی تھی۔ جیوش نے منہ بنا کر بیئر کے ڈبے کو دیکھا اور بولا۔

"ان لوگوں کے پاس پینے کی کوئی ڈھنگ کی چیز بھی نہیں ہے۔"

"میں دیکھتا ہوں۔" میگوار بولا اور اس نے کچن کی کیبنٹ دیکھنا شروع کیں۔ بالآخر اسے ایک خانے سے وہسکی کی نصف بوتل مل گئی اور وہ خوشی خوشی واپس آیا۔ بریڈ اپنے ایک آدمی سے بات کر رہا تھا۔

"تم لوگ کوشش کرو... نہیں، وقت کم ہے... تلاش کرنے والے یہاں تک آ سکتے ہیں۔" اس نے بات مکمل کر کے فون رکھ دیا۔ اس نے شاٹ گن اپنی ران پر رکھی ہوئی تھی۔ ان کو پولیس والوں سے دو شاٹ گنز اور دو پستول ملے تھے۔ ایک پستول جیوش کے پاس تھا جس سے اس نے میڈ کو شوٹ کیا تھا اور دوسری شاٹ گن میگوار کے پاس تھی۔ بریڈ کے پاس ایک شاٹ گن اور ایک پستول تھا۔ وہ دونوں اب وہسکی پی رہے تھے۔ بریڈ ناگوار نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا جیسے ان کا پینا اسے اچھا نہیں لگ رہا ہو۔

قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

"بے بریڈ... تم بھی آ جاؤ۔" میگوار بولا۔

بریڈ نے انہیں سرد نظروں سے دیکھا اور بولا۔ "اس وقت ہمیں ہوش میں رہنے کی ضرورت ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم ایک گلاس لے لو، جسم ذرا گرم ہو جائے گا۔" میگوار نے گلاس میں وہسکی ڈال کر بریڈ کی طرف بڑھائی تو اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی لے لی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ فی الحال ان سے بات بگاڑنا نہیں چاہتا۔ جیوش معنی خیز انداز میں ہنسا۔

"جسم گرم کرنے کے لیے یہاں اور بھی بہت کچھ ہے۔"

"ابھی ہم انہیں نہیں چھیڑ سکتے۔" بریڈ نے جلدی سے کہا۔ "اگر پولیس یہاں تک آ گئی تو ہمیں ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"پولیس جلد یا بدیر یہاں آ جائے گی۔" جیوش نے گلاس منہ سے ہٹا کر کہا۔ "تم اس آدمی کو بھول رہے ہو۔"

بریڈ پہلی بار چونکا۔ "ہاں اس پر تو میں نے توجہ ہی نہیں دی۔ میگوار! اسے باہر لاؤ۔"

میگوار نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھولا اور لِلی کو باہر آنے کا اشارہ کیا جو بستر پر بُت بنا بیٹھا تھا۔ میگوار کے اشارے پر وہ باہر آیا تو میگوار نے پہلے اس کی تلاشی لی اور اس کا پرس نکال لیا لیکن موبائل نہیں تھا۔

"موبائل کہاں ہے؟" بریڈ نے اس سے پوچھا۔

"وہ آج صبح نیچے گر گیا تھا تو میں نے بننے کے لیے دیا ہوا ہے۔" لِلی نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"تم بکواس کر رہے ہو... تم کوریئر ہو بغیر موبائل کے کیسے کام کر رہے ہو؟" جیوش غرایا۔

"مجبوری ہے اور ویسے بھی میں کچھ دیر میں واپس پہنچ جاتا ہوں اس لیے میرے باس کو مجھ سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

وہ اس کی بات پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھے۔ بریڈ نے جیوش اور میگوار سے کہا۔ "ان تینوں کی تلاشی بھی لو۔"

ان دونوں کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ گزشتہ تین سال سے

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیل میں تھے اور اس دوران میں عورت سے دور رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان ماں بیٹی پر ان کی رال ٹپک رہی تھی۔ وہ کمرے کی طرف لپکے اور فوراً ہی کیور اور اس کی ماں کی احتجاجی آوازیں آنے لگیں۔ وہ حواشی کے نام پر بدتمیزی کر رہے تھے۔ پھر کیور نے کچھ کیا تو جواب میں اسے تھپڑ پڑا۔ بلی نے اس کی چیخ سنی۔ اس نے بریڈ سے کہا۔

”یہ مناسب نہیں ہے۔ ہم تم لوگوں سے پورا تعاون کر رہے ہیں۔“

”کیا مناسب ہے اور کیا نہیں، یہ میں جانتا ہوں۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ اس دوران میں جیوش اور میگوار ان تینوں کو بھی باہر لے آئے۔ ان کی دست درازی کی وجہ سے کیور کی شرٹ سامنے سے پھٹ گئی تھی۔ اس نے شرٹ کو ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا اور اس کے ہونٹ کے گوشے سے خون نکل رہا تھا۔ جیوش نے کہا۔

”موبائل ان کے پاس نہیں ہے۔“

”تم ذلیل…“ کیور بے قابو ہو گئی۔ ”تم نے تلاشی لی تھی یا…“

جیوش نے ہاتھ اٹھایا لیکن بریڈ نے اشارے سے روک دیا۔ ”بس… اتنا کافی ہے۔“

اس پر جیوش نے بریڈ کو گھورا لیکن کچھ کہا نہیں اور پیچھے ہٹ گیا۔ پھر بریڈ نے کیور سے کہا۔ ”اپنی زبان پر قابو رکھو ورنہ مشکل میں پڑ جاؤ گی۔“

جیوش کی دھمکی دیتی نظریں کہہ رہی تھیں کہ وہ ایک بار ضرور مشکل میں پڑے گی۔ کیور کی ماں نے کہا۔ ”تم لوگ میرے شوہر کو مار چکے ہو… اب اور کیا چاہتے ہو؟“

”باہر پولیس ہماری تلاش میں ہے۔“ بریڈ نے نرمی سے کہا۔ ”جیسے ہی وہ واپس جائے گی، ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔“

بلی کو محسوس ہوا کہ وہ انہیں دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے کیونکہ پولیس اوّل تو اتنی آسانی سے واپس نہیں جائے گی اور جب وہ واپس نہیں جائے گا اور نہ ہی کال ریسیو کرے گا تو جانسن کو لازمی تشویش ہوگی اور وہ پولیس کو اطلاع کر سکتا ہے۔ پھر وہ ان نمبروں پر کال کرے گا جہاں سے پیزا آرڈر آئے تھے۔ ظاہر ہے، یہاں سے جواب نہیں جائے گا تو اس کا امکان ہے کہ وہ پولیس کو کال کر دے۔ یہ بات اس کے ذہن میں آسکتی تھی تو یقیناً ان مجرموں کے ذہن میں بھی آنی چاہیے تھی۔ ایک بار پولیس یہاں تک آجاتی تو اس کا بھی امکان تھا کہ خون خرابا ہوتا۔ اس میں کون بچتا اور کون مارا جاتا، یہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

”ان کو دوسرے کمرے میں بند کر دو۔“ بریڈ نے حکم دیا۔

”کیوں نہ ان عورتوں کو الگ بند کیا جائے۔“ جیوش نے کہا۔

”نہیں، ان سب کو ایک جگہ رکھو اور اب ان کی نگرانی بھی کرنی ہے۔“ بریڈ نے اس کی تجویز مسترد کر دی۔ اس پر جیوش اور میگوار خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ وہ شاید عورتوں کو الگ بند کر کے کوئی فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھے لیکن بریڈ نے ان کی بات ماننے سے انکار کر کے ان کے ارادوں پر پانی پھیر دیا۔ انہوں نے ان چاروں کو دھکے دے کر دوسرے کمرے میں دھکیل دیا۔ یہ کیور کے بھائی میش کا کمرا تھا۔ یہاں کی حالت بتا رہی تھی کہ یہاں کی بھی مکمل تلاشی لی گئی ہے اور انہیں یہاں بند کرتے ہوئے کوئی خطرہ نہیں تھا کہ وہ باہر کہیں رابطہ کر سکیں گے۔ بلی نے کیور کے کہنے پر موبائل ایک طرف رکھے ریک کے پیچھے سرکا دیا تھا۔ یہاں اسے باآسانی تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا اور وہ جیمی پر بھی نظر نہیں آتا لیکن اب وہ بے ہی تھا۔

”موبائل تو اسی کمرے میں رہ گیا۔“ اس نے کیور سے کہا۔

کیور نے اس دوران میں میش کی ایک ٹی شرٹ تلاش کر لی اور رخ بدل کر اپنی پھٹی شرٹ تبدیل کر لی۔ اس نے بلی سے کہا۔ ”اگر موبائل ہوتی بھی تو کیا فائدہ؟ تمہارا باس تو نہ جانے کب کال کرے… اور ممکن ہے سرے سے کرے ہی نہیں۔“

”پھر بھی ایک چانس تو تھا، اب وہ بھی نہیں رہا۔“ بلی نے گہری سانس لی اور ایک طرف فرش پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ دونوں سفید فاموں کی عورتوں پر نیت خراب ہو رہی ہے۔ اگرچہ بریڈ انہیں روکے ہوئے تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس معاملے میں بغاوت پر اتر آئیں گے اور بریڈ محض ان عورتوں کے لیے اپنے دو ساتھیوں سے لڑائی مول نہیں لے سکتا۔ اس بات کا امکان بھی کم تھا کہ وہ جاتے ہوئے انہیں زندہ چھوڑ جائیں۔ وہ انہیں مار کر یا یرغمال کے طور پر ساتھ لے جاتے۔ اس صورت میں بھی ان کے بچنے کا امکان کم تھا۔

☆☆☆

اس وقت شہر بھر کی پولیس اس علاقے میں جمع تھی اور … مجرموں کی تلاش کے لیے سرچ آپریشن کی تیاری کر رہی تھی کیونکہ مجرم اسی علاقے میں تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ انہوں نے کسی گھر میں پناہ لی ہوئی ہے۔ اس صورت میں امکان تھا کہ پولیس کو انہیں گرفتار کرنے کے لیے کارروائی کرنا پڑتی۔ شمالی فلاڈلفیا کی پولیس پہلے ہی سرگرم تھی۔ اس علاقے میں

تعینات پولیس افسران میں سے ایک جولیو برونی اور اس کا ساتھی ڈیوڈ بین بھی تھے۔ وہ معمول کی ڈیوٹی سے ہٹ کر ان مجرموں کی تلاش میں علاقے میں گھوم رہے تھے۔ یہ سارا علاقہ ان کا جانا پہچانا تھا۔ ان کا کام عوام کو ان مجرموں سے خبردار کرنا بھی تھا۔ وہ ہر گلی میں دس بارہ گھروں کے بعد رک کر میگا فون پر لوگوں کو مفرور مجرموں کے بارے میں خبردار کرتے ہوئے اپنے گھروں میں رہنے اور دروازے بند رکھنے کو کہتے۔ ڈیوڈ کے خیال میں وہ ایک بے کار مشق کر رہے تھے۔

”وہ یقیناً کسی گھر میں گھس چکے ہیں اور اہل خانہ کو یرغمال بنا لیا ہے۔“

”ممکن ہے۔“ جولیو نے کار آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت بارھویں اسٹریٹ پر تھے اور یہاں زیادہ تر پوش طبقے کے لوگ رہتے تھے۔ ”لیکن پھر بھی لوگوں کو خبردار کرنے میں کیا حرج ہے، ممکن ہے اس طرح کسی کا فائدہ ہو جائے۔“

”ان میں جیوش اور میگوار نہایت خطرناک ہیں۔“ ڈیوڈ نے کہا۔ ”وہ ان مجرموں میں سے ہیں جو گولی پہلے چلاتے ہیں اور سوچتے بعد میں ہیں۔“

”میں نے بھی سنا ہے۔ اگر ہمارا ان سے سامنا ہو گیا تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”شوٹ ایٹ دی سائٹ۔“ ڈیوڈ نے حتمی انداز میں کہا۔ ”انہیں ذرا سی مہلت دینے کا مطلب ہے کہ آپ اپنی بیوی کو بیوہ… کر رہے ہیں اور آپ کو اس تاخیر کا انعام ایک عدد خوب صورت تابوت کی صورت میں مل جائے گا۔“

جولیو اس کی بات سے متفق تھا۔ اس نے کار روکتے ہوئے میگا فون کا مائک سنبھال لیا اور اعلان کرنے لگا۔

☆☆☆

بلی کو یہاں آئے ہوئے ایک گھنٹا ہونے کو آیا تھا۔ وہ خاموش بیٹھے تھے۔ سناٹا ایسا تھا کہ وہ اپنے دل کی دھڑکن بھی سن سکتا تھا۔ اچانک اسے کہیں دور سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی میگا فون پر بات کر رہا ہو۔ آواز واضح نہیں تھی لیکن اسے فوراً پولیس کا خیال آیا۔ اس رہائشی علاقے میں صرف پولیس ہی میگا فون استعمال کر سکتی تھی۔ یہ اعلان ان تینوں نے بھی سن لیا۔ فوراً کمرے کا دروازہ کھلا اور میگوار اندر آیا، اس نے شاٹ گن اٹھا رکھی تھی۔

”سب اپنا منہ بند کر کے بیٹھیں گے۔“

”ہم خاموش بیٹھے ہیں۔“ مسز میڈرسل نے اسے بتایا۔

”پولیس یہاں اعلان کر رہی ہے۔ اگر تم میں سے کسی کے دماغ میں ایسا خیال آئے کہ تم اسے متوجہ کر سکتے ہو تو یہ تمہارا آخری خیال بھی ہو سکتا ہے۔“

”ہمیں اپنی زندگیاں عزیز ہیں اور ہم کسی کو متوجہ کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔“ مسز میڈرسل نے کہا۔ میگوار انہیں گھورتا ہوا وہیں بیٹھ گیا۔ اگلی بار پولیس کار کا اعلان میڈرسل کے گھر کے بالکل پاس ہوا۔ اس میں موجود پولیس والوں کو معلوم نہیں تھا کہ ان کے مطلوبہ مجرم پاس ہی موجود ہیں۔ اب جیوش اور بریڈ بھی اندر آگئے تھے اور… پوری طرح چوکس تھے کہ ان کی طرف سے کوئی حرکت ہو تو وہ ان سے نمٹ لیں۔ وہ ان پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھے۔ بریڈ اس دوران میں چپ تھا اور کسی سوچ میں گم تھا۔ جب پولیس کار آگے چلی گئی تو اس نے بلی کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”تم… باہر آؤ۔“

بلی بادل ناخواستہ باہر آیا۔ بریڈ نے اس سے کہا۔ ”اگر تم واپس نہیں جاؤ گے تو تمہارا باس کیا کرے گا؟“

”وہ میرے موبائل پر کال کرتا رہے گا۔“ بلی نے کہا۔

”لیکن اسے جواب نہیں ملے گا۔“

”اسے جواب نہیں ملا تو وہ پولیس کو کال کر سکتا ہے؟“

”شاید کر سکتا ہے۔“ بلی نے اعتراف کیا۔

”تب ادھر آؤ۔“ بریڈ نے اسے گھر کے فون کی طرف بلایا۔ ”اسے کال کرو اور کہو کہ تمہاری طبیعت خراب ہو رہی ہے اور تم یہاں پیزا ڈلیور کر کے گھر جا رہے ہو۔“

بلی نے ریسیو اٹھایا تھا کہ بریڈ نے اسے چھین کر واپس رکھ دیا۔ ”اسپیکر فون آن کر کے بات کرو۔“

مجبوراً بلی نے اسپیکر فون آن کیا اور جانسن پیزا کا نمبر

وجہ

پنڈت ہری چند اختر نے عبدالحمید عدم کو طویل مدت کے بعد کسی مشاعرے میں دیکھا لیکن پہچانا نہیں کیونکہ عدم صاحب بہت موٹے ہو چکے تھے۔ عدم نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اختر صاحب نے انہیں پہچانا نہیں… ان سے کہا:

”پنڈت جی! میں عدم ہوں۔“

اختر صاحب نے بے ساختہ فرمایا۔

”اگر یہی عدم ہے تو وجود کیا ہوگا؟“

شیرافگن… کراچی

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملایا۔ دوسری طرف سے جانسن نے فون اٹھایا۔ بلی نے کہا۔ ”باس! میں بلی بات کر رہا ہوں۔“
”بلی۔“ جانسن کی خفگی آمیز آواز آئی۔ ”کہاں مر گئے ہو تم؟ اور میں تمہارے موبائل پر کال کر رہا ہوں تو اٹھا کیوں نہیں رہے ہو؟ تمہیں گئے ہوئے دو گھنٹے سے اوپر ہو چکے ہیں۔“
”موبائل خراب ہو گیا تھا، میں نے بننے کے لیے دیا ہوا ہے۔“
”بکواس۔“ جانسن غرایا۔ ”اس پر بیل جا رہی ہے۔“
بلی کو پسینا آ گیا کیونکہ بریڈ اسے خوف ناک نظروں سے گھور رہا تھا مگر فوراً ہی اسے بات سوجھ گئی۔ ”موبائل ٹھیک ہو گیا ہوگا لیکن ریپیئر کرنے والا کال تو ریسیو نہیں کرے گا۔“
”اب تم کہاں ہو؟“ جانسن اس کی وضاحت سے مطمئن ہو گیا تھا۔
”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ بلی نے آواز کو ذرا نحیف بنا کر کہا۔ ”میں آخری گھر میں پیزا دے کر گھر جا رہا ہوں آرام کرنے۔“
”کیا؟“ جانسن چلایا۔ ”یہاں جو ڈھیر کام پڑا ہے اس کا کیا ہوگا؟“
”باس! میں نہیں آ سکتا... تم جانتے ہو میرا گھر بھی کتنا دور ہے۔ اب میں کل آؤں گا۔“ یہ کہہ کر بلی نے کال کاٹ دی۔ بریڈ اب مطمئن تھا۔
”گڈ! تم نے اچھی طرح بات کی... تمہارا باس کیسا آدمی ہے؟“
”بس ٹھیک ہے... جیسے سارے باس ہوتے ہیں۔“ بلی نے شانے اچکائے۔ ”لیکن تم نے کال کیوں کرائی ہے؟“
”تاکہ وہ پولیس کو کال نہ کرے... اور تم جانتے ہو پولیس یہاں آ گئی تو کیا ہوگا؟“
بلی جھرجھری لے کر رہ گیا۔ یہ عام مجرم نہیں تھے۔ جیل سے بھاگے ہوئے تھے۔ اگر پولیس یہاں آ جاتی تو یقیناً وہ آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالتے۔ بریڈ نے اسے واپس کمرے میں بھیج دیا۔ میگوار اور جیوش باہر آ گئے تھے۔ کیور نے اس سے آتے ہی پوچھا کہ وہ فون پر کس سے بات کر رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے بتایا۔
”پیزا شاپ کے مالک سے۔ بریڈ نے مجھ سے کہلوایا ہے کہ میری طبیعت خراب ہے اور میں یہاں پیزا ڈلیور کر کے آرام کرنے کے لیے گھر چلا جاؤں گا۔“
”مجھے ان لوگوں کی نیت ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ کیور بولی۔ ”اگر پولیس نہ بھی آئی تب بھی یہ ہمیں زندہ چھوڑ کر جانے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔“
بلی کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ ”تمہارا مطلب ہے... یہ ہمیں مار کر جائیں گے؟“
کیور نے سر ہلایا۔ ”شاید مجھے اور مام کو مارنے سے پہلے...“ کیور کہتے کہتے رک گئی لیکن بلی اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ یہ اس نے بھی محسوس کیا تھا کہ میگوار اور جیوش کے عزائم ٹھیک نہیں اور وہ ان عورتوں کی قربت حاصل کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ عین ممکن تھا اگر انہیں بریڈ نے نہ روک رکھا ہوتا تو وہ اب تک اپنی من مانی کر گزرے ہوتے۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ اسے جانسن سے بات کیے ہوئے ایک گھنٹا ہونے کو آیا تھا۔ اس نے کیور سے کہا۔
”تم کسی طریقے سے میرا موبائل حاصل نہیں کر سکتیں؟“
”ناممکن... وہ دوسرے کمرے میں ہے۔“ کیور نے جواب دیا۔ دونوں سرگوشی میں بات کر رہے تھے۔
بلی بھی یہ بات جانتا تھا اس لیے پھر خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ پولیس کار کے یہاں آنے کے بعد بریڈ، میگوار اور جیوش بہت محتاط تھے وہ وقتے وقتے سے کھڑکیوں اور دروازوں سے باہر دیکھ رہے تھے لیکن جب ایک گھنٹے تک انہیں کوئی مشکوک چیز دکھائی نہیں دی تو وہ مطمئن ہو گئے۔ بلی نے ان لوگوں کی بات کرنے کی آواز سنی، اس نے کان لگا دیے۔ میگوار اور جیوش... بریڈ سے اجازت طلب کر رہے تھے کہ انہیں من مانی کرنے دے۔ بریڈ انکار کر رہا تھا اور انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کے انداز میں بغاوت نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ بریڈ نے محسوس کر لیا، اگر اس نے انہیں اجازت نہیں دی تو وہ آپس میں ہی لڑ مریں گے۔ اس لیے اس نے ہتھیار ڈال دیے۔
”ٹھیک ہے لیکن اب حالات کو درست رکھنا تمہاری ذمے داری ہے۔“ اس نے ان کو خبردار کیا۔
”تم اس کی فکر مت کرو۔“ بلی نے جیوش کی آواز سنی۔ ”ہمیں صرف آدھا گھنٹا چاہیے۔“
”انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔“ بریڈ نے پھر کہا لیکن وہ اس کی بات سنے بغیر۔ کمرے کی طرف آ گئے۔ کیور اور اس کی ماں ذرا دور بیٹھے تھے اس لیے وہ ان تینوں کی باتیں نہیں سن سکے تھے۔ بلی نے پلٹ کر کیور کی طرف دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے خبردار کرتا، میگوار اور جیوش شکاری درندوں کی طرح اندر گھس آئے۔ جیوش نے کیور اور اس کی ماں سے کہا۔
”اے... تم دونوں ادھر آؤ۔“
وہ اس کے لہجے سے سمجھ گئیں۔ کیور لرزنے لگی۔ اس نے

تھانے والی نوں

ایک دفعہ اتفاق سے سردار چاندی سنگھ کی بیوی گم ہو گئی۔ بیوی کے فراق میں روتا دھوتا گمشدگی کی رپورٹ کرانے وہ تھانے پہنچا۔ تھانے دار نے جوان جہان سنگھ کو روتے دیکھا تو سمجھا ضرور کوئی شخص قتل ہو گیا ہے۔ اس نے چاندی سنگھ کو آرام سے بٹھایا، ٹھنڈا پانی پلایا اور پوچھا:
”سردار جی... کیا ہوا؟“
چاندی سنگھ بین کرتے ہوئے بولا۔
”تھانے دار صاحب... میری تیوی (بیوی) گواچ گئی اے۔“
تھانے دار نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
”تیری گواچ گئی اے تے کیہ ہویا مرد ہو کے رونے پے او روواں دیاہ کرو۔“
چاندی سنگھ نے روتے روتے چیخ ماری اور کہنے لگا۔
”دوبارہ ایہ گل نہ کرنا تھانے دار صاحب... میتھوں اوہ دے نال بڑا پیار سی۔ تسی اوہدی رپورٹ لکھو تے اہنوں لبھو۔“
تھانے دار چاندی سنگھ کے جذبہ عشق سے بہت متاثر ہوا اور کہنے لگا۔
”سردار جی... چلو رپورٹ لکھ کے اوہنوں لبھدے آں... تسی اپنی تیوی دے بارے میتھوں دسو۔“
چاندی سنگھ بدستور سسکیاں لیتے ہوئے بولا۔
”جناب... میری تیوی بڑی چنگی ماتی تے شریف سی۔“
تھانے دار نے کہا۔ ”چاندی سنگھ... ساری تیویاں ای شریف ہوندیاں نیں پر میں رپورٹ لکھنی اے... میتھوں کوئی ہور گل دس۔“
چاندی سنگھ نے جواب دیا۔
”تھانے دار جی... اوہ کوشت بہت اچھا پکاندی سی۔“
تھانے دار چاندی سنگھ کو سمجھاتے ہوئے بولا۔
”سردار جی... ایہ وی کوئی دسن دی گل نئیں... تیویاں نوں ہور کج پکا نا آوے نا آوے، آلو گوشت ساریاں ای پکا لیندیاں نیں... میتھوں رپورٹ لکھن واسطے کوئی گل دسو!“
چاندی سنگھ بیوی کے غم میں پاگل ہو رہا تھا، بولا۔
”جناب میری بیوی پیرھ پاون تے ماہر سی اے۔“
تھانے دار پریشان ہو گیا کہ وہ چاندی سنگھ کو کیسے سمجھائے کہ رپورٹ لکھنے کے لیے آلو گوشت ورگی شے کا ذکر ضروری نہیں، کچھ اور قسم کی معلومات چاہئیں۔ بہرحال اسے ایک ترکیب سوجھی، وہ چاندی سنگھ سے کہنے لگا۔
”سردار جی... تہانوں میری گل سمجھ نئیں آ رہی کہ میں تہاڈے کولوں کیہ پچھنا چاہندا آں... ایداں کرو کہ تسی تھانے دار بن جاؤ تے فرض کرو میری بیوی گواچ گئی اے تے میں تہاڈے کول رپورٹ کران واسطے آیا واں... تسی میرے کولوں میری بیوی دے بارے پچھو... جس طراں دے میں جواب دیواں گا، بعد وچ تسی وی میتھوں اوسے طراں جواب دینا۔“
چاندی سنگھ کو تھانے دار بننا اچھا لگا، کہنے لگا۔
”جناب... میتھوں اپنی بیوی دے بارے کج دسو...“
تھانے دار کہنے لگا۔
”جناب اوہدا ساڈھے پنج فٹ قد اے...؟“
چاندی سنگھ بولا۔ ”ہور؟“
تھانے دار نے جواب دیا۔ ”گورا رنگ۔“
چاندی سنگھ نے مزید پوچھا۔ ”ہور؟“
تھانے دار بولا۔ ”گول چہرہ تے ٹھوڈی تے تل اے۔“
چاندی سنگھ کا اشتیاق اور بڑھا۔ ”ہور کج؟“
تھانے دار کہنے لگا۔ ”جناب اوہدیاں موٹیاں موٹیاں اکھاں۔“
چاندی سنگھ مزید بے چین ہوا۔ ”ہور؟“
تھانے دار بھی موڈ میں آ گیا۔ ”جناب اوہ بڑے ناز نخرے والی، اوہدی ہرنی ورگی چال...“
ابھی تھانے دار نے اتنا ہی حلیہ بتایا تھا کہ چاندی سنگھ چلا کر بولا۔
”جناب میری والی نوں گولی مارو... چلو تہاڈے والی لبھن چلدے آں!“

منڈی بہاؤ الدین سے سردار طیب شاہین کی کاوش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اٹھنے سے انکار کر دیا۔ "میں نہیں آؤں گی۔" وہ ماں سے لپٹ گئی۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" بلی کھڑا ہی ہوا تھا کہ جیوش نے اس کے منہ پر پستول کا دستہ مارا اور وہ پلٹ کر بیڈ کے برابر میں جا گرا۔ اسے چکر آ گیا تھا اور وہ منہ میں خون کا ذائقہ محسوس کر رہا تھا۔ اسے کیور اور اس کی ماں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن وہ خود میں اٹھنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ جیوش اور میگوار ان پر بھی تشدد کر رہے تھے۔ پھر اسے بریڈ کی آواز آئی۔ وہ انہیں منع کر رہا تھا اور اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا۔ پہلے کھڑکیاں ٹوٹنے کی آوازیں آئیں اور اس کے بعد بے تحاشا فائرنگ ہونے لگی۔ لوگوں کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور فائرنگ سے چیزیں ٹوٹ رہی تھیں۔ یہ سب نہ جانے کتنی دیر جاری رہا۔ پھر اچانک ہی خاموشی چھا گئی۔

بلی فرش پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ پھر کسی نے اسے سیدھا کیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو سامنے ایک ماسک پوش تھا۔ وہ بلی کی گردن ٹٹول رہا تھا۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

تب بلی کو احساس ہوا کہ وہاں اتنا سناٹا بھی نہیں ہے۔ اصل میں ابتدائی قیامت خیز شور کے بعد اتنی سی آوازیں سنائی دی گئیں۔ مکان میں دھواں سا بھرا ہوا تھا اور کافی لوگ جمع تھے۔ بلی بہ مشکل اٹھا۔ اس کا سر اب بھی چکرا رہا تھا۔ "عورتیں کہاں ہیں... وہ ٹھیک ہیں؟"

"ہاں، وہ ٹھیک ہیں۔" ماسک پوش نے بتایا۔ اس کے سینے پر موجود بلٹ پروف جیکٹ پر پولیس لکھا تھا۔

"اور وہ تینوں؟"

"وہ مارے جا چکے ہیں۔"

بلی نے جیوش کو دروازے کے سامنے اوندھے منہ پڑے دیکھا۔ میگوار کی لاش ایک کھڑکی کے ساتھ پڑی تھی اور بریڈ کمرے کے وسط میں سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ وہاں ہر چیز فائرنگ سے برباد ہو چکی تھی۔ بلی لڑکھڑاتا ہوا باہر آیا جہاں لان میں کیور، اس کی ماں اور اس کا بھائی موجود تھے۔ وہ ٹھیک لگ رہے تھے، بس کیور کے ماتھے پر زخم کا نشان تھا۔ بلی ان کی طرف بڑھا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں۔" کیور نے اس کا رخسار دیکھا۔ "تمہیں چوٹ آئی ہے۔"

"خاص نہیں ہے۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

ایک پولیس افسر ان کی طرف آیا۔ "تم میں سے بلی کون ہے؟"

"میں ہوں۔" بلی بولا۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔" اس نے گرم جوشی سے بلی سے ہاتھ ملایا۔ "جانسن تمہارا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ اس نے فوراً پولیس کو خبردار کر دیا تھا کہ تم یہاں کسی مشکل میں ہو۔ چونکہ ان تینوں کی پہلے ہی اس علاقے میں تلاش جاری تھی اس لیے پولیس نے پہلے دوسرے طریقوں سے مکان کا جائزہ لیا۔ ہم نے انفرا ریڈ بھی استعمال کیا اور اس سے ہمیں پتا چل گیا کہ مسلح مجرم کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کا کام ہمارے لیے آسان ہو گیا۔"

بلی بولا۔ "مجھے امید تھی کہ جانسن سمجھ جائے گا۔"

"لیکن تم نے اسے کیا اشارہ دیا تھا؟" پولیس افسر چونک کر بولا۔

"میں نے جانسن سے کہا تھا کہ میری طبیعت خراب ہے اور میں گھر جا رہا ہوں۔"

"اس میں اشارے والی بات کون سی ہے؟"

"اس میں اشارے والی بات یہ ہے کہ میں جانسن بیزا کے اوپر بنے رہائشی حصے میں ہی رہتا ہوں اس لیے کہیں اور گھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا... پھر بریڈ نے مجھ سے اس گھر کے نمبر سے فون کرایا، اس سے جانسن کو پتا چل گیا کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔"

پولیس افسر چونکا۔ "تم بیزا شاپ کے اوپر رہتے ہو... لیکن وہاں تو جانسن کی رہائش ہے؟"

"میں جانسن کا بیٹا ہوں اس لیے وہیں رہوں گا نا۔" بلی نے سادگی سے کہا۔

"تم جانسن کے بیٹے ہو؟" پولیس افسر حیران ہو گیا۔

"ہاں۔" بلی نے سڑک کے کنارے جانسن کی گاڑی رکتے دیکھی۔ اس سے جانسن اور کیرول نکلے۔

"اور اس کی بیزا شاپ پر جاب بھی کرتے ہو؟"

"اپنے باپ سے میں نے واحد یہی فائدہ تو اٹھایا ہے۔" بلی نے مسکرا کر کہا اور اپنے باپ اور کیرول کی طرف بڑھ گیا جو دوڑے چلے آ رہے تھے۔ کیرول کی آنکھوں میں آنسو تھے اور جانسن خدا کا شکر ادا کرتے نہیں تھک رہا تھا۔ بلی اس کا ایک ہی تو بیٹا تھا۔ عقب سے پولیس افسر نے اسے پکارا۔

"بلی! تم بیان دے کر جانا۔"

"میں یہیں ہوں۔" اس نے مڑے بغیر کہا اور اپنے باپ کے کھلے بازوؤں میں سما گیا۔

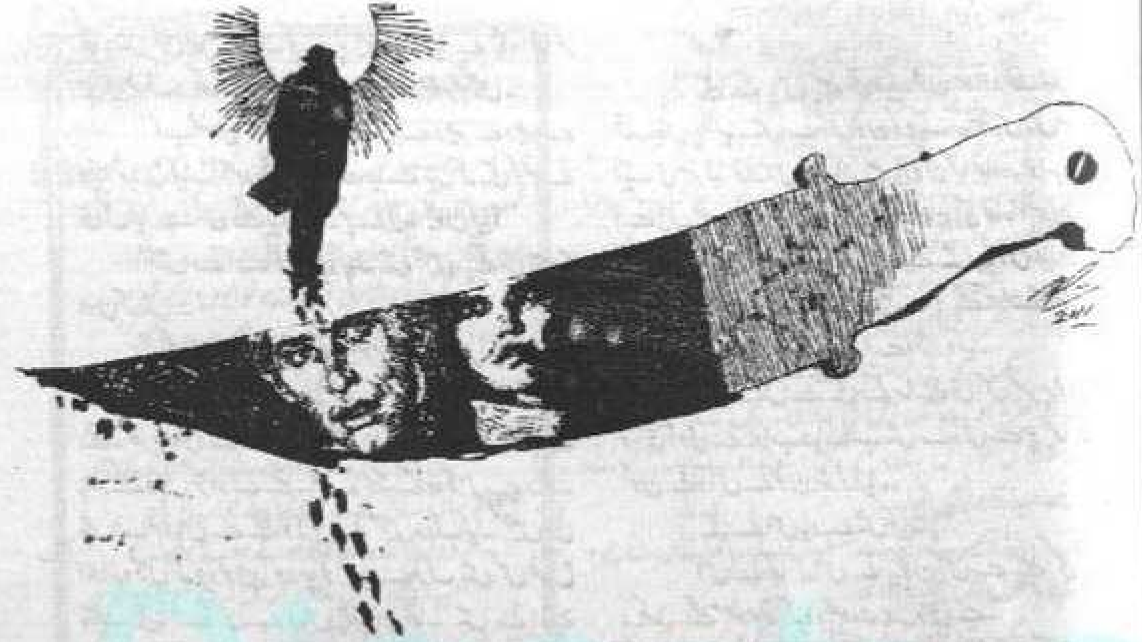

پیش بندی

سلیم انور

عقلمندی کا تقاضا ہوتا ہے... کہ سیلاب آنے سے پہلے ہی بند باندھ لیا جائے... ایک ایسے ہی ذی فہم کا ماجرا جس نے وقت سے پہلے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔

فیصلے کی ان ساعتوں کا کمال جس نے بازی کو پلٹ دیا تھا

"اگر اس نے ٹھیک ٹھیک نہیں بتایا تو میں مار مار کر اس کا بھرکس نکال دوں گا۔" میں نے کہا۔

"اگر یہ قتل اس نے نہیں کیا ہے تو پھر؟" میرے پارٹنر نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔

میں نے خون آلود چاقو کی جانب اشارہ کیا اور کہا۔ "وہ اس کی وضاحت کیسے کرے گا؟"

"اس کا کہنا ہے کہ اس نے یہ چاقو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" میرے پارٹنر نے بتایا۔

"یہ اس کے ٹرک میں تھا۔"

میرے پارٹنر نے شیشے کی اوٹ سے جیڈ لینڈر پر نظریں جما دیں اور پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "وہ دیکھنے میں قاتل لگتا ہی نہیں ہے۔"

"کسی قاتل کو اس کے چہرے بشرے سے نہیں پرکھا جاتا۔ حقائق کو مدِنظر رکھنا چاہیے۔" میں نے اپنی ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔ "کمرا بند کر دو اور کسی کو بھی اندر مت آنے دینا۔"

"اوکے!"

میں تفتیشی کمرے میں داخل ہو گیا جہاں جیڈ لینڈر موجود

Digests of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ میں آہنی میز کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ جیڈ نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔

"اب فضول گفتگو ختم کرو۔" میں نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔ "ہم دونوں یہ بات جانتے ہیں کہ سیلی کو تم نے ہی قتل کیا ہے۔ بس مجھے یہ بتا دو کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں..."

"مجھے معلوم ہے... مجھے معلوم ہے۔" میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم پورا دن اپنے کام پر تھے۔ گھر واپسی کے دوران تم ریکس بار پر رکے تھے اور تم نے چند گھنٹے وہاں گزارے تھے۔ تم نے بیئر کے دو گلاس پیے تھے۔ پھر جب تم وہاں سے نکلے تو ڈپٹی نے تمہیں روک لیا۔ تمہیں کوئی اندازہ نہیں کہ وہ خون آلود چاقو تمہارے ٹرک میں کس طرح پہنچا۔ یقیناً اسے کسی نے وہاں چھپا دیا تھا۔" میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا میں نے مکمل خلاصہ بیان کر دیا ہے؟"

"تم اس طرح کہہ رہے ہو جیسے تمہیں میری بات پر یقین نہیں ہے۔" جیڈ نے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ مجھے کس بات پر یقین ہے؟" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

جواب میں جیڈ مجھے گھورنے لگا۔

"مجھے تمہاری پڑوسن پر یقین ہے... جب اس نے یہ بتایا کہ گزشتہ شب اس نے تم دونوں کی جھگڑے کے دوران بلند آوازیں سنی تھیں۔ جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟"

"بس... بس وہی معمول کی میاں بیوی کی تکرار... اور کچھ نہیں۔"

میں نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔ "دیکھو، میں صرف ایک مرتبہ یہ سوالات کروں گا۔ اگر مجھے محسوس ہوا کہ تم حیلے بہانے سے کام لے رہے ہو تو میں تم سے کوئی رعایت نہیں برتوں گا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم دونوں میں جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟"

جیڈ نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بہ مشکل تمام تھوک نگلا اور بولا۔ "ہوں... یہ مجھے اس کے پرس میں ملا تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی پتلون کی جیب میں سے ایک سستا سا سیل فون نکالا اور اسے میری جانب بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"ایک پے ایز یو گو فون۔"

"اور؟"

"سیلی کے پاس پہلے ہی ایک فون موجود تھا۔ لہٰذا میں شک میں پڑ گیا۔ میں نے اس فون کو چیک کیا تو اس میں صرف ایک ہی نمبر فیڈ تھا۔ اس نے اس نمبر پر فون کیا تھا اور جواب میں اسے اس نمبر سے دن میں بیس مرتبہ فون آیا تھا۔ انہوں نے آپس میں گھنٹوں باتیں کی تھیں۔" جیڈ نے اپنے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے پونچھتے ہوئے بتایا۔

"آگے بولو!" میں نے اسے اشارہ کیا۔

"ڈیل... میں نے سیلی کے سامنے ہی اس نمبر پر فون کیا تو کسی آدمی نے جواب دیا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے تو اس نے فون بند کر دیا۔"

"سیلی نے اس بارے میں کیا بتایا؟"

"اس نے کہا کہ اس نے یہ فون اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔"

"جب تم نے اسے قتل کر دیا؟ یا تم نے آج صبح کام پر روانہ ہونے سے پہلے اسے قتل کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اسے میں نے..."

میں نے آگے جھک کر جیڈ کے چہرے پر ایک زوردار گھونسا جڑ دیا۔ وہ بلبلاتا ہوا فرش پر گر پڑا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "تم... تم نے مجھے مارا ہے۔"

میں نے اس کا بازو پکڑا اور ایک جھٹکے سے اسے اوپر اٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ "میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں صرف ایک مرتبہ پوچھوں گا۔ اب دوبارہ پوچھ رہا ہوں کہ کیا تم نے سیلی کو اسی وقت قتل کر دیا تھا؟"

"میں نے اسے قتل نہیں کیا..."

میں نے جیڈ کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑتے ہوئے اس کے سر کو پیچھے کی جانب جھکا دیا اور اس کے حلقوم پر ایک کھڑا ہاتھ رسید کر دیا۔ اس کے حلق میں پھندا سا پڑ گیا اور وہ ابکائیاں لیتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

"تم نے اسے قتل کیوں کیا؟" میں نے اس کی جانب جھکتے ہوئے چیخ کر کہا۔

جیڈ نے تکلیف سے تیزی سے سر ہلایا اور بولا۔ "میں قسم کھا کر کہتا ہوں، میں نے اسے قتل نہیں کیا..."

میں نے اپنے بائیں ہاتھ سے اس کے بالوں کو اپنی گرفت میں لیا اور اپنے داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت اور انگوٹھا اس کی آنکھوں میں ڈال کر پوری طاقت سے اس کی آنکھوں کے ڈھیلوں کو اس کی کھوپڑی کے اندر دبانا شروع کر دیا۔

جیڈ نے تڑپتے ہوئے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

میں نے اس کی آنکھ کے ڈھیلوں کو اپنی انگلیوں سے اندر دبانے کا عمل جاری رکھا۔ میری انگلیاں اس کی آنکھوں کے خول میں دھنستی جا رہی تھیں۔ جب میں نے سوچا کہ اب اس کی آنکھوں کے ڈھیلے پھٹ پڑیں گے تو وہ اقرار کر بیٹھا۔

"او کے... او کے!" وہ چلانے لگا۔ "قتل میں نے ہی کیا ہے، میں اقرار کرتا ہوں۔"

میں نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور اسے اطمینان کے ساتھ کھڑا ہونے میں اس کی مدد کی۔ میں نے اس کی قمیص درست کی اور اس کے سر پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "تم نے دیکھا، یہ اتنا برا نہیں تھا۔"

جیڈ دھیرے دھیرے سسکیاں لے رہا تھا۔ اس نے چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپایا ہوا تھا۔

میں نے اشارے سے اپنے پارٹنر کو کمرے میں طلب کیا۔ "اس کا بیان لے لو۔ جب بیان مکمل ہو جائے تو مجھے خبر کر دینا۔"

میں کمرے سے باہر نکل آیا اور اپنے دفتر کی جانب چل دیا۔ ہال وے میں مجھے ایک پیٹرول ڈپٹی نے روک لیا اور مجھے ایک شہادتی لفافہ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ریکس بار کی نگرانی کے کیمرے کا ٹیپ!"

"کیا تم نے اسے چلا کر دیکھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں سر! جیسا کہ آپ نے حکم دیا تھا، اسے حاصل کرتے ہی میں جتنی جلدی ممکن ہو سکتا تھا، اسے یہاں لے آیا ہوں۔" پیٹرول ڈپٹی نے جواب دیا۔

"شکریہ۔" میں نے کہا اور لفافہ لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

میں نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور لفافے میں سے ٹیپ نکال کر اسے وی سی آر میں لوڈ کر دیا۔ پھر جلدی سے ریموٹ اٹھا کر سرچ کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ مجھے اسکرین پر جیڈ کا ٹرک نظر آ گیا۔

ٹیپ کے وقت کے مطابق جیڈ وہاں سات بجے پہنچا تھا۔ اگلے ایک گھنٹے یا اس سے زیادہ عرصے تک کاریں آتی اور جاتی رہیں۔ پھر ساڑھے نو بجے جیڈ کے ٹرک کی ہیڈ لائٹس اور اندر کی لائٹیں روشن ہو گئیں۔ اسی دوران ایک سایہ ٹرک کے نزدیک پہنچا۔ اس نے دروازہ کھولا اور کوئی شے ڈرائیور کی سیٹ کے پیچھے رکھ دی۔

وہ خون آلود چاقو تھا!

میں نے وی سی آر میں سے ٹیپ نکال لیا اور بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا۔

پھر کچھ منٹ گزرنے کے بعد میں نے اسے اپنے جم بیگ میں اچھال دیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی جیب میں سے سیلی کا فون نکالا اور اس میں موجود اپنا نمبر ڈیلیٹ کر دیا۔ پھر وہ فون سیلی کے پرانے بیگ میں ٹھونس دیا اور ساتھ ہی جیڈ کے ٹرک کی ڈپلیکیٹ چابی بھی اس میں ڈال دی۔

پھر میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور ایک لمبی آہ بھری جیسے کسی طویل سفر سے واپس لوٹا ہوں۔

سیلی میری عیاشی کی ایک اچھی رفیق تھی اور میں اسے بے حد مس کروں گا۔ لیکن وہ خاصی بے پروا ہو گئی تھی۔ میں یہ رسک نہیں لے سکتا تھا کہ میری بیوی کو اس کے بارے میں خبر ہو جائے۔ بیوی سے طلاق کا مطلب میری معاشی موت تھی کیونکہ طلاق کی صورت میں میری نصف پنشن اس کے حصے میں چلی جاتی...... اگر ایسا ہوتا تو میری گزشتہ ستائیس سال کی پولیس کی نوکری بے سود ہو جاتی اور میرے ہاتھ کچھ نہ آتا۔

اسی لیے میں نے سیلی کو قتل کر دیا تھا اور آلۂ قتل جیڈ کے ٹرک میں چھپا دیا تھا!

نجومی

جوان اور خوب صورت لڑکی نجومی کے پاس اپنی قسمت کا حال معلوم کرنے کی غرض سے گئی۔ نجومی نے جوان لڑکی کے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے انداز سے کہا۔

"تمہاری شادی تمہارے خوابوں کے شہزادے سے ہو گی جو جوان، خوب صورت اور صحت مند ہو گا۔"

"اور دولت مند بھی؟" لڑکی نے سوالیہ نظروں سے نجومی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں، دولت بے انتہا، ساتھ میں عمر بھی 28 سال کے قریب۔" نجومی نے جواب دیا۔

لڑکی خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے بولی۔

"اب مجھے یہ بھی بتا دو کہ میں اپنے موجودہ شوہر سے کس طرح جان چھڑا سکتی ہوں!!"

دانش اقبال، رحیم یار خان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلا رنگ

بحرِ تلاطم

منظر امام

زندگی... مشکلات کے خلاف مسلسل دیانت داری... حب الوطنی اور بامقصد نصب العین کے تحت گزارنا ہی اصل گوہرِ حیات ہے... کچھ لوگ انفرادی اور اجتماعی دونوں میدانوں میں انسانی اقدار کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے ہیں... ایک ایسی ہی ہستی کا احاطہ کرتی مہماتی تحریر... جو کٹھن سے کٹھن حالات میں عزم و ہمت کا پیکر بن کے مظلوموں کے لیے ایک مضبوط ڈھال بن گیا... اس کا مطمح خاص اپنی اور اپنے ساتھ وابستہ لوگوں کی زندگی کو ہر صورت بچانا تھا۔

بپھرے ہوئے سمندر کی موجوں کے درمیان معلق شوخ حیات کی کشمکش پر مبنی سنسنی خیز احوال

ہم دونوں باپ بیٹی کے درمیان پیار کا رشتہ بھی تھا اور دوستی کا بھی۔

ایک باپ کے لیے بیٹی سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے یا ایک بیٹی کے لیے باپ سے زیادہ کس کی اہمیت ہو سکتی ہے۔

میری بیٹی سائرہ ایک خوب صورت لڑکی ہے۔

خوب صورت اور ذہین۔ ابھی وہ صرف گیارہ برس کی ہے لیکن وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کا باپ یعنی ہمایوں صفدر سال کے سات آٹھ مہینے ملک سے باہر کیوں رہتا ہے۔

میں ایک کارگوشپ کا کپتان ہوں۔ ہم بڑے بڑے کنٹینرز ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک لے جاتے ہیں۔

ہماری کمپنی کا نام "وینس لائن" ہے۔ اس کے کئی کارگو جہاز دنیا بھر کی بندرگاہوں کے درمیان گھومتے رہتے ہیں۔

بحری جہاز کا کپتان ہونا کوئی عام بات نہیں ہے۔ محنت اور تربیت کے بعد یہ مقام حاصل ہوتا ہے۔ ایک اچھے کپتان کو صرف تکنیکی ماہر ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس میں بروقت اور درست فیصلہ کرنے کی صلاحیت بھی ہو۔

اس کا آئی کیو بھی بہت وسیع ہونا چاہیے۔ اس میں اتنی بہادری ہونی چاہیے کہ وہ بپھرے ہوئے اسٹاف کو سنبھال سکے۔

میں نے اس مقام تک پہنچنے کے لیے بہت جدوجہد کی ہے۔

پہلے میں ایک آفیسر تھا۔ اس کے بعد مالکان نے میری کارکردگی دیکھتے ہوئے کپتان مقرر کر دیا۔

میں اپنی بیٹی سائرہ کی بات کر رہا تھا۔

اسے میں نے ایک مزے کی نظم سکھائی تھی۔ وہ نظم کچھ یوں تھی۔

آج کی رات
تم اور میں
بازار نکل جائیں گے
خوب کھلونے لائیں گے

سائرہ کو جب بھی مجھ سے کوئی فرمائش کرنی ہوتی، وہ یہی نظم پڑھا کرتی اور میں اسے اپنے ساتھ بازار لے جاتا۔

میری بیوی ارم کہا کرتی۔ "ہمایوں آپ اس کی عادتیں خراب کر دیں گے۔"

"ارے بابا، ایک ہی تو بیٹی ہے۔ اب اس کے ناز اٹھاؤں تو کس کے اٹھاؤں؟"

اس وقت ارم مسکرا کر خاموش ہو جایا کرتی۔

وہ میری چھٹیوں کے دن تھے۔ میں نے پندرہ دن پہلے وینس لائن سے سائن آف کیا تھا کیونکہ وہ لوگ چاہتے تھے کہ میں کبھی چھٹی نہ کروں اور ہر وقت جہاز ہی پر رہوں۔ ظاہر ہے یہ میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

میرا اپنا گھر تھا، اپنا ملک تھا، بیوی تھی۔ میں اپنے آپ کو صرف جہاز کے حوالے تو نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن ابھی پندرہ دن ہی گزرے تھے کہ شپنگ ایجنٹ کا فون آ گیا۔ "ہمایوں صاحب آپ کو مرکری والے اپنے جہاز کا کپتان مقرر کر رہے ہیں۔"

"بھائی میں اپنی چھٹی انجوائے کر رہا ہوں۔"

"بہت اچھی آفر ہے۔ آپ کی سیلری بھی وینس لائن سے دگنی ہوگی۔" اس نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ میں سوچ کر بتاؤں گا۔"

میں نے ارم سے مشورہ کیا۔ اس نے بہت عقل مندی کی بات کی۔ "دیکھیں ہمایوں۔ یہ درست ہے کہ آپ کا اپنی بیوی

اور بچوں کے ساتھ رہنا بہت ضروری ہے لیکن دوسری طرف پیسے کی بھی اہمیت ہے۔ ہم آج تک کرائے کے مکان میں رہ رہے ہیں۔ سائرہ کا پورا مستقبل ہمارے سامنے ہے۔ ہمیں اس کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ میرا تو مشورہ ہے کہ آپ دو چار سال لگا دیں۔ اس کے بعد جہاز کا جھنجٹ چھوڑ کر اپنے ہی ملک میں کوئی بزنس شروع کر دیجیے گا۔"

اس وقت سائرہ مچل گئی۔ "نہیں بابا ابھی تو میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔"

بہت مشکلوں سے ہم دونوں میاں بیوی اس کو سمجھانے میں کامیاب ہوئے۔ اسی دن میں نے اپنے ایجنٹ کو فون کر کے کہا کہ وہ مجھے اس جہاز کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کر دے۔

ایک تجربہ کار کپتان آنکھیں بند کر کے کسی جہاز کو جوائن نہیں کرتا بلکہ وہ اس کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرتا ہے۔

ایجنٹ نے مجھے ساری معلومات فراہم کر دی تھیں جو ہر لحاظ سے تسلی بخش تھیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ جہاز اس وقت ایتھنز کی بندرگاہ پر ہے۔

اس کے مالک نے تمام عملے کو فارغ کر دیا تھا۔ اسی لیے کریو کی ذمے داری بھی میری ہوگی اور مجھے ایتھنز سے ہی کریو بھی بھرتی کرنا ہوگا۔

مجھے ایتھنز تک کا ٹکٹ بھیج دیا گیا۔

Digests of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کہانی کو آگے بڑھانے سے پہلے میں سمندری راستوں کے بارے میں تھوڑی بہت آگاہی دینا چاہتا ہوں...

سمندر کے کئی روٹس بہت زیادہ معروف سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے فارایسٹ (معروف ترین) چین اور جاپان کے ساتھ جو سویز کینال اور ملاکا تک سفر ہے۔ دوسرا نارتھ اٹلانٹک روٹ جو مغربی یورپ کو امریکا اور کینیڈا سے ملاتا ہے۔ اسی طرح مڈل ایسٹ کا روٹ ہے اور...... انڈیا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، سینٹرل اور ساؤتھ امریکا اس کے علاوہ ایسٹ اور ویسٹ افریقہ بھی بہت معروف خیال کیے جاتے ہیں۔

وہ دن بھی آ گیا جب مجھے ایتھنز کے لیے روانہ ہونا تھا۔ نہ جانے کیوں اس بار ارم اور سائرہ دونوں ہی بہت اُداس اور پریشان ہو رہی تھیں حالانکہ سفر تو میری زندگی کا حصہ بن کر رہ گیا تھا۔

مجھے جس جہاز کو جوائن کرنا تھا، اس کا نام ازدستیا تھا۔ یونانی فلیگ تھا اس کا۔ اس کا مالک ایک بھاری بھرکم لیکن بے تکلف اور خوش دل قسم کا آدمی تھا۔ اس کا نام گریکو تھا۔

ائرپورٹ پر کمپنی کا ایک آدمی مجھے ریسیو کرنے کے لیے کھڑا تھا۔ میں نے جب اپنا تعارف کروایا تو اس نے بہت گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بتایا۔ ”میرا نام مارلو ہے۔ باپ دادا اٹلی سے انگلینڈ چلے گئے تھے اسی لیے میں بہت اچھی انگریزی بول لیتا ہوں اور کمپنی کا مالک گریکو بھی انگریزی داں ہے۔“

”چلو یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے اطمینان کا اظہار کیا۔ ”ورنہ عام طور پر اس طرف کے لوگ انگریزی نہیں جانتے۔“

”اور ہاں۔ ایک اور بات سن لو کہ باس کو لطیفے سننے سنانے کا بہت شوق ہے۔ تمہیں اس کے ہر بے تکے لطیفے پر قہقہے لگانے ہیں۔“

”دوست اس کی تو فکر ہی مت کرو۔ میں ہنس ہنس کر بے حال ہو جاؤں گا۔“

”گڈ... پھر تو وہ تمہارا بہت اچھا دوست بن جائے گا۔“

”یہ بتاؤ اس وقت کہاں جانا ہے۔ باس کے پاس؟“

”نہیں، تم کمپنی کے ریسٹ ہاؤس میں آرام کرو گے۔ صبح باس کے پاس بھیج دیا جائے گا۔“

ہم ریسٹ ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایتھنز میرا دیکھا بھالا شہر تھا، پہلے بھی کئی بار یہاں آ چکا تھا۔

بہر حال میں نے وہ رات ریسٹ ہاؤس میں گزاری اور دوسری صبح مسٹر گریکو سے ملاقات ہوئی۔ وہ واقعی ایک خوش اخلاق اور دلچسپ انسان تھا۔ ذرا سی دیر میں اس نے کئی لطیفے سنا دیے تھے۔

”مسٹر ہمایوں، اب سارا جہاز تمہارے حوالے ہے۔ تم اپنے کریو کا انتخاب بھی خود ہی کرو گے۔“

یہ ایک مشکل مرحلہ ہوا کرتا ہے۔ جہاز پر کئی طرح کے شعبے ہوتے ہیں۔ ان کی مہارت اور تجربے کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ وہ کس مزاج کے ہیں۔ لڑائی جھگڑے والے تو نہیں ہیں۔ شراب پی کر مدہوش تو نہیں ہوا کرتے۔

ان لوگوں میں جہاز کے کپتان سے خلاصی اور خاکروب تک بہت سے پیشوں کے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ یہ سمجھ لیں کہ بحری جہاز اچھا خاصا محلہ ہوا کرتا ہے۔

میں نے اسی شام سے کریو کی بھرتی شروع کر دی۔ نائب کپتان کے طور پر ایک یونانی ہی سامنے آیا تھا۔ دو انجینئرز برطانوی مل گئے۔ ڈیک آفیسرز دونوں پاکستانی تھے۔ اس کے علاوہ موزمبیق، انڈونیشیا، ملاباری بھی بھرتی کا حصہ ہو گئے...

غرضیکہ رات گئے تک بھرتیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس جہاز کو تیسرے دن اپنے سفر پر روانہ ہو جانا تھا۔

جہاز کی روانگی سے پہلے بہت کام ہوتے ہیں۔ ہزاروں طرح کی چیزیں اسٹور کر لی جاتی ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں۔ دوائیں۔ میڈیکل بکس، کپڑے، صابن، ٹوتھ برش، پانی اور نہ جانے کیا کیا...

اس کے علاوہ جہاز کے حفاظتی انتظامات کا بھی جائزہ لینا ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ کپتان ہر بات کا ذمے دار ہوتا ہے۔

سامان کی خریداری کے بعد کنٹینرز لوڈ کرنے کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ جہاز گندم اور تیل لے کر جا رہا تھا۔ ان کی ترسیل کے لیے چوبیس چوبیس فٹ کے کنٹینرز استعمال کیے جا رہے تھے۔

سارا کام بخیر و خوبی نمٹا لیا گیا تھا۔

جہاز روانہ ہونے والا تھا۔ ہر شخص نے اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی تھی کہ ایک حادثہ ہو گیا۔

☆☆☆

بحری پولیس کی دو بوٹ جہاز کے دونوں پہلوؤں سے آ گئیں۔ انہوں نے اشارہ کیا۔ ان کے لیے سیڑھیاں لگا دی گئیں۔

دس بارہ پولیس والے جہاز پر آ گئے۔ وہ سیدھے میرے پاس آئے۔ ”سوری مسٹر! تمہیں اور تمہارے دو ساتھیوں کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔“

”وہ کیوں؟“

”ہم اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیونکہ تم مسلمان ہو اور تمہارا پاسپورٹ بھی پاکستانی ہے۔“

میرا دل چاہا کہ میں اس پر حملہ کر دوں۔ کم بخت نے کتنے اطمینان کے ساتھ اتنی بڑی بات کہہ دی تھی لیکن اس وقت سوائے بے بس ہو کر خاموش رہنے کے میں کیا کر سکتا تھا۔

نہ جانے کیوں پوری دنیا میں اس طرح کی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے پوری دنیا نے ہمارے خلاف محاذ بنا لیا ہے۔

”دیکھو آفیسر!“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اس وقت میں اپنا جہاز چھوڑ کر تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا اور نہ ہی میرا کوئی آدمی تمہارے ساتھ جائے گا اسی لیے جو اطمینان کرنا ہے یہیں کر لو۔“

میری اس دو ٹوک بات نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اپنے کاغذات دکھا دیے، اسے اندازہ ہو گیا کہ میں نے اپنی زندگی کتنی بڑی بڑی کمپنیز کے ساتھ کام کرتے ہوئے گزاری ہے اور میرا تجربہ کتنا وسیع ہے۔

”او کے۔“ اس نے کاغذات واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری ڈیوٹی تھی۔“

”کوئی بات نہیں۔“

پولیس والے واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد دونوں ڈیک آفیسر میرے پاس آ گئے، دونوں بہت خوفزدہ ہو رہے تھے۔ ”سر یہ کیا ہو رہا ہے۔ احتشام نے کہا۔ ”ہمیں تو ڈر لگ رہا تھا۔“

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 350/-
اندھیری رات کے مسافر 325/-
ثقافت کی تلاش 150/-
قیصر و کسریٰ 380/-
اور تلوار ٹوٹ گئی 350/-
گمشدہ قافلے 350/-
داستان مجاہد 200/-
پردیسی درخت 325/-
یوسف بن تاشفین 325/-
معظم علی 325/-
خاک اور خون 350/-
کلیسا اور آگ 300/-
قافلہ حجاز 350/-
محمد بن قاسم 300/-
پورس کے ہاتھی 180/-
انسان اور دیوتا 280/-
پاکستان سے دیارِ حرم تک 160/-
آخری چٹان 325/-
سو سال بعد 150/-
سفید جزیرہ 225/-
شاہین 325/-

Buy online:
www.anarkalimall.com
www.j5dpress.com

جہانگیر بک ڈپو
061-4781781 022-2780128
051-35539609 021-2765086
042-37220879 041-2627568

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کوئی بات نہیں۔" میں نے انہیں تسلی دی۔ "بس فرض شناسی کے ساتھ اپنی ڈیوٹیز انجام دیتے رہو۔ آج کل پوری دنیا میں اسی قسم کی اتھل پتھل مچی ہوئی ہے۔"

"دنیا بہت غیر محفوظ جگہ ہو گئی ہے سر۔" عزیز خان نے کہا۔

"یہ بات تو ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ محتاط رہو۔" ہمارے لنگر اٹھانے کا وقت آ گیا تھا۔

میں نے واچ کیپر کو رفتار وغیرہ کا حساب کتاب رکھنے کے لیے ہدایت کر دیں اور کنٹرول روم میں آ گیا۔ کیبن بوائے نے مجھے کافی لا کر دے دی۔

جہاز کی دنیا بھی کتنی مختلف ہوا کرتی ہے۔ یہ ایک یو این او سی ہوا کرتا ہے ہر قومیت، ہر نسل اور زبان کے لوگ جہاز کے عملے میں شامل ہوتے ہیں۔

ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کے ساتھ رہتے ہیں اور کبھی کبھی جھگڑے فساد بھی ہو جاتے ہیں۔ ان پر کنٹرول کرنا ایک ہوشیار کپتان کا کام ہوا کرتا ہے۔

جہاز کا سفر پُرسکون ہی تھا۔ موسم کی رپورٹ بھی اچھی تھی۔ آلات بھی ٹھیک ٹھیک کام کر رہے تھے یعنی بظاہر تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔

ہماری رفتار بیس ناٹ تھی۔ ایک نوٹیکل میل ایک اعشاریہ آٹھ پانچ دو صفر کلومیٹر ہوا کرتا ہے... اس جہاز کے عملے میں مجھ سمیت دو چار مسلمان بھی تھے اور کک بھی بنگلہ دیشی مسلمان تھا اسی لیے ہمارے لیے کھانا حلال ہی بنایا گیا۔

رات ہو گئی۔

سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ میں آرام کرنے کے لیے اپنے کیبن میں چلا گیا۔ ابھی میں لاگ بک بھر ہی رہا تھا کہ نائب کپتان آندرے میرے پاس آ گیا۔ وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ "سر۔ اس اندھیرے میں ایک جہاز بہت تیزی سے ہمارے جہاز کی طرف آ رہا ہے۔"

میں آندرے کے ساتھ کنٹرول روم میں آ گیا۔ دوربین نے بتایا کہ واقعی ایک جہاز ہماری طرف آ رہا ہے۔ میں نے سائرن بجانے کا آرڈر دیا۔ یہ سائرن اس لیے بجایا جاتا ہے کہ دونوں جہاز ایک دوسرے کے وجود سے آگاہ ہو جائیں اور ان کے درمیان کوئی تصادم نہ ہو سکے۔

سائرن کے جواب دوسری طرف سے بھی سائرن بجایا گیا پھر وہ جہاز آہستہ آہستہ دور ہوتا چلا گیا۔ اس نے شاید اپنا راستہ بدل لیا تھا۔

اس رات اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ سب خیریت سے گزر گیا۔

دوسری صبح موسم بہت خوب صورت تھا۔

ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایسے موسم میں میری بیٹی سائرہ بہت انجوائے کرتی تھی۔ ہم تینوں سیر کے لیے کسی پارک یا سمندر کی طرف نکل جاتے اور جب بارش ہوتی تو بارش میں نہایا کرتے۔

اس وقت بھی مجھے وہ دونوں یاد آ رہی تھیں۔ میں نے انہیں خیریت کا پیغام بھیج دیا۔ آج کل یہ بہت عام سی سہولت ہو گئی ہے۔

میں ڈیک پر کھڑا سمندر اور موسم سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ عزیز خان میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بے انتہا خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ "سر ایک بہت بڑا حادثہ ہو گیا ہے۔" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں بتایا۔

"کیسا حادثہ؟"

"سر قتل ہو گیا ہے۔" اس نے بتایا۔

"قتل!" میں کانپ کر رہ گیا۔ "کیا بکواس کر رہے ہو۔ کس کا قتل ہوا ہے؟"

"فرسٹ انجینئر کا۔ اس کی لاش اس کے کیبن میں پڑی ہوئی ہے۔"

☆☆☆

یہ بہت خطرناک بات تھی۔

سمندر کے سینے پر چلتے ہوئے جہاز میں کسی کا قتل وہ بھی فرسٹ انجینئر کا جو ایک برطانوی باشندہ تھا اور میں اس جہاز کا کپتان تھا یعنی ساری ذمے داری میری تھی۔

میرے خدا، ہم تو ویسے ہی بدنام ہو رہے تھے۔ اب یہ ایک نئی افتاد سر پر آ گئی۔

انجینئر کی لاش کیبن بوائے نے دریافت کی تھی۔ وہ اس کے لیے کافی لے کر گیا تھا۔ اس نے کیبن کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا پایا۔ دو چار بار دستک دینے کے بعد بھی جب اندر سے کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے دروازہ کھول دیا۔

انجینئر کی لاش فرش پر پڑی ہوئی تھی۔

اس نے سب سے پہلے عزیز خان کو خبر دی اور عزیز خان نے مجھے آ کر بتایا۔ انجینئر کو چاقو کے وار سے قتل کیا گیا تھا۔ چاقو

کا دستہ ابھی تک اس کے سینے میں پیوست تھا۔ اس کے جسم سے خون نکل کر ہر طرف جم چکا تھا۔

ذرا سی دیر میں ہر ایک کو یہ بات پتا چل گئی۔

سب لوگ کیبن کے سامنے جمع ہو گئے۔ کون مار سکتا تھا اس کو؟ کیوں مارا گیا۔ اس قسم کے بے شمار سوالات تھے۔

میں نے سب سے پہلے کمپنی کے مالک کو وائرلیس پر خبر کر دی، بے چارہ گرگو اس خبر کو سن کر بوکھلا گیا۔ "مسٹر ہمایوں، یہ بہت برا ہوا ہماری کمپنی بدنام ہو جائے گی۔"

"یس سر اب آپ بتائیں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا میں قریبی پورٹ پر اطلاع کر دوں۔"

"مسٹر ہمایوں تم جانتے ہو کہ یہ کتنا بڑا رسک ہے۔" جہاز کو پورٹ پر لے جانا ہوگا یا کھلے سمندر میں روک دینا ہوگا وہاں کی پولیس آئے گی۔ تفتیش شروع ہوگی۔ اس میں نہ جانے کتنے دن نکل جائیں اور اگر وقت پر کارگو نہیں پہنچا تو ہمیں نقصان بھرنا ہوگا، ہم تباہ ہو جائیں گے۔"

"یس سر! یہ سارے امکانات تو ہیں۔ پھر آپ بتائیں کیا کروں؟"

"مسٹر ہمایوں تم ایک ہوشیار آدمی ہو۔" گرگو نے کہا۔

"تم کرو کو ساری صورت حال سمجھا دو۔ میں مرنے والے کے گھر والوں سے بات کرتا ہوں کہ تمہارا آدمی ایک حادثے کا شکار ہو کر مر چکا ہے اور ہم نے سمندر ہی میں اس کی آخری رسومات ادا کر کے لاش سمندر کے حوالے کر دی ہے، سمجھ گئے۔"

"یس سر، سمجھ گیا۔"

"میں اس کے گھر والوں کو کچھ رقم بھجوا دیتا ہوں اور تم قاتل کا پتا چلاؤ اور جب وہ مل جائے تو اسے پکڑ لینا اور جب جہاز لنگر انداز ہو تو اسے پولیس کے حوالے کر دینا۔"

"لیکن سر میں قاتل کا پتا کیسے چلاؤں؟"

"یہ تمہاری محنت اور ذہانت ہے۔ قاتل جہاز ہی میں ہو گا وہ باہر تو نہیں جا سکتا۔"

"ٹھیک ہے سر۔ میں کوشش کرتا ہوں۔"

سارا کریو مرنے والے کے کیبن کے سامنے جمع تھا۔

میں نے ان سب سے مخاطب ہو کر وہ باتیں دہرا دیں جو جہاز کے مالک نے کہی تھیں پھر کہا۔ "یہ کوئی اچھا شگون نہیں ہے کہ ہمارے جہاز پر اس قسم کا حادثہ ہو گیا ہے۔ میں کوئی سراغ رساں نہیں ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ قاتل ہم ہی میں سے ایک ہے اور وہ کون ہے ظاہر ہے کہ وہ خود سے تو یہ نہیں بتائے گا اسی لیے ہمیں اس کا سراغ لگانا ہوگا۔"

"یس سر لیکن ہم یہ سراغ کیسے لگا سکتے ہیں؟" کسی نے پوچھا۔

"بس ایک دوسرے پر نظر رکھنی ہوگی لیکن اس سے پہلے ہمیں اس کی آخری رسومات ادا کرنی ہیں کیونکہ سمندر کے قانون کے مطابق یہی ہوا کرتا ہے۔"

"لیکن سر میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔" پاکستانی ڈیک آفیسر احتشام نے کہا۔ "کیونکہ اس طرح ہم سب پھنس جائیں گے۔ ہم سب مجرم سمجھے جائیں گے کیونکہ ہم نے لاش سمندر کے حوالے کر کے سارے ثبوت مٹا دیے ہیں۔ قدرتی موت کی بات اور ہوتی ہے، یہ ایک الگ معاملہ ہے۔"

ہم سب خاموش ہو گئے۔

اس نے ایک معقول بات کی تھی۔ ہم واقعی پھنس جاتے۔ خاص طور پر ہم تینوں یعنی میں، عزیز خان اور احتشام ہم پر ویسے ہی پوری دنیا کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں۔

سبھی احتشام سے متفق تھے لیکن سوال یہ تھا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ میں نے پھر اپنے طور پر فیصلہ کر لیا کہ اگر ہم نے لاش کو سمندر برد نہیں کیا تو وہ کیبن میں سڑ جائے گی اسی لیے اسے برف خانے میں رکھوا دیا جائے۔ جہاں اس کے محفوظ رہنے

اہم انتباہ

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شایع کیے جاتے ہیں۔ مشتہرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضایع کر دی جاتی ہے، قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہِ راست مشتہرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں ہوگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے امکانات ہوسکتے تھے۔
اس انجینئر کی لاش کو سمندر میں پھینکنے کے بجائے برف خانے میں رکھ دیا گیا اور اس کے کیبن کو سیل کر دیا گیا۔ اس وقت ہم اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔
جہاز سمندر کے سینے پر اپنا سفر طے کرتا رہا۔
سب کچھ ٹھیک تھا۔ موسم بھی خوشگوار تھا۔ جہاز یقیناً اپنے مقررہ وقت پر اپنی منزل پر پہنچ جاتا۔
صرف ایک حادثے کے اور کچھ بھی نہیں ہوا تھا لیکن یہ اکلوتا حادثہ بھی بہت تھا۔
اس رات میں جلدی اپنے کیبن میں چلا گیا کیونکہ اگے تک عمل کرنے کے علاوہ اس واقعے کے ممکنہ پہلوؤں کا جائزہ بھی لینا تھا۔
یہ بات طے تھی کہ مرنے والے سے کسی کی دشمنی جہاز پر پروان نہیں چڑھی ہوگی کیونکہ ہمیں سفر شروع کیے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی تھی۔
دشمنی خشکی پر ہوئی ہوگی پھر قاتل نے موقع پا کر اس کا خون کر دیا یا پھر یہ ہوسکتا ہے کہ مرنے والے کے پاس کوئی ایسی قیمتی چیز ہو کہ جس کی وجہ سے وہ مارا گیا ہو اور قاتل نے اپنا کام کر لینے کے بعد وہ چیز حاصل کر لی ہو لیکن وہ چیز کیا ہوسکتی تھی؟
اچانک کیبن کے باہر زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان آوازوں میں کسی عورت کی آواز بھی شامل تھی جو زور زور سے چیخ رہی تھی اور رو رہی تھی جبکہ ہمارے جہاز میں کوئی عورت نہیں تھی۔
میں جلدی سے کیبن سے باہر آ گیا۔
جہاز کے بنگالی کک نے ایک عورت کا ہاتھ تھام رکھا تھا دوسرے لوگ حیرت اور دلچسپی سے اس عورت کو دیکھ رہے تھے وہ ایک خوب صورت عورت تھی۔ شاید بائیس اور پچیس کے درمیان... اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ منان سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔
''کیا بات ہے منان، کون ہے یہ؟'' میں نے منان سے پوچھا۔
''سر۔ یہ پتا نہیں کون ہے؟'' منان نے بتایا۔ ''یہ کچن اسٹور میں چھپی ہوئی تھی۔''
''کون ہو تم؟'' میں نے عورت کے قریب آ کر پوچھا۔ ''اس جہاز میں کہاں سے آ گئیں؟''
''میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔'' اس عورت نے صاف انگریزی میں کہا۔

''بے وقوف عورت، تم نہیں جانتیں تم کتنا بڑا جرم کر رہی ہو۔'' میں غصے سے بولا۔ ''اس طرح غیر قانونی طور پر جہاز میں چھپ کر تم کہاں جا رہی تھیں؟''
''میں نے کہا نا کہ میں نہیں بتاؤں گی۔''
میں نے جہاز کے عملے کی طرف دیکھا۔ ''دیکھو اس جہاز میں اس عورت کا ہونا جہاز کے لیے بدنامی کا سبب بن جائے گا۔ اسی لیے یہ سمجھا جائے کہ اس جہاز پر کوئی عورت نہیں تھی۔''
''کیا مطلب؟'' پیٹر نے پوچھا۔
''پیڈرو اسے اٹھا کر سمندر میں پھینک دو۔'' میں نے بوائلر سے کہا۔ ''وہ ایک طاقت ور انسان تھا۔''
''اوکے سر۔'' پیڈرو نے جھپٹ کر اس عورت کو گود میں اٹھا لیا۔
وہ عورت مچل رہی تھی، چیخ رہی تھی، گالیاں دے رہی تھی لیکن پیڈرو نے اسے دبوچ رکھا تھا۔
جہاز کے عرشے کے پاس پہنچتے ہی اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ ''چھوڑ دو مجھے۔ میں سب بتا دیتی ہوں۔''
پیڈرو نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ فرش پر بیٹھ کر رونے لگی۔
ہم سب اس کے پاس پہنچ گئے۔
''ہاں اب بتاؤ کون ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔
''لزی نام ہے میرا۔'' اس نے بتایا۔ ''اٹریک آ کر پھنس گئی تھی۔ برطانیہ جانے کے پیسے نہیں تھے پھر میں اس جہاز میں داخل ہو کر چھپ گئی کیونکہ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ جہاز انگلینڈ جا رہا ہے۔''
''لیکن تم اندر داخل ہونے میں کیسے کامیاب ہو گئیں؟''
''بندرگاہ کا ایک لوڈر مجھے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اس بے چارے نے مجھ سے ہمدردی کی تھی۔''
''اس کے بعد کیا ہوا؟''
''اس کے بعد جہاز کے ایک آدمی نے مجھے دیکھ لیا۔ میں نہ جانے کس طرح اس کی نگاہوں میں آ گئی۔ اور اس نے مجھے بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔''
''وہ کیوں؟''
''کسی عورت کو کوئی مرد کیوں بلیک میل کرتا ہے۔''
میرے ذہن میں اچانک ایک خیال آ گیا۔ ''سمجھ گیا اور تم نے اس کا قتل کر دیا۔''
''ہاں میں نے مار دیا اس کو۔'' اس نے بتایا۔
ایک لمحے کے لیے خاموشی طاری ہو گئی انجینئر کا قاتل سامنے آ گیا تھا۔ ''لیکن کیوں تم نے اس کا قتل کیوں کیا؟'' میں

نے پوچھا۔
''اس لیے'' اس نے اپنی شرٹ پیچھے سے اٹھا دی۔ اس کی کمر پر دانتوں کے نشانات تھے۔ پھر اس نے اپنے دونوں شانے دکھائے۔ وہاں بھی زخم تھے۔ ''دیکھ لیا۔ میں نے اس لیے مارا ہے اس کو وہ ایک پاگل آدمی تھا۔ وہ کسی کتے کی طرح مجھے بھنبھوڑا کرتا تھا اسی لیے میں نے مجبور ہو کر اس کا خون کر دیا۔''
معاملہ حل ہو چکا تھا۔ قاتل بھی سامنے تھا اور قتل کی وجہ بھی سامنے آ گئی تھی۔
اب سوال یہ تھا کہ اس عورت کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے پھر یہی طے پایا کہ اسے قید کر لیتے ہیں اور بندرگاہ پہنچ کر پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔
مرنے والے انجینئر کا دوست جو خود بھی اسی جہاز میں تھا اسے یہ تجویز پسند نہیں آ رہی تھی، وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ اس عورت کو سمندر میں پھینک دیا جائے۔ بڑی مشکل سے ہم نے اسے خاموش کرایا تھا۔
اس دوران اس عورت کا رویہ حیرت زدہ کرتا رہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کا ان معاملات سے کوئی تعلق ہی نہ ہو یا ہم کسی اور کے بارے میں باتیں کر رہے ہوں۔ اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ بندرگاہ پہنچ کر اسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔
لیکن جب اسے قید میں رکھنے کی بات کی گئی تو اس وقت اس نے مجھ سے کہا۔ ''دیکھو کپتان! مجھے قیدی رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ میں تو ویسے ہی ایک چلتے ہوئے جہاز میں ہوں خود سوچو میں بھاگ کر کہاں جا سکتی ہوں۔ چاروں طرف سمندر ہی سمندر ہے۔ اس کے برعکس میں تمہارے بہت کام آ سکتی ہوں۔''
''کیا کام آ سکتی ہو؟''
''میں بہت اچھی کک ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے کوکنگ کے کورسز کر رکھے ہیں۔ تم لوگوں کے لیے مزیدار کھانے بنا سکتی ہوں۔ کچن میں ہاتھ بٹا سکتی ہوں۔''
ایک بار پھر مشورے کے بعد اسے اجازت دے دی گئی کیونکہ یہ درست تھا کہ وہ بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتی تھی۔
اس کے بعد جہاز میں کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ دو دن گزر گئے۔ اس دوران اس عورت نے واقعی بہت اچھے اچھے کھانے بنا کر کھلائے۔ وہ اپنے فن کی استاد معلوم ہوتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ہنر بھی تھا۔

ایک شام میں ڈیک پر تھا کہ وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی وہ شاید نہا کر آئی تھی اسی لیے بھیگی بھیگی سی دکھائی دے رہی تھی اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ وہ اچھی خاصی خوب صورت تھی۔
''کپتان!'' اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتی ہوں۔''
''کیوں نہیں، پوچھو۔''
''کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟''
''کیوں، تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''بس یونہی پوچھنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔''
''ہاں، میری شادی ہو چکی ہے اور میں ایک بیٹی کا باپ بھی ہوں۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''وہ اس وقت گیارہ برس کی ہو چکی ہے۔''
''چلو یہ تو اچھی بات ہے۔'' وہ مسکرا دی۔ ''ویسے میں نے سنا ہے کہ تمہارے یہاں شادیوں پر کوئی پابندی نہیں ہوں۔ تم ایک ساتھ چار بھی کر سکتے ہو۔''
''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔
''ناراض کیوں ہوتے ہو۔ یونہی ایک بات کہہ دی۔'' اس نے کہا اور مسکراتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔ وہ دن بھی گزر گیا۔ دوسری صبح وہ پھر میرے پاس آ گئی۔ ''کپتان مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' اور اس سے پہلے کہ میں اس سے پوچھ سکتا کہ وہ مجھ سے کیا کہنے والی ہے، نائب کپتان تیزی سے میرے پاس آ گیا۔
''سر سمندر میں ایک طوفان پیدا ہو گیا ہے۔''
☆☆☆
سمندری طوفان یونہی پیدا نہیں ہوا کرتے۔
ہوا کے دباؤ اور موسم وغیرہ کی ہر لمحے مانیٹرنگ ہوتی ہے۔ اسکرین پر نقشے ہوتے ہیں جس سے یہ پتا چلتا ہے کہ سمندری طوفان کن راستوں پر بیدار ہو رہا ہے اور وہ کہاں کہاں آنے والا ہے۔ اس کی رفتار کیا ہے؟
ایسے موقعوں پر کئی قسم کے اقدامات کیے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے ہر حرکت کرنے والی چیز کو مضبوطی سے باندھ دیا جاتا ہے کہ کوئی شخص زخمی نہ ہو جائے اور دوسرے مرحلے میں سارے دروازوں کو سیل کر دیتے ہیں تاکہ پانی اندر نہ آئے۔ اس کے بعد حکمت عملی طے ہوتی ہے کہ اس طوفان سے نمٹنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ طوفان کی شدت کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جہاز کے پہلوؤں پر نہ لیا جائے۔ اس سے جہاز کے الٹ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ دوسرا حل یہ ہوتا ہے کہ طوفان کے راستے سے کترا کر نکل جایا جائے۔

تیسرا یہ ہوتا ہے کہ جہاز کا رخ بدل کر اس کا اگلا حصہ طوفان کے سامنے کر دیا جائے یا پھر اس کے برابر سے گزرتے ہوئے اپنی رفتار اتنی تیز کر دی جائے کہ جہاز اس خطرے سے نکل جائے۔

عام طور پر چھوٹے موٹے طوفانوں کی پروا نہیں کی جاتی کیونکہ اس قسم کے طوفان آتے رہتے ہیں لیکن اس بار جو طوفان پیدا ہوا تھا، اس کی شدت دس تھی۔

دس انتہائی خطرناک شدت ہوتی ہے۔ آس پاس کے تمام ساحلوں میں ریڈ الرٹ ہو جاتا ہے، جہازوں کو روک لیا جاتا ہے۔

ہم سب بڑھتے ہوئے طوفان کو دیکھ رہے تھے جو اگرچہ ابھی بہت فاصلے پر تھا لیکن اس کی رفتار بہت تیز تھی اور ہر لمحے رفتار میں اضافہ بھی ہوتا جا رہا تھا۔

اب میرا دھیان کسی طرف بھی نہیں تھا۔ مجھے اپنے جہاز کو طوفان سے بچانا تھا۔ اپنے عملے کی حفاظت کرنی تھی۔ نئی طرح کی تدبیریں ذہن میں آ رہی تھیں۔ طوفان اپنی رفتار سے بڑھتا جا رہا تھا اور خیال تھا کہ اگر اس کی یہی رفتار برقرار رہی تو صرف دو گھنٹوں کے بعد ہمارے سر پر ہوگا۔

آج کل جدید ٹیکنالوجی نے جہاز رانوں کے لیے بھی آسانیاں پیدا کر دی ہیں پہلے جہاز رانوں کو طوفانوں کا پتا اس وقت چلتا تھا جب وہ ان کے سروں پر آ جاتا۔ لیکن آج کل پہلے سے اندازہ کر لیا جاتا ہے اور ایک ایک منٹ کا حساب حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ہمیں معلوم تھا کہ ہمارے پاس صرف دو گھنٹے ہیں۔

میں نے جہاز کے رخ کو موڑنے کا آرڈر دے دیا۔ طوفان کی شدت چونکہ بہت زیادہ تھی اس لیے ہمارا جہاز سامنے کے رخ سے بھی اسے فیس نہیں کر سکتا تھا، بہتر یہی تھا کہ رخ ہی تبدیل کر دیا جائے۔

میری ہدایت پر جہاز کے رخ کو تبدیل کر دیا گیا۔ اس دوران وہ عورت لزی میرے پاس کھڑی ہو کر دلچسپی سے میری کارروائیاں دیکھ رہی تھی۔ میں نے بھی اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

بالآخر یہ حکمت عملی کام آ گئی اور طوفان ہم سے کچھ فاصلے سے گزرتا چلا گیا۔ اس کے بعد دوسرا کام شن دیا گیا کہ جہاز کو اس کے مقررہ راستے پر واپس لایا جائے۔

سب کچھ ایک بار پھر معمول پر آ گیا۔ سب نے بچ نکلنے پر ایک دوسرے کو مبارک باد دیں۔ اسی وقت میرے موبائل سیٹ پر بیوی اور سائرہ کا فون بھی آ گیا۔ انہیں بھی طوفان کی آمد کا پتا چل گیا تھا آج کل میڈیا اسی طرح تیز رفتار ہو گیا ہے۔

”بابا آپ تو خیریت سے ہیں نا۔“ سائرہ نے پوچھا۔

”ہاں بیٹا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”بس تم لوگ احتیاط کرو کیونکہ طوفان کا رخ بدل کر اس طرف جا سکتا ہے۔“

”کوئی بات نہیں بابا۔ جب آپ خیریت سے ہیں تو پھر سب ٹھیک ہی ہوگا۔“

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کتنا پیار کرنے والی بیٹی تھی کتنا اعتماد تھا اس کو اپنی محبت پر۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد میں نے موبائل آف کر دیا۔

اس دوران لزی میرے پاس ہی کھڑی رہی۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اب تم میرے سر پر کیوں کھڑی ہو؟“

”کپتان مجھے تمہاری تعریف کرنی ہے۔“ اس نے کہا۔

”وہ کیوں؟“

”تم ایک باحوصلہ اور بہت جلدی فیصلہ کرنے والے انسان ہو اور انسان کی کامیابی اسی میں پوشیدہ ہے۔“

”شکریہ۔“

”ایک بات بتاؤ۔ کیا تم ساحل پر مجھے واقعی پولیس کے حوالے کر دو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”تو اور کیا کرنا چاہیے۔ تم نے ایک آدمی کا خون کیا ہے۔ جہاز میں خفیہ طور پر آ کر چھپ گئی ہو۔ کتنے ہی جرم کیے ہیں تم نے۔ تمہیں چھوڑ تو نہیں سکتے۔“

”یہ جاننے کے باوجود کہ وہ میرے ساتھ وحشیانہ رویہ رکھتا تھا۔“

”ہاں۔ یہ جاننے کے باوجود کیونکہ میں عدالت نہیں ہوں۔ اسی لیے تمہارا انصاف میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔“

”تمہاری مرضی۔“ اس کے خوب صورت چہرے پر اداسی چھا گئی۔

مجھے خود اس سے ایسا کہتے ہوئے دکھ ہو رہا تھا لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا کیونکہ اس کا جرم ہی ایسا تھا اور اچانک۔۔۔ اچانک ہی پتا چلا کہ اس طوفان نے ایک بار پھر اپنا رخ بدل لیا ہے۔ اس کی رفتار بھی بہت تیز ہو گئی ہے اور وہ پوری قوت کے ساتھ ہمارے جہاز سے ٹکرانے والا ہے اور ہمارے پاس اتنا وقت بھی نہیں رہا کہ ہم اپنا بچاؤ کر سکیں۔

☆☆☆

ہم تنکوں کی طرح بہتے جا رہے تھے۔

اس طوفان نے ہمارے دیوہیکل ٹینکر کو کھلونے کی طرح توڑ مروڑ کر رکھ دیا تھا۔ ستم یہ تھا کہ ہم وقت کی کمی کی وجہ سے اس کا مقابلہ بھی نہیں کر سکے تھے۔ لہٰذا وہ جہاز سے آ کر ٹکرا گیا اور اس نے جہاز کو ایک طرح سے اچھال کر پھینک دیا تھا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے اپنی سمندری زندگی میں بھی اتنا شدید طوفان دیکھا ہو۔ جہاز الٹ گیا تھا۔ کئی کئی فٹ پانی ہمارے سروں کے اوپر آ گیا تھا۔

ہر طرف سے چیزوں کے ٹوٹنے کی آوازیں اس طرح آ رہی تھیں جیسے کسی دیوہیکل دیو نے غصے میں آ کر توڑ پھوڑ مچا دی ہو۔

انسانی چیخیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اب ہم اس جہاز کو کسی قیمت پر نہیں بچا سکتے تھے۔ لیکن اس وقت مجھے اتنا ہوش تھا کہ میں نے کسی طرح ایک لائف بوٹ سمندر میں اتروا دی۔ پھر میری ہدایت کے مطابق کریو نے اپنی جانیں بچانے کے لیے سمندر میں کودنا شروع کر دیا۔

اس وقت چونکہ سورج ڈوبا نہیں تھا اس لیے ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ مجھے ہوش نہیں تھا کہ کون کون اپنی جانیں بچا کر لائف بوٹ میں سوار ہونے میں کامیاب ہوا اور کس کس کو سمندر کی بے رحم موجوں نے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

ہماری کوشش تھی کہ جتنی جلد ہو اس لائف بوٹ کو ڈوبتے ہوئے جہاز سے دور لے جائیں ورنہ ہم اور بھی پریشانی میں مبتلا ہو جاتے۔

لائف بوٹ بری طرح ڈول رہی تھی۔ اس میں صرف سات یا آٹھ افراد کی گنجائش تھی لیکن اس وقت دس بارہ افراد اس پر سوار ہو چکے تھے۔ اس دوران میں سورج غروب ہو چکا تھا۔ کھلے سمندر میں سورج کے غروب ہوتے ہی رات اچانک اتر آتی ہے اور اندھیرا پوری شدت سے حملہ آور ہو جاتا ہے۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔ اندھیرا ہو گیا اور اس مہیب اندھیرے میں ہم اپنے جہاز کو ڈوبتے ہوئے دیکھ رہے تھے جو کسی دیوپیکر خاکے کی طرح آہستہ آہستہ نگاہوں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا۔

اور اسی وقت کسی نے توجہ دلائی۔ ”سر فقاً تیز کریں، جہاز سے تیل خارج ہو رہا ہے۔“

یہ انتہائی خطرناک اور جان لیوا صورت حال تھی۔ سمندر کے سینے پر تیل کا پھیلاؤ اور کسی بھی رگڑ سے صرف ایک چنگاری اس کے بعد ہر طرف آگ ہی آگ۔

یہ بہت۔۔۔ آگ ہوتی ہے۔ سیکڑوں میل دور سے اس کے شعلے دیکھے جاتے ہیں اور پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ یہ آگ پھیلتی چلی جاتی ہے۔

ہم اپنی بوٹ کو جلد سے جلد ڈوبتے ہوئے جہاز سے دور لے جانا چاہتے تھے۔ اتنی دور جہاں تک آگ کی رسائی نہ ہو سکے۔

ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس بوٹ پر کون کون آ گیا ہے۔ میرے قریب بنگالی عبدالمنان تھا۔ پھر میں نے لزی کو پہچان لیا۔ وہ بھی بوٹ تک آنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ بوائلر بھی تھا اور دونوں پاکستانی عزیز خان اور احتشام کے بارے میں معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

پھر اچانک عزیز خان کی آواز سنائی دی۔ ”سر۔ تیل نے آگ پکڑ لی ہے۔“

میرے خدا۔ میں اس موت کے منظر کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔ ایسا لگتا تھا جیسے جہنم کے شعلے ہماری طرف دوڑے چلے آ رہے ہوں۔ دور دور تک سمندر کے سینے پر تیل پھیلا ہوا تھا۔ اسی لیے آگ کسی عفریت کی طرح بوٹ کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ آگ اتنی تیز تھی کہ دور دور تک روشنی ہو گئی۔ میں نے اس روشنی میں بوٹ پر سوار ہونے والوں کو شناخت کر لیا تھا۔

ایک بوائلر تھا۔ دونوں پاکستانی۔ یعنی عزیز خان اور احتشام۔ پھر وہ عورت لزی۔ ایک میں۔ ایک بنگالی عبدالمنان۔ اس کے علاوہ یونانی انجینئر۔

میں نہیں جانتا کہ دوسروں کا کیا حشر ہوا۔ ظاہر ہے اگر وہ بے چارے جہاز سے گر کر سمندر میں ہاتھ پاؤں مار بھی رہے ہوں گے تو اس بھیانک آگ نے انہیں جلا دیا ہوگا۔

ہماری بوٹ بہت دور نکل آئی تھی۔ یعنی ہم اس بھیانک آگ کی لپیٹ سے باہر آ گئے تھے اور کھلے سمندر میں ایک ایسا وحشت ناک نظارہ دیکھ رہے تھے جو انسانی آنکھوں نے ذرا کم ہی دیکھا ہوگا۔

ہمارا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اب ہماری زندگی کی بھی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ خدا جانے ہمارے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

اچانک میرے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ بہت بڑی

Digest of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات تھی۔ اس افراتفری کے باوجود میرا موبائل سیٹ میری جیب میں رہ گیا تھا۔ یہ ہماری زندگی کے لیے بہت بڑی امید تھی۔

ہم اس کے ذریعے ریسکیو والوں کو اپنی خبر دے سکتے تھے۔ میں نے بے تابی سے موبائل اپنی جیب سے نکالا۔ اس پر میرے گھر کا نمبر چمک رہا تھا۔

سیلائٹ فون جدید ٹیکنالوجی کا شاہکار ہوا کرتے ہیں۔ ہم چاہے کہیں بھی ہوں۔ ان کے سگنلز ختم نہیں ہوتے۔ یقیناً سائرہ یا میری بیوی نے فون کیا ہوگا۔ شاید ان تک یہ خبر پہنچ چکی ہو کہ میرا جہاز طوفان میں پھنس گیا ہے۔ میں نے باتیں کرنے کے لیے بٹن دبایا اور ایک ٹوں کی آواز کے ساتھ موبائل بند ہوگیا۔

اس کی بیٹری ختم ہو چکی تھی اور بیرونی دنیا سے رابطے کا ہمارے پاس اب کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

☆☆☆

دوسرا دن

بے رحم اور وسیع سمندر کے سینے پر تیرتے ہوئے ہمارا دوسرا دن تھا۔ نہ جانے ہم کس طرف جا رہے تھے۔ ہمیں اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔

تھوڑا سکون ملنے کے بعد ہم نے بوٹ میں رکھی ہوئی چیزوں کا جائزہ لیا۔ پانی کی دو چار بوتلوں اور بسکٹوں کے پیکٹوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ جانے ہمیں کب تک سمندر میں رہنا تھا۔ اتنے آدمیوں کے لیے یہ چیزیں کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔

دوسرے معنوں میں ہم زندگی سے دور اور موت کے بہت قریب تھے۔ ہم مکمل طور پر قدرت کے رحم و کرم پر تھے۔ دوسرے دن کی دھوپ اتنی تیز تھی کہ ہمارے بدن چٹخنے لگے تھے۔ یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ چند گھنٹوں پہلے ہم بڑے طوفان میں گھرے ہوئے تھے۔

اچانک لزی نے رونا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی وہ اپنی قسمت کو گالیاں بھی دیتی جا رہی تھی۔ اس لمحے کو گالیاں دے رہی تھی جب وہ اپنے ملک سے یونان آئی تھی۔ جب اس کے پیسے ختم ہوئے اور اس نے جہاز میں چھپ کر سفر کا پروگرام بنایا اور جب اس کے ہاتھوں ایک آدمی کا قتل ہوا۔

غرضیکہ وہ ہر لمحے اور ہر چیز کو گالیاں دیے جا رہی تھی۔ اس کی مغلظات سن کر ہم سب برہم ہونے لگے۔ خاص طور پر بوائلر بہت ناراض ہو رہا تھا۔ "سر! اگر اجازت دو تو اس کم بخت کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دوں۔"

"نہیں، تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے۔" میں نے اسے ڈانٹا۔ "یہ اس وقت افسردہ ہے۔"

"تو ہمیں کیوں پریشان کر رہی ہے؟ اس سے کہیں چپ ہو جائے۔"

لزی تو وہیں خاموش ہوگئی۔ وہ اس بوائلر سے ڈر گئی تھی۔ بہرحال اب اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

"سر، اب ہمارا کیا بنے گا۔" عزیز خان نے پوچھا۔

"دیکھو جس وقت ہم بیٹھے ہیں۔ اسی وقت ہمیں اپنے دل میں یہ سوچ لینا چاہیے کہ ہم نے موت کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا ہے۔ اب خدا اپنے فضل سے ہمیں کسی ساحل تک پہنچا دے تو بات دوسری ہے۔"

عزیز خان نے پھر کچھ نہیں کہا۔

سمندر کے سینے پر دور دور تک کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ پانی کے اس ذخیرے پر ہماری بوٹ کسی تنکے کی طرح بہتی چلی جا رہی تھی۔ ہمارے ساتھ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

لزی کھسکتے ہوئے میرے قریب آگئی۔ "کپتان! تمہارا کیا خیال ہے۔ ہم لوگ زندہ رہ سکیں گے؟"

"ابھی تک تو زندہ ہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ خدا آئندہ بھی زندہ رکھے گا۔"

"تم تو تجربہ کار آدمی ہو۔ یہ بتاؤ جب ایسی صورت حال ہو تو پھر کیا ہوتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یا تو اوپر سے گزرتا ہوا کوئی جہاز پناہ دے دیتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یا پھر کسی ساحل پر پہنچ جاتے ہیں اور یا....."

"یا... تیسرا آپشن کیا ہوتا ہے؟"

"موت، یا تو سمندر کی بے رحم موجوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

لزی خاموش ہوگئی۔ میرے پاس بھی اس بوٹ پر کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر جہاز ہوتا تو ہزاروں کام ہوتے۔ لیکن اس بوٹ پر سوائے انتظار کے اور کیا کر سکتے تھے۔ دن گزرنے کا انتظار... پھر رات کے آنے کا انتظار... اس کے بعد پھر نئے دن کا انتظار۔

میں نے راشن کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ بشرطیکہ جو کچھ ہمارے پاس تھا۔ اسے راشن کہا جا سکے۔ میں نے دو دو بسکٹ اور تھوڑا تھوڑا پانی ایک وقت کے راشن کے طور پر سب میں تقسیم کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے کیا ہو سکتا تھا

لیکن میں اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا؟

ایک اور بھیانک رات آگئی۔

نہ جانے ہمیں کتنی راتیں اسی طرح گزارنی تھیں اور یہ بھیانک تصور تھا کہ ہمارے پاس جب بسکٹ ختم ہو جاتے اور پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں رہتا۔ اس وقت ہم کیا کر سکتے تھے۔

احتشام میرے پاس آگیا۔ وہ ایک سمجھا ہوا انسان تھا اور میں نے اس دوران یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ باہمت بھی ہے۔ کم از کم اس کے انداز سے اس کے خوف کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

"کپتان۔ ایک مصیبت آنے والی ہے۔" اس نے سرگوشی کی۔

"کیا مصیبت؟"

"اس کم بخت بوائلر کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتے۔ وہ کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"کپتان! اب اس اتفاق کو دیکھ لیں کہ بچ نکلنے والوں میں سوائے اس بوائلر اور اس عورت کے علاوہ کوئی بھی یورپین نہیں ہے۔ ان دونوں کے علاوہ ہم تین پاکستانی ہیں اور ایک عبدالمنان ہے۔ بنگلہ دیش کا۔ وہ آدمی لزی کے ساتھ مل کر ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔"

احتشام کو تجربہ بہت پُرفکر تھا۔ وہ بہت آگے کی سوچ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم اس پر نظر رکھو۔" میں نے کہا۔ "اگر اس نے کوئی گڑبڑ کی تو پھر دیکھ لیں گے۔"

لیکن اس رات کچھ بھی نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ بوائلر اور لزی ایک دوسرے سے بہت گھل مل کر باتیں کرتے رہے۔ شاید وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنے اپنے بارے میں بتا رہے ہوں گے۔

وہی شخص جو لزی کو بار بار سمندر میں پھینک دینے کی بات کر رہا تھا، اب وہی اس پر قربان ہو رہا تھا بلکہ اس نے ایک بار اپنے حصے کا پانی بھی لزی کو پلا دیا تھا۔

وہ رات بھی گزر گئی۔ خدا جانے ہم کس سمندر میں اور دنیا کے کس حصے میں تھے۔ ہم نے ایک دو بار جہازوں کو پرواز کرتے ہوئے بھی دیکھا لیکن وہ بہت بلندی پر تھے اور ہم کسی طرح بھی انہیں اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتے تھے۔

صبح ہوئی تو تیز دھوپ کے ساتھ ایک وحشت ناک خبر بھی اپنے ساتھ لے آئی تھی۔

بسکٹ تو تھوڑے سے موجود تھے لیکن ہمارے پاس پانی ختم ہو چکا تھا۔ پانی جو زندگی ہے جو امید ہے۔ کیسی ستم ظریفی تھی کہ ہمارے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا لیکن وہ ہمارے کسی کام کا نہیں تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رات کے وقت ہمارے پاس پانی تھا لیکن صبح کو ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا۔ اس وقت بنگالی منان نے مجھ سے کہا۔ "صاحب۔ یہ چور آدمی ہے۔" اس نے بوائلر کی طرف اشارہ کیا۔ "اس نے ہمارا پانی چوری کیا ہے۔"

"کیوں بکواس کرتا ہے۔" بوائلر بھڑک اٹھا۔ "میں پانی کیوں چوری کروں گا۔ خود میرے حصے کا پانی بھی غائب ہو گیا ہے۔"

"یہ جھوٹ بولتا ہے صاحب۔" منان نے کہا۔ "یہ پانی چوری کرتا ہے۔"

"اگر چوری کیا ہے تو کہاں رکھا ہے۔" بوائلر غصے سے بولا۔

"یہ ہم نہیں جانتا لیکن تم چور ہے۔"

میں نے بڑی مشکلوں سے منان کو خاموش کرایا۔ میں جانتا تھا کہ اس موقع پر اس قسم کے جھگڑے مناسب نہیں ہوتے۔ اگر بوائلر نے پانی چوری کر کے چھپایا بھی تھا تو وہ بھی نہ کبھی تو اسے استعمال کرتا اور اس وقت اس کو دیکھ لیا جاتا۔

"کپتان!" لزی نے مجھ سے کہا۔ "اس وقت آسمان بھی بہت بے رحم ہو رہا ہے۔"

"ہاں۔" میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ "پورے آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں ہے۔"

"کپتان۔ لگتا ہے ہم اسی طرح مر جائیں گے۔"

"ہم تم کو جان سے مار دے گا۔" اچانک منان کا شور سنائی دیا۔ اس نے بوائلر کا گریبان تھام رکھا تھا۔ "ہم کو پانی چاہیے۔"

"کپتان، اس کو سمجھا لو۔" بوائلر نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "ورنہ میں اسے اٹھا کر پانی میں پھینک دوں گا۔"

"منان بیٹھ جاؤ۔" میں نے منان سے کہا۔ "بچوں والی حرکت مت کرو۔"

"ہم کو پیاس لگا ہے سر۔" منان غصے سے بولا۔ "ہم بہت پیاسا ہے۔ ہم کو پانی نہیں ملا تو ہم مر جائے گا۔" پھر اس نے رونا شروع کر دیا۔

وہ کسی بچے کی طرح رو رہا تھا۔ خشک حلق سے اس کی آواز بہت پھنسی پھنسی سی نکل رہی تھی۔ اس وقت کسی میں اتنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طاقت نہیں تھی کہ اسے چپ کرانے کی کوشش کرتا۔ ہم سب خالی اور ویران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ اپنے آدھے دھڑ کو آگے لٹکا کر اس نے چلو بھر بھر کر سمندر کا پانی پینا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے روک سکتا، اس نے نہ صرف اچھا خاصا پانی پی لیا بلکہ ایک جنونی کیفیت میں سمندر میں چھلانگ بھی لگا دی۔

اور اس سے پہلے کہ کوئی اسے بچانے کی کوشش کرتا۔ سمندر میں ایک آرا نما چیز نمودار ہوئی۔ ستان کی چیخیں گونجنے لگیں۔

آس پاس خون ہی خون پھیل رہا تھا۔ وہ چیز اسے پانی کے اندر اتار لے گئی۔ ہم سب سکتے کی سی کیفیت میں یہ دیکھتے رہ گئے۔

ذرا ہی دیر میں اس کا ایک کٹا ہوا بازو سمندر کی سطح پر تیرتا ہوا دکھائی دے گیا۔ لزی بری طرح چیخنے لگی اور اس وقت ہمیں پتا چلا کہ یہاں شارک تھی۔

شارک جو خوف کی علامت ہے اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ صرف ایک شارک ہوگی۔ ستان کے خون کی بو اور نہ جانے کتنی شارکس کو کس طرف کھینچ لانے گی۔

☆☆☆

کیسا وحشت ناک اور یادگار سفر تھا ہمارا۔

شارک کی صورت میں موت ہمارے سروں پر منڈلا رہی تھی۔ یہ انتہائی وحشی اور جنونی ہوتی ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ ٹکر مار کر کشتی یا بوٹ کو الٹ دیا جائے۔ اس کے بعد انسان کا شکار اس کے لیے ایک دلچسپ مشغلہ ہوتا ہے۔

وہ انسان کو تیز دھار آرے کی طرح چھاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اس کے مضبوط اور خونی دانتوں کی گرفت میں جسم کا جو حصہ آجائے، وہ اسے کاٹ کر الگ کر دیتی ہے۔

ہم موت کے دہانے پر تھے۔ شارک کے جتھے ہماری بوٹ کو توڑ مروڑ کر رکھ سکتے تھے۔ بے چارہ ستان اپنی وحشت میں اپنی جان سے چلا گیا۔

”کپتان، خدا کے لیے ہمیں یہاں سے نکال لے جاؤ۔“ لزی کی کانپتی ہوئی آواز آئی۔

”میں اپنی پوری کوشش کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن بوٹ کی رفتار اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ اب ہمارا ایندھن بھی ختم ہونے والا ہے۔“

اس انکشاف نے سب کو اور بھی لرزا دیا۔ ان کے چہرے آنے والی موت کی تصویر بن گئے اور اس وقت ایک معجزہ ہو گیا۔

میں تو اسے معجزہ ہی کہوں گا جس کی طرف بوالر نے توجہ دلائی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر ایک طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ”سر! وہ دیکھیں۔ زمین۔“

اب ہم سب اس لکیر کو دیکھنے لگے جو آہستہ آہستہ واضح اور بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ بلاشبہ وہ زمین ہی تھی اور آباد بھی کیونکہ اب پرندے بھی اڑتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے پرندے جو ساحلوں کے آس پاس ہوتے ہیں۔

موت کا خوف ہمارے دلوں سے اچانک نکل گیا۔ زندگی کسی اجنبی ساحل کی صورت میں ایک بار پھر ہمارے سامنے آگئی تھی۔

اسی وقت سمندر میں بوٹ کے آس پاس پھر کچھ تیز آرے سے دکھائی دیے۔ یہ شارک تھیں جو مسلسل ہمارا تعاقب کر رہی تھیں لیکن اب ہمیں ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔

زمین بہت تیزی سے ہمارے قریب آرہی تھی۔ اور زمین تک پہنچ کر ہمیں شارکس سے نجات مل سکتی تھی۔ کھانا مل سکتا تھا۔ پانی مل سکتا تھا۔ ہم اپنے گھروں کو واپس جا سکتے تھے۔ وہ گھر جہاں ہم سے پیار کرنے والے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

زمین اب اور بھی قریب آگئی اور احتشام نے آواز لگائی۔ ”سر! ایک موٹر بوٹ بھی نظر آرہی ہے۔“

وہ موٹر بوٹ آدھے پانی اور آدھے ساحل پر تھی۔ یعنی ہمارے علاوہ بھی کوئی موٹر بوٹ کے ذریعے یہاں تک آیا تھا۔

تعاقب کرنے والی شارکس ابھی تک مایوس نہیں ہوئی تھیں۔ ان کا تعاقب جاری تھا لیکن اب ہماری بوٹ اس بوٹ کے برابر آکر لگ چکی تھی۔ ہم سب باری باری چھلانگ لگا کر باہر آگئے۔ خونی مچھلیاں مایوس ہو کر واپس چلی گئی تھیں۔

اب ہمارے بچ نکلنے کے امکانات واضح ہو گئے تھے۔ کیونکہ یہ ساحل ہرا بھرا تھا۔ ناریل اور تاڑ کے درخت لگے ہوئے تھے۔ بے شمار اقسام کے پودے بھی تھے۔

”سر! کیوں نہ پہلے اس بوٹ کو دیکھ لیں۔“ بوالر نے مشورہ دیا۔

”جاؤ، تم دیکھ کر آؤ۔“ میں نے کہا۔

بوالر اوک کہہ کر بوٹ میں داخل ہو گیا۔ یہ اس قسم کی لانچ تھی۔ جس کے دو ڈیک ہوا کرتے ہیں۔ سیڑھیاں اتر کر اندر کیبن بنے ہوئے تھے۔ بوالر ان ہی کیبنوں میں دیکھنے گیا تھا۔

اس کی واپسی بہت تیزی سے ہوئی۔ ”سر، کیبن میں ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔“ اس نے سپاٹ اور کھردرے لہجے میں بتایا۔

☆☆☆

ہم شاید پھر ایک خواب دیکھ رہے تھے یا بھیانک خوابوں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

زمین کا وہ ٹکڑا بہت مختصر سا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ پورا جزیرہ دو تین میل سے زیادہ نہیں تھا اور بالکل غیر آباد تھا۔

پرندوں اور چھوٹے موٹے جنگلی جانوروں کے سوا یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

البتہ ایک موٹر بوٹ تھی۔ جس کے انجن کو توڑ کر ناکارہ بنا دیا گیا تھا اور ایک کیبن میں ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ یہ لاش کسی یورپین ہی کی تھی۔

لاش کئی دن پرانی معلوم ہوتی تھی۔ کسی نے اسے گولیاں مار کر ہلاک کیا تھا۔ لیکن کس نے اور کیوں، فی الحال ہمارے پاس ان سوالوں کے جواب نہیں تھے۔

ایک سوال یہ تھا کہ مرنے والا اس ویران جزیرے پر کیا لینے آیا تھا اور جس نے اسے گولی ماری ہے وہ خود کہاں غائب ہو گیا۔

اصولاً تو اسے موٹر بوٹ لے کر فرار ہونا چاہیے تھا لیکن موٹر بوٹ کو وہ بری طرح ناکارہ کر گیا تھا۔ تو پھر وہ کس ذریعے سے یہاں سے گیا ہوگا۔

یہ تو طے تھا کہ وہ اس جزیرے پر موجود نہیں ہے۔ سورج غروب ہونے میں ابھی دیر تھی اور اتنی دیر میں ہم نے پورا جزیرہ چھان مارا تھا لیکن ہمیں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا تھا البتہ ایک جگہ جلی ہوئی لکڑیاں ضرور ملی تھیں جو اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ اس جزیرے پر کوئی موجود ہے۔ ایک یا ایک سے زیادہ لوگ۔

وہاں اترنے کے بعد وقتی طور پر ہمارے دو مسائل تو حل ہو گئے تھے یعنی کھانا اور پانی۔ میں بتا چکا ہوں کہ وہاں ناریل کے درختوں کی بہتات تھی تو وہ ناریل کام آئے تھے۔

رات ہونے سے پہلے ہم نے سوکھی لکڑیاں الاؤ کے لیے جمع کر لی تھیں۔ جزیرہ ویران سہی لیکن جنگلی جانور تو ہو سکتے تھے اور ان کو دور رکھنے کے لیے آگ روشن رکھنی ضروری تھی۔

ہم نے رات گزارنے کے لیے اپنی بوٹ ہی کا انتخاب کیا تھا۔ ہم اسے ساحل تک کھینچ لائے تھے اور کچھ فاصلے پر آگ روشن کر دی تھی۔

ہم سب خاموش تھے... بالکل خاموش لیکن ہم سب کی خاموشی صرف ایک سوال کر رہی تھی اور وہ سوال یہ تھا کہ ہمارا کیا ہوگا؟

ہم نے پہرے دینے اور سونے کے اوقات تقسیم کر لیے لیکن ایسا لگتا تھا جیسے ہمارا امتحان ابھی ختم نہ ہوا ہو۔

آدھی رات کے وقت لزی نے مجھے جھنجوڑ کر جگا دیا۔

”کپتان، وہ دیکھو۔“ اس کی آواز میں بے پناہ جوش تھا۔

”کیا دیکھوں؟“

”وہ روشنی... ایسا لگتا ہے کوئی جہاز اس جزیرے کی طرف آرہا ہے۔“

ہم سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سمندر کی طرف دیکھنے لگے۔ واقعی ایک جہاز اس جزیرے کی طرف آرہا تھا۔ اس کی روشنیاں سمندر کی سطح پر چمک رہی تھیں۔

”سر ایسا لگتا ہے جیسے ہم بچ گئے۔“ بوالر نے کہا۔

”ابھی ہمیں اتنا خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ عزیز خان نے سب کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ہم نہیں جانتے یہ کون لوگ ہیں۔ ہمیں فوراً چھپ جانا چاہیے۔“

”ہم کہاں چھپ سکتے ہیں۔“ عزیز خان نے کہا۔ ”ہمارا الاؤ تو دور سے نظر آگیا ہوگا۔“

”اور شاید یہی آگ دیکھ کر یہ جہاز ہماری طرف آرہا ہے۔“ احتشام جہاز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ جس کا مہیب خاکہ اب آہستہ آہستہ واضح ہوتا جا رہا تھا۔

جہاز کچھ فاصلے پر آکر رک گیا پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دو موٹر بوٹ سمندر میں اتاری گئیں اور وہ دونوں بوٹ ساحل پر ہماری بوٹ کے پاس آکر رک گئیں۔

وہ بارہ افراد تھے اور سب کے سب مسلح... ان کے انداز اور چہرے یہ بتا رہے تھے کہ وہ افریقی لوگ ہیں۔ ان میں سے ایک نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں پوچھا۔ ”کون ہو تم لوگ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”بھائی ہم بھٹکتے ہوئے اس طرف آنکلے ہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”ہمارا جہاز تباہ ہو گیا تھا۔“

”وہ جو بگڑ رہا ہے کیا تم اسی کی بات کر رہے ہو؟“

”ہاں میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔“

”اب تم لوگ خود کو ہمارا قیدی سمجھو۔“ اس نے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ موٹر بوٹ میں۔“

”لیکن کیوں؟ ہم نے کیا قصور کیا ہے اور تم لوگ کون

Digestpk
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو؟"

وہ ہنس پڑا۔ بہت بھیانک ہنسی تھی اس کی۔ کچھ دیر تک ہنسنے کے بعد اس نے کہا۔ "تم لوگوں نے ہمارے بارے میں تو ضرور سنا ہوگا۔ ہم قزاق ہیں۔ بحری قزاق ہائی ریٹ اور ہمارا کام ہے تم جیسوں کو قیدی بنا کر رکھنا، اب جلدی چلو شاباش۔"

☆☆☆

ہمارے بھیانک خواب کا دورانیہ اور طویل ہوتا جا رہا تھا۔

بوائلر نے جدوجہد کرنے کی کوشش کی تھی لیکن انہوں نے بوائلر کو مارنا شروع کر دیا۔ ذرا سی دیر میں وہ نڈھال اور لہولہان ہو کر گر پڑا جبکہ لزی اس طرح چیخ رہی تھی جیسے اس پر دورہ پڑ گیا ہو۔ اسی افریقی نے ایک گولی چلا دی جو لزی کے سر کے اوپر سے گزر گئی اس کے بعد لزی خاموش ہو گئی۔

وہ لوگ رسیاں اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ ہمیں بہت مضبوطی سے باندھ دیا اور اسی حالت میں ہمیں بوٹ تک پہنچا دیا گیا۔

نہ جانے ہمارے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ ایک آفت سے نکلنے بھی نہیں پاتے تھے کہ دوسری میں گرفتار ہو جاتے تھے۔ ہمیں جہاز کے ایک کیبن میں بند کر دیا گیا۔

ہم نے ان بحری قزاقوں کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا، ٹی وی پر ان کی خبریں دیکھی تھیں۔ آج کل ان کی سرگرمیاں بہت زوروں پر تھیں۔

ایسے سمندری ڈاکوؤں کی تاریخ بہت پرانی ہے آپ نے پرانی فلموں اور کارٹونز میں بھی دیکھا ہوگا۔ موٹا بھدا انسان، بڑھی ہوئی شیو... ایک آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی یہاں کسی کی آنکھ پر کوئی پٹی تو نہیں تھی لیکن ان کے چہرے بہت بھیانک تھے۔

ان میں سے کسی نے زخمی بوائلر کی طرف توجہ دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ وہ ہوش میں تھا اور کیبن کی دیوار سے لگا ہوا آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔

"کپتان اب ہمارا کیا ہوگا؟" لزی نے پوچھا۔ "میں نے ان لوگوں کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے، یہ بہت بے رحم ہوتے ہیں ذرا ذرا سی بات پر قتل کر دیتے ہیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتا کہ یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔" میں نے کہا۔ "بس خدا سے دعا کرو۔"

ہمیں رات بھر سوائے چند بسکٹوں کے کھانے کے لیے اور کچھ نہیں دیا گیا۔

صبح کے وقت ایک موٹا اور تنومند شخص کیبن میں داخل ہوا۔ "تم شاید اس جہاز کے کپتان تھے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں میں ہی کپتان ہوں۔"

"تم اپنے ساتھیوں کو بتا دو کہ ہم نے تاوان کی غرض سے تم سب کو اغوا کر لیا ہے۔" اس نے کہا۔ "اور ہمارا مطالبہ دو ملین ڈالرز کا ہے۔"

"دو ملین ڈالرز۔" میری سانسیں رکنے لگیں۔ "ہم دو ملین ڈالرز کہاں سے دے سکتے ہیں، یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔"

"یہ ہم نہیں جانتے۔ تم میں سے کون کس ملک سے تعلق رکھتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں اور یہ دونوں۔" میں نے احتشام اور عزیز خان کی طرف اشارہ کیا۔ "ہم تینوں کا تعلق پاکستان سے ہے۔ یہ پیڈرو یونانی ہے اور یہ لزی برطانوی ہے۔"

"اوہ۔ اچھی کاک ٹیل ہے۔" وہ مسکرا دیا۔ "تمہارے گھر والے نہ سہی تمہاری حکومتیں تو دیں گی نا؟"

"یہ لو۔" اس نے ایک موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ "پہلے اپنی کمپنی سے بات کرو۔"

میں نے کمپنی کے باس کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے اسی نے کال ریسیو کی تھی۔ "ہاں۔"

میں نے کچھ کہنا شروع ہی کیا تھا کہ اس نے شور کرنا شروع کر دیا۔ "کہاں مر گئے تھے تم لوگ۔ کیا ہو گیا تھا تم لوگوں کو؟"

"سر ہمارا جہاز ڈوب چکا ہے۔" میں نے بتایا۔

"ہاں یہ خبر پوری دنیا کو مل چکی ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن تم لوگ ہو کہاں؟"

"باس ہمیں صومالی قزاقوں نے اغوا کر لیا ہے۔" میں نے بتایا۔ "ان کا مطالبہ دو ملین ڈالرز کا ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں۔" وہ غرایا۔ "ایک تو میرا جہاز ڈوب گیا اوپر سے تاوان کے دو ملین ڈالر بھی ادا کروں۔ اب مجھے تم لوگوں سے کیا دلچسپی ہے۔ تم ہماری طرف سے جہنم میں جاؤ۔" اس نے فون بند کر دیا۔

موبائل کی آواز بلند رکھی تھی۔ وہ قزاق بھی سن رہا تھا۔

"سن لیا تم نے۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "کمپنی کے مالک نے کیا کہا ہے۔"

"یہ میں نہیں جانتا۔ اپنے گھر والوں سے بات کرو، اپنی حکومت سے بات کرو ورنہ ٹھیک دس دن کے بعد تم سب کو مار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Digests of Pakistan
digestpk.blogspot.com

دیا جائے گا۔" وہ اتنا بول کر چلا گیا۔

بوائلر نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ "کون دے گا بیس لاکھ ڈالرز ہمارے گھر والوں کے پاس ہے کیا اور ہماری حکومت کو میری کیا ضرورت ہے۔ یہ لوگ ہمیں مار دیں گے ہماری کہانی ختم ہونے والی ہے۔"

میرے دونوں پاکستانی ساتھی شاید مجھ سے زیادہ پریشان ہو رہے تھے۔ ان کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے، جلتے ہوئے جہاز سے بچ نکلے تھے۔ شارک کے حملوں سے محفوظ رہے لیکن اب ہم انسانوں کی قید میں تھے اور انسان کسی پر رحم نہیں کرتا۔

"کپتان۔" لزی کی آواز آئی۔ "میرا کیا ہوگا، میرا تو کوئی گھر ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ تو مجھے مار دیں گے۔"

"نہیں بے بی یہ تمہیں نہیں ماریں گے۔" بوائلر نے اس کی طرف دیکھا۔ "اس پوری ٹیم میں صرف تم ہی تو کام کی ہو۔"

"فالتو باتیں نہ کرو سوچو کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

"ہم کچھ نہیں کر سکتے سر۔ سوائے موت کا انتظار کرنے کے۔"

دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ اس دفعہ بھی وہی آدمی تھا جو شاید ان ڈاکوؤں کا سردار دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ساتھ دو مسلح افراد اور بھی تھے، وہ دونوں بالکل لڑکے تھے۔ سرغنہ نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو میں بہت نرم دل انسان ہوں اسی لیے کسی پر سختی نہیں کرتا لیکن کسی نے ایڈونچر کی کوشش کی تو پھر اس کے ساتھ بہت برا ہوگا۔ تم لوگ یہاں قید میں رہو گے اس کے سوا کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ رقم ملتے ہی تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔"

"اور رقم نہیں ملی تو...." عزیز خان نے پوچھا۔

"وہ بات دوسری ہے پھر ہم باری باری سب کو قتل کر دیں گے۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "ہاں اب میں یہ بھی بتا دوں کہ اس جہاز پر ہم اٹھارہ آدمی ہیں اور سب کے پاس ہتھیار ہیں۔ اسی لیے کوئی حماقت مت کرنا۔"

پھر اس نے میری طرف دیکھا اور اپنا موبائل بڑھا دیا۔ "کپتان یہ لو اپنے گھر والوں سے بات کرو، اس کے سگنلز بہت طاقتور ہیں۔ تم بہت آرام سے بات کر لو گے۔"

میرے سامنے میری بیوی آ گئی، میری بیٹی سائرہ آ گئی۔ جب ان دونوں کو یہ پتا چلے کہ میں کہاں پھنس گیا ہوں تو نہ جانے ان کا کیا حال ہوگا۔

"سوچ کیا رہے ہو، بات کرو۔" اس نے کہا۔

میں نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل لے لیا۔ گھر کا نمبر تھا۔ دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں ان دونوں کو کچھ بتاؤں لیکن اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

میں نے نمبر ملایا۔ دو چار بار گھنٹی بجنے کے بعد سائرہ ہی کی آواز آئی۔ "ہیلو۔"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نہ جانے کتنے دنوں کے بعد میں نے اس کی آواز سنی تھی۔ "ہیلو۔" اس نے پھر کہا۔ "بولتے کیوں نہیں۔"

"بیٹا۔ یہ میں ہوں۔ تمہارا ابو۔"

"بابا۔ بابا جانی۔" وہ اچانک رونے لگی۔ "بابا آپ کہاں چلے گئے تھے۔ کہاں ہیں آپ؟"

"بیٹا امی کو بلاؤ۔" میں نے کہا۔ "وہ کہاں ہیں؟"

سائرہ نے فون نزہت (میری بیوی) کو دے دیا۔ اس کا بھی وہی حال تھا جو سائرہ کا تھا۔ پھر جب میں نے اسے ساری صورت حال بتائی تو اس بے چاری پر سکتہ طاری ہو گیا۔

"ہائیں۔ ہم کیا کریں۔ کہاں سے لائیں اتنی رقم۔"

"نزہت سب سے پہلے تم اخبار والوں کو بتا دو۔" میں نے کہا۔ "تاکہ وہ شور مچائیں اور حکومت متوجہ ہو۔ خدا نے چاہا تو کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔"

اس نے موبائل میرے ہاتھ سے چھین کر احتشام کی طرف بڑھا دیا۔ پھر عزیز خان نے باتیں کیں۔ ان کے گھروں پر بھی ویسی ہی قیامت آئی ہوگی جیسی قیامت میرے گھر میں آئی تھی۔

بوائلر نے بھی بات کی لیکن لزی نے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ "نہیں، مجھے کسی سے بات نہیں کرنی۔" اس نے کہا۔ "تم لوگ چاہے میرا جو بھی حشر کرو۔"

"تو پھر جب تم سے کچھ ملنے کی امید ہی نہیں ہے تو پھر تم ہمارے کسی اور کام آ سکتی ہو۔" اس شخص نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ "اسے ساتھ لے چلو۔"

"نہیں۔" ہم سب نے احتجاج کرنے کی کوشش کی۔ "تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ یہ ہمارے ساتھ اسی کیبن میں رہے گی۔"

لیکن ہمارے احتجاج اور شور شرابے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ لوگ لزی کو زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔

بوائلر زور زور سے گالیاں دے رہا تھا۔ دہاڑ رہا تھا۔ "اگر ان کتوں نے میرے ہاتھ نہیں باندھے ہوتے تو میں ایک ایک کو جان سے مار دیتا۔"

ہم سب لوزی کے اس انجام پر دکھ ہو رہا تھا، وہ وحشیوں کے چنگل میں پھنس گئی تھی اور وہ اس کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کرنے والے تھے۔

میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس وقت میرے گھر میں کیا ہو رہا ہوگا، کتنے لوگ یہ خبر سن کر آ گئے ہوں گے۔ میری بیوی نے اپنے بھائی انور کو خبر کر دی ہوگی۔ انور ایک صحافی ہے اس نے ذرا سی دیر میں سارے اخبارات کو بتا دیا ہوگا، طرح طرح کی باتیں ہو رہی ہوں گی۔

یہ سب میں سوچ ہی سکتا تھا۔ نہ جانے سائرہ کا کیا حال ہو رہا ہوگا۔ وہ تو مجھ سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ میری تصویر اپنے سرہانے رکھ کر سوتی ہے، وہ کس طرح اس مصیبت کا سامنا کرے گی۔

ہم سب شاید یہی سب کچھ سوچ رہے تھے اسی لیے کیبن میں مکمل خاموشی تھی۔ اسی وقت دروازہ ایک بار پھر کھلا اور لوزی داخل ہو گئی۔ وہ بہت مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا ہوا تمہارے ساتھ؟ کیوں لے گئے تھے تمہیں؟" ہم سب اس سے پوچھ رہے تھے۔ "پھر تمہیں کیوں چھوڑ دیا۔"

"مم اطمینان سے بتاتی ہوں۔" وہ ایک طرف بیٹھ گئی۔

"یہ لوگ مجھے اچھے ارادے سے تو نہیں لے گئے تھے لیکن ابراہیم نے مجھے بچا لیا۔"

"ابراہیم۔ کون ابراہیم؟"

"ان ڈاکوؤں کا ساتھی... جو اس جہاز کا کپتان بھی ہے۔ مجھے تو وہ پڑھا لکھا سلجھا ہوا انسان دکھائی دیا ہے۔ ان وحشیوں سے بالکل مختلف ہے۔"

"اس کی تعریف کے علاوہ کام کی بات بھی تو بتاؤ۔" بیولر نے کہا۔

"کام کی بات یہ ہے کہ اسی کے کہنے پر مجھے چھوڑ دیا گیا۔" لوزی نے بتایا۔ "ابراہیم نے اپنے ساتھیوں کو سمجھایا کہ ہمارا کام یہ نہیں ہے، ہمیں اس حد تک نہیں جانا چاہیے۔ ہمارا کام ہے تاوان وصول کرنا۔ اس کے علاوہ ہمارے سامنے کوئی مقصد نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ ہماری جدوجہد ناکام ہو جائے گی۔"

"جدوجہد... کیسی جدوجہد؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"یہ میں نہیں جانتی۔ بس اسی کے کہنے پر مجھے چھوڑ دیا گیا ہے۔" لوزی نے کہا۔

"اب ایک نئی بات سامنے آئی ہے سر۔" احتشام نے میری طرف دیکھا۔ "یعنی ان لوگوں کا بھی کسی قسم کی جدوجہد سے تعلق ہے۔"

دروازہ کھلا اور ایک دوسرا آدمی کمرے میں داخل ہو گیا وہ صورت ہی سے مہذب اور پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے انتہائی صاف لہجے میں انگریزی میں کہا۔ "میرا نام ابراہیم ہے۔ شاید تمہاری ساتھی نے تمہیں بتا دیا ہوگا۔"

"ہاں بتا دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور یہ تمہاری تعریف کر رہی تھی کہ تم ایک شریف انسان ہو۔"

"ہاں بعض معاملات میں شریف ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "لیکن اس سے یہ مت سمجھ لینا کہ میری نرمی تم لوگوں کو آزاد کروا سکتی ہے، ہرگز نہیں۔ ہمیں تمہاری حکومتوں اور تمہارے گھر والوں سے تاوان وصول کرنا ہے۔ بہرحال میں ورنہ پھر وہی ہوگا جو ہمارا ساتھی تمہیں بتا چکا ہے۔ یعنی موت.... صرف موت۔"

☆☆☆

کیبن کے باہر سے کسی کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید یہ ان ہی لوگوں کا ساتھی تھا۔ اس کے گانے کے بول تو سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن اس کی آواز بہت اچھی تھی جیسے جنگلوں اور ویرانوں سے سفر کرتی ہوئی نہ جانے کہاں تک جا رہی ہو۔

اس آواز نے ذرا سی دیر کے لیے ہمارے دھیان سے یہ بتا دیا کہ ہم کہاں ہیں اور ہماری کیا حالت ہے۔ ہمیں یہاں قید ہوئے آج تیسرا دن تھا۔

اس دوران میں ابراہیم سے بہت سی باتیں ہوتی رہی تھیں اور بہت کچھ معلوم بھی ہوا تھا۔ ایسے ایسے انکشافات ہوئے تھے جس نے ہمیں حیران کر کے رکھ دیا۔

اس نے بتایا۔ "ہم کسی ایک جہاز کو اپنی مدرشپ بناتے ہیں۔ ہمارا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ ہم پہلے ایک لانچ پر قبضہ کرتے ہیں اس کے بعد کسی چھوٹے جہاز پر۔ لانچ کو چھوڑ دیا جاتا ہے پھر اس جہاز کے ذریعے کسی اور جہاز کو قابو میں کرتے ہیں اور پہلے جہاز کو سمندر میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ دوسرا بڑا جہاز ہمارا مرکز بن جاتا ہے ہم اسی جہاز سے کارروائیاں کرتے ہیں۔"

"پھر تو تمہاری آمدنی لاکھوں میں ہوگی۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں، یہ پوری دنیا اسی غلط فہمی میں ہے۔" اس نے کہا۔

"جبکہ بات کچھ اور ہے ہماری رقم کچھ بھی نہیں ہے۔ تم جانتے ہو ہم میں سے ہر ایک کو کتنا ملتا ہے؟"

"نہیں یہ میں نہیں جانتا۔"

"صرف پانچ سو ڈالر۔" اس نے بتایا۔

"کیا صرف پانچ سو ڈالرز۔" میں حیران رہ گیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہی تو اصل کہانی ہے۔" اس نے کہا۔ "ہم لوگ تو صرف کٹھ پتلیاں ہیں جن کی ڈور کسی اور کے ہاتھوں میں ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ اتنا بڑا کام ہم بین الاقوامی سپورٹ کے بغیر کر سکتے ہیں، ہرگز نہیں خود سوچو اس میں کتنی دشواریاں ہوتی ہیں۔ جہاز پر قبضہ کرنا، لوگوں کو یرغمال بنانا، ان کی حکومتوں سے مذاکرات کرنا، تاوان کی رقم وصول کرنا، یرغمالیوں کو رہائی دینا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ فرض کر دو کہ ہمیں پچاس لاکھ ڈالر مل گئے تو ہم سمندر میں کہاں خرچ کریں گے۔"

"یہ بات تو ہے۔" میں نے تائید کی۔ "خرچ کرنے کے لیے تمہیں کسی نہ کسی ساحل پر جانا ہوگا اور وہاں تمہاری گرفتاری تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔"

"لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ہم جہاز سے ساری رقم خشکی پر ٹرانسفر کروا دیتے ہیں تو اس کا آسان مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمیں بااثر شخصیات اور حکومتوں کا تعاون بھی حاصل ہے۔"

"اور وہ کون لوگ ہوتے ہیں؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔" اس نے کہا۔ "اس کے لیے ہم سے حلف لیا جاتا ہے۔"

"ایک بات بتاؤ۔ کیا تم مسلمان ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم مذہب کو درمیان میں نہ لاؤ تو بہتر ہے۔" اس نے کہا۔ "یاد رکھو دنیا بھر میں سب سے زیادہ اتحاد مجرموں کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ ہم میں مسلمان بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں، ایک ہندو بھی اور دو یہودی بھی شامل ہیں ہم رنگ، نسل اور مذہب سے بالاتر ہو کر اپنا کام کر رہے ہیں۔"

ابراہیم سے میری گفتگو کیبن میں ہو رہی تھی۔ میرے ساتھ میرے ساتھی بھی اس کی یہ باتیں سن رہے تھے۔ ابھی اس نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ باہر سے گولی چلنے اور کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔

ہم پریشان ہو کر رہ گئے لیکن ابراہیم بہت سکون سے بیٹھا رہا۔ "ابراہیم یہ کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ آج ایک قیدی کی ڈیڈ لائن ختم ہو گئی تھی۔ اسے گولی مار دی گئی ہوگی۔"

☆☆☆

جس شخص کو گولی مار کر اس کی لاش کو سمندر میں پھینک دیا گیا، اس کا نام پریرا تھا۔ سری لنکا کا باشندہ ایک عام سا ملاح۔ ایک غریب شخص جس کے گھر والے اس کے لیے مطلوبہ رقم کا بندوبست نہیں کر پائے تھے اور نہ ہی حکومت نے اس بے چارے کی طرف توجہ دی تھی۔

اسی لیے اسے مار دیا گیا تھا کیونکہ ان لوگوں کا دستور یہی تھا۔ یہ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ انہوں نے بین الاقوامی میڈیا کو اس کے مارے جانے کی خبر دے دی ہوگی تاکہ پوری دنیا پر ان کی دہشت طاری ہو جائے۔

ان لوگوں نے ابراہیم کے کہنے پر وقتی طور پر تو لوزی کو چھوڑ دیا تھا لیکن ان کا کوئی بھروسا نہیں تھا کہ کب ان کے ارادے بدل جائیں۔

ہمیں دن میں ایک بار شام کے وقت تازہ ہوا کے لیے ڈیک پر لے جایا جاتا تھا۔ اس کے سوا ہماری کوئی تفریح نہیں تھی۔ ہم ڈیک پر ایک بنچ پر بیٹھے سمندر کی طرف دیکھتے رہتے۔

اس جہاز پر کوئی جھنڈا بھی نہیں تھا جس سے یہ اندازہ ہو سکتا کہ وہ جہاز کہاں کا ہے۔ بہت ہی چالاک لوگ تھے۔

ابراہیم کی بات سچ ہی معلوم ہوتی تھی کہ یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں تھا اس قسم کی قزاقی ایک بین الاقوامی سازش کا حصہ تھی۔

اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کام میں کون کون سی بااثر شخصیات ان کا ساتھ دے رہی ہیں۔

ایک شام ایک اور واقعہ ہوا۔

ہم ڈیک پر بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ہلچل سی مچ گئی۔ مستول پر نیدرلینڈ کا جھنڈا لگا دیا گیا تھا۔ ہم لوگوں کو فوری طور پر ہمارے کیبن کی طرف ہانک دیا گیا کیونکہ سمندر کے سینے پر اچانک ایک جہاز نمودار ہو گیا تھا۔

ہم سب بہت خوش تھے، شاید ہمارے نجات دہندہ آ گئے ہیں۔ شاید ان ڈاکوؤں کو گھیر لیا ہوگا شاید یہاں سے ہمیں رہائی مل جائے۔

لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم سمجھ رہے تھے گولیاں چلیں گی جنگ ہوگی لیکن کچھ بھی نہیں ہوا صرف سناٹا چھایا اور کچھ دیر بعد دروازہ کھول دیا گیا۔ آنے والا وہی سرغنہ تھا جس کا نام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

برگمرا تھا۔ ”وہ ہمارا ہی جہاز تھا۔“ اس نے اعلان کیا۔ ”واپس جا چکا ہے۔“

”تمہارے جہاز سے کیا مراد ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تم کیا سمجھتے ہو کہ اس قسم کی کارروائی کیا صرف اسی ایک جہاز سے ہو رہی ہے۔“ اس نے پوچھا۔ ”اس وقت سمندر کے سینے پر ہمارے آٹھ جہاز گھوم رہے ہیں اور ہاں ایک خبر سن لو۔ پاکستان میں تم لوگوں کے حوالے سے ہنگامہ مچا ہوا ہے اور اس سے زیادہ مزے کی بات یہ ہے کہ ہمارے خلاف وہاں جلوس نکل رہے ہیں، نہ جانے تم لوگوں کو جلوس نکالنے کا کیا شوق ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم..... کہ ہم جلوس نکالتے رہتے ہیں۔“

”ہمارا کام ہی یہی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”دنیا بھر کے نیوز چینل ہمارے سامنے ہوتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ تمہارے ہاں کسی بزرگ کی توہین ہو تو جلوس نکالتے ہو۔ امریکا ڈرون حملے کرتا ہے تو جلوس، انڈیا دھمکیاں دے تو جلوس آخر جلوس نکالنے کی تمہیں کیا سوجھتی ہے۔ اب یہ دیکھو اب ہمارے خلاف بھی جلوس نکل رہا ہے۔“

میں خاموش ہو کر رہ گیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ہم نے اب تک سوائے جلوس نکالنے کے اور کیا کیا تھا۔

☆☆☆

کئی اور پریشان کرنے والے دن اسی طرح گزر گئے۔

ایک بار سرغنہ برگمرا غصے میں بھرا ہوا ہمارے پاس آیا۔ ”کیا مذاق ہے، تمہارے گھر والے اور تمہارا ملک تم لوگوں کے لیے سنجیدہ کیوں نہیں ہے؟“

”ان سے زیادہ کون سنجیدہ ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اتنی بڑی رقم کا بندوبست اتنا آسان تو نہیں ہے۔“

”یہ ہم نہیں جانتے۔ تم یہ بتاؤ یہ تمہارے ملک میں سکندر زمان کون ہے۔“

”میں صرف ایک ہی سکندر زمان کو جانتا ہوں اور وہ ایک بہت بڑی این جی او سے وابستہ ہے۔“

”تو بس یہ وہی ہوگا۔“ برگمرا نے کہا۔

”لیکن تم سکندر زمان کو کیسے جانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ اس وقت وہی تمہارے گھر والوں کا ترجمان بنا ہوا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اسی کے ذریعے تاوان کی بات چیت ہو رہی ہے۔“

”خدا کا شکر ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”سکندر زمان کی ان معاملات میں عالمی شہرت ہے۔ انہوں نے بہت سے کام کیے ہیں۔“

”دیکھتا ہوں تمہارا سکندر زمان ہمارے ڈالرز کا بندوبست کرتا ہے یا نہیں۔“ پھر اس نے احتشام کی طرف دیکھا۔ ”اور تمہاری ماں کا کیا حال ہے؟“

”خدا کے لیے اتنے بے رحم نہ بنو۔“ احتشام نے کہا۔ ”تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ میری ماں بیمار ہے۔“

”تو پھر اس سے کہو کہ جلدی سے رقم کا بندوبست کر دے اور تمہیں لے جائے یہاں سے۔“

”خدا کا خوف کرو، وہ بوڑھی بیمار عورت پیسوں کا بندوبست کہاں سے کر سکتی ہے؟“

”تو پھر وہ اپنے بیٹے کی لاش دیکھنے کے لیے تیار ہو جائے۔“ برگمرا نے بے رحمی سے کہا۔

”کمینے۔“ بوائلر اچانک دہاڑنے لگا۔ ”جس دن تو میرے ہاتھ آ گیا، میں تیری یہ ناپاک گردن مروڑ کر رکھ دوں گا۔“

”خاموش۔“ برگمرا نے آگے بڑھ کر بوائلر کو ٹھوکر مار دی۔

بوائلر کو نہ جانے کیا سوجھی... شاید اس وقت اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ اس نے برگمرا کی ٹانگ اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں لے کر بری طرح مروڑ دی۔

برگمرا کی دہاڑ نے پورا کیبن ہلا کر رکھ دیا۔ اس کی چیخ سن کر اس کے دو آدمی تیزی سے کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے بوائلر کو مارنا شروع کر دیا لیکن بوائلر پر تو پاگل پن ہی سوار تھا۔ وہ پوری قوت سے اس کی ٹانگ مروڑے جا رہا تھا۔ بالآخر وہی ہوا جو اس کا مقدر بن چکا تھا۔ ان میں سے ایک نے ریوالور نکال کر اسے گولی مار دی۔ لزی چیخ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ احتشام اور عزیز خان کا بھی بہت برا حال تھا۔

بوائلر کی لاش کیبن کے فرش پر پڑی تھی۔ بے شک وہ بہادر انسان تھا جس نے اتنی دلیری سے اپنی جان دے دی تھی۔ وہ اپنی توہین برداشت نہیں کر سکا تھا۔

”لے جاؤ اس کتے کو سمندر میں پھینک دو۔“ برگمرا نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

وہ بوائلر کی لاش گھسیٹ کر کیبن سے باہر لے گئے۔ لزی ابھی تک کانپے جا رہی تھی۔ بوائلر کی اس موت نے یقین دلا دیا تھا کہ یہ بے رحم لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

چونکہ اس کیبن میں ہر طرف مرنے والے کا خون پھیلا ہوا تھا اسی لیے ان لوگوں نے ہمیں ایک دوسرے کیبن میں منتقل کر دیا۔

اب چاہے وہ کہیں بھی رکھیں۔ قید تو قید ہی ہوتی ہے۔

بہت دیر بعد ابراہیم ہمارے کیبن میں آیا۔ ”دیکھ لیا تم لوگوں نے۔“ اس نے ہمیں مخاطب کیا۔ ”میں نے سمجھا دیا تھا کہ ان لوگوں کو بھڑکانے اور غصہ دلانے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ ذرا سی بات پر قتل کر دیتے ہیں۔“

”لیکن یہ تو درندگی ہے۔“ احتشام نے کہا۔

”درندگی کہاں نہیں ہے۔“ ابراہیم دھیرے سے بولا۔ ”کیا افریقا میں ظلم نہیں ہو رہا۔ کیا بوسنیا، کشمیر اور فلسطین میں لوگ نہیں مارے جا رہے، کیا خود تمہارے یہاں بم بلاسٹ اور ڈرون حملے نہیں ہو رہے۔ یہ سب کیا ہے، کیا درندگی نہیں ہے۔ تو پھر ہمیں کیوں الزام دے رہے ہو؟ ہم میں سے ہر ایک اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے اور ہم بھی ان میں سے ایک ہیں۔“

”دیکھو ابراہیم ہمیں بین الاقوامی سیاست وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہم تو صرف اتنا چاہتے ہیں کہ ہمیں ہمارے گھروں کو واپس بھیج دیا جائے۔“

”تاوان کی رقم وصول کیے بغیر یہ نہیں ہو سکتا۔“

”تم یہ بتاؤ کہ سمندر میں رقم کی وصولی اور ہماری رہائی کا کیا طریقہ ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”خشکی کی بات ہوتی تو سمجھ میں آ جاتا۔ یہ کام سمندر میں کیسے ہو سکتا ہے؟“

”اس کے لیے تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ابراہیم نے کہا۔ ”ہم نے جو اتنا چکر چلایا ہے تو ہمارے پاس کوئی نہ کوئی طریقہ تو ہوگا ہی۔“

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”اب یہ بتا دو کہ ہمارے حوالے سے تم لوگوں کے پاس کیا خبریں ہیں؟“

”کوئی خاص نہیں۔ تمہارے یہاں ابھی تک تاوان کی رقم ہی جمع ہو رہی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے ساتھیوں کا غصہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر انہوں نے تم لوگوں کے خلاف بھی کوئی ایکشن لینے کا فیصلہ کر لیا تو شاید میں بھی کچھ نہ کر سکوں۔“

ابراہیم ابھی کیبن میں ہی تھا کہ برگمرا موبائل لیے کیبن میں آ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر تم لوگ پیسے دینے میں ضرورت سے زیادہ ہی دیر لگا رہے ہو۔ اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ تمہاری حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے تم تینوں میں سے کسی ایک کو مار دیا جائے اور اب تم تینوں آپس میں فیصلہ کر کے بتا دو کہ کس کو مارا جائے۔“

☆☆☆

”آپ پاگل ہو گئے ہیں کپتان۔“ احتشام مجھ سے کہہ رہا تھا۔ ”آپ کی بیوی ہے۔ ایک پیاری بچی ہے۔ ابھی آپ کو نہیں مرنا ہے جبکہ میرا معاملہ کچھ اور ہے۔“

”تمہارا معاملہ کیا ہے؟“ میں نے احتشام کی طرف دیکھا۔

”میری شادی نہیں ہوئی۔“ اس نے کہا۔ ”اسی لیے مجھ پر کسی کوئی ذمے داری نہیں ہے۔“

”دیکھو احتشام اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ تم مجھے مر جانے دو کیونکہ میں دنیا دیکھ چکا ہوں۔ اچھی خاصی خوشیاں حاصل کر لی ہیں جبکہ تم نے ابھی کچھ بھی نہیں دیکھا۔“

”آپ دونوں خوامخواہ الجھے ہوئے ہیں۔“ عزیز خان بول پڑا۔ ”مجھے جانے دیں کیونکہ میری صرف ایک بیمار ماں ہے اور کوئی بھی نہیں ہے۔“

”بے وقوف انسان۔ تمہارے بعد تمہاری ماں کا کیا ہوگا؟“

”رشتے دار بھی ہیں، وہ اس کی دیکھ بھال کر ہی لیں گے۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”تم دونوں کو میری بات ماننی ہوگی کیونکہ میں کپتان ہوں۔“

”ہمایوں صاحب اب نہ تو جہاز رہا اور نہ آپ کپتان رہے۔“ احتشام نے کہا۔ ”اسی لیے آپ کی بات نہیں مانوں گا۔ مجھے جانے دیں۔ آپ گھر جائیں اپنی بچی کو دیکھیں، اپنی بیوی کو دیکھیں، انہیں آپ کی ضرورت ہے۔“

ہمارے درمیان یہ بحث برگمرا کے اس فیصلے کے بعد ہو رہی تھی کہ کسی ایک کو مرنا ہے اور وہ کون ہو سکتا ہے۔ اس کا فیصلہ بھی اس نے ہم پر ہی چھوڑ دیا تھا اور اس وقت ہم وہی فیصلہ کر رہے تھے۔

لزی جو اس دوران میں بالکل خاموش رہی تھی،

Digestsofpakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچانک ہمارے پاس آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خدا کی پناہ تم کتنے عظیم لوگ ہو۔ میں نے ایسی مثال پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ لوگ تو اپنی جانیں بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور تم جانیں قربان کرنے میں پہل کر رہے ہو۔ واقعی بہت کمال کے لوگ ہو تم سب۔“

”تو پھر بتاؤ ہم کیا کریں؟“ میں نے پوچھا۔

”اپنے آپ کو خود سے پیش نہ کرو۔“ اس نے کہا۔ ”ان سے کہو کہ ابھی تم نے فیصلہ نہیں کیا ہے کیونکہ تمہیں امید ہے کہ تمہارے گھر والے اور...... حکومت تمہاری رہائی کا بندوبست کر دے گی۔ اس کے بعد دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

”فرض کرو اگر وہ ہم تینوں میں سے کسی ایک کو مارنا بھی چاہتے ہیں تو پھر کیا ہوگا۔“

”تو پھر...“ لڑکی بولتے بولتے رک گئی۔

”ہاں بتاؤ۔ پھر کیا کرنا چاہیے؟“

”پھر وہی پرانا طریقہ۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”قرعہ اندازی اپنے نام کی پرچیاں لکھ کر نکال لو جس کا نام آئے وہ اپنے آپ کو ان درندوں کے سامنے پیش کر دے۔“

برگنزا موبائل فون لیے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ”یہ لو۔“ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”تمہاری بیٹی تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔“

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس سے موبائل لے لیا۔ آخر کب تک میں اپنی سائرہ کو اپنی رہائی کا جھوٹا یقین دلاتا رہتا کب تک؟

”ہیلو بابا جان۔“ دوسری طرف سے سائرہ کی آواز آئی۔ ”آپ میری آواز تو سن رہے ہیں نا۔“

”ہاں بیٹا سن رہا ہوں۔“ میری آواز رندھی ہوئی تھی۔ ”تم کیسی ہو؟“

”بابا جان آپ کے بغیر تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔“ اس نے کہا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں بیٹا۔ تم تو بہادر بیٹی ہو تم اپنی امی کا خیال رکھو ان کو پریشان نہیں ہونے دینا۔ ان سے کہنا کہ میری فکر نہ کریں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہاں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں واپس آ جاؤں گا۔“

”ہاں بابا جان آپ واپس آ جائیں گے۔“ سائرہ نے کہا۔ ”یہاں بہت سے لوگ پیسوں کا بندوبست کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ سکندر انکل ہماری بہت مدد کر رہے ہیں۔“

”ہاں بیٹا ایسے لوگ بہت بڑے ہوتے ہیں۔“

اس سے پہلے کہ سائرہ کچھ اور کہتی۔ برگنزا نے مجھ سے موبائل چھین لیا۔ ”بس بہت ہو گئی، پتا چل گیا کہ تمہارے گھر والے تمہارے لیے رقم کا بندوبست کرنے میں لگے ہوئے ہیں اسی لیے تمہیں شاید زندہ رہنا چاہیے لیکن یہ دونوں...“ اس نے احتشام اور عزیز کی طرف دیکھا۔

”میری تو بات ہی مت کرو۔“ عزیز خان نے کہا۔ ”میں تو ویسے بھی مرنے کے لیے تیار ہوں اس لیے مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”خیر اس کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا۔“ برگنزا مسکرا دیا۔ ”لیکن تمہارا کپتان تو بچ گیا اور تم۔“ اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ”تم بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟“

”مار دو مجھے۔“ لڑکی نے کہا۔

”نہیں، تمہیں مارنا بے وقوفی ہے۔“ وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ”تم میرے کام آؤ گی۔ میرے ساتھیوں کے کام آؤ گی کیونکہ وہ سب بہت دنوں سے عورت کے لیے ترسے ہوئے ہیں اور ہاں ایک بات اور بھی سن لو اب تمہیں بچانے کے لیے ابراہیم نہیں آ سکے گا۔“

”کیوں۔“

”اس لیے کہ ہمارے درمیان ابراہیم جیسے بے وقوف اور رحم دل انسان کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہم نے اسی لیے اسے مار کر سمندر میں پھینک دیا ہے۔“

”تم وحشی ہو، درندے ہو۔“ لڑکی غصے سے دہاڑنے لگی۔ ”ابراہیم تم سب سے اچھا تھا۔“

”اسی لیے تو وہ مارا گیا ہے۔“ برگنزا نے کہا۔ ”یہاں ہم سب اپنے لیے جیتے ہیں۔ ہمیں کسی اور کی پروا نہیں ہوتی۔“

☆☆☆

اور اب باقی کہانی میں آپ کو بتاؤں گی۔

میں... میرا نام سائرہ ہمایوں ہے۔ کپتان ہمایوں کی بیٹی۔ اب تک کی کہانی بابا جان نے اپنی ڈائری میں لکھ لی تھی میں نے وہ ڈائری پڑھی اور اس سے آگے لکھنا شروع کر دیا تاکہ دنیا کو پتا تو چلے کہ کیا ہو رہا ہے۔ اچھی طرح لکھنا نہیں آتا تھوڑی بہت غلطی ہو تو معاف کر دیجیے گا۔“

یہ تو پتا چل گیا تھا کہ بابا جان کا جہاز ڈوب گیا ہے اس کے بعد ان کا کوئی پتا نہیں تھا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا خدانخواستہ انہیں کچھ ہو گیا ہے۔

میرا اور امی کا رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ ہم نے بابا جان کے جہاز کی کمپنی والوں سے بھی بات کی لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر اچانک ایک دن بابا جان کا فون آ گیا، میرے تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے کیونکہ میں نے اتنے دنوں کے بعد بابا جان کی آواز سنی تھی۔

پھر جب یہ پتا چلا کہ بابا جان کو ظالم بحری ڈاکو اپنے ساتھ لے گئے ہیں اور پیسوں کا مطالبہ کیا ہے تو ہم پر جیسے قیامت ہی آ گئی۔

ہمارے گھر والوں کو لاکھوں ڈالرز جمع کرنے تھے، یہ کہاں سے ہوتے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ ہم اپنا پورا گھر، گاڑی، زیورات سب کچھ بیچ کر بھی اتنی رقم جمع نہیں کر سکتے۔

ان اغوا کرنے والوں نے یہ کہا تھا کہ اگر مقررہ وقت تک پیسے نہیں ملے تو وہ سب کو مار دیں گے خدا غارت کرے ان کو۔ جو یہ نہیں جانتے کہ ایک باپ کے اغوا کے بعد اس کی بیٹی پر کیا گزر رہی ہوگی۔

امی کا تو رو رو کر برا حال ہو رہا تھا اور میں بار بار بابا جان کی تصویر کو چومتی رہتی۔ ہمارے گھر لوگوں کا آنا جانا شروع ہو چکا تھا۔

رشتے داروں کے علاوہ اور نہ جانے کون کون سے لوگ آ رہے تھے۔ اخبار والے، چینل والے، این جی او والے۔ وہ سب ہم سے تاثرات پوچھتے رہتے کہ بابا جان کے اغوا کے بعد ہمارا کیا حال ہے۔ اب انہیں کیسے سمجھاتی کہ باپ اغوا ہو جائے تو بیٹی کے دل پر کیا گزرتی ہے۔

باپ تو اس کا دوست بھی ہوتا ہے۔ ہے نا؟

تو بابا جان میرے دوست تھے اور میرے دوست کے ساتھ یہ کیا ہو گیا تھا۔

بابا جان کے بہت سے دوست بھی آ رہے تھے۔ ان سب کو بابا جان کی بہت فکر تھی کیونکہ بابا جانی سب سے پیار کرنے والے تھے۔ سب کا خیال رکھتے۔ سب کے وقت پر کام آتے۔

کئی چینل والے بھی میرے پاس آئے۔ وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ میں انہیں کیا بتاتی۔ پورا ملک بابا جان کے اس مسئلے میں دلچسپی لے رہا تھا۔

پھر ایک صاحب آئے۔ سکندر زماں۔ وہ ایک بہت بڑی این جی او چلا رہے تھے۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا تم گھبراؤ نہیں۔ خدا نے چاہا تو ہم تمہارے بابا جان کو واپس لے آئیں گے۔“

سکندر زماں صاحب نے زور و شور کے ساتھ پیسے جمع کرنے کی مہم شروع کر دی لیکن یہ رقم بہت بڑی تھی اور بہت مشکلوں سے جمع ہوتی۔

ایک بار موبائل پر بابا جان سے میری بات ہوئی۔ وہ مجھے حوصلہ دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ مجھے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور اپنا حوصلہ برقرار رکھنا چاہیے اور اپنی پڑھائی کی طرف دھیان دینا چاہیے لیکن مجھ سے تو کھانا بھی نہیں کھایا جا رہا تھا پڑھائی تو بہت دور کی بات تھی۔

پندرہ دن اسی طرح گزر گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنے بابا جان کے لیے کیا کروں۔ ایک صبح میں نے اخبار میں ایک اشتہار دیکھا (میں اخبار ضرور پڑھنے لگی تھی کیونکہ اس میں بابا جان کی خبریں ہوتی تھیں) تو اس اشتہار میں یہ لکھا تھا کہ ایک بچی کو ایک گردے کی ضرورت ہے اور اس کے ماں باپ اس کے لیے دس لاکھ دینے کو تیار ہیں۔ اس پر ان کا فون نمبر بھی تھا۔

میں نے امی کو بتائے بغیر چپکے سے فون کر دیا۔ دوسری طرف ایک انکل تھے۔ ”ہیلو۔“ انہوں نے کہا۔

”اسلام علیکم انکل۔“ میں نے کہا۔

انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ ”ہاں بیٹا کس سے بات کرنی ہے۔“

”انکل اخبار میں ایک اشتہار چھپا ہے جس میں گردے کی بات ہوئی ہے۔“

”ہاں، ہاں وہ میری بچی کی ضرورت ہے لیکن تم کون ہو؟“

”انکل کیا میں آپ کی بیٹی کے کام آ سکتی ہوں۔“ میں نے پوچھا۔

”تم کیا کام آ سکتی ہو؟“

”اپنا گردہ دے کر۔“ میں نے کہا۔

دوسری طرف خاموشی ہو گئی۔ بالکل گہری خاموشی میرے بار بار ہیلو کہنے پر انہوں نے کہا۔ ”بیٹی تم کہاں ہو کہاں رہتی ہو؟“

”نہیں انکل میں اپنا پتا نہیں بتاؤں گی۔“ میں نے کہا۔ ”بلکہ خود آپ کے پاس آ جاؤں گی۔“

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں بیٹا اس طرح نہیں ہوگا پورا ایک گراؤنڈ جانے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

مجبور ہو کر میں نے اپنا نام اور پتا بتا دیا۔ یہ سب سن کر وہ ایک بار پھر چپ ہو گئے جب دوبارہ بولے تو ان کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ "بیٹا تم ان ہی کپتان ہمدانی کی بات کر رہی ہو نا جن کو بحری قزاقوں نے قید کر لیا ہے۔"

"جی انکل، میں ان ہی کی بات کر رہی ہوں۔ اپنے بابا کی جان چھڑانے کے لیے میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے بیٹا میں آج شام کو تمہارے پاس آرہا ہوں۔" انہوں نے کہا۔ "پھر سامنے بات ہوگی۔"

میں انتظار کرتی رہی لیکن وہ نہیں آئے۔ دوسرے دن بھی نہیں آئے۔ تیسرے دن بھی نہیں آئے پھر چوتھے دن آگئے۔

وہ بہت باوقار سے انکل تھے۔ سفید بالوں نے ان کی شخصیت کو اور بھی چھا جانا دیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے ملاقات کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا میں تمہارا گردہ خریدنے کو تیار ہوں اس کے لیے دس لاکھ کا چیک لے کر آیا ہوں۔ یہ رکھ لو۔"

انہوں نے چیک نکال کر میز پر رکھ دیا۔

"انکل تو پھر مجھے اسپتال کب جانا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بیٹی۔ تمہیں کہیں نہیں جانا ہوگا تمہارا گردہ تمہارے جسم ہی میں رہے گا اس کو وہیں رہنے دو۔"

"وہ کیوں انکل؟"

"اس لیے کہ اب ضرورت نہیں رہی۔" وہ رونے لگے۔ "میری بچی کا انتقال ہو چکا ہے۔"

ان کو روتے دیکھ کر خود میں بھی ان سے لپٹ کر رونے لگی کچھ دیر بعد میں نے ان سے کہا۔ "انکل پھر آپ یہ دس لاکھ کیوں دے رہے ہیں؟"

"بیٹا جب میں اپنی ایک بچی کے لیے دس لاکھ دینے کو تیار تھا تو کیا دوسری کو نہیں دے سکتا۔ اسے رکھ لو بیٹا۔ شاباش۔"

تو ایسے لوگ بھی میرے پاس آتے رہے۔ اتنا پیار کرنے والے اتنے ہمدرد، اور ایک وہ لوگ تھے جو صرف خبریں لینے کے لیے آتے تھے۔

ایک بات بتاؤں۔ اخبار والوں نے اور ٹی وی والوں نے بابا جان کے اس کیس کو زندہ رکھا۔ پورے ملک کی توجہ ہماری طرف کرا دی۔ اسی لیے اتنی ڈھیر ساری ہمدردیاں اور محبتیں مل گئیں، پیسے مل گئے۔ ورنہ کون یاد رکھتا ہے کسی کو۔ لوگ تو یہاں سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

ایک دن بابا جان کا اسی جہاز سے فون آیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"آج کی رات

تم اور میں بازار نکل جائیں گے

خوب کھلونے لائیں گے۔"

پتا نہیں کیوں میں سوچتی رہ گئی کہ بابا جان نے یہ نظم مجھے کیوں سنائی۔ اس میں کیا خاص بات ہے۔ میں اور بابا جان اس نظم کو پڑھا کرتے تھے لیکن آج بابا جان کو یہ نظم کیوں یاد آگئی۔ میں نے امی سے بھی پوچھا لیکن امی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

ہاں میں اب سب کے سمجھانے پر اسکول جانے لگی تھی۔ امی نے بھی یہی کہا تھا کہ میں اسکول جایا کروں۔ اسی طرح میرا دھیان بٹا رہے گا ورنہ ہر وقت روتی رہوں گی۔

تو میں نے اسکول جانا شروع کر دیا۔ میری اسکول کی ایک ٹیچر ہیں مس شاہدہ، بہت عقل مند ہیں۔ اکثر ان ہی سے مشورے لیا کرتی۔

میں نے یہ بات بھی ان کو بتا دی۔ وہ بھی سوچ میں پڑ گئی تھیں پھر انہوں نے کہا۔ "سائرہ ہو سکتا ہے اس نظم کے ذریعے تمہارے بابا جان نے تمہیں کوئی پوشیدہ پیغام دیا ہو۔"

"کیا پوشیدہ پیغام ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو تم بتاؤ گی۔ یاد کرو کوئی ایسی بات کوئی حرکت، کوئی عمل، کوئی اشارہ۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے ویسے بابا جان جب مجھ سے شرارت کرتے تو شرارت کے طور پر یہ نظم پڑھتے ہوئے خود اکیلے گھر سے نکل جاتے اور کہتے کہ اب میں اکیلا جا کر کھلونے لاؤں گا۔"

"بیٹا تمہارے بابا جان نے اشارہ دے دیا ہے کہ وہ اس جگہ سے فرار ہونے والے ہیں۔" مس شاہدہ نے کہا۔ "یہ میں نے سمجھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی کوئی بات نہ ہو لیکن تم اس کا تذکرہ کسی سے مت کرنا، ہو سکتا ہے یہ بات چینل پر آجائے اور تمہارے بابا جان کا منصوبہ ناکام ہو جائے۔"

☆☆☆

منصوبہ مکمل تھا۔

ابراہیم کے قتل نے ان ڈاکوؤں کے کچھ لوگوں میں بددلی پیدا کر دی تھی۔ ابراہیم کو بھی پسند کرتے تھے لیکن اس کے قتل کے بعد وہ لوگ برگنزا کے خلاف ہو گئے تھے۔

چونکہ ان کی تعداد کم تھی۔ اسی لیے وہ کھل کر بغاوت نہیں کر سکتے تھے لیکن انہوں نے بہت خاموشی سے یہ منصوبہ بنا لیا تھا۔

وہ منصوبہ راتوں رات فرار کا تھا۔

ڈنگوبا ان ہی میں سے ایک تھا۔ اس کی ذمے داری ہمیں کھانا کھلانے کی تھی۔ ایک بار جب وہ ہمارے لیے کھانا لے کر آیا تو اس نے کہا۔ "جانتے ہو۔ تمہارا ملک اور تمہارے گھر والے تاوان کی رقم دینے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔"

"ہاں مجھے بھی فون پر بتا دیا گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن یہ مت سمجھنا کہ تم لوگ رہا ہو جاؤ گے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ برگنزا بہت کمینہ شخص ہے۔" اس نے بتایا۔ "اس کا منصوبہ ہے کہ تاوان ملنے کے بعد تم لوگوں کو قتل کر دیا جائے۔"

"او گاڈ۔" لڑکی کانپنے لگی۔ "پھر کیا ہوگا۔"

"گر تم لوگ ہمارا ساتھ دو تو ہم تمہیں یہاں سے نکال لے جائیں گے۔" اس نے بتایا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم بھی تو اس کے ساتھی ہو؟"

"ساتھی تھا لیکن ابراہیم کی موت کے بعد ہم میں سے کچھ اس کے خلاف ہو گئے ہیں۔ ہم اس کا ساتھ دینا نہیں چاہتے لیکن کھل کر کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان کی تعداد زیادہ ہے۔ اسی لیے راتوں رات ہم نے فرار کا پروگرام بنایا ہے۔"

"اور یہ فرار کس طرح ہوگا؟"

"موٹر بوٹ کے ذریعے۔" اس نے بتایا۔ "بوٹ تیار ہے۔ رات کے وقت ہم اسے سمندر میں اتار دیں گے۔ اس میں بارہ آدمیوں کی گنجائش ہے۔ تم چار ہو جبکہ ہم آٹھ افراد ہیں۔"

"ایک بات بتاؤ۔ تم لوگ تو ویسے بھی فرار ہو سکتے ہو پھر ہمیں ساتھ ملانے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ضرورت ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم ایک تجربہ کار جہاز راں ہو۔ تم سمندر کے راستوں سے اچھی طرح واقف ہو اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم تم سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔"

"کیسا فائدہ؟"

"دیکھو یہ تو طے ہے کہ ہم بین الاقوامی مجرم ہیں۔" اس نے کہا۔ "ہمارے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے۔ کبھی نہ کبھی تو کسی ملک کے قانون کی گرفت میں آجائیں گے پھر اس وقت ہمارے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں ہوگا لیکن ہو سکتا ہے کہ ہم جب تمہیں آزاد کرا دیں تو ہمیں معاف کر دیا جائے یا ہماری سزائیں بہت کم ہو جائیں۔"

"ہاں، یہ ایک امکان ہے۔"

"تو پھر آج رات تم لوگ جاگتے رہنا۔" اس نے کہا۔ "ہم کسی بھی وقت یہاں سے نکل جائیں گے۔"

ڈنگوبا کے جانے کے بعد ہم ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے۔ حالانکہ یہ فرار بھی آسان نہیں ہوتا... نہ جانے کون کون سی دشواریاں ہمارے ساتھ ہوتیں لیکن اتنا ضرور تھا کہ ہم ان وحشیوں کے چنگل سے نکل جاتے۔ اس کے بعد ہماری قسمت۔

منصوبہ مکمل تھا اور بظاہر اس میں کوئی جھول نہیں تھا اسی لیے جب برگنزا نے سائرہ سے میری بات کروائی تو میں نے نظم کے ذریعے اسے اشارہ دینے کی کوشش کی کہ وہ اگر سمجھ لے تو اس کی پریشانی اور اداسی ختم ہو جائے گی۔

میں نے جب سائرہ سے بات مکمل کی تو برگنزا نے موبائل جیب میں رکھتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھا۔ "لڑکی اب وقت آگیا ہے کہ تم میرے ساتھ چلو۔ آج اتفاق سے موسم بہت خوب صورت ہو رہا ہے۔"

"نہیں میں نہیں جاؤں گی تمہارے ساتھ۔ میں اپنے ساتھیوں کے پاس رہوں گی۔"

"لڑکی ضد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" برگنزا نے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ "تم جانتی ہو کہ میں ذرا سی دیر میں ڈھیر کر دیتا ہوں۔"

لڑکی نے مایوس نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے پھر اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے خدا حافظ کہا اور اچانک کھلے ہوئے دروازے سے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

ہم سب مع برگنزا کے دیکھتے رہ گئے پھر ایک طرف سے شور کی آوازیں آئیں اور ایک آدمی دوڑتا ہوا کیبن میں داخل ہو گیا۔ "ماسٹر لڑکی نے سمندر میں کود کر جان دے دی ہے۔" اس نے بتایا۔

"لعنت ہو تم سب پر۔" برگنزا غصے سے پاگل ہونے

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگا۔ پھر اس نے ہماری طرف دیکھا۔ ''اب صرف تم تینوں رہ گئے ہو۔ میں تمہیں تو نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ بھناتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

☆☆☆

بابا جان کی ڈائری میرے بہت کام آرہی تھی۔

بابا جان نے اپنی پوری کہانی ایک ڈائری میں لکھ لی تھی۔ میں نے ان کی ڈائری پڑھی اور جہاں جہاں پر مجھے مکمل کرنا تھا۔ وہ مکمل کرتی چلی گئی۔

بابا جان کی واپسی ہی بہت حیرت انگیز تھی۔ ہمارے مہربان سکندر زمان صاحب نے تاوان کی رقم بھی جمع کر لی تھی۔ سارے انتظامات ہو چکے تھے کہ بابا جان اس جہاز سے فرار ہو گئے۔

ڈگوبا نامی آدمی نے جو منصوبہ بنایا تھا اس نے اسی رات عمل کر ڈالا تھا۔ بابا جان کے ساتھ اب صرف دو پاکستانی رہ گئے تھے۔ احتشام انکل اور عزیز انکل۔

باقی لوگ تو ایک ایک کر کے مرتے چلے گئے تھے۔ جس طرح بابا جان نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کیسی کہانی ہے بابا جان کی کتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں انہوں نے۔

خیر تو سمندر میں ان کی موٹر بوٹ بھٹکتی جا رہی تھی کہ ایک چینی جہاز نے اس بوٹ کو بھٹکتے ہوئے دیکھ لیا اور موٹر بوٹ کے سارے آدمی اس چینی جہاز پر آ گئے۔

وہاں پہنچ کر جب جہاز کے عملے کو پتا چلا کہ وہ کون لوگ ہیں تو پوری دنیا کو خبر کر دی گئی کیونکہ بابا جان اور ان کے ساتھیوں کی کہانی تو پوری دنیا میں مشہور ہو چکی تھی۔

چینی جہاز نے ان سب کو بہ حفاظت پہنچا دیا۔ میں بتا نہیں سکتی کہ میری خوشی کا کیا عالم ہو گا، امی نے شکرانے کی نمازیں پڑھیں۔

یہ ایک معجزہ ہی تھا کہ بابا جان اور ان کے ساتھی ان ڈاکوؤں کے چنگل سے نکل کر آ گئے تھے جو ڈاکو انہیں ساتھ لے کر آئے تھے۔ انہیں فوری طور پر قانون نافذ کرنے والے اداروں نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔

بابا جان نے میرے کہنے پر اپنی کہانی لکھنی شروع کر دی۔

دیکھا زبردست کہانی تھی اس میں میرا بھی ذکر ہے نا میں ان کی بیٹی جو ٹھہری۔

ایک دن سکندر زمان انکل میرے گھر آئے۔ وہ بھی بابا جان کی واپسی سے بہت خوش تھے۔ جب وہ مجھ سے مل کر جانے لگے تو میں نے ان سے کہا۔ ''انکل آپ نے بابا جان اور ان کے ساتھیوں کے لیے جو کچھ جمع کیا ہے وہ اب اس مقصد میں کام تو نہیں آئے گا۔''

''نہیں بیٹا وہ رقم اب اسی مقصد سے کام آئے گی بلکہ مجھے کچھ اور بھی جمع کرنے ہیں۔''

''وہ کیوں انکل؟''

''اس لیے کہ ان ظالموں نے ایک اور کپتان اور اس کے ساتھیوں کو اپنا قیدی بنا لیا ہے۔'' سکندر زمان انکل نے بتایا۔ ''ان لوگوں کی بھی بیٹیاں ہیں۔ تمہاری طرح پیاری پیاری۔ اپنے اپنے باپ سے بہت محبت کرنے والی۔ اس بار ان کا مطالبہ تیس لاکھ ڈالرز کا ہے۔''

''او خدا۔ انکل کیا یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا؟''

''ہاں بیٹا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک دنیا سے بھوک اور ناانصافی ختم نہیں ہوتی جب تک صومالیہ جیسے ملکوں میں اناج کا قحط اور دوسرے ملکوں میں اناج کی بہتات رہے گی۔ جب تک وسائل کی منصفانہ تقسیم نہیں ہوگی۔ دنیا میں اسی طرح جہاز اغوا ہوتے رہیں گے۔ گھروں میں ڈاکے پڑتے رہیں گے اور ایک معمولی سے موبائل سیٹ کے لیے انسانوں کا خون بہتا رہے گا۔''

سکندر زمان انکل تو یہ سب کہہ کر چلے گئے لیکن میں یہ سوچ رہی ہوں کہ کاش کبھی ایسا ہوگا۔ کاش کبھی یہ دنیا امن اور سکون کا گہوارہ بنے گی۔

اس وقت بابا جانی نے مجھے ایک نظم سنائی۔ وہ میں لکھ رہی ہوں۔

امید ابھی کچھ باقی ہے۔ اک بستی بسنے والی ہے
جس بستی میں کوئی ظلم نہ ہو اور جینا کوئی جرم نہ ہو
وہاں پھول خوشی کے کھلتے ہوں اور موسم سارے ملتے ہوں
بس رنگ اور نور برستے ہوں اور سارے ہنستے بستے ہوں
امید ہے ایسی بستی کی
جہاں جھوٹ کا کاروبار نہ ہو دہشت کا بازار نہ ہو
جینا بھی دشوار نہ ہو، مرنا بھی آزار نہ ہو
یہ بستی کاش ہماری ہو
وہاں خون کی ہولی عام نہ ہو غم کی کوئی شام نہ ہو
جہاں منصف سے انصاف ملے سب کے سب معاف ملے
اک آس ہے ایسی بستی ہو جو روٹی زہر سے سستی ہو
امید ابھی کچھ باقی ہے اک بستی بسنے والی ہے

دوسرا رنگ

سعی بے لذت

کاشف زبیر

بلائے ناگہانی کبھی کہہ کر نہیں آتی بس اچانک ہی حملہ آور ہو جاتی ہے... شامی تیمور اور فولاد خان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے... مشکلات ہمہ وقت ان کی کھوج میں رہتی ہیں... اور وہ خندہ پیشانی سے ان کے استقبال کے لیے سر تسلیم خم کیے تیار کھڑے ہوتے ہیں... اس دفعہ تو ایک نازنین خوش جمال ان کے روبرو ہے۔

خاندانی رکھ رکھاؤ اور روایات کے شکنجے میں جکڑی دوشیزہ کی زندگی کے اسرار و رموز

ایک دن پہلے ہی شامی نے تیمور سے سوال کیا تھا کہ محبت کیا ہے؟ اور تیمور نے کہا۔ ''دل کا درد سے معمور ہو جانا۔''

''او بھائی... میں اس محبت کی بات نہیں کر رہا ہوں۔''

''اگر تیری مراد اس محبت سے ہے جس کا وائرس فلو کی طرح بار بار چمٹ جاتا ہے تو اس پر اظہار خیال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شعرا اور قلم کار اس پر ضرورت سے کہیں زیادہ بات کر چکے ہیں۔''

''میرا مطلب ہے کہ آج کے دور میں محبت کا مفہوم

Digests of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ بدل سا نہیں گیا ہے۔"

"کچھ بدلا ہے۔" تیمور نے ٹھنڈی سانس لی۔ "پہلے محبت صرف ذات پات نہیں دیکھتی تھی۔ اب تو رنگ، نسل، عمر، شکل اور حتی کہ جنس تک نہیں دیکھتی ہے۔"

"دوسرے لفظوں میں محبت کچھ بھی نہیں دیکھتی۔" شامی نے سرد آہ بھری۔ "پھر ایسی محبت کا فائدہ؟"

تیمور مسکرایا۔ "معاف کرنا میں کہنا بھول گیا تھا۔ دیگر ضروری چیزوں کی طرح محبت نفع نقصان بھی نہیں دیکھتی ہے۔"

شامی نے نفی میں سر ہلایا۔ "فی زمانہ کی جانے والی محبت سب دیکھتی ہے۔"

"یار! بور نہ کر... پہلے ہی یونیورسٹی والے جان کو آئے ہوئے ہیں اسائنمنٹ پر اسائنمنٹ دیے جا رہے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ..."

"قصہ مختصر یہ ہے میرے بھائی کہ نوشی اب پہلے جیسی نہیں رہی ہے۔"

"ظاہر ہے کل اس کی سالگرہ تھی اور وہ دس کاؤنٹ کے ساتھ بائیس برس کی ہو چکی ہے۔"

"میرا اشارہ اس کی عمر نہیں، اس کی محبت کی طرف ہے۔"

"یعنی وہ محبت جو وہ تیرے خیال میں تجھ سے کرتی ہے؟"

"بالکل وہی محبت..."

"تو بھائی بات یہ ہے کہ محبت آنکھ سے اندھی ہوتی ہے عقل سے نہیں۔"

"کیوں میں نے ایسا کیا کیا ہے جو اس کی عقل میں نہیں آرہا ہے؟" شامی نے برا مان کر کہا۔

"تیرے کرتوت۔" تیمور نے اطمینان سے کہا۔ "ہر دوسرے تیسرے مہینے تجھے کوئی نہ کوئی لڑکی پسند آجاتی ہے اور تو نوشی کو بائی پاس کر کے اس کے پیچھے لگ جاتا ہے تو وہ کب تک برداشت کرے گی؟"

شامی فکر مند ہو گیا۔ "تیرا مطلب ہے اس کی برداشت کی حد آگئی ہے اور وہ مجھے خیر باد وغیرہ کہنے کا سوچ رہی ہے؟"

"اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو یہ حد بہت پہلے آچکی ہوتی لیکن مجھے لگتا ہے وہ تجھ سے سچی محبت کرنے لگی ہے۔"

"سچی محبت...؟"

"ہاں، عورت جب کسی آدمی سے سچی محبت کرنے لگے تو اس کا مطلب ہوتا ہے وہ بیوی بن کر صرف اس کی زندگی اجیرن کرنا چاہتی ہے۔"

"وہ تو مجھ سے بات نہیں کر رہی ہے۔"

"بات بھی کرے گی لیکن پہلے تجھے شوہر تو بنالے۔"

شامی کے لیے یہ زیادہ فکر مندی کی بات تھی کہ نوشی اس سے بدلہ لینے کے لیے شادی کو تیار ہو جاتی مگر اس کے خیال میں یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ یہ بات اس نے تیمور سے بھی کہہ دی۔ وہ بولا۔ "بیٹے اتنا مشکل بھی نہیں ہے۔ وہ اپنے پاپا سے بات کرے گی اور گریز ی انکل دادا جان سے بات کریں گے اور دادا جان تجھے رشتۂ ازدواج کی زنجیر میں باندھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

تیمور کی کھینچی تصویر خاصی ہولناک لیکن حقیقت سے قریب تر تھی۔ ایسا بالکل ہو سکتا تھا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ "اب کیا کروں؟"

"نوشی کو منا... اسے احساس دلا کہ اصل لائف تو شادی سے پہلے کی ہوتی ہے اور شادی کے بعد انسان کولہو کا بیل بن جاتا ہے۔"

"وہ تو بیل نہیں بن سکتی۔" شامی نے اعتراض کیا۔

"ہاں، میں بن سکتا ہوں اور اسے اس کی بہت خوشی ہوگی۔"

"احمق، میرا مطلب ہے عورت بھی اپنی آزاد لائف کھو دیتی ہے... تو اسے سمجھا تو سکتا ہے۔"

مگر ان دنوں شامی کے ستارے کچھ اس طرح گردش میں آئے ہوئے تھے کہ وہ نوشی کو کیا فولاد خان کو بھی نہیں سمجھا پا رہا تھا۔ اس نے فولاد خان سے چھ مہینے پہلے دس ہزار روپے لیے تھے۔ ایک گرل فرینڈ کو ڈنر پر لے جانا تھا۔ ہر مہینے باقاعدگی سے ایک ہزار روپے کی ادائیگی کے باوجود ابھی تک چار ہزار سات سو روپے باقی تھے۔ یہ بات فولاد خان نے شامی کو آج ہی بتائی تھی جبکہ شامی کے خیال میں اس کا قرض کب کا بے باق ہو گیا تھا اور وہ غلطی سے اس مہینے فولاد خان کو ہزار روپے دے بیٹھا تھا۔ وہ ہزار روپے واپس لینے گیا تو تب فولاد خان نے اسے اپنا قرضہ جاتی کھاتا دکھایا جس میں شامی کے ذمے اتنی رقم مزید تھی۔

"چار ہزار سات سو۔" شامی چلا اٹھا۔ "فولاد خان! تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟"

فولاد خان فکر مند ہو گیا۔ "تب ای ام کو اپنے سر سے بو آتا اے۔"

حالانکہ بو اس لیے آرہی تھی کہ سردیوں میں فولاد خان سر دھونے سے گریز کرتا تھا۔ شامی غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔ "فولاد خان! میں نے صرف ڈھائی ہزار روپے لیے تھے اور اب تک تم کو چھ ہزار دے چکا ہوں تو چار ہزار سات سو روپے کس خوشی میں باقی ہیں؟"

"خوشی؟" فولاد خان نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔ "ام کو خوشی بالکل نہیں اے۔ یہ جب تک امارا رقم امارے پاس نہ آجائے ام اس کے لیے غمگین رہتا اے۔"

شامی کا دل چاہا کہ مکا مار کر فولاد خان کا سر توڑ دے لیکن یہ کام بہت مشکل تھا۔ ایک تو اس کے لیے اس کے سر سے کوئی بیس گز کپڑے کی پگڑی اتارنی پڑتی اور دوسرے فولاد خان کا سر بھی فولادی تھا۔ امکان یہی تھا کہ شامی کا مکا ٹوٹ جائے گا۔ اس میں سب سے زیادہ برا تو یہ ہوگا کہ قرض اپنی جگہ رہے گا اور بات نواب صاحب تک پہنچ جائے گی۔ اس لیے اس نے امن کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

"فولاد خان! میرا مطلب ہے چار ہزار سات سو روپے کیوں ہیں اور تمہارا قرض کیوں ختم نہیں ہوا؟"

"قرض اس واسطے ختم نہیں اے کہ آپ پورا قسط نہیں دیتا اے۔ آپ دو ہزار دیتا تو قرض اب تک ختم ہو جاتا۔"

شامی کے ہوش اڑ گئے۔ ڈھائی ہزار کے بدلے بارہ ہزار۔ "فولاد خان! تم کس حساب سے سود لگاتے ہو؟"

اس نے دانت نکالے۔ "اپنا حساب سے۔"

اس کے بعد شامی آدھے گھنٹے تک فولاد خان سے مغز ماری کرتا رہا اور درست حساب کی ہر کوشش فولاد خان نے ناکام بنا دی تھی جس کا حساب کرنے اور سود نکالنے کا ایسا طریقہ تھا کہ یہودی بینکر بھی سنیں تو چکرا جائیں۔ آخر میں فولاد خان نے حجت اتمام حجت کے لیے کہا۔ "ٹھیک اے شامی صیب! ام آپ کا قرض ماف کرتا اے... اگرچہ ام اپنے والد صیب کا قرض بی ماف نہیں کرتا۔"

"بکواس۔" شامی کا موڈ آف ہو گیا۔ "ہم نواب ابن نواب ہیں۔ تمہاری یہ جرأت..."

"ام کو ماپی دو صیب۔" فولاد خان نے جلدی سے کہا۔ "ام اپنا ماپی واپس لیتا اے۔"

طے پایا کہ شامی اگلے مہینے سے دو ہزار دے گا اور یوں آنے والے تین مہینوں میں فولاد خان کا قرض پورا ہو جائے گا۔ جیسا کہ بتایا ہے شامی کے ستارے گردش میں تھے۔ نوشی نے اس سے بات بند کی ہوئی تھی۔ خان پور ڈیم کے پاس شامی کے ایک یونیورسٹی فیلو محسن کے باپ کا فارم ہاؤس تھا اور ان دنوں وہاں مرغابی کا شکار چل رہا تھا۔ محسن نے اسے شکار پر چلنے کی دعوت دی تھی لیکن شامی نے انکار کر دیا۔ اس کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ "نہیں یار! آج کل حالات خراب ہیں۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں گڑبڑ ہوتی ہے۔ مرغابی کے بجائے کوئی بندہ مر گیا تو پولیس سے پہلے خود دادا جان تین سو دو میں لٹکا دیں گے۔"

مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ چلا جائے۔ اس دوران میں محسن جا چکا تھا۔ شامی اس کے فارم ہاؤس پر پہلے بھی جا چکا تھا۔ وہاں موبائل سگنل سے رابطہ ممکن نہیں تھا اور فارم ہاؤس کا فون نمبر اسے یاد نہیں تھا۔ اس لیے اس نے سوچا کہ ایسے ہی چلا جائے۔ محسن کو سرپرائز دے گا۔ تیمور نے صاف انکار کر دیا۔ اس لیے اب شامی کو اکیلے جانا تھا۔ اتفاق سے کل ہفتہ تھا اور آنے والے دو دن چھٹی تھی اس لیے اس نے مجوزہ مطالعہ نواب صاحب کو اپنی روانگی کے بارے میں بتایا، ان سے اجازت لی اور اپنے بیگ میں دو جوڑے اور نائٹ سوٹ رکھ کر روانہ ہو گیا۔ ان دنوں نواب صاحب نے سخی پچارو کا نیا

ہر ضرورت مند اپنے دلی مقاصد میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے

خدانخواستہ اگر آپ بھی تنگی ☆ مشکلات اور پریشانیوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں ☆ ممکن ہے آپ کی الجھنوں میں کسی دشمن کا خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہو ☆ بالوجہ حسد و بغض آپ کے دنیاوی امور میں رکاوٹ ڈال کر ناکامیوں کو آپ کا مقدر بنانا چاہتا ہو ☆ مثلاً کاروبار میں نقصان / شادی میں رکاوٹ ☆ گھریلو لڑائی جھگڑے، رشتوں میں رکاوٹ ☆ دوستی ☆ محبت میں ناکامی ☆ نافرمان اولاد اور ازدواجی زندگی کے کامیاب حل کے لیے ابھی فون کریں contact : faith healer

ماہر عملیات و تعویزات این اے جوہری

0300-2222567

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماڈل منگوایا تھا اور دور دراز کے سفر کے لیے شامی اور تیمور اسے ہی استعمال کرتے تھے۔

جھیل کے کنارے دور تک فارم ہاؤس ہیں جن میں امرا نے شان دار بنگلے بنوا رکھے ہیں۔ محسن کے باپ نے بھی یہاں خوب صورت بنگلا بنوایا تھا جس میں ہر سہولت تھی اور اکثر چھٹیوں میں محسن کی فیملی یہاں آتی تھی۔ گرمیوں میں یہاں بہت رونق رہتی تھی لیکن ابھی سردی تھی اس لیے زیادہ تر فارم ہاؤس خالی پڑے تھے اور وہاں صرف چوکیدار تھے۔ شامی نے ہارن دیا۔ محسن کے چوکیدار اقبال نے گیٹ سے باہر آکر دیکھا۔

''شامیر صاحب۔'' اس نے کہا۔

''کیسے ہو اقبال؟'' شامی نیچے اتر آیا۔ ''محسن اندر ہی ہے؟''

''جی صاحب، اندر ہیں۔''

''بس ٹھیک ہے، میں ذرا اسے حیران کرتا ہوں۔'' شامی نے جیپ کی چابی اقبال کو تھما دی۔ ''تم کچھ دیر بعد جیپ اندر لے آنا۔''

محسن لاؤنج میں آتش دان کے سامنے اپنے آئی فون پر ایک سنسنی خیز ویڈیو دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک پارٹی کی ویڈیو تھی جس میں ہائی سوسائٹی کی لڑکیاں ناچ رہی تھیں۔ شامی نے محسن کے کندھے پر ہاتھ مارا تو وہ اچھل پڑا۔ ''ابے تو... اچانک؟''

''ہاں بیٹے، میں نے سوچا چل کر دیکھوں کہ تو کیا حرکتیں کر رہا ہے۔'' شامی نے اس کے ہاتھ سے آئی فون اچک لیا۔ محسن ہنسا۔

''ایک دوست کے گھر پارٹی تھی۔ اس کا باپ بہت بڑا بیوروکریٹ ہے...''

''یہ تو اس پارٹی سے بھی ظاہر ہے۔'' شامی نے ویڈیو میں نظر آنے والی شراب کی بوتلیں دیکھیں۔ ''یہ تو کوئی مغربی ڈیلٹا پارٹی لگ رہی ہے۔''

محسن نے آنکھ ماری۔ ''اس سے کم مت سمجھ... یہاں بھی وہی سب ہوتا ہے جو مغربی ڈیلٹا پارٹیوں میں ہوتا ہے۔''

''یعنی ہم اس لحاظ سے مغرب سے پیچھے نہیں ہیں؟''

''بالکل۔'' محسن نے آئی فون لے کر بند کر دیا۔ ''یہ بتا کہ تو نے تو منع کر دیا تھا پھر اچانک کیسے ٹپک گیا؟''

''بس یار! گھر میں بوریت ہو رہی تھی۔ سوچا مرغابیاں ہی مارلوں۔''

''اور وہ جو بندہ مر رہا تھا؟'' محسن ہنسا۔ ''اب تجھے دادا جان نہیں پینگ کریں گے؟''

شامی کھسیا گیا۔ ''وہ تو ایسے ہی کہہ رہا تھا... خیر چھوڑ اسے، یہ بتا کہ کھانے میں کیا ہے... ڈرائیونگ نے بھوک چمکا دی ہے۔''

''یہاں کھانے کو کیا ہوگا۔ میں آتے ہوئے پیزا اور بیک فوڈ لے آیا تھا، وہی ملے گا۔''

وہ کچن میں آئے۔ محسن نے ایک گوشت کا ٹن کھولا اور اس میں سے پارچے نکال کر تلنے کے لیے فرائی پین میں ڈال دیے۔ اس دوران میں شامی نے کافی تیار کی۔ باہر تاریکی تھی جسے جھیل سے اٹھنے والی بھاپ اور گہرا کر رہی تھی۔

محسن نے ایک پیزا نکال کر مائیکروویو میں گرم ہونے کے لیے رکھ دیا۔ دس منٹ بعد وہ ڈنر کر رہے تھے۔ اقبال، شامی کی جیپ اندر لے آیا اور اس نے شامی کے لیے گیسٹ ہاؤس کا ایک کمرا بھی کھول دیا تھا۔ ڈنر کے بعد محسن اور شامی کچھ دیر گپ شپ کرتے رہے، پھر شامی کو نیند آنے لگی اور وہ سونے کے لیے اٹھ گیا۔ ویسے بھی شکار کے لیے صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے جانا تھا۔ محسن نے بارہ بور کی دو رائفلیں تیار کر لی تھیں جن میں چھرے والا کارتوس پڑتا تھا۔ شامی نے سونے سے پہلے پانچ بجے کا الارم لگایا تھا لیکن اس کی آنکھ اس سے پہلے کھل گئی۔ کوئی دروازہ بجا رہا تھا۔ شامی نے گھڑی دیکھی، ابھی چار بجے تھے۔ اس نے چلا کر کہا۔

''اتنی جلدی کیا ہے ابھی چار بجے ہیں۔''

''شامی اٹھ جا یار... ایمرجنسی ہے۔'' باہر سے محسن بولا۔

ایمرجنسی کے نام پر شامی اٹھ گیا۔ وہ باہر آیا جہاں محسن پریشان کھڑا تھا۔ ''یار! گھر سے فون آیا ہے... ماما کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔''

''اوہ... پھر چلتے ہیں۔'' شامی نے کہا۔

''نہیں تو رک جا... میں اقبال کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔ پریشانی میں مجھ سے ڈرائیونگ نہیں ہوتی۔ یہاں کسی کا رہنا بھی ضروری ہے اور گاڑی بھی نہیں چھوڑ سکتا۔''

گاڑی تو شامی بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا اس لیے بہتر حل یہی تھا کہ اقبال، محسن کے ساتھ چلا جائے اور شامی یہیں رک جائے۔ محسن عجلت میں روانہ ہوا۔ اسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی اور اسی وجہ سے وہ ان کی علالت کا سن کر پریشان ہوگیا تھا۔ شامی باہر والا گیٹ بند کر کے اندر آیا تو اس کی نیند اڑ گئی

تھی۔ اس نے اکیلے شکار کا سوچا۔ باہر سردی اچھی خاصی تھی۔ اس نے کپڑے بدلے اور پہلے کچن میں آکر اپنے لیے کافی تیار کی پھر رائفل اور ٹارچ لے کر باہر نکل آیا۔

وہ جھاڑیوں سے نکل کر جھیل کے پاس آیا جس کی سطح سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اسی بھاپ میں مرغابیوں کے جھنڈ پوشیدہ تھے۔ شامی کنارے کنارے چلنے لگا۔ اسے امید تھی کہ سورج بلند ہونے سے پہلے اسے کہیں نہ کہیں مرغابیاں نظر آجائیں گی۔ یہاں کنارے کے ساتھ ساتھ کشتیاں بھی تھیں۔ اگر اسے شکار مل جاتا تو وہ بعد میں کشتی میں بیٹھ کر ماری جانے والی مرغابیوں کو جھیل سے نکال سکتا تھا۔ مگر فی الحال تو کوئی مرغابی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ کنارے کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کوئی سو گز دور نکل گیا۔

وہ واپسی کے لیے پلٹا تھا کہ اسے عقب سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی جھیل میں کودا ہو۔ شامی چونک گیا۔ اس موسم میں اور تاریکی میں تیراکی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ پلٹ کر دوبارہ اسی سمت چلنے لگا۔ ساتھ ہی وہ ٹارچ سے پانی پر روشنی ڈال رہا تھا۔ اچانک اسے جھاڑیوں کے درمیان کوئی نظر آیا تھا جب تک شامی ٹارچ کا رخ اس کی طرف کرتا وہ فرار ہوگیا۔ مگر اس کے بھاگتے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ شامی نے اس کے پیچھے جانے کا سوچا لیکن جھیل سے آتی آوازیں سن کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

پہلے چھپاکے کے بعد کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے کوئی تیرنے کی کوشش کر رہا ہو اور ڈوب رہا ہو۔ روشنی کا دائرہ ایک بھنور پر گیا تھا۔ پھر اس بھنور سے ایک سر برآمد ہوا جس کا منہ کھلا تھا۔ شامی دم بخود رہ گیا کیونکہ چہرہ نسوانی تھا۔ اس لڑکی نے بے تابی سے سانس لی اور دوبارہ پانی میں چلی گئی۔ وہ ڈوب رہی تھی اور جان بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شامی نے ٹارچ زمین پر اس طرح رکھی کہ اس کی روشنی پانی پر پڑے اور رائفل اس کے برابر میں رکھ کر وہ پانی میں اتر گیا۔ نسوانی چہرہ کنارے سے کوئی دس فٹ دور نظر آیا تھا اور جھیل یہاں خاصی گہری تھی۔ چند فٹ کے بعد شامی بھی تیرنے لگا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس جگہ پہنچ گیا جہاں لڑکی نظر آئی تھی۔ اس نے ہاتھ پاؤں مارے مگر لڑکی کہیں گہرائی میں جا چکی تھی۔

شامی نے گہری سانس لی اور پھر پانی میں غوطہ مارا۔ یہاں تاریکی تھی اور وہ بس ہاتھ مار کر لڑکی کو تلاش کر سکتا تھا۔ ایک بار سانس ختم ہوئی تو اس نے دوبارہ سطح پر آکر سانس لی اور جیسے ہی زیر آب گیا، لڑکی مل گئی۔ اس کا جسم بے جان انداز میں تیر رہا تھا۔ شامی نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔ سطح پر

اخلاقیات

دو سیلز مین بہت عرصے بعد ملے۔ ایک نے حالات کا شکوہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آج کا دن تو بہت ہی برا گزرا۔ کہیں ڈانٹ پھٹکار سننے کو ملی۔ کہیں گالیاں، کہیں لوگوں نے منہ بنا کر دروازہ بند کر لیا۔ کہیں گرجنے برسنے لگے۔ فروخت کچھ بھی نہ ہوا۔''

''کیا بیچ رہے ہو آج کل؟'' دوسرے نے پوچھا۔

''اخلاق سنوارنے والی کتابیں۔'' پہلے نے جواب دیا۔

اسما کامران، کراچی

لانے کے بعد وہ اسے کنارے پر لانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ کام توقع سے زیادہ دشوار ثابت ہوا کیونکہ کنارے کی ڈھلان کسی دیوار کی طرح سیدھی تھی اور اس پر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ اس لیے پہلے وہ کوشش کر کے خود چڑھا اور پھر جھک کر لڑکی کو کھینچ لیا۔ وہ بے ہوش تھی یا مر چکی تھی۔ شامی نے اس کی نبض دیکھی اور پھر دل کی دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں شامی کے اپنے دل کی دھڑکن خاصی تیز ہوگئی تھی۔

لڑکی کے پھیپھڑوں میں پانی بھر گیا تھا اور شاید دل بھی رک گیا تھا۔ شامی نے اسے سیدھا لٹایا اور سر بائیں طرف موڑ دیا اور پھر ہمت کر کے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر رکھے اور پر زور دباؤ ڈالا۔ لڑکی کے منہ سے پانی نکلا۔ ہر بار دباؤ ڈالنے پر پانی خارج ہو رہا تھا۔ دوسری یا تیسری بار دباؤ ڈالنے پر لڑکی کھانسنے لگی اور کھانسی کے دوران اس کے منہ سے پھر پانی نکلنے لگا۔ یہ پانی ابھی پھیپھڑوں میں تھا۔ شامی نے اطمینان کا سانس لیا۔ لڑکی کھانس رہی تھی لیکن اس کے حواس بحال نہیں ہوئے تھے۔ جب اس کے پھیپھڑوں سے سارا پانی نکل گیا تو اس نے نڈھال ہو کر سر ڈال دیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ شامی نے ٹارچ کا رخ اس کی طرف کیا۔ وہ دل کش لڑکی تھی۔ عمر شاید بائیس چوبیس برس تھی اور جسم کسی قدر گداز تھا۔ اس موسم میں اس نے سادہ ریشمی سوٹ پہن رکھا تھا جو بھیگ کر نہ ہونے جیسا رہ گیا تھا۔ اس کے تمام جسمانی خدوخال نمایاں ہو رہے تھے۔ شامی نے جھینپ کر ٹارچ ہٹالی اور آہستہ سے بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اے، تم ہوش میں ہو... میری آواز سن رہی ہو؟"

لیکن لڑکی بے ہوش ہو چکی تھی۔ شاہی نے اسے ہلایا جلایا اور جب اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تو اسے اٹھا کر شانے پر ڈال لیا۔ وہ وزنی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ شاہی کو اس کا وزن گراں گزرتا۔ پانچ منٹ بعد وہ اسے گیسٹ ہاؤس کے کمرے میں آتش دان کے سامنے لٹا چکا تھا کیونکہ اس وقت بھی آتش دان جل رہا تھا۔ اس میں پڑی لکڑی بھی انگاروں میں بدل چکی تھی لیکن ابھی تک حرارت دے رہی تھی۔ لڑکی نے سامنے کے رخ پر ہلکی سی کڑھائی والا نیلا ریشمی سوٹ پہن رکھا تھا اور اسی رنگ کا دوپٹا تھا جو بھیگ کر اس کے لباس سے چپک گیا تھا۔

شاہی نے پہلے اپنے بھیگے کپڑے اتارے اور دوسرا لباس پہن لیا۔ پھر تولیا لا کر لڑکی کو بھی ممکنہ حد تک خشک کر دیا۔ یعنی بال اور چہرہ... لباس پانی جذب کرنے والا نہیں تھا اس لیے اس کا پانی نچڑ گیا تھا مگر بھی کچھ گیلا تھا جسے شاہی نے تولیے سے مزید خشک کر دیا۔ یہ کام کر کے اس نے لڑکی کو کمبل اوڑھا دیا اور خود کچن میں آیا۔ فریج سے دودھ کا ایک پیکٹ نکال کر اسے گرم کیا۔ ایک گلاس لڑکی کے لیے نکالا اور ایک اپنے لیے۔ لڑکی آنکھیں بند کیے کراہ رہی تھی۔ شاید وہ ہوش میں آنے والی تھی اور پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور شاہی پر نظر پڑتے ہی وہ اچھل کر بیٹھ گئی۔ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تک... کون ہو تم... میں کہاں ہوں؟"

"میں شاہی ہوں اور تم ایک فارم ہاؤس میں ہو۔" شاہی کہتے ہوئے آگے بڑھا تو وہ چلائی۔ "خبردار! میرے قریب مت آنا۔"

شاہی رک گیا۔ "میں قریب نہیں آرہا لیکن تم یہ دودھ پی لو، تمہیں اس کی ضرورت ہے۔"

"ہرگز نہیں... تم نے دودھ میں کچھ ملا دیا ہے۔ میں تمہارے عزائم کامیاب ہونے نہیں دوں گی۔" اس نے مزید سہم کر کہا اور کمبل اپنے گرد مضبوطی سے لپیٹ لیا۔

شاہی نے غور سے اسے دیکھا۔ "لگتا ہے تم خواتین کے رسائل شوق سے پڑھتی ہو؟"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" لڑکی نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

"تمہارے ڈائیلاگ سے۔" شاہی نے دودھ کا گلاس اس کے سامنے رکھ دیا۔ "پی لو، اس میں کچھ نہیں ملا ہے۔" لیکن جب لڑکی نے حرکت نہیں کی تو اس نے اپنا والا گلاس اس کے سامنے رکھ دیا جس سے وہ کئی گھونٹ لے چکا تھا۔

"اچھا یہ لو... یہ میں نے پیا ہے۔"

"میں کہاں ہوں؟" لڑکی نے کہا۔ اس نے گلاس اٹھا لیا کیونکہ سردی سے اس کی رنگت ہلکی نیلی پڑ گئی تھی اور اسے واقعی کسی گرم چیز کی ضرورت تھی۔

"یہ میرے دوست کا فارم ہاؤس ہے۔ اس جگہ سے کوئی سو گز دور ہو گا جہاں تم جھیل میں گری تھیں۔ ویسے اتنے سویرے اور عام سے کپڑوں میں تم جھیل کے پاس کیا کر رہی تھیں؟"

لڑکی نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے نیچے رکھ دیا۔ اس سے ظاہر تھا کہ وہ خوش خوراک تھی۔ یہ بات اس کی صحت سے بھی ظاہر تھی۔ گرم دودھ نے حیرت انگیز اثر کیا تھا اور ایک منٹ میں اس کے چہرے سے سرخی جھلکنے لگی۔ شاہی نے کچھ دیر بعد اپنا سوال دہرایا اور اس میں اضافہ کیا۔ "تم نے بتایا نہیں اور کیا تم یہیں کہیں کی رہنے والی ہو؟"

"ہاں..." وہ ہچکچائی۔ "میں نے کسی سے بچنے کے لیے جھیل میں چھلانگ لگائی تھی۔"

شاہی اچھل پڑا۔ "یہ خودکشی کا کیس ہے؟"

"نہیں... لیکن شاید میں نے اسی وجہ سے جھیل میں چھلانگ لگائی تھی۔ میں اب مرجانا چاہتی ہوں۔"

"مگر کیوں؟"

شاہی کے سوال پر یکایک لڑکی کی بڑی بڑی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے اور ان آنسوؤں کی مناسبت سے وہ رو دینے والے انداز میں بولی۔ "بابا میری شادی اپنے کزن سے کرنا چاہتے ہیں جو پہلے ہی ایک بیوی کو دنیا سے رخصت کر چکا ہے۔"

شاہی نے وجہ پر غور کیا اور نفی میں سر ہلایا۔ "خودکشی کے لیے یہ وجہ ناکافی ہے۔ اصل بات بتاؤ۔"

اس بار لڑکی اچھل پڑی۔ "تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ اصل وجہ نہیں ہے؟"

شاہی فخریہ انداز میں مسکرایا۔ "اسے چھوڑو... وہ خوش نصیب کون ہے جس کی خاطر تم نے خودکشی کی کوشش کی؟"

اس بار لڑکی دم بخود رہ گئی..... خاصی دیر تک اس سے بولا نہیں گیا۔ "کیا تم جادوگر ہو؟"

"نہیں لیکن مجھے لوگوں کے بارے میں پتا چل جاتا ہے۔" شاہی نے گپ مارنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔

"اچھا تو بتاؤ وہ کون ہے؟"

"بتایا تو ہے، خوش نصیب ہے۔ اب نام پتا مجھے کیا

معلوم۔" شاہی نے کہا۔ "ویسے تم نے اپنا نام نہیں بتایا اب تک۔ مجھے شاہ میر کہتے ہیں، پیار سے شاہی بھی کہلاتا ہوں۔"

"روشنا چنگیزی۔" اس نے تعارف کرایا۔ "اگر یہ گھر اس جگہ سے سو گز کے فاصلے پر ہے تو یہاں سے تیسرا فارم ہاؤس ہمارا ہے۔ میرے والد پروفیسر وقار چنگیزی ہیں۔"

"وقار چنگیزی۔" شاہی نے جھرجھری لی۔ "کتنا خوف ناک نام ہے۔"

"چنگیزی کی وجہ سے کہہ رہے ہو، یہ ہماری ذات ہے۔ بابا کا کہنا ہے کہ ہمارا خاندان کئی سو سال سے بالکل خالص چلا آرہا ہے... یعنی ہم غیر چنگیزیوں میں شادی نہیں کرتے۔"

"اسی وجہ سے تمہیں کزن سے شادی پر مجبور کیا جارہا ہے؟ اور میں نے کب چنگیزی کو خوف ناک کہا؟ میرا اشارہ تو وقار کی طرف ہے۔"

روشنا نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔ "وقار کہاں سے خوف ناک ہو گیا؟"

"ابھی تم دادا حضور سے ناواقف ہو۔ ان کے سامنے تو چنگیز خان بھی رحم دل لگتا ہے۔"

روشنا کو شاہی کے دادا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے بے دلی سے کہا۔ "تم نے مجھے بچا کر اچھا نہیں کیا۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔" شاہی نے سر کھجایا۔

"کیا؟"

"یہی کہ تمہیں بچا کر اچھا نہیں کر رہا ہوں۔" شاہی نے جواب دیا۔ "خیر چھوڑو، اب تو بچا لیا ہے۔ یہ بھی اچھی بات ہے کہ تمہارا گھر یہاں سے صرف سو گز کے فاصلے پر ہے۔"

"میں ہرگز واپس نہیں جاؤں گی۔ اس سے بہتر ہے کہ تم مجھے دوبارہ جھیل میں پھینک دو۔"

"یہ ناممکن ہے۔ میں تمہیں سو گز دوبارہ اٹھا کر جھیل تک نہیں لے جا سکتا۔" شاہی نے انکار کر دیا۔ "تمہیں وزن کم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔"

وہ روہانسی نظر آنے لگی۔ "تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟" اس نے کہتے کہتے رونا شروع کر دیا۔ شاہی بوکھلا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کس طرح خاموش کرائے۔ شاہی اس کے آس پاس ناچنے لگا اور جب رکتا تو گھگیا کر ایک ہی جملہ کہتا۔ "پلیز! چپ کر جاؤ۔"

بالآخر جب اس نے وعدہ کیا کہ وہ اسے اس کی مرضی کے بغیر واپس نہیں بھیجے گا اور نہ ہی اس کے چنگیز والد صاحب کو اس کے بارے میں بتائے گا، تب کہیں جا کر وہ چپ ہوئی۔ پھر اس نے کہا۔ "مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

"یہاں کپڑے تو ہیں نہیں لیکن خیر کچھ کرتے ہیں۔"

آدھے گھنٹے میں وہ شاہی کا سلیپنگ سوٹ پہن کر اور اچھی طرح بال خشک کر کے اور انہیں سلجھا کر خاصی اچھی لگنے لگی۔ جب تک اس نے لباس تبدیل کیا اور بال خشک کیے، شاہی اس کے لیے کافی اور بسکٹ لے آیا تھا۔ اس نے پہلی بار لڑکی کو اصل روپ میں دیکھا تھا۔ جسم کی طرح اس کے نقوش بھی کسی قدر گداز تھے۔ موٹی ہرنی جیسی آنکھیں اور دعوت انگیز لب جن کے اطراف میں صبیح رخسار تھے۔ پہلے رنگت نیلی تھی پھر سرخ ہوئی اور آخر اصل یعنی گلابی پر آگئی تھی۔ شاہی کافی لے کر آیا تو کچھ دیر اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ جھینپ گئی۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

وہ بے تکلفی سے صوفے پر کمبل لپیٹے بیٹھی تھی۔ شاہی نے ٹرے اس کے سامنے رکھ دی اور سرد آہ بھر کر بولا۔ "جو دیکھ رہا ہوں، بیان نہیں کرسکتا۔"

روشنا نے اس بار بھی تکلف سے کام نہیں لیا اور کافی کے ساتھ بسکٹ کی پلیٹ خالی کر دی۔ شاہی نے صرف کافی لی۔ وہ منتظر تھا کہ وہ کھا پی لے تو بات آگے بڑھائی جائے۔ لڑکی آسانی سے اس کی جان چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آتی تھی۔ شاید اسے شاہی میں ایک کاٹھ کا الو نظر آگیا تھا جو اس کے کام آسکتا تھا۔

☆☆☆

پروفیسر وقار چنگیزی سچ مچ کے پروفیسر تھے اور کوئی تیس برس تک مختلف کالجوں میں طلبا کو ہسٹری کے مضمون میں پھنسا کر فیل کرتے رہے تھے۔ خاندانی طور پر دولت مند تھے اور خان پور کے علاقے میں ان کی خاصے بڑے رقبے پر زرعی زمین تھی لیکن اسے ٹھیکے پر دے کر خود ساری عمر شہر میں رہے تھے۔ نام کے علاوہ طبیعت میں بھی چنگیزیت پائی جاتی تھی۔ اس لیے بیوی خاصی دیر سے ملی اور جلد ساتھ چھوڑ گئی۔ یعنی اس دنیا سے رخصت ہوئی۔ نشانی میں روشنا کو چھوڑ گئی تھی۔ اس لحاظ سے روشنا، پروفیسر چنگیزی کی ایک ہی اولاد تھی لیکن وہ اس کے ساتھ بھی نرم سلوک نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ اس سے محبت بہت کرتے تھے لیکن محبت ان کی چنگیزیت کے آڑے نہیں آتی تھی۔

او لیول تک روشنا نے ایک محدود سی زندگی گزاری تھی۔ گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر۔ جب سات سال کی تھی تو ماں مر گئی تھی، تب سے ایک گورنس نے اسے پالا تھا

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور روشا اسے ماں کی طرح سمجھنے لگی تھی لیکن جیسے ہی اس نے اسکول کی تعلیم مکمل کی پروفیسر صاحب نے گورنس کی چھٹی کر دی۔ روشا نے پہلی بار ان کے سامنے احتجاج کیا۔ پروفیسر کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔

یوں گھر میں موجود روشا کا واحد ہمدرد اور غم گسار بھی رخصت ہو گیا۔ اسے ایک اچھے کالج میں داخل کیا گیا تھا۔ صبح سے دوپہر تک کالج میں اچھا وقت گزر جاتا لیکن اس کے بعد باقی دن گھر میں گزارنا بہت مشکل لگتا۔ پروفیسر صاحب تو اپنے کمرے یا اسٹڈی میں ہوتے تھے اور وہاں سے صرف کھانے کے وقت نکلتے تھے۔ روشا سے ان کی ملاقات اکثر کھانے کی میز پر ہوتی تھی۔ اس میں بھی روشا کے لیے وقت ذرا مشکل ہی رہتا تھا کیونکہ پروفیسر صاحب اس سے سارے دن کی رپورٹ لیا کرتے تھے اور اپنے فیصلے سناتے تھے۔ دو سال بعد اس نے گریجویشن کر لیا اور جب یونیورسٹی میں داخلے کا مرحلہ آیا تو روشا نے پروفیسر صاحب کی خواہش کے برعکس سوشیالوجی کا انتخاب کیا۔ اسے حیرت ہوئی جب پروفیسر صاحب نے اس پر دباؤ ڈالنے سے گریز کیا۔

یونیورسٹی جانے کے بعد روشا کی روکھی پھیکی اور بور زندگی میں تھوڑی تبدیلی آئی۔ سوشیالوجی کا مضمون ایسا تھا جس میں اسے گھومنے پھرنے اور مختلف جگہوں پر جانے کا موقع ملتا تھا۔ پہلے دوسرے سمسٹر کے بعد گرمیوں کی چھٹیوں میں ڈپارٹمنٹ کی جانب سے اسکردو جانے کا پروگرام بنا تھا۔ مقصد سیر و تفریح کے ساتھ وہاں کی مقامی آبادی کے مسائل کا جائزہ لینا بھی تھا۔ گویا تعلیم کی تعلیم اور تفریح کی تفریح۔ یہ چار ہفتے کا پروگرام تھا اور اس دوران میں ان کو اسکردو کے آس پاس پہاڑی تفریحی مقامات جانے کا موقع بھی ملتا۔ شعبے کے سربراہ پروفیسر حماد اختر ایک منصوبہ بنا کر اور تمام .... انتظامات کر کے روانہ ہوئے تھے۔ وہ بس کے ذریعے اسکردو پہنچے۔

ایک ہفتے تک وہ اسکردو میں ہی گھومتے پھرتے رہے اور اس کے آس پاس کے قابلِ دید مناظر دیکھتے رہے۔ یونیورسٹی کی بس ہونے کی وجہ سے ان کو بہت سہولت ہو گئی تھی اور وہ آرام سے ہر جگہ پہنچ جاتے تھے۔ ایک ہفتے میں وہ یہاں کی بلندی کے عادی ہو گئے تھے۔ اس کے بعد پروفیسر حماد نے اپنے پروگرام کا اعلان کیا۔ ٹیم کو ایک ہفتے کی مہم پر نانگا پربت کے دامن میں واقع فیری میڈو نامی جگہ جانا تھا۔ یہ ایک طویل اور جوکھم بھرا سفر تھا اس لیے پروفیسر نے اعلان کر دیا کہ سب اپنی ذمے داری پر چلیں اور جو رکنا چاہیں وہ اسکردو میں قیام کریں اور ان کی واپسی کا انتظار کریں۔ روشا چلنے کے لیے راضی ہو گئی۔ کل چالیس طلبا اور طالبات تھے جن میں سے بائیس جانے کے لیے راضی ہو گئے۔ روشا جسمانی طور پر مضبوط تھی اور اسے اعتماد تھا کہ وہ یہ سفر کر لے گی۔ مگر جب وہ پیدل روانہ ہوئے، تب اسے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ پروفیسر صاحب نے ان کو کہاں لا پھنسایا تھا لیکن جب وہ فیری میڈو پہنچے تو ان کی ساری کلفت دور ہو گئی۔ روشا نے کبھی تصور میں بھی اتنی حسین جگہ کا نہیں سوچا تھا۔ پھر انہوں نے رائے کوٹ بیس کیمپ جانے کا پروگرام بنایا۔ راستے کی مشکلات سن کر سوائے تین طلبا کے اور کوئی راضی نہیں ہوا۔ ان میں واحد لڑکی روشا تھی۔ اسے اب ان مشکلات میں مزہ آنے لگا تھا۔

وہ صبح سویرے نکلے۔ ایک جنگل اور پھر ایک نالا عبور کر کے وہ گلیشیر تک پہنچ گئے۔ یہاں سے سفر بہت خوف ناک تھا۔ بیس کیمپ تک جانا ماہر کوہ پیماؤں کا کام تھا۔ ان کے پاس نہ تو سامان تھا اور نہ مہارت اس لیے انہوں نے گلیشیر سے واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ واپسی میں وہ ایک ڈھلی پہاڑی سے گزر رہے تھے۔ یہ عین گلیشیر کے اوپر تھی کہ روشا کا پاؤں پھسل گیا اور وہ لڑھکتی ہوئی گلیشیر کی طرف جانے لگی اور عین اس وقت جب وہ گلیشیر پر گرنے والی تھی اچانک کسی نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے روک لیا۔ روشا کے ہوش و حواس مکمل طور پر گم ہو چکے تھے اور اسے نہیں معلوم کہ وہ کس طرح واپس اوپر آئی۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے ایک بڑھی ہوئی داڑھی مونچھوں والے شخص کو سامنے پایا۔ اس نے پیروں میں کوہ پیماؤں جیسے جوتے پہن رکھے تھے اور اس کی پشت پر ایک بڑا بیگ بندھا ہوا تھا۔ اس نے مسکرا کر روشا کی طرف دیکھا۔

”کیسی ہیں آپ؟... مجھے ضیا تیموری کہتے ہیں۔“

”روشا! انہوں نے تمہاری جان بچائی ہے۔“ پروفیسر حماد نے کہا۔ ”میرے خدا! تم بس گرنے والی تھیں جب انہوں نے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا۔“

”تھینک یو۔“ روشا آہستہ سے بولی۔

”آپ کوہ پیما ہیں؟“ پروفیسر حماد نے دلچسپی سے پوچھا۔

اس نے سر ہلایا۔ ”پیشہ ور نہیں، شوقیہ ہوں۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ روشا نے پوچھا۔

اس نے دلچسپی سے روشا کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ اس کی نظر بہت گہری تھی۔ ”فیری میڈو کی طرف۔“

”تب آپ ہمارے مہمان ہوں گے۔“ پروفیسر حماد نے اسے پیش کش کی تو وہ مان گیا۔ واپسی کے سفر میں وہ ان کے ساتھ تھا۔ وہ ان کو اپنے تجربات سنا رہا تھا۔ اس کا تعلق اسلام آباد سے تھا جہاں اس کا کنسٹرکشن کا کاروبار تھا۔ سال کے دس مہینے وہ لوگوں کے لیے بنگلے اور کوٹھیاں بناتا تھا اور دو مہینے کے لیے ان علاقوں کی طرف نکل جاتا تھا۔

”آپ اپنے گھر والوں کی وجہ سے کوئی خطرہ نہیں لیتے ہیں؟“ روشا نے خیال ظاہر کیا تو وہ ہنس دیا۔

”میرے گھر میں میرے سوا کوئی نہیں ہے۔ ایک بھائی اور ایک بہن ہے۔ ان کے اپنے گھر ہیں۔ ماں باپ گزر چکے ہیں اس لیے بالکل اکیلا ہوں۔“

اس نے سیاہ شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی اور سر پر اونی ٹوپی تھی۔ چہرے کا جو حصہ داڑھی مونچھوں سے بچ رہا تھا وہ ان سے ڈھک گیا تھا اس لیے روشا اس کے صحیح خدوخال نہیں جان سکی تھی۔ ویسے اس کا اندازہ تھا کہ وہ چالیس کے آس پاس ہے۔ اس کا جسم بالکل فٹ اور مضبوط تھا جیسا کہ ایک کوہ پیما کا ہونا چاہیے۔ شام ہونے سے پہلے وہ واپس فیری میڈو پہنچ گئے جہاں ضیا تیموری فوراً ہی طلبا اور طالبات میں مقبول ہو گیا۔ وہ ان کے خیمے میں تھا۔

روشا خود کو بہتر محسوس نہیں کر رہی تھی۔ وہ لڑکیوں کے لیے مخصوص خیمے میں آ گئی۔ ابھی تک اس حادثے کا اثر تھا اس لیے اس نے کچھ دیر آرام کر لینا مناسب سمجھا۔ وہ سو کر اٹھی تو رات ہو چکی تھی اور کھانا بن رہا تھا۔ ضیا تیموری اسے نظر نہیں آیا۔ وہ سمجھی کہ وہ جا چکا ہے لیکن الاؤ کے پاس بیٹھے ایک شخص نے اس سے طبیعت پوچھی تو وہ چونکی۔ وہ ضیا تیموری تھا۔ روشا حیران رہ گئی۔ اس نے شیو کر لی تھی اور داڑھی کے ساتھ مونچھیں بھی غائب تھیں۔ وہ بالکل بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ روشا اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ ”اب بہتر ہوں۔ واپس آنے کے بعد میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”بلندی کا خوف آدمی کو کس طرح پکڑ لیتا ہے۔“

روشا اس سے باتیں کرتی رہی اور اس نے غیر ارادی طور پر اسے اپنے بارے میں بہت کچھ بتا دیا۔ روشا اس سے متاثر ہوئی۔ ضیا تیموری اگلے دن چلا گیا۔ اسکردو میں مزید دو ہفتے قیام اور گھومنے کے بعد انہوں نے واپسی کی راہ اختیار کی۔ روشا بہت خوش تھی۔ اسے خوش گوار حیرت ہوئی جب واپسی پر پروفیسر صاحب کئی دن تک اس سے سفر کی روداد سنتے رہے۔ جب اس نے ضیا تیموری کے بارے میں بتایا تو وہ چونک گئے۔

”اگر اس کا تعلق تیمور لنگ کی نسل سے ہے تو یقیناً وہ اچھا آدمی نہیں ہوگا۔“

”بابا۔“ روشا نے احتجاج کیا۔ ”اس نے میری جان بچائی تھی۔“

”وہ ٹھیک ہے لیکن اس سے تیموری خون کی شرارت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

پروفیسر چنگیزی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ اگر چنگیز خان ان کا ہیرو تھا تو تیمور لنگ ان کے نزدیک کسی ولن سے کم نہیں تھا۔ روشا کے نزدیک ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی اس لیے اس نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی اس کے خیال میں ضیا تیموری کا باب فیری میڈو میں ہی بند ہو چکا تھا۔

گرمی کی چھٹیوں کے بعد یونیورسٹی کھل گئی اور روشا اس میں مصروف ہو گئی۔ اس دن وہ کچھ ساتھی طلبا کے ساتھ یونیورسٹی کے لان میں ایک اسٹڈی وزٹ کا پروگرام طے کر رہی تھی کہ اس نے اچانک ہی ضیا تیموری کو اپنے سامنے پایا۔ وہ حیران رہ گئی۔ ”آپ یہاں...؟“

”ہاں۔“ وہ بے تکلفی سے بولا۔ اس نے ایک بڑا سا خاکی لفافہ اٹھا رکھا تھا۔ ”اپنی ماسٹرز کی ڈگری نکلوانے آیا تھا۔ سوچا تم سے بھی ملتا چلوں۔“

”ماسٹرز؟ کس سبجیکٹ میں کیا ہے؟“

”آئی آر میں۔“ اس نے جواب دیا۔

روشا نے اس کا تعارف کرایا۔ اس نے سب سے ہاتھ ملایا اور پھر روشا سے کہا۔ ”میں ذرا اکیلے میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ چونکی۔ ”اکیلے میں...؟“

”بس دو منٹ۔“ اس نے اصرار کیا تو وہ اپنے ساتھیوں سے معذرت کر کے اس کے ساتھ لان میں ہی ایک طرف آ گئی۔

”جی فرمایئے۔“

ضیا نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔ ”میں صرف تم سے ملنے کی خاطر یہاں آیا ہوں۔“

”ڈگری؟“ روشا نے لفافے کی طرف اشارہ کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

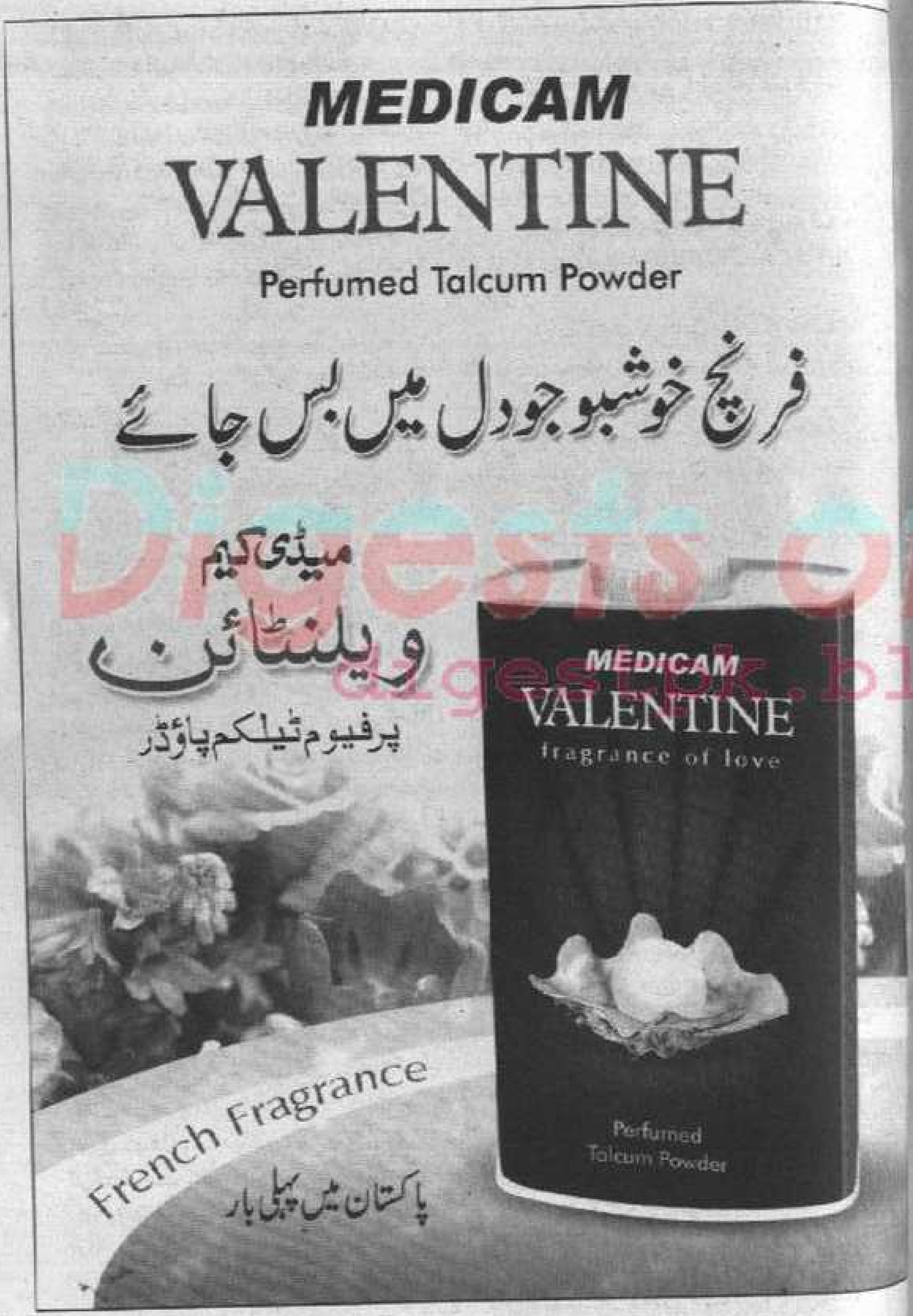

''اسے تم بہانہ سمجھ سکتی ہو۔'' اس نے لفافہ تھما دیا۔ ''ویسے ڈگری بھی نکلوائی تھی۔''

''آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟''

وہ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کچھ لوگ ایک ہی ملاقات میں آدمی کے ذہن پر چھا جاتے ہیں اور پھر ان سے بار بار ملنے کو دل کرتا ہے۔''

روشنا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے کچھ کہا نہیں۔ ضیا نے ایک کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔ ''یہ میرا کارڈ ہے۔ ممکن ہے کبھی تمہارا دل بھی مجھ سے ملنے کو چاہے۔ صرف ایک کال کر دینا... او کے بائے۔'' کارڈ اسے تھماتے ہی وہ وہاں سے چلا گیا۔ روشنا کچھ دیر خود پر قابو پاتی رہی۔ اس نے کارڈ اپنے پرس میں رکھ لیا۔ پروفیسر صاحب کو ریٹائر ہوئے کئی سال ہو چکے تھے۔ وہ اب تک اپنی اسلام آباد والی کوٹھی میں مقیم تھے۔ پھر اچانک انہوں نے اپنی زمین پر منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وہاں بھی جھیل کے ساتھ ان کی شاندار کوٹھی تھی۔ روشنا نے کہا۔ ''پاپا! اتنی جلدی فیصلہ کر لیا... ابھی میرا کورس باقی ہے۔''

''تم اپنی تعلیم جاری رکھ سکتی ہو۔'' وہ اطمینان سے بولے۔

''لیکن میں اکیلے یہاں نہیں رہ سکتی۔''

''تم ہاسٹل میں رک سکتی ہو۔''

''ہاسٹل میں...؟''

''ہاں، یونیورسٹی کی نصف طالبات ہاسٹل میں رہتی ہیں۔ وہ کہیں اور سے پڑھنے کے لیے آتی ہیں۔''

یوں پروفیسر صاحب جھیل کے کنارے والی کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی زمینوں کی دیکھ بھال بھی خود شروع کر دی کیونکہ کئی سال پہلے وہ اسے ٹھیکے سے واپس لے کر زمین پر کینو، مالٹے اور سنگترے کے باغات لگا چکے تھے۔ جانے سے پہلے انہوں نے روشنا کے لیے ایک نجی ہاسٹل میں جگہ حاصل کر لی۔ یہ مہنگا لیکن تمام سہولتوں سے آراستہ تھا اور روشنا یہاں آرام سے پڑھ کر اپنا آخری سمسٹر دے سکتی تھی۔

روشنا تن من سے پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔ اسے ایک کتاب کی ضرورت تھی اور اتوار کے دن وہ وقت نکال کر نزدیکی بک اسٹور تک آئی۔ کتاب دستیاب نہیں تھی لیکن بک اسٹور کے مالک نے اس سے وعدہ کیا۔ ''میں کل شام تک منگوا لوں گا۔''

روشنا مایوس باہر نکل رہی تھی کہ سامنے سڑک پر ضیا کی گاڑی رکی اور دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا۔ ضیا بے تابی سے لپک کر اس کے پاس آیا۔ ''تم... یہی ہو... یہاں کیا کر رہی ہو... مجھے کال نہیں کی... کارڈ مس ہو گیا تھا؟'' اس نے ایک ہی سانس میں سوالات کر ڈالے۔

روشنا اس کے انداز پر گڑبڑا گئی۔ ''وہ کارڈ... نہیں وہ تو میرے پاس ہے۔''

ضیا مرجھا گیا اور اس کا جوش و خروش ذرا کم ہوا۔ ''اچھا، میں ہی پاگل ہوں جو تمہارے بارے میں سوچتا رہا اور تم کو یاد کرتا رہا۔''

''آپ مجھے کیوں سوچتے اور یاد کرتے رہے؟'' روشنا نے نظریں چرا کر کہا۔

سڑک پار ایک آئس کریم پارلر تھا۔ ضیا نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہاں چلیں...؟ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

''وہ دراصل... میرے پیپرز ہونے والے ہیں اس لیے...''

''پلیز۔'' اس نے التجا کی تو روشنا اس بار انکار نہیں کر سکی۔ دس منٹ بعد وہ آئس کریم پارلر میں سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے سامنے بیٹھے تھے۔ ضیا اسے بتا رہا تھا کہ وہ اسے کتنا یاد کرتا رہا اور اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ روشنا نے پھر سوال کیا۔

''لیکن کیوں؟''

''کیا تمہیں اندازہ نہیں ہے؟'' اس نے روشنا کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں، مجھے اندازہ نہیں ہے۔''

ضیا حیران ہوا۔ ''تمہیں نہیں پتا کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

روشنا ششدر رہ گئی۔ ''نہیں۔''

''اوہ۔'' وہ بولا۔ ''میں تو سمجھا تھا کہ تم میرا حالِ دل جان گئی ہو۔''

روشنا خاموش رہی۔ اس نے سامنے رکھی آئس کریم کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ ضیا بھی خاموش ہو گیا۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا۔ پھر روشنا کھڑی ہو گئی۔ ضیا نے بل کی رقم میز پر رکھی اور پھر اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''شاید تمہیں میری بات اچھی نہیں لگی... لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اس بارے میں سوچو... ٹھیک ہے میں عمر میں تم سے بڑا ہوں۔ ابھی میری عمر چھتیس ہے اور تم چوبیس کی بھی نہیں ہوئی ہو... پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ تم سوچو... اور جب سوچ لو تو مجھے کال

Digests of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر کے ہاں یا نہیں کہہ دو... یقین کرو اگر تم نے نہیں کہا تو میرا تم سے کہیں سامنا بھی ہوا تو میں انجان بن جاؤں گا۔"

روشنا نے سر ہلایا اور وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر رخصت ہو گیا۔ امتحان کے دنوں میں انہی سوچوں نے اسے تنگ کیا اور اس کی تیاری متاثر ہوئی لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح پیپر دے دیے۔ تھیسس کا کام بھی تقریباً مکمل تھا اور اسے جمع کرانا تھا کیونکہ یہ بس ایک دن کا کام تھا اس لیے وہ گھر آ گئی۔ پروفیسر صاحب اسے دیکھ کر خوش ہوئے۔ "اچھا ہوا تم آ گئیں۔"

"کیوں بابا... کوئی خاص بات ہے؟"

"خاص بات تو ہے۔ میں تمہارے رشتے کے لیے پریشان تھا۔"

روشنا کا دل دھڑک اٹھا۔ "تو کیا اب نہیں ہیں؟"

"نہیں کیونکہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔" وہ بولے۔ "خیر، ابھی تو تم اتنا لمبا سفر کر کے آئی ہو، فریش ہو جاؤ اور آرام کر لو... رات کے کھانے کے بعد بات کریں گے۔"

شہر والی کوٹھی میں پروفیسر صاحب نے صرف ایک ملازم رکھا ہوا تھا اور ایک روشنا کی گورنس تھی لیکن یہاں چوکیدار سمیت چار ملازمین تھے۔ ایک مالی، ایک باورچی اور ایک پروفیسر صاحب کا ذاتی ملازم تھا۔ صفائی اور دوسرے کاموں کے لیے دو ملازمائیں روز آتی تھیں۔ یہ خاصا بڑا فارم ہاؤس تھا اور عقب میں پروفیسر صاحب کی ساری زمین بھی تھی جو تقریباً تیس ایکڑ تھی اور اس پر پھل دار درخت تیار تھے۔ روشنا دوپہر میں آئی تھی، شام کو وہ باغات کی سیر کے لیے نکلی۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے بھی دو افراد مستقل ملازم تھے جو اہل خانہ سمیت رہتے بھی وہیں تھے۔ ان کے کچے گھر زمین کے بالکل آخری حصے میں بنے تھے۔ مگر اس سیر کے دوران میں روشنا کا ذہن پروفیسر صاحب کی بات پر اٹکا ہوا تھا۔

باورچی نوجوان آدمی تھا لیکن کھانا بہت اچھا بناتا تھا۔ روشنا کو کھانا اچھا لگا مگر فکر میں اس سے صحیح سے کھایا نہیں گیا۔ کھانے کے بعد پروفیسر صاحب نے موسم کی مناسبت سے باورچی سے کافی لانے کو کہا اور روشنا کو لے کر اپنے کمرے میں آ گئے۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود ٹہلنے لگے۔ اچانک رک کر انہوں نے روشنا سے پوچھا۔ "تم شاہ جہاں کو جانتی ہو؟"

"وہی جو آپ کے دور کے کزن ہیں؟" روشنا بولی۔

"ہاں وہی... جی ٹی روڈ پر اس کا گیس اپلائنسز بنانے کا کارخانہ ہے... عمر بھی زیادہ نہیں ہے... تم سے دس برس بڑا ہے۔"

روشنا کا دم خشک ہو گیا۔ "آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟"

پروفیسر صاحب نے اس کی طرف دیکھا۔ "روشنا! اس نے مجھ سے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔"

"میرا؟" روشنا کا لہجہ تیز ہو گیا۔ "آپ جانتے ہیں وہ ایک بار شادی کر چکا ہے اور اس کی بیوی اس کے ظلم کا شکار ہو کر مر گئی تھی؟"

"اس کے بارے میں ساری کہانیاں جھوٹ ہیں جو اس کی بیوی کے خاندان والوں نے پھیلائی ہیں۔ وہ کینسر سے مری تھی۔"

"کینسر بھی اس کے ظلم و ستم کی وجہ سے ہوا ہوگا۔" روشنا تلخی سے بولی۔ "آپ نے اس سے پوچھا نہیں کہ اسے میرا رشتہ مانگنے کی ہمت کیسے ہوئی؟"

"روشنا! میرے خیال میں یہ اچھا رشتہ ہے۔" پروفیسر صاحب بولے۔

"اس میں کیا اچھائی ہے؟"

"وہ ہمارے خاندان کا ہے اور تم جانتی ہو کہ ہمارے ہاں باہر شادی نہیں کی جاتی۔"

"بابا! یہ پرانی باتیں ہیں۔"

"ہر پرانی بات روایت ہوتی ہے۔"

"تب آپ لوگوں کو اپنی نئی نسل کو اعلیٰ تعلیم بھی نہیں دلانی چاہیے تھی کیونکہ یہ بھی روایت میں نہیں تھی۔"

"روشنا! تم مجھ سے بحث کر رہی ہو۔" پروفیسر صاحب کا موڈ خراب ہو گیا۔

"میں آپ سے بحث نہیں کر رہی۔" وہ کھڑی ہو گئی۔ "میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ میں اس شخص سے کسی صورت شادی نہیں کر سکتی۔ آپ اسے انکار کر دیں۔"

"روشنا... میری بات سنو..." پروفیسر صاحب آوازیں دیتے رہ گئے اور وہ ان کے کمرے سے نکل آئی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے ان کے سامنے ایسا طرز عمل دکھایا تھا۔

وہ ساری رات جاگتی اور روتی رہی۔ اگلی صبح پروفیسر صاحب نے اس کی سوجی آنکھیں دیکھیں لیکن انہوں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ معمول کے مطابق رہے اور ناشتے کے بعد باغات کے معائنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ روشنا کا خون جل کر رہ گیا۔ اس کا دماغ خراب ہو رہا تھا لیکن تھیسس کو

آخری بار دیکھنا تھا... کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اس لیے وہ سب بھلا کر اس میں لگ گئی۔ دو دن میں اس نے کام مکمل کر لیا اور اس دوران میں صرف کھانے کے لیے باہر نکلی۔ دونوں باپ بیٹی میں سوائے ضرورت کے کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ تیسرے دن اس نے ناشتے کی میز پر کہا۔ "آج میں اسلام آباد جا رہی ہوں۔ کل تھیسس جمع کرانا ہے۔"

پروفیسر صاحب اسلام آباد والی کوٹھی کرائے پر دے چکے تھے اور اس نے ہاسٹل بھی چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے پوچھا۔ "تم کہاں رکو گی؟"

"میری فرینڈ شہناز ہے اس کے گھر رکوں گی۔" روشنا نے جواب دیا۔ "آپ کے پاس اس کے گھر کا نمبر ہے؟"

"نہیں دے جاؤ اور کوئی موبائل نمبر ہو تو وہ بھی دے دو۔"

روشنا نے دونوں نمبر دے دیے۔ شہناز اس کی کلاس فیلو بھی تھی اور وہ بھی تھیسس جمع کرانے والی تھی۔ اگلے دن انہوں نے جا کر تھیسس جمع کرا دیا۔ روشنا کا ابھی واپس جانے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا اس لیے جب شہناز نے اسے چند دن کے لیے روکا تو وہ مان گئی اور اس نے فون کر کے پروفیسر صاحب کو رکنے کی اطلاع دے دی۔ اس رات جب وہ سونے سے پہلے اپنی چیزیں سنبھال کر پرس میں رکھ رہی تھی تو اچانک ضیا کا کارڈ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس رات وہ دیر تک اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ اگلے دن جب وہ کمرے میں اکیلی تھی تو اس نے ضیا کا موبائل نمبر ملایا۔ اس کے پاس موبائل تھا لیکن وہ اسے بہت کم استعمال کرتی تھی۔ ضیا نے کچھ دیر بعد کال ریسیو کی۔ "ہیلو۔"

"میں روشنا بات کر رہی ہوں۔"

"روشنا۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "تو تم نے فیصلہ کر لیا؟"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"یہ میں آپ کو مل کر بتا سکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، تم جگہ بتاؤ میں آ جاتا ہوں۔"

"باہر کی جگہ...؟" وہ ہچکچائی۔

"یونیورسٹی کے سامنے ایک کیفے ہے، اچھی پُرسکون جگہ ہے اور زیادہ ہجوم بھی نہیں ہوتا۔" ضیا نے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں وہاں آج شام کو چار بجے آؤں گی۔"

روشنا نے شہناز کو نہیں بتایا تھا بلکہ وہ اپنے ایک رشتے دار کے گھر جانے کا کہہ کر نکلی تھی۔ ٹھیک چار بجے وہ کیفے کے سامنے پہنچی تو ضیا اس کا منتظر تھا۔ اس نے ایک کونے کی میز بک کرائی تھی جہاں ماحول اچھا خاصا تاریک تھا۔ روشنا یہاں آ گئی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیسے بات کرے اور بات بھی وہ جو اس کی انتہائی ذاتی تھی۔ ضیا نے پوچھا نہیں، وہ منتظر تھا کہ روشنا خود بتائے۔ آخر اس نے گلا کھنکھار کر کہا۔

"بابا میری شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔"

ضیا چونکا۔ "کس سے؟"

"ان کے ایک کزن ہیں۔ پہلے بھی شادی کی ہے اور بیوی مر چکی ہے۔" روشنا نے آگاہ کیا۔

"تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"اگر میرا کوئی ارادہ ہوتا تو میں یہاں آپ کے سامنے بیٹھی ہوتی۔" اس نے تیز لہجے میں کہا تو ضیا گھبرا گیا۔

"او کے... او کے، یعنی تم بالکل تیار نہیں ہو؟"

"کیا بات ہے۔ اس شخص کے بارے میں خاندان میں کہانیاں پھیلی تھیں۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا تھا اور وہ اسی وجہ سے کڑھ کڑھ کر کینسر کی مریضہ ہو گئی تھی۔ آپ سوچیں، کیا ایسے شخص سے شادی کی جا سکتی ہے؟"

"بالکل نہیں... یہ تو تمہارے ساتھ ظلم ہے۔" ضیا بولا۔ "میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"پتا نہیں آپ یا کوئی اور میرے لیے کچھ کر سکتا ہے۔" وہ مایوسی سے بولی۔ "کیونکہ بابا نہایت ضدی آدمی ہیں۔ وہ ایک بار کوئی فیصلہ کر لیں تو اس پر ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔"

ضیا نے سوچ کر کہا۔ "ابھی تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے لیکن میں اس پر غور ضرور کروں گا۔ کوئی حل نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ملتے رہیں۔ تم یہاں کہاں رکی ہو؟"

"ایک سہیلی کے گھر ہوں اور اسے بھی نہیں معلوم کہ میں یہاں آپ سے ملنے آئی ہوں۔"

"تم کب تک رکو گی؟"

"ابھی دو تین دن ہوں۔"

"بس تو ان دو تین دنوں میں کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔" ضیا نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

☆☆☆

شامی نے کہا۔ "تم نے تو کہا تھا کہ تمہیں اس سے محبت

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگئی ہے۔"

روشنا شرمائی اور رک رک کر بولی۔ "جب اس سے... ملنا شروع کیا... تو جیسے خود بہ خود..."

"چونتیس سالہ رنڈوے سے بچنے کے لیے تم نے چھتیس سالہ کنوارے کو قبول کرلیا... فرق کیا ہوا؟"

"فرق کیوں نہیں ہے۔" وہ برا مان کر بولی۔ "شاہ جہاں سے مجھے نفرت ہے اور ضیا سے... نہیں ہے۔"

شامی کا خیال تھا کہ روشنا نے اس جیسے کسی نوجوان کی حق تلفی کی تھی لیکن یہ خیال اس نے دل میں رکھا کیونکہ اتنی دیر میں اس نے دیکھ لیا تھا کہ خاتون صرف نام کی چنگیزی نہیں تھیں بلکہ مزاج بھی والد صاحب پر گیا تھا۔ اسے تو حیرت تھی کہ اس نے خودکشی کی کوشش کیوں کی؟ یہ سوال اس نے پوچھ لیا۔ روشنا بولی۔ "ابھی کہانی مکمل کہاں ہوئی ہے... آج سے دو دن بعد بابا نے نکاح طے کردیا ہے۔"

"یعنی کل؟"

"ہاں شام کو شاہ جہاں آتا اور سادگی سے ہمارا نکاح کردیا جاتا اور میرا وزٹ آنے کے بعد رخصتی کی جاتی۔"

شامی نے سرد آہ بھری۔ "اپنی بھی کیا قسمت ہے... جسے بچایا وہ ایک سے محبت کرتی ہے اور والد صاحب کسی اور کی منکوحہ بنانا چاہ رہے ہیں۔"

"فضول بات مت کرو۔ میں مر کر بھی اس سے شادی نہیں کروں گی۔" روشنا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے مت کرو اور جس سے مرضی ہو اس سے کرو لیکن یہ بتاؤ کہ باقی کہانی کیا ہے؟"

☆☆☆

پروفیسر صاحب نے گرج کر کہا۔ "یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"

روشنا نے ہمت کر کے انہیں اپنی پسند کے بارے میں بتا دیا تھا۔ پروفیسر صاحب بھڑک اٹھے۔ ایک تو روشنا نے ان کی پسند پر اپنی پسند کو ترجیح دی تھی، دوسرے جسے پسند کیا تھا، وہ ایک تیموری تھا۔ اس لیے یہ شادی ان کے نزدیک ناممکن تھی۔ روشنا نے کہا۔ "بابا! یہ میرا حق ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ تم نے کیا سوچ کر ایک بالکل اجنبی آدمی کو پسند کرلیا جس کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتی ہو۔"

"وہ اچھا آدمی ہے۔"

"ناممکن... کوئی تیموری کبھی اچھا نہیں ہوسکتا۔ روشنا! میں تمہیں کسی تیموری کے ساتھ شادی کر کے رخصت کرنے کے مقابلے میں اپنے ہاتھ سے دفن کرنا پسند کروں گا۔"

روشنا کو یقین تھا کہ وہ ایسا ہی کریں گے بلکہ اس سے پہلے وہ اسے اپنے ہاتھ سے قتل بھی کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود وہ باپ کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ ممکن ہے اگر صرف ضیا سے شادی کا معاملہ ہوتا تو وہ بھی اس بات پر اسٹینڈ نہ لیتی۔ اس نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "بابا! میں صرف ضیا سے شادی کروں گی اور آپ مجھے کسی اور سے شادی کرنے پر مجبور نہیں کرسکتے۔"

"روشنا۔" پروفیسر صاحب غصے کی شدت سے گھٹی گھٹی آواز میں بولے۔ "اپنے کمرے میں چلی جاؤ، اس سے پہلے کہ زندگی میں پہلی بار میرا ہاتھ تم پر اٹھ جائے۔"

روشنا ڈر گئی اور وہاں سے جانے لگی تو عقب سے پروفیسر صاحب کی آواز آئی۔ "اب گھر سے باہر قدم رکھنے کی کوشش مت کرنا۔ تم اعتماد کے لائق نہیں رہی ہو۔"

روشنا اپنی قسمت پر روتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس رات اس نے سب کے سونے کے بعد گھر کے فون سے ضیا کو کال کر کے صورت حال بتائی۔ اس نے کہا۔

"تمہارا باپ ماننے کا بھی نہیں۔"

"تب میں کیا کروں؟"

"اگر تم میں ہمت ہے تو میں آجاتا ہوں، تمہیں لے جاتا ہوں۔ ہم کورٹ میرج کرلیں گے اور اس کے بعد معاملہ پروفیسر صاحب کے سامنے رکھ دیں گے۔ اگر ان کو اپنی عزت عزیز ہوگی تو وہ سب کے سامنے تمہیں میرے ساتھ رخصت کردیں گے۔"

روشنا یہ سن کر کانپ گئی۔ "نہیں، میں ایسا نہیں کرسکتی۔ اس کے علاوہ کچھ اور سوچو۔"

"میری سمجھ میں تو اس کے علاوہ کچھ نہیں آ رہا۔" ضیا مایوسی سے بولا۔ "میری بات لکھ لو، یہ بات کھل گئی ہے۔ اب پروفیسر صاحب اچانک تمہاری شادی کردیں گے اور تب ممکن ہے تم انکار نہ کرسکو۔"

روشنا کا خیال تھا کہ شاید ایسا نہ ہو لیکن دو دن بعد ہی پروفیسر صاحب نے اسے اپنی اسٹڈی میں طلب کرلیا۔ "جی بابا!"

"روشنا!" وہ بولے۔ "میں نے شاہ جہاں کو بلا لیا ہے، تین دن بعد تمہارا اس سے نکاح ہے۔"

"بابا!" وہ چیخ اٹھی۔ "آپ میری مرضی کے بغیر ایسا نہیں کرسکتے۔"

پروفیسر صاحب کچھ دیر اسے دیکھتے رہے پھر انہوں نے اپنی میز کی دراز سے ایک پستول نکال لیا۔ "روشنا! تمہیں یہ شادی کرنا ہوگی۔"

"نہیں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "آپ مجھے گولی مار سکتے ہیں لیکن اس شادی پر مجبور نہیں کرسکتے۔"

روشنا کی توقع کے خلاف پروفیسر صاحب نے پستول کا رخ اس کی طرف کرنے کے بجائے اس کی نال اپنے سر سے لگا لی۔ "روشنا! اگر تم نے انکار کیا تو میں خود کو شوٹ کرلوں گا۔"

روشنا کانپ گئی۔ "بابا... یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میرے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ تین دن بعد تمہاری طرف سے انکار کے بعد میں یہ ذلت برداشت نہیں کرسکوں گا۔"

"پلیز بابا! اسے ہٹائیں۔" روشنا نے روہانسے لہجے میں کہا۔

پروفیسر صاحب نے پستول واپس دراز میں رکھ دیا۔ "ابھی میں نے اسے واپس رکھ دیا ہے لیکن تین دن بعد تم اسے نہیں ہٹا سکو گی۔ اب تم جا سکتی ہو۔" انہوں نے کہتے ہوئے رخ بدل لیا۔

اس رات روشنا نے پھر ضیا کو کال کی اور اسے صورت حال بتائی۔ وہ بولا۔ "دیکھا، میں نے کہا تھا... اور یہ پستول والی دھمکی تمہیں مجبور کرنے کے لیے ہے۔"

"نہیں ضیا! تم نہیں جانتے، بابا بہت ضدی ہیں۔"

"کوئی اپنی جان نہیں دیتا اور تمہارے پاس یہ آخری موقع ہے۔ اب بھی نہیں نکلیں تو تمہیں ان کی مرضی کے سامنے سر جھکانا ہوگا۔"

"نہیں۔" وہ بولی۔ "میں شاہ جہاں سے شادی نہیں کرسکتی۔"

"بس تو تم کل رات بارہ بجے کے بعد گھر سے نکل آنا۔ میں تمہارے فارم ہاؤس کے سامنے تمہارا منتظر ہوں گا۔ ہم پرسوں صبح کورٹ میرج کر کے پروفیسر صاحب کے سامنے حاضر ہو جائیں گے۔"

"لیکن..." روشنا نے کہنا چاہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" ضیا اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "روشنا! میں کل تمہارا انتظار کروں گا۔" ضیا نے کہہ کر رابطہ ختم کردیا۔ روشنا ہیلو ہیلو کہتی رہ گئی۔ اس نے پھر ضیا کا نمبر ملایا لیکن وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے بھی روشنا کو اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ کشمکش میں پڑ گئی تھی کہ کیا کرے۔ اگر وہ رات بارہ بجے یہاں سے نکلتی تو اپنی اور باپ کی عزت کو پیچھے چھوڑ جاتی اور پیچھے رہ جاتی تو پروفیسر صاحب اسے اپنی ضد اور خاندانی روایات کی بھینٹ چڑھا دیتے۔ روشنا کی یہ ساری رات اور اگلا دن بھی اسی کشمکش میں گزرا۔ شام کو اس نے ایک فیصلہ کیا اور پروفیسر صاحب کے سامنے جا پہنچی۔ "بابا! میں شاہ جہاں سے شادی نہیں کرسکتی۔ باقی آپ جس سے چاہیں میری شادی کردیں، میں اف نہیں کروں گی۔"

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔ میں، شاہ جہاں کو ہاں کر چکا ہوں۔"

"یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟"

"ہاں، تم اسے پتھر پر لکیر سمجھو۔" وہ بولے۔

واپس آتے ہوئے روشنا نے فیصلہ کرلیا تھا۔ رات بارہ بجے وہ دبے قدموں گھر سے نکلی۔ گیٹ سے باہر جانا مشکل تھا کیونکہ اس پر اب چوکیدار ہوتا تھا اس لیے اس نے عقبی باغ کا راستہ اختیار کیا۔ رکھوالی کے کتے اس سے مانوس تھے اس لیے دم اٹھائے اسے رخصت کرنے دروازے تک آئے۔ ان کو بلاوجہ بھونکنے سے باز رکھنے کے لیے روشنا ان کو پچکارتی رہی۔ باہر نکل کر اس نے فارم ہاؤس کے سامنے والے حصے کا رخ کیا۔ وہ جہاں سے گزر رہی تھی، وہاں جھاڑیاں تھیں۔ اچانک وہ کسی کی آواز سن کر رک گئی۔ یہ دو افراد تھے جو آپس میں بات کر رہے تھے اور اتنے قریب تھے کہ روشنا ان کی بات سن سکتی تھی۔

"لڑکی سامنے سے آئے گی۔" ایک بولا۔

"اگر کہیں اور سے نکل آئی تو؟" دوسرا بولا۔

"کہیں سے بھی نکلے، آئے گی تو سامنے ہی۔" پہلا بولا۔ "بس اسے قابو کرنا ہے اور لے جانا ہے۔"

روشنا کی جان نکل گئی۔ وہ یقیناً اسی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ظاہر ہے اس وقت کسی اور لڑکی نے تو باہر نہیں آنا تھا۔ لیکن وہ کون تھے اور ان کو کیسے پتا چلا کہ وہ باہر آنے والی ہے؟ اسے شاہ جہاں کا خیال آیا۔ اسے کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ وہ گھر سے نکلنے والی ہے اور اس نے اسے اغوا کرانے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ لیکن اسے کس طرح پتا چلا؟ کیا گھر میں اس کا کوئی مخبر تھا جس نے اس کی اور ضیا کی فون پر بات سن لی تھی؟ یہ تمام باتیں چند لمحے میں اس کے ذہن میں آ گئیں۔ اس دوران میں کوئی کیڑا اس کے پاؤں پر چڑھا اور اس نے بے ساختہ پاؤں جھٹکا۔ آواز ہوئی اور وہ دونوں چونک گئے۔

"یہاں کوئی ہے۔" پہلا بولا۔

digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"دیکھو اسے۔" دوسرا بولا تو روشنا بے اختیار بھاگی۔

"وہ دیکھو۔" پہلا چلایا اور دونوں اس کے پیچھے بھاگے۔ ان سے بچنے کے لیے روشنا جھیل کے ساتھ والی جھاڑیوں میں گھس گئی۔ وہ مایوس تھی۔ ضیا نہیں آیا تھا، اس کی جگہ کوئی اور آ گئے تھے اور اسے اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے۔ ان سے بچنے کے لیے اس نے جھیل میں چھلانگ لگا دی۔ اس میں بچنے کی خواہش کے ساتھ ہی کہیں خودکشی کا ارادہ بھی تھا۔

☆☆☆

"تو یہ ہے سارا قصہ۔" شانی نے گہرا سانس لیا۔

"اب کیا ہوگا؟" روشنا فکرمندی سے بولی۔

"بی بی! اس قوم کا کچھ نہیں ہونا جس کا واحد مسئلہ عشق و عاشقی رہ گیا ہے۔"

"میں اپنی بات کر رہی ہوں۔"

"تمہارا ابھی کیا ہونا ہے۔ کہ پیا تو شاید کسی اور چوٹی کو سر کرنے کے لیے نکل گیا ہے اور نہ جانے کون تمہیں لے جانے آئے تھے۔"

"تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟" اس نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

"بی بی! میں پردیسی ہوں۔ یہی اس جگہ مہمان ہوں۔"

روشنا مایوس نظر آنے لگی۔ "تو تم میری کوئی مدد نہیں کرو گے؟"

"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن اتنی سردی میں تم بغیر کسی گرم چیز کے باہر کیسے آ گئیں؟"

"وہ بس پریشانی میں خیال نہیں رہا۔" وہ بولی۔

شانی نے پوچھا۔ "ضیا کیوں نہیں آیا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"تمہارے پاس اس کا فون نمبر ہے؟"

"ہاں ہے۔" اس نے کہا۔

"کہاں ہے؟"

"میرے موبائل میں۔"

"یعنی تمہیں زبانی یاد نہیں ہے؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہو؟" روشنا نے یوں کہا جیسے کہہ رہی ہو کہ کیا احمقانہ باتیں کر رہے ہو۔ "آج کل کون فون نمبر زبانی یاد کرتا ہے۔ تمہیں اپنا کوئی اہم فون نمبر زبانی یاد ہے؟"

شانی نے غور کیا اور تسلیم کیا کہ اسے کوئی نمبر بھی زبانی یاد نہیں تھا اور سرد آہ بھر کر بولا۔ "موبائل فون نے آ کر سب کی یادداشتوں کو ایک طرف بٹھا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے لوگ آج کل اپنا لفٹ جگر گم ہو جانے پر اتنا پریشان نہیں ہوتے جتنا موبائل گم یا چھن جانے کی صورت میں کوڑا لٹلوں کے لیے ہوتے ہیں۔"

"یہ تو ہے لیکن اب میں کیسے جانوں گی کہ ضیا کیوں نہیں آیا؟" روشنا پریشان ہو گئی۔

"تمہیں اس کا گھر معلوم ہے؟"

"نہیں۔"

"دفتر یا کوئی ایسی جگہ جہاں سے اس کے بارے میں معلوم ہو سکے؟"

"نہیں... ہم ہمیشہ باہر ملتے تھے۔"

"بی بی! تمہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں اور تم گھر سے بھاگ کر اس کے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہو گئیں؟"

روشنا روہانسی ہو گئی۔ "تو میں کیا کرتی؟ میرے پاس کوئی اور راستہ ہی نہیں تھا۔ کل شام کو میرا شاہ جہاں مگوں سے نکاح ہو جاتا۔"

شانی نے افسوس سے اس سادہ لوح لڑکی کو دیکھا جو دوسروں پر اتنی آسانی سے اعتماد کر لیتی تھی۔ شانی پر بھی اس نے اسی طرح اعتماد کر لیا تھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے اس کے کمرے میں اس کے صوفے پر، اس کا نائٹ سوٹ پہنے اور اس کا کمبل اوڑھے بیٹھی تھی جبکہ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس گھر میں اور کوئی نہیں ہے۔ اگر شانی کی نیت اس کے توبہ شکن حسن پر خراب ہو جاتی تو اسے بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ "مجھے تو لگ رہا ہے جیسے تم کنوئیں سے بچنے کے چکر میں کھائی میں گرتے گرتے بچی ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ مجھے تو ضیا تیموری کوئی فراڈ لگ رہا ہے۔ اس نے تمہیں بے وقوف بنایا ہے۔"

"ایسا نہیں ہے۔"

"پھر وہ آیا کیوں نہیں... کہیں اس نے اپنا مطلب تو نہیں نکال لیا؟"

"کیا مطلب؟" وہ پھر نہیں سمجھی۔

"کہیں تم اس سے تنہائی میں تو نہیں ملیں جہاں بس وہ اور تم ہو اور..." یہاں تک پہنچ کر شانی کی زبان رک گئی لیکن وہ اس کا مطلب سمجھ چکی تھی کیونکہ اس کا گلابی چہرہ مزید گلابی ہو گیا تھا۔

"نن... نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ہمیشہ اس سے کسی پبلک پلیس پر ملتی تھی۔"

"یہاں تم عقل مند ثابت ہوئیں۔"

روشنا کا موڈ آف ہو گیا۔ "ضیا ایسا نہیں ہے۔ وہ مجھ سے سچی محبت کرتا ہے۔"

"ہر لڑکی یہی سمجھتی ہے۔" شانی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "کہ اس سے محبت کا دعویٰ کرنے والا سچی محبت کرتا ہے۔"

"سنو، تم یہ باتیں کرنے کے بجائے میرے مسئلے کا کوئی حل نکالو۔"

"اچھا یہ بتاؤ تم نے مجھ پر کیسے اعتماد کر لیا؟"

"تم پر۔" وہ اٹک کر بولی۔ "بس مجھے لگا کہ تم ایسے آدمی ہو جو کسی لڑکی کی مجبوری کا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔"

"میں بالکل بھی ایسا آدمی نہیں ہوں۔" شانی نے کہا۔ وہ بستر سے اٹھا تو اس کے چہرے پر شیطانی تاثرات نمودار ہوئے۔

"کک... کیا مطلب؟"

"مطلب ابھی سمجھاتا ہوں عملی طور پر۔" شانی اس کی طرف بڑھا تو اس نے کمبل پھینک دیا اور کھڑے ہو کر ہراساں لہجے میں بولی۔

"اے... تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"مجھے تمہارے حسن کا نشہ چڑھ گیا ہے اور یہ اس وقت تک نہیں اترے گا جب تک تم میری بانہوں میں نہیں آ جاتیں۔" شانی نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ شاخِ گل کی طرح لچک کر جھکائی دے گئی اور دروازے کی طرف بھاگی لیکن اسے باہر نکلنا نصیب نہیں ہوا۔ شانی نے اس سے پہلے اسے پکڑ کر بستر کی طرف دھکیل دیا۔ روشنا نے محسوس کر لیا کہ اب اس کے لیے بچنا ممکن نہیں ہے اس لیے وہ رحم کی اپیلوں پر اتر آئی۔ "پلیز! مجھے چھوڑ دو۔"

"اتنی آسانی سے نہیں۔" شانی نے ایک خوف ناک مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "پہلے تم تسلیم کرو کہ تم ایک احمق لڑکی ہو۔"

روشنا سمجھی نہیں۔ "کیا... کیا کہوں؟"

"یہ کہ تم ایک احمق لڑکی ہو۔" شانی نے کہا۔

"یہ سب کیا تھا؟"

"ایک سبق جو تمہیں ہمیشہ یاد رہے گا۔" شانی صوفے پر جا بیٹھا۔ روشنا کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس بار شانی بوکھلا گیا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر اسے پانی کا گلاس پیش کیا۔ "سوری! میں نے کچھ زیادتی کر دی، اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔"

روشنا نے پانی پیا اور اپنی سرخ ہو جانے والی ناک رگڑی۔ "نہیں، تم نے ٹھیک کہا ہے۔ میں واقعی احمق لڑکی ہوں۔ ہر ایک پر اعتبار کر لیتی ہوں۔ تم نے اچھا سبق دیا ہے مجھے... میں ساری عمر یاد رکھوں گی۔" اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔ شانی صوفے پر جا بیٹھا۔ وہ اس کے چپ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی سسکیاں تھم گئیں اور اس نے سر اٹھا کر شانی کی طرف دیکھا۔

"اب میں کیا کروں؟"

"میرا مشورہ ہے کہ واپس چلی جاؤ اور پروفیسر صاحب کی بات مان لو۔ تم ان کی اکلوتی بیٹی ہو، وہ تمہارا برا نہیں چاہ سکتے۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔ تم ان کو نہیں جانتے۔ وہ اپنی خواہش پر مجھے بھی قربان کر سکتے ہیں۔ ان کو اپنے خاندان پر بہت ناز ہے۔"

"کیا پروفیسر صاحب کو ضیا کے تیموری ہونے پر اعتراض ہے؟"

"ایک اعتراض یہ بھی ہے لیکن اصل بات وہی ہے۔ وہ خاندان سے باہر شادی نہیں کرنا چاہتے۔"

"یہ تو ساتھ کی دہائی کی کوئی فلم چل رہی ہے۔" شانی نے تشویش سے کہا۔ "آج کل تو ڈراموں میں بھی ایسے آئیڈیاز پیش نہیں کیے جاتے۔"

"تم مذاق اڑا رہے ہو؟" وہ جھنجلائی۔

"نہیں بی بی... لیکن تم واپس جانے کے لیے تیار نہیں ہو تو اس مسئلے کا کیا حل نکل سکتا ہے۔"

"تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو جب تک ضیا نہیں مل جاتا۔"

"تمہیں ساتھ لے جاؤں؟" شانی نے اس کی بات پر غور کیا۔ "تمہیں ضیا تیموری ملے یا نہ ملے لیکن مجھے چمن پور روانگی کا پروانہ ضرور مل جائے گا۔"

"چمن پور؟" روشنا نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"مت پوچھو۔" شانی کا لہجہ دردناک ہو گیا۔ "یہ میری زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔"

"تمہیں وہاں کون بھیجے گا؟"

"دادا جان۔"

لیکن اس وقت روشنا کو دادا جان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح ضیا تک رسائی حاصل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرے۔ اس نے پُر امید نظروں سے شامی کی طرف دیکھا۔ ”پلیز! تم اچھے آدمی ہو، میری مدد کرو نا۔“

”لیکن مجھے تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ شامی نے سرد آہ بھری تو وہ جھینپ گئی۔ پھر اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”پلیز... اگر ضیا نہیں مل سکا تو میرے پاس بچ بچ سوائے خودکشی کے اور کوئی راستہ نہیں رہے گا اور میں اپنے باپ کی رسوائی بھی نہیں چاہتی۔“

”سبحان اللہ۔“ شامی بے ساختہ بولا۔ ”رات کو گھر سے نکل کر اور خودکشی کی کوشش کر کے آپ نے والد صاحب کی عزت رکھنے کی کوشش کی ہے؟“

”طنز مت کرو۔“ وہ جھنا گئی۔ ”وہ بات ختم ہو چکی ہے۔ اب اگر میں ضیا کو تلاش کر لیتی ہوں اور ہماری کورٹ میرج ہو جاتی ہے تو بابا خود شاہ جہاں کو منع کر دیں گے کہ وہ آنے کی زحمت نہ کرے... ورنہ وہ نکاح کے لیے آ گیا تو بابا کی رسوائی ہو گی۔“

”لگتا ہے ابھی تک تمہاری عقل ٹھکانے پر نہیں ہے۔ جب تم ہی نہیں ہو گی تو بابا کس سے نکاح کرائیں گے؟ وہ خود بادشاہ سلامت کو آنے سے منع کر دیں گے۔“

”بادشاہ سلامت...؟“

”آئی مین شاہ جہاں ظل سبحانی۔“

”یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔“ وہ معصومیت سے بولی۔ ”پھر بھی ضیا کو تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔“

”ضیا کو تلاش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ میں تمہیں اسلام آباد دے جاؤں۔ میں تمہیں وقار ولا نہیں لے جا سکتا ورنہ میں خود بھی وہاں نہیں رہ سکوں گا۔“

”تم مجھے لے چلو، میں خود تمہارے دادا جان سے التجا کروں گی۔ کیا وہ ایک ستم رسیدہ لڑکی کو کچھ دن کے لیے پناہ نہیں دے سکتے؟“

”تمہیں تو وہ پناہ دے دیں گے لیکن پھر مجھے سوائے چمن پور کے اور کہیں پناہ نہیں ملے گی۔“

روشا مایوس نظر آنے لگی۔ ”میرے پاس رقم نہیں ہے ورنہ کسی ہوٹل میں ٹھہر جاتی۔“

شامی کو اس پر ترس آنے لگا۔ اگرچہ اس نے اندر ہی اندر خود کو خبردار کیا تھا کہ برخوردار اس کا انجام برا بھی ہو سکتا ہے۔ اس لڑکی کے حسن کے وار سے تو اللہ نے بچا لیا تھا، یعنی شامی تنہائی میں بھی اس پر عاشق نہیں تھا جیسا کہ وہ اکثر لڑکیوں پر ہو جاتا تھا لیکن وہ اسے ساتھ لے جاتا تو دادا جان سے اس کو کون بچاتا؟ شامی اس پر عاشق نہیں ہوا تھا تو کیا ہوا، ایک حسین لڑکی کو اکیلے میں پاس پا کر اس کی عقل تو گھاس چرنے جا سکتی تھی... اس لیے وہ چلی گئی اور شامی اس کی مدد کے لیے تیار ہو گیا۔

☆☆☆

تیمور تن دہی سے اپنے اسائنمنٹ کی تیاری کر رہا تھا کہ اس کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے نمبر دیکھے، شامی کا تھا۔ ”یہ واپس آ گیا ہے۔“ اس نے زیر لب کہا اور کال ریسیو کی۔ ”تو واپس آ گیا؟“

”آ رہا ہوں۔“ شامی نے کہا۔ ”پر یار ایک چکر ہو گیا۔“

”تیرے ساتھ چکر کب نہیں ہوتا؟“ تیمور جلدی سے بولا۔ ”لیکن یاد رکھنا، میں تمہارے کسی چکر میں پڑنے والا نہیں ہوں۔“

”اگر چکر خود چکرا دینے والا ہو اور میرے ساتھ ہو، تب بھی نہیں؟“

تیمور چونک گیا۔ اس نے دلچسپی سے پوچھا۔ ”کوئی لڑکی ہے؟“

”ہاں اور کون سی چیز مجھے چکرا سکتی ہے؟ لیکن اسے لے کر گھر نہیں آ سکتا، ورنہ دادا جان سے تو رکھ لیں گے لیکن مجھے نکال دیں گے۔“

”کوئی بات نہیں، میں ہوں گا نا اس کی دیکھ بھال کے لیے اور تجھے بھی تین چار دن بعد آنے کی اجازت مل جائے گی۔“

”بکواس مت کر... یہ بتا کہ وہ تیرا یونیورسٹی فیلو جو پشاور سے تعلق رکھتا ہے اور یونیورسٹی سے زیادہ پشاور میں پایا جاتا ہے... وہی یار جس کا گھر اس بازار کے پیچھے ہے جہاں...“

”اتنی تفصیل کافی ہے، مجھے یاد آ گیا۔“ تیمور نے اس کی بات کاٹی۔

”اس کا یہاں ایک فلیٹ ہے جس کی چابی تیرے پاس بھی ہوتی ہے۔“

”ہاں لیکن اس کا کیا کرنا ہے؟“

”اس چکر کو وہیں ٹھہرانا ہے۔ ان دنوں وہ حسب معمول پشاور گیا ہوا ہے نا؟“

”ہاں، آج کل اس بازار میں ایک نئی قتالہ سامان آئی ہے۔“

”بس ٹھیک ہے... تو چابی لے کر آجا۔“ شامی بولا۔ ”بے چاری بہت خوب صورت اور مظلوم ہے۔ میں اب پارہ چوک پر تیرا انتظار کر رہا ہوں۔“

☆☆☆

شامی نے موبائل بند کیا تو روشا اسے گھور رہی تھی۔

”یہ تم میرے بارے میں بات کر رہے تھے؟“

”ظاہر ہے اور کون ہے جس کی مجھے مدد کرنی ہے۔“

روشا نے اپنے کپڑے پہن رکھے تھے اور شامی نے اسے محسن کی جیکٹ بھی دے دی تھی جو اگرچہ اسے ذرا بڑی تھی لیکن وہ سردی سے محفوظ تھی۔ اس نے زیر لب شامی کو کچھ سنائیں اور بولی ”تم نے کسے بلایا ہے؟“

”تیمور ہے اس کا نام۔ اس کا ایک دوست یہاں پڑھتا ہے۔ اس نے ایک فلیٹ کرائے پر لیا ہوا ہے اور وہ اکثر خالی پڑا رہتا ہے۔ تمہیں وہیں رکھا جائے گا۔“

”میں اکیلی کسی فلیٹ میں نہیں جا سکتی۔“ اس نے انکار کر دیا۔ ”دو مردوں کے ساتھ۔“

شامی بھنا گیا۔ ”رات سے بھی تو اب تک میرے ساتھ اکیلی ہو۔“

”لیکن کوئی اور تو نہیں تھا۔“ وہ بولی۔

”تیمور مجھ سے بھی زیادہ شریف اور احمق ہے، اگر معاملہ کسی حسین لڑکی کا ہو۔“ شامی نے اسے اطمینان دلایا۔ ”دوسرے تمہیں جہاں لے جا رہے ہیں، وہاں چاروں طرف لگے بازار ہیں اور فلیٹ کی دیواریں تک تپتی رہتی ہیں کہ تم سرد آہ بھرو گی تو برابر والے فلیٹ کا درجہ حرارت گر جائے گا۔“

روشا اب مسکرا رہی تھی۔ ”کاش کہ تم پہلے ملے ہوتے۔“

شامی خوش ہو گیا۔ ”ضیا تیموری سے پہلے۔“

اس نے منہ بنایا۔ ”تمہارا ذہن بس اسی طرف لگا ہوا ہے۔ تم پہلے ملتے تو میری زندگی میں ایک ایسے دوست کی کمی نہ ہوتی جو ہر حال میں میرا ساتھ دیتا، مجھے صرف لڑکی نہ سمجھتا۔“

شامی چپ ہو گیا۔ شاید اندر سے شرمندہ ہوا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”میری باتوں کو دل پر نہ لیا کرو، مجھے بکواس کرنے کی عادت ہے۔“

”رات تم نے مجھے جو سبق دیا ہے، اس کے بعد میں تمہاری کسی بات کو دل پر نہیں لے رہی۔ میں نے جو کہا ہے پورے خلوص سے کہا ہے۔“

”یہ تم نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔“ شامی نے اسٹیئرنگ پر مکا مارا۔ ”یعنی تمہیں لڑکی سمجھے بغیر پورے خلوص سے تمہارا دوست بن کر رہوں۔“

سود مرکب

دو دوست اپنے خریدے ہوئے قیمتی زیورات کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

”تم نے سب سے قیمتی زیور کون سا خریدا ہے؟“

”شادی کی انگوٹھی۔“ دوسرے نے جواب دیا۔

”کیونکہ اس کے بعد سے میرا ہر ہفتے کا خرچ سو روپے بڑھ گیا ہے۔“

عمران احمد، حیدرآباد

روشا ہنستی رہی۔ وہ آب پارہ چوک پہنچے تو جھنجھلایا ہوا تیمور ان کا انتظار کر رہا تھا۔ شامی کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔ ”پورے سات منٹ سے تیرا منتظر ہوں۔“

”مجھے کیا پتا تھا تو بائیک ورلڈ کی طرح دوڑا آ جائے گا۔“ شامی نے کہا اور گاڑی میں بیٹھی روشا کا تعارف کرایا۔ ”روشا! ان سے ملو، یہ تیمور ہے لیکن اس کا خاندان تیمور یہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”تمہارا دوست ہے؟“

”نہیں دوست تو بنائے جاتے ہیں، یہ کزن ہے۔“ شامی نے کہا۔ اس پر تیمور نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور پھر ممکنہ حد تک باچھیں پھیلا کر روشا سے کہا۔

”اسے بکواس کرنے کی عادت ہے، آپ اسے چھوڑیں۔ یہ بتائیں کہ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”مدد کے بچے۔“ شامی اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ ”خاتون نہ صرف محبت شدہ ہیں بلکہ کل تک شادی شدہ بھی ہو جاتیں اگر گھر سے نہ بھاگ جاتیں۔“

تیمور دنگ رہ گیا۔ ”محبت کی شادی سے بچنے کے لیے گھر سے بھاگ گئیں؟“

”نہیں یار! اس کا باپ بھی دادا جان والا نمونہ ہے۔ نسلاً بھی چنگیزی ہے۔ اس کی شادی زبردستی اپنے کسی رنڈوے کزن سے کر رہا ہے۔ جبکہ یہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔“

”یہ سراسر ظلم ہے۔“ تیمور کو جوش آ گیا۔ ”میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“

”بیٹے پہلا مرحلہ تو بی بی کو کسی مناسب جگہ رکھنے کا ہے۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''چلو... گل خان کم سے کم دو ہفتے نہیں آئے گا۔''

گل خان کا یہ فلیٹ دوسری منزل پر اور دو کمروں کا تھا۔ چونکہ یہاں زیادہ تر طالب علم اور ملازم پیشہ لوگ رہتے تھے اس لیے محلے والا ماحول نہیں تھا اور صبح وہاں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ فلیٹ ویسا ہی تھا جیسا ایک چھڑے چھانٹ کا ہو سکتا ہے۔ ہر طرف میلے کپڑے اور برتن بکھرے تھے۔ روشنا نے منہ بنا کر فلیٹ کا معائنہ کیا اور شاہی کی طرف دیکھا۔

''میں یہاں رکوں گی؟''

''تو اب تمہیں کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں تو نہیں لے جا سکتے۔'' وہ بولا۔

''اور یہ کچرا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔'' تیمور نے کہا اور حیرت انگیز پھرتی سے تمام میلے کپڑے اور برتن غائب کر دیے۔ شاہی تک حیران رہ گیا۔ اس کے خیال میں تیمور گھر میں اتنی دیر میں ایک کپ بھی اپنی جگہ سے نہیں اٹھا سکتا تھا۔ روشنا اور شاہی نے بھی اس کا ہاتھ بٹایا اور کم سے کم سٹنگ روم بیٹھنے کے قابل ہو گیا۔ شاہی نے تیمور کو سارے حالات سے آگاہ کیا اور اسی دوران میں روشنا نے کچن میں کچھ قابل استعمال برتنوں کی مدد سے چائے تیار کی۔ تیمور اور شاہی اب بالکل سنجیدہ تھے۔ تیمور نے شاہی کی طرف دیکھا۔

''تیرے خیال میں اس مسئلے کا حل کس طرح نکالا جا سکتا ہے؟''

''ہمیں دو سمتوں میں کام کرنا ہوگا۔'' شاہی بولا۔ ''ایک تو ضیا تیموری کا سراغ لگانا ہے کہ وہ کہاں ہے اور دوسرے شاہ جہاں چنگیزی کے بارے میں معلوم کرنا ہے کہ اس کا حدود اربعہ کیا ہے۔''

''اس کے بارے میں جاننے کی کیا ضرورت ہے؟'' روشنا نے اعتراض کیا۔

''اس قسم کے معاملات میں ہر پہلو پر نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ممکن ہے ضیا تیموری کو شاہ جہاں نے غائب کرا دیا ہو۔''

روشنا چونکی۔ ''وہ کیسے غائب کرا سکتا ہے؟ اسے ضیا کے بارے میں کیا معلوم ہے؟''

''بہ قول تمہارے جب اسے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ تم رات بارہ بجے گھر سے نکلو گی تو اسے ضیا کے بارے میں بھی پتا ہوگا۔''

شاہی کی بات پر روشنا سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں، ہو سکتا ہے۔''

''تب وہ اس کی گم شدگی میں ملوث ہو سکتا ہے۔ وہ کس طرح برداشت کر سکتا ہے کہ اس کی ہونے والی منکوحہ کا کوئی عاشق اس زمین پر باقی رہے۔ سنا ہے یہ چنگیزی روایت کے خلاف ہے۔''

''کیا تم لوگ اصل موضوع پر بات نہیں کر سکتے؟'' شاہی نے سوچا اور بولا۔ ''میں ضیا تیموری کو تلاش کرتا ہوں اور تو شاہ جہاں کے بارے میں معلومات حاصل کر۔''

تیمور نے تجویز پیش کی۔ ''جو کرنا ہے ساتھ کریں گے۔''

''اس صورت میں سستی سے کام ہوگا۔''

''تم کیا کرو گی؟'' شاہی نے روشنا سے پوچھا۔

''کیا میں تمہارے ساتھ چل سکتی ہوں؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ مناسب نہیں ہے کیونکہ تمہارا رخ روشن دیکھنے والوں کو فوراً متوجہ کرے گا اور کوئی واقف کار نکل آیا تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔''

''میرا خیال ہے، اس کو ساتھ رکھ سکتے ہیں۔'' تیمور نے کہا۔ ''بس ذرا حلیہ بدلنا پڑے گا۔''

''حلیہ بدلنا پڑے گا؟'' شاہی نے طنز کیا۔ ''ہم کوئی میک اپ کے ماہر ہیں؟''

''اب حلیہ بدلنے کے لیے میک اپ کا ماہر ہونا ضروری نہیں ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''صرف ایک برقع کی ضرورت ہے اور والد بزرگوار بھی ان کو نہیں پہچان سکیں گے۔''

''یہ ٹھیک ہے۔'' روشنا خوش ہو گئی۔ ''لیکن میرے پاس برقع نہیں ہے۔''

تیمور نے سر کھجایا۔ ''برقع تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔ شاہی تیرے پاس ہے؟''

شاہی بھنا گیا۔ ''میں کوئی خاتون ہوں جو میرے پاس برقع ہو؟''

''اچھا اچھا... ناراض کیوں ہوتا ہے؟ کوئی اور حل تلاش کرتے ہیں۔''

جتنی دیر میں وہ بحث کرتے رہے، روشنا نے ایک صاف ستھری شال نما چادر تلاش کر کے اسے پردہ کرنے کے انداز میں اوڑھ لیا... اور ان کے سامنے آئی تو وہ حیران ہو گئے۔ شاہی نے کہا۔ ''زبردست۔''

''یہ تم نے زبردست کام کیا ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''تو چلیں؟''

''پہلے شاہ جہاں کو تلاش کرتے ہیں۔'' شاہی نے تجویز دی۔ ''اس کا کوئی پتا معلوم ہے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ وہ سیٹلائٹ ٹاؤن میں کہیں رہتا ہے اور اس کی فیکٹری جی ٹی روڈ پر ہے۔"

"یہ تو بہت آسان پتا ہے۔" تیمور ہنسا۔ "بس پورا سیٹلائٹ ٹاؤن اور پوری جی ٹی روڈ دیکھنا پڑے گی۔"

شامی نے اسے گھورا۔ "عقل کس لیے ہے؟ اسے استعمال کرو۔"

"تو تم کرلو۔" وہ بولا۔

شامی نے روشا سے اس کے گھر کا نمبر مانگا۔ اس نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ دے دیا۔ شامی نے نمبر ملایا اور فون اٹھانے والے سے کہا۔ "مجھے شاہ جہاں سے بات کرنی ہے۔"

"تم کون ہو؟" بولنے والے نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

"میں کوریئر کمپنی کا نمائندہ ہوں۔ ان کا ایک پارسل آیا ہے۔ اس پر لکھا ہوا پتا درست نہیں ہے۔ میں نے دیے ہوئے نمبر پر کال کی تو مجھے یہ نمبر دیا گیا۔ شاہ جہاں صاحب یہاں موجود ہیں؟"

"ایک منٹ رکو۔" اس نے کہا اور فون رکھ دیا۔ شامی نے تیمور کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری تو اس نے برا سا منہ بنایا۔ دو منٹ بعد وہی آدمی فون پر آیا۔ "پتا لکھو۔"

شامی نے ایک کتاب کھینچی اور تیمور کا پین لے کر پتا لکھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا، شکریہ کہہ کر کال کاٹ دی۔ اس نے کتاب فاتحانہ انداز میں لہرائی۔ "اسے کہتے ہیں عقل کا استعمال۔"

"میرے خیال میں تو خوش قسمتی کا عنصر زیادہ ہے جو تجھے اتنی آسانی سے پتا مل گیا۔" تیمور خفت سے بولا کیونکہ روشا تحسین آمیز نظروں سے شامی کو دیکھ رہی تھی۔

شامی نے طنز کیا۔ "اب تو تو کہے گا۔"

"اچھا تم ضیا کا پتا معلوم کرو؟" تیمور نے اسے چیلنج دیا۔

"کچھ تم بھی کرلو۔" شامی نے کہا۔ "پہلے میں شاہ جہاں کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"کس طرح معلوم کرو گے؟"

"بس کرلوں گا۔ اب تم ذرا اسلام آباد کی ذرا پوش قسم کی اسٹیٹ ایجنسیوں کا چکر لگانا شروع کرو اور وہاں ضیا کے بارے میں معلوم کرو۔ اگر وہ بیچ ہی بلڈر کا کام کرتا ہے تو کہیں نہ کہیں سے اس کا پتا مل جائے گا۔"

"کوشش کرتا ہوں۔" تیمور نے مرے مرے انداز میں کہا۔ "کیا تو اس کے ساتھ جائے گا؟"

اس موقع پر روشا نے مداخلت کی۔ "نہیں، میں تیمور کے ساتھ جاؤں گی کیونکہ جب ایک لڑکی پوچھے گی تو لوگ ٹالیں گے نہیں بلکہ ہر ممکن مدد کریں گے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" اس بار شامی نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔

طے ہوا کہ تیمور جیپ لے جائے گا اور شامی اس کی بائیک پر جائے گا کیونکہ اب روشا تیمور کے ساتھ ہوتی اور وہ بائیک پر بیٹھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس پر تیمور کو کسی قدر مایوسی ہوئی۔ بہرحال، یہ بھی کم نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ جا رہی تھی۔ شامی بائیک لے کر سیٹلائٹ ٹاؤن کی طرف روانہ ہو گیا۔ پتا وقار ولا سے زیادہ دور کا نہیں تھا۔ چار گلی پہلے یہ شان دار بنگلا تھا جس کے سامنے نیم پلیٹ پر شاہ جہاں چنگیزی بڑا بڑا لکھا تھا۔ شامی نے سوچا اور پھر کال بیل بجائی۔ کچھ دیر بعد اندر سے ایک ملازم نکلا۔ گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں تھا کیونکہ گلی والوں نے گلی کے دونوں سروں پر گارڈز بٹھا دیے تھے جن کا کام آتے جاتے لوگوں کو سلام کرنا اور گاڑیوں کے لیے راستہ کھولنا بند کرنا تھا۔ انہوں نے شامی کو بھی آرام سے اندر آنے دیا۔ شاہ جہاں کے نوکر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"جی صاحب؟"

"شاہ جہاں صاحب گھر پر ہیں؟"

"نہیں جناب! لیکن آپ کون ہیں؟"

"میرا نام شکیل جلالی ہے۔" شامی نے ذہن میں آنے والا پہلا نام بتا دیا۔ "اچھا، ان کی بیگم یا گھر کا کوئی اور فرد ہے؟"

نوکر کو شاید اس کے نام پر حیرت ہوئی لیکن اس نے ظاہر نہیں کیا اور غمی میں سر ہلایا۔ "صاحب کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ اکیلے رہتے ہیں۔"

"اوہ۔" شامی نے حیرت سے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا۔ اصل میں میں ملک سے باہر تھا اور تمہیں بھی پہلی بار دیکھا ہے۔"

"جی، میں یہاں پانچ سال سے ملازم ہوں۔" نوکر بولا۔ وہ سادہ سا آدمی تھا، اس نے شامی کی بات پر آسانی سے اعتبار کر لیا۔ "آپ اس سے پہلے ملک سے چلے گئے ہوں گے۔"

شامی نے شکر ادا کیا کہ چار گلیوں کے فرق کے باوجود وہ اس کا صورت آشنا نہیں تھا۔ "ہاں، میں بھی تقریباً پانچ سال پہلے باہر گیا تھا۔ ان کی بیوی کا انتقال کیسے ہوا؟"

"دو سال پہلے کینسر سے ہوا۔" نوکر افسردہ ہو گیا۔ "وہ بہت اچھی تھیں لیکن ان کے گھر والے..." وہ بولتے بولتے رک گیا۔

"میں جانتا ہوں۔ شاہ جہاں پہلے بھی ان سے تنگ رہتے تھے۔ وہ لوگ ان کی بیوی کو بھڑکاتے تھے۔"

نوکر کی زبان کی رکاوٹ دور ہو گئی۔ وہ شامی کو واقف سمجھ کر رکا تھا۔ "جی... کئی بار میرے سامنے انہوں نے آکر جھگڑا کیا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ چاہتے کیا تھے؟"

"وہ چاہتے تھے کہ صاحب اپنی ہر چیز بیگم صاحب کے نام کر دیں لیکن بیگم صاحبہ نے کبھی صاحب سے خود نہیں کہا۔ پھر ان کو کینسر ہوا تو ان کے گھر والوں نے صاحب کو الزام دیا کہ کینسر ان کی وجہ سے ہوا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ شاہ جہاں بہت اچھے آدمی ہیں۔" شامی نے ٹکا مارا۔

"بہت ہی اچھے۔" نوکر نے کہا۔ "مزاج کے تھوڑے سخت ہیں لیکن کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتے ورنہ کسی کی بے عزتی کرتے ہیں۔ اللہ نے بیوی دی تو اس کا ساتھ کم دیا اور کوئی بچہ بھی نہیں ہے۔ پیسے والے ہیں لیکن خدا ترس ہیں۔"

"یہ تو ہے۔" شامی نے ایک بار پھر اس کی تائید کی۔ "ابھی وہ کہاں ہیں... اپنی فیکٹری گئے ہیں؟"

"نہیں جی..." نوکر کہتے کہتے رکا۔ "وہ اپنے رشتے دار کے گھر گئے ہیں۔ ابھی چار گھنٹے پہلے نکلے ہیں۔"

یعنی شاہ جہاں پروفیسر کے فارم ہاؤس میں تھا۔ شامی کو خیال آیا کہ جب وہ وہیں تھا تو اس نے خود اس سے فون پر بات کیوں نہیں کی اور اس اکھڑ لہجے والے ملازم سے پتا کیوں لکھوا دیا۔ شامی نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ "آج صبح؟"

اس وقت بارہ بج رہے تھے۔ شامی صبح آٹھ بجے روشا کو لے کر فارم ہاؤس سے روانہ ہو گیا تھا۔ اقبال، محسن کو چھوڑ کر بس سے واپس آ گیا تھا۔ شامی نے اس کی نظر بچا کر روشا کو جیپ کے پچھلے حصے میں چھپایا اور جب وہ اس علاقے سے نکل آئے تو روشا اس کے برابر میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ یہ تو ظاہر ہے پروفیسر نے شاہ جہاں کو بلایا تھا اور ایمرجنسی کال تھی اس لیے وہ صبح سویرے روانہ ہو گیا تھا۔ نوکر ہچکچایا تو شامی نے پھر پتا پھینکا۔

"کہیں وہ ان پروفیسر صاحب کے ہاں تو نہیں گئے جن کی بیٹی سے ان کی شادی طے ہوئی ہے؟"

نوکر کا منہ کھل گیا۔ "آپ کو کیسے پتا چلا جی؟"

"ایک ہفتہ پہلے میری ان سے فون پر بات ہوئی تھی لندن سے۔"

"اچھا اچھا۔" نوکر مطمئن نظر آنے لگا۔ "جی، وہ وہیں گئے ہیں۔ وہ خان پور میں رہتے ہیں۔ ادھر اپنے صاحب کی زمینیں بھی ہیں۔"

"اچھا ایسا کرو کہ شاہ جہاں صاحب کا موبائل اور گھر کا فون نمبر دے دو۔ اب میں آنے سے پہلے رابطہ کرلوں گا۔"

"ایک منٹ جی... میں لکھ کر لاتا ہوں۔" اس نے کہا اور اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ ایک کاغذ پر نمبر لے کر آیا۔ "یہ لیں جی... دونوں نمبر ہیں۔ پر آپ نے کیا نام بتایا تھا؟"

نام تو خود شامی بھی بھول گیا تھا اس لیے اس نے پھر ذہن میں آنے والا پہلا نام بتا دیا۔ "فضل دین۔"

جب وہ بائیک پر جا رہا تھا تو نوکر دروازے پر کھڑا کچھ سوچ رہا تھا کہ پہلے بھی یہی نام بتایا تھا یا کچھ اور بتایا تھا۔ شامی کو اس کی پروا نہیں تھی کہ اسے پہلا نام یاد آتا ہے یا نہیں۔ اس کا کام نکل گیا تھا۔ گلی سے نکل کر اس نے تیمور کو کال کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ اسے نوشی کی گاڑی دکھائی دی۔ وہ کہیں جا رہی تھی اور شامی تیمور کو بھول کر اس کے پیچھے لگ گیا۔ کچھ دیر بعد نوشی نے بھی اسے بیک ویو مرر میں دیکھ لیا۔ اس نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔ شامی اس کے پاس رکا اور ڈرائیونگ سیٹ والا شیشہ بجایا۔ نوشی نے شیشہ نیچے کیا اور پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی۔

"کیا ہے... میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟"

"تمہیں یہ بتانے کے لیے کہ آدمی بعض اوقات اپنی شامت کے پیچھے خود آتا ہے۔" شامی نے آرام سے کہا۔ "بائی دی وے، تمہارا موڈ کیوں خراب ہے؟"

"میرا موڈ ٹھیک ہے۔" نوشی رکھائی سے بولی۔ "تم میرے پیچھے کیوں آئے؟"

اس بار شامی کا موڈ بھی خراب ہو گیا۔ "کیونکہ کوئی اور لڑکی نہیں ملی جس کے پیچھے جاتا۔ ویسے اس وقت میں ایک لڑکی کے پاس ہی جا رہا ہوں۔"

"تو جاؤ۔" نوشی نے جل کر کہا۔ "یہاں مرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

Digestpk
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مس نوشی! تمیز سے بات کریں۔ میں آپ کا شوہر نہیں ہوں۔" شامی نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں، کبھی بدقسمتی سے بن گیا تب اس طرح ضرور بات کرنا۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" نوشی نے غرا کر کہا۔

"مجھے بھی یہی امید ہے لیکن آدمی سوچتا کچھ ہے اور ہو کچھ جاتا ہے۔ خواب تو میں نے بھی کترینا کیف کے دیکھ رکھے ہیں۔" شامی نے بائیک آگے بڑھا دی۔ نوشی نے عقب سے کچھ چلا کر کہا لیکن شور میں سنائی نہیں دیا۔ شامی نے ذرا آگے ایک جگہ رک کر تیمور کو کال کی۔

☆☆☆

روانہ ہونے کے بعد تیمور نے غور سے روشنا کو دیکھا۔ اس نے جواباً تیمور کو گھورا۔ "مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"میں کچھ سوچ رہا ہوں۔"

"سوچنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہاری نک سک میں کمی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"دیکھو، تم کچھ زیادہ ہی دکھی دکھائی ہو رہی ہو۔ نہ لپ اسٹک ہے، نہ آنکھوں میں کاجل ہے، بال بھی نہیں بنے ہیں۔"

روشنا نے آئینے میں دیکھا۔ لباس اس نے استری کر کے پہنا تھا اس لیے وہ ٹھیک تھا۔ لیکن چہرہ پھیکا ہو رہا تھا۔ اس نے تیمور کی طرف دیکھا۔ "ہاں، ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تو اب کیا کرنا ہے؟"

تیمور نے جیپ ایک سپر اسٹور کے سامنے روک دی۔ "یہاں دیکھتے ہیں کچھ۔"

وہ اسٹور میں کاسمیٹکس والے حصے میں آئے۔ روشنا نے اسے خبردار کیا۔ "میرے پاس رقم نہیں ہے۔"

"ہم نواب زادے ہیں۔" تیمور نے اسے آگاہ کیا۔

"تب ٹھیک ہے۔" روشنا نے کہا اور پہلے ایک اعلیٰ درجے کی لپ اسٹک منتخب کی۔ اس کی قیمت بارہ سو روپے تھی۔ پھر اس نے ایک سات سو والی نیل پالش منتخب کی۔ آئی لائنر اور بلشر لیا۔ ان سب کا مجموعی بل چار ہزار دو سو بنا تھا۔ تیمور نے ادائیگی کرتے ہوئے خود کو کوسا کہ اسے اپنی نواب زادگی کا اعلان کرنے کے لیے بھی موقع ملا تھا۔ وہ باہر جانے لگے تھے کہ روشنا رک گئی۔ "ایک چیز تو رہ گئی۔"

"کیا؟" تیمور نے مردہ لہجے میں کہا۔

روشنا ہنسی۔ "فکر مت کرو، زیادہ مہنگی نہیں ہے۔ ایک ہیئر برش چاہیے۔"

برش لے کر وہ باہر آئے۔ روشنا نے آئینے میں دیکھ کر جیپ میں بیٹھے بیٹھے میک اپ مکمل کیا اور پھر تیمور کی طرف دیکھا۔ "کیسی لگ رہی ہوں؟"

"جیسی پانچ ہزار کا میک اپ کرنے کے بعد لگ سکتی ہو۔" تیمور نے جواب دیا۔

"لگتا ہے تمہیں یہ اچھا نہیں لگا ہے۔ کوئی بات نہیں، تم یہ پیسے مجھ سے لے لینا۔"

"ارے نہیں۔" تیمور بوکھلا کر بولا۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ روانہ ہوئے۔ اسلام آباد میں کم سے کم ایک ہزار اسٹیٹ ایجنسیز بکھرے ہوئے تھے اور ان سب کو فرداً فرداً کھنگالنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ تیمور نے اسے بتایا کہ ضیا تیموری کو تلاش کرنے کا یہ طریقہ بہت مشکل ہے۔

"ٹھیک ہے، یہ بتا کہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے؟"

"ابھی تو کچھ نہیں کیا ہے۔" تیمور نے کن انکھیوں سے روشنا کو دیکھا جس کا بنا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ نارمل ہے۔

"کیا مطلب؟ تم دونوں کو نکلے ہوئے اتنی دیر ہو گئی ہے۔" شامی نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"یار! وہ روشنا کو کچھ شاپنگ کرا رہا تھا۔"

"کیا؟" شامی چلایا۔ "تم لوگ شاپنگ کے لیے نکلے تھے؟"

"وہ یار... یہ بغیر میک اپ کے تھی۔ وہی لے رہے تھے۔ اب نکلے ہیں... یہ بتا کہ تو نے کیا کیا ہے؟"

"میں نے اپنا کام کر لیا ہے۔" شامی نے کہا۔ "مجھے تم دونوں سے بات کرنی ہے۔ یہ بتاؤ کہ کہاں ہو؟"

تیمور نے جگہ بتائی تو شامی نے کہا۔ "پاس ایک کیفے ہے، شاید بلورنگ کے نام سے۔ وہاں جا کر میرا انتظار کرو۔"

"بیٹے یہ سوچ کر آنا کہ میرے پاس اب بل ادا کرنے کی استطاعت باقی نہیں رہی ہے۔" تیمور نے آہستہ سے کہا لیکن روشنا نے سن لیا۔

"ہونہہ... نواب زادے۔" اس نے زیر لب کہا لیکن اس طرح کہ تیمور سن لے۔ نتیجے میں جب شامی کیفے پہنچا تو دونوں ایک دوسرے سے رخ پھیر کر بیٹھے تھے۔ شامی نے ان دونوں کو دیکھا۔ "کیا ہوا، غلیظ سے تو خوشی خوشی نکلے تھے؟"

"تمہارا کزن۔" روشنا بولی۔ "مجھے نہیں لگتا کہ نواب زادہ ہے۔"

"تو کیا لگتا ہے؟" شامی نے روانی میں پوچھا جس پر تیمور نے اسے خونی نظروں سے دیکھا تو اس نے جلدی سے تصدیق کی۔ "یہ نواب زادہ ہی ہے۔ نواب ابن نواب۔"

"اچھا ابھی چار ہزار کی کاسمیٹکس دلا کر ہارٹ اٹیک ہونے والا تھا۔" روشنا نے طنز کیا۔

"یار تیمور! کیا ہو گیا اگر اتنی سی شاپنگ کرا دی تو...؟"

شامی نے اسے پُرملامت نظروں سے دیکھا۔ وہ بھنا گیا۔

"تم تو دے دو اگر یا اتنی سی رقم ہے۔"

تیمور کنجوس نہیں تھا، خاص طور سے خواتین کے معاملے میں لیکن ان خواتین کے معاملے میں جن سے اسے کچھ امید ہوتی تھی اور یہاں نکوں میں تیل تو بہت تھا لیکن اس تیل کے جملہ حقوق محفوظ ہو چکے تھے۔ بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا اور وہ اصل مسئلے پر آئے۔ چائے پیتے ہوئے شامی نے ان کو اپنی تحقیقات سے آگاہ کیا اور اس کے بعد وہ اس کے تجزیے کی طرف آیا۔ "بات یہ ہے روشنا بی بی کہ گڑبڑ بہت زیادہ ہے۔"

"کیا مطلب؟" روشنا بولی۔ وہ اس وقت ایک کریم رول بہت دل لگا کر کھا رہی تھی کیونکہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ شامی نے کیفے میں ملنے والی اچھی چیزیں منگوا لی تھیں۔ کچھ دیر پہلے روشنا سے لڑنے والا تیمور کھانے میں اب اس کا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ کم سے کم شامی کو یہی لگ رہا تھا کہ ان دونوں میں مقابلہ ہو رہا تھا کھانے کا۔

"مطلب یہ کہ تمہارے بابا چنگیزی نے رات کو ہی شاہ جہاں کو تمہاری گمشدگی سے آگاہ کر دیا تھا اور وہ صبح سویرے تمہارے گھر کے لیے روانہ ہو گیا ہے اور اس وقت تمہارے گھر میں ہے۔"

"اچھا۔" وہ بے دھیانی سے بولی کیونکہ رول کے بعد اس نے اپنی توجہ لائٹ پیزا کی طرف مبذول کر لی تھی۔ "وہ وہاں کیا کر رہا ہے؟"

"محترمہ کا انتظار۔" شامی نے جل کر کہا۔ "کہ آئیں تو نکاح کی کارروائی مکمل کی جائے۔"

"اوہو... تم جھنجلا کیوں رہے ہو؟ میں سن تو رہی ہوں۔"

"شاہ جہاں وہیں ہے لیکن جب میں نے فون پر کوریئر بن کر اس کے گھر کا پتا لگانا تھا تو اس کے بجائے اس شخص نے پتا بتایا تھا جس نے فون اٹھایا۔"

"ہو سکتا ہے وہ اہم کام کر رہا ہو۔"

"ہاں، ہو سکتا ہے۔ یہ بتاؤ تمہارے گھر کوئی اکھڑ لہجے میں بات کرنے والا ملازم ہے؟"

روشنا اس سوال پر چونکی۔ "نہیں تو... فون کال بابا کا ذاتی ملازم مبارک وصول کرتا ہے اور وہ ہمیشہ بہت مہذب انداز میں بات کرتا ہے۔"

"جس نے فون ریسیو کیا تھا، وہ لہجے سے بدمعاش لگ رہا تھا۔"

"ہمارے ہاں ایسا کوئی ملازم نہیں ہے اور ہر ایک فون ریسیو بھی نہیں کرتا۔"

"ایک منٹ... میرے ساتھ آؤ۔" شامی نے کہا اور کھڑا ہوا تو روشنا بھی بادل ناخواستہ برگر چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ شامی اس کے ساتھ ایک طرف بنے فون بوتھ تک آیا۔ اس نے آپریٹر سے نمبر ملانے کو کہا اور اسے روشنا کے گھر کا نمبر بتایا۔ روشنا چونکی لیکن شامی نے آنکھوں سے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ جیسے ہی بیل جانے لگی، آپریٹر نے ان کو فون اٹھانے کا اشارہ کیا۔ شامی نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے وہی اکھڑ آواز والا ہیلو... ہیلو کر رہا تھا۔ شامی نے ریسیور روشنا کو دے دیا۔ وہ کچھ دیر سنتی رہی پھر اس نے کہا۔

"کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

شامی نے بھی ریسیور سے کان لگایا۔ اکھڑ لہجے والا ویسے ہی اونچا بولتا تھا۔ اس سوال پر وہ چراغ پا ہو گیا۔ "اوئے تو کون ہے؟"

"تمیز سے بات کرو۔" روشنا نے اسے جھڑک دیا۔ "میں وقار چنگیزی کی بیٹی ہوں۔"

"جو گھر سے بھاگ گئی ہے؟" لہجہ تمسخرانہ ہو گیا۔

"ذلیل شخص..." روشنا اسے گالی دینے والی تھی کہ شامی نے کال کاٹ دی۔

"تم نے اپنا تعارف کس خوشی میں کرا دیا۔" شامی بولا۔

روشنا کا غصے سے برا حال تھا۔ "اس کی جرأت کیسے ہوئی مجھ سے اس طرح بات کرنے کی۔ میں واپس جا کر اس کا دماغ درست کر دوں گی۔"

کیونکہ آپریٹر ان کی باتیں دلچسپی سے سن رہا تھا اس لیے شامی نے کال کی ادائیگی کی اور اسے لے کر واپس میز پر آ گیا۔ شامی نے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہارے گھر میں کوئی ایسا ملازم ہو سکتا ہے جو تم سے

digestpk.blogspot.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس لہجے میں بات کرے؟"

روشنا نے اس کی بات پر غور کیا۔ "نہیں، اتنی جرأت کوئی نہیں کرسکتا۔ گھر سے نکلنا میرا اور بابا کا معاملہ ہے۔ اس میں کوئی ملازم دخل دے تو بابا خود اسے شوٹ کردیں گے۔"

"اس صورت میں بات کرنے والا ملازم نہیں ہو سکتا۔" شامی نے کہا۔ "کیا یہ آواز شاہ جہاں کی تھی؟"

تیمور نے اسے گھورا۔ "تو نے خود بتایا تھا کہ بولنے والا پتا پوچھنے گیا تھا۔ کیا شاہ جہاں اپنا پتا خود پوچھنے جائے گا؟"

"ممکن ہے اسے زبانی یاد نہ ہو اور وہ کہیں دیکھنے گیا ہو جیسے آئی ڈی کارڈ پر؟"

"وہ شاہ جہاں نہیں ہے۔" روشنا نے ان کی بحث ختم کی۔ "میں اس کی آواز پہچانتی ہوں۔"

"پھر کون ہو سکتا ہے؟" تیمور نے سوال کیا۔

"اس کا پتا وہیں جاکر چلے گا۔" شامی نے کہا۔ "ہمیں وہاں جانا ہوگا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ وہاں کوئی گڑبڑ ہے۔"

"اب تو مجھے بھی ایسا لگ رہا ہے۔" روشنا نے اس کی تائید کی۔

"لیکن کل مجھے اسائنمنٹ جمع کرانا ہے۔" تیمور نے شامی کو یاد دلایا۔ "میں نہیں جاسکتا۔"

"تو کسی کی مدد کرنے کے لیے ایک معمولی سا اسائنمنٹ نہیں چھوڑ سکتا۔" شامی نے غصے سے کہا۔

"معمولی تو نہیں ہے، پورے دس نمبر کا ہے اور یہ سمسٹر رزلٹ میں شامل ہوگا لیکن خیر اگر کوئی مجھ سے مدد کو کہے تو میں یہ قربانی دینے کو تیار رہوں۔"

"اگر تمہارا اشارہ میری طرف ہے تو میرا تم سے مدد طلب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" روشنا نے صاف انکار کردیا۔

تیمور نے شامی کی طرف دیکھا۔ "جب اسے میری مدد کی ضرورت ہی نہیں ہے تو میں کس لیے اپنا نقصان کروں۔"

"اسے نہیں لیکن مجھے تو تیری مدد کی ضرورت ہے اور تو میری خاطر ایک اسائنمنٹ کا نقصان نہیں کرسکتا۔"

تیمور نے غور کیا۔ "ٹھیک ہے، تیری خاطر چلتا ہوں ورنہ...." اس نے روشنا کی طرف دیکھا تو وہ فوراً بولی۔

"میں بھی تمہیں شامی کی خاطر برداشت کروں گی۔"

"بس تو طے ہوا ہم چل رہے ہیں۔" شامی نے سکھ کا سانس لیا کیونکہ تیمور کے بغیر اسے کسی معاملے میں مزہ نہیں آتا تھا اور وہ خود کو ادھورا سمجھتا تھا۔ "ہم محسن کے فارم جائیں گے اور وہاں سے حالات کا جائزہ لیں گے۔"

"لیکن اس کا چوکیدار۔" روشنا نے شامی کو یاد دلایا۔ "شاید وہ مجھے پہچانتا ہے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم اسے منع کر دیں گے تو وہ کسی سے کچھ نہیں کہے گا۔" شامی نے کہا۔

"نہیں یار! اس قسم کے معاملات میں آدمی جتنا ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرے اتنا اچھا ہے۔ بہتر ہے ہم روشنا کو چھپا کرلے جائیں یا چوکیدار کو وہاں سے ہٹادیں۔"

"ہٹادیں.... لیکن کیسے؟" شامی نے سوال کیا۔

"محسن سے کہہ اسے کسی بہانے وہاں سے چلتا کر۔"

"اور محسن سے کیا کہوں گا؟"

"اسے بعد میں دیکھ لیں گے۔" تیمور بولا۔

"نہیں.... وہ سمجھے گا کہ میں کسی لڑکی کو ڈیٹ پر لارہا ہوں۔ اس سے میری ریپوٹیشن خراب ہوجائے گی۔"

"لڑکی تو ہم لے کر جارہے ہیں اور اسی وجہ سے چوکیدار کو ہٹارہے ہیں۔" تیمور نے کہا تو روشنا نے اسے گھورا۔

"لیکن یہاں کوئی ڈیٹ نہیں ہورہی ہے۔"

"مسئلہ یہ نہیں ہے۔ مسئلہ کسی طرح محسن کے چوکیدار کو ہٹانا ہے کیونکہ ہم وہاں جو کریں گے اگر وہ دیکھے گا تو مشکوک ہوجائے گا۔" شامی نے کہا۔

تیمور سوچنے لگا۔ اب وہ بھی اس معاملے میں پوری دلچسپی لے رہا تھا۔ پھر اسے خیال آیا۔ "محسن کے فارم ہاؤس میں فون ہے؟"

"بالکل ہے۔"

"ایک ہی سیٹ ہے یا ایکسٹینشن بھی ہے؟"

"میرا خیال ہے ایکسٹینشن بھی ہے۔" شامی نے سوچا۔

"تب کام بن سکتا ہے۔ ہم وہاں پہنچیں گے اور روشنا کو چھپا کر اندر لے جائیں گے اور پھر چوکیدار کے لیے فون آئے گا جس میں اسے محسن کے شہر والی کوٹھی پہنچنے کا حکم دیا جائے گا۔"

شامی اچھل پڑا۔ "میں سمجھ گیا.... مجھے محسن کی آواز کی نقل بھی اتارنی آتی ہے۔"

"بس تو پھر چلو۔" روشنا نے بے تابی سے کہا۔

"ایک منٹ.... اتنی جلدی بھی کس بات کی ہے؟" تیمور نے کہا اور شامی کی طرف دیکھا۔ "تم نے یہ سوچا۔ وہاں ہمیں کسی غیر متوقع سچویشن کا سامنا کرنا پڑا تو ہم کیا

کریں گے؟"

"مثلاً کس قسم کی سچویشن؟"

"بہ قول مس روشنا کے، ان کا کوئی ایسا ملازم نہیں ہے جو ان سے اس لہجے میں بات کرسکے.... لیکن اس شخص نے تجھے شاہ جہاں کے گھر کا پتا لا دیا۔"

"ممکن ہے وہ باہر کا کوئی فرد ہو اور کچھ دیر کے لیے آیا ہو؟" شامی نے اظہار خیال کیا۔ تیمور نے نفی میں سر ہلایا۔

"اگر ایسا ہوتا تو وہ دوبارہ فون پر نہیں ملتا لیکن کئی گھنٹے بعد بھی اسی شخص نے فون ریسیو کیا۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر اب کوئی فون کرے تو وہ شخص ہی ریسیو کرے گا۔"

شامی نے اس کی بات پر غور کیا۔ "تو کہنا کیا چاہ رہا ہے؟"

"یہی کہ مس روشنا کے گھر میں کوئی گڑبڑ ہے اور اس وقت یقیناً وہاں کچھ غیر متعلقہ لوگ موجود ہیں۔"

"ایسا نہیں ہوسکتا۔" روشنا کانپ گئی۔

"اس کا پتا بہت آسانی سے چلایا جاسکتا ہے۔" تیمور بولا۔ "اب میں وہاں کال کروں گا اور پروفیسر سے بات کرنا چاہوں گا۔ اگر وہ لائن پر آگئے تو اس کا مطلب ہوگا میرا مفروضہ غلط ہے۔"

"اور اگر نہ آئے تو....؟" روشنا کے لہجے میں خدشات تھے۔

"میں کہہ چکا ہوں کہ وہاں گڑبڑ ہے لیکن ابھی تک اس کی نوعیت سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ شاید وہاں جاکر پتا چلے۔"

"بس تو ہم چل رہے ہیں۔" شامی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

جب وہ محسن کے فارم ہاؤس پہنچے تو شام بھی ڈھلنے والی تھی۔ چوکیدار اقبال نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ یہاں آنے سے پہلے وہ وقار ولا کی طرف گئے تھے۔ مقصد نواب صاحب سے اجازت لینا تھا کیونکہ شامی کی گزشتہ دن کی روانگی ان کے علم میں تھی۔ اب تیمور نے بھی جانا تھا اور نواب صاحب کے علم میں یہ بات لانا لازمی تھا ورنہ ان کی طرف سے تلاش اور پھر تفتیش کا عمل شروع ہوجاتا۔ البتہ روشنا کا کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔ تیمور کی بائیک چھوڑ کر اور اجازت لے کر وہ روانہ ہوئے۔ جب وہ محسن کے فارم پہنچے تو شامی گیٹ پر ہی اتر گیا اور تیمور جیپ اندر لے گیا۔ شامی کا مقصد اس وقت تک اقبال کو اندر جانے سے روکنا تھا جب تک روشنا اتر کر اندر نہ چلی جائے۔

"اقبال! یہاں کے حالات ٹھیک ہیں؟"

"جی شامیر صاحب! یہاں کے حالات کو کیا ہو ہے؟"

"میرا مطلب ہے آس پاس سب امن ہے نا؟"

"جی صاحب! بالکل امن ہے۔" وہ بولا۔ اس

شامی نے اس کے کیبن تک آتی فون وائر دیکھ لی۔ یعنی جب فارم ہاؤس میں کوئی نہیں ہوتا تھا تو فون یہاں منتقل ہوجا تھا۔ شامی نے پوچھا تو اس نے تصدیق کردی۔ "جی صاحب.... جب کوئی نہیں ہوتا ہے تو فون اس لائن پر آجاتا ہے ورنہ کوئی کال آئے تو مجھے اندر جانا پڑے گا پھر اتنی دور سے فون کی آواز بھی نہیں آتی ہے۔"

شامی کے خیال میں ان کا کام آسان ہوگیا تھا۔ وہ اندر آیا تو تیمور روشنا کو اندر لے جاچکا تھا۔ روشنا کا منہ بنا ہوا تھا۔ شامی نے تیمور کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے کہا۔ "خاتون جذباتی ہوگئی ہیں یہاں آکر اور فوری اپنے گھر جانا چاہتی ہیں۔"

شامی نے روشنا سے کہا۔ "دیکھو، تمہیں وہی کرنا ہے جو ہم کہیں.... ٹھیک ہے؟"

"ورنہ ہم اپنا راستہ لیتے ہیں اور تم اپنا معاملہ خود نمٹاتی رہو۔"

روشنا کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ "مجھے بابا کا خیال آگیا۔ وہ کسی مشکل میں نہ ہوں۔"

"تم فکر مت کرو، وہ مرد ہیں اور مردوں کو مشکلات کی عادت ہوتی ہے۔" شامی نے اسے تسلی دی۔ اس کی تسلی نہیں ہوئی لیکن وہ خاموش ہوگئی۔ انہوں نے اپنے پلان پر عمل شروع کیا۔ شامی نے چوکیدار کے کیبن میں موجود فون ایکسٹینشن کے بارے میں بتایا۔ شامی نے اندر موجود فون سے ایک سو بارہ ملا کر فون رکھ دیا اور اس کا اسپیکر آن کردیا۔ فوراً ہی بیل بجنے لگی۔ اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ جیسے ہی بیل رکی، اس نے ریسیور اٹھالیا۔

"ہیلو۔" اقبال کی آواز آئی۔ "کون بول رہا ہے؟"

"اقبال! میں محسن بات کررہا ہوں۔" شامی نے محسن کے باپ کی آواز کی نقل اتاری اور بہت اچھی اتاری کیونکہ اقبال مؤدب ہوگیا تھا۔

"حکم صاحب!"

"اقبال! یہاں تمہاری ضرورت ہے جلدی آجاؤ۔"

"جو حکم صاحب.... پر محسن صاحب کے دوست شامیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صاحب اور تیمور صاحب آئے ہوئے ہیں۔"
"یہ تو اچھی بات ہے۔ تم ان کو چھوڑ کر آ جاؤ۔"
"ٹھیک ہے صاحب! لیکن بس سے آؤں گا تو کچھ دیر لگے گی۔"
"کوئی بات نہیں۔ بے شک تم رات کو دیر سے آؤ۔" شامی نے کہا اور فون رکھ دیا۔ تیمور نے ہاتھ سے شان دار کا اشارہ کیا۔
"تو نے اتنی اچھی آواز نکالی ہے کہ خود محسن کا باپ سنے تو سمجھے خود بول رہا ہے۔"
وہ گیسٹ ہاؤس میں تھے۔ شامی نے روشنا کو واش روم میں جانے کا کہا۔ "مہربانی کر کے کوئی آواز نکالنے کی کوشش مت کرنا۔"
روشنا واش روم میں چلی گئی اور ان کی توقع کے عین مطابق اقبال اندر آیا۔ "شامیر صاحب! مجھے بڑے صاحب نے اسلام آباد بلایا ہے۔ میں ابھی جا رہا ہوں۔"
"ٹھیک ہے، تم چلے جاؤ۔ ہم یہیں ہیں۔" شامی نے کہا تو اقبال نے اسے چابیوں کا گچھا دیا۔
"اس میں گیٹ کی چابیاں بھی ہیں۔ آپ اسے اندر سے بند کر لیجیے گا۔"
"تم بے فکر رہو۔" شامی اسے گیٹ تک چھوڑنے آیا اور اس کے جاتے ہی گیٹ اندر سے بند کر لیا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور تاریکی کے ساتھ سردی بھی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ شامی واپس آیا۔ اس نے محسن کا کمرا کھولا۔ اسے یہاں ایک خاص چیز کی تلاش تھی اور یہ چیز اسے الماری میں مل گئی۔ وہ اس کے ساتھ واپس آیا تو تیمور نے اسے دیکھ کر کہا۔ "دوربین کا کیا کرنا ہے؟"
"روشنا کے فارم ہاؤس کی جاسوسی۔" شامی نے کہا۔ "اس بنگلے کی اوپری منزل پر ایک کمرا ہے اور اس کی چھت سے دور تک کا منظر صاف نظر آتا ہے۔" وہ اوپری منزل پر آئے۔ احتیاطاً شامی نے اوپر کی روشنیاں بجھا دی تھیں۔ کمرے کے اوپر چھت تک ایک لکڑی کی سیڑھی جا رہی تھی۔ روشنا نے کہا۔ "میں بھی اوپر جاؤں گی۔"
"تمہاری موجودگی بہت ضروری ہے۔" شامی نے سر ہلایا۔ "تم سب کو پہچانتی ہو۔"
وہ تینوں اوپر آئے۔ یہاں سے روشنا کا فارم واضح تو نہیں لیکن نظر آ رہا تھا۔ پہلے شامی نے فارم ہاؤس کا جائزہ لیا اور بولا۔ "تمہارا بنگلا تو بہت خوب صورت ہے۔"
"بابا نے خاص طور سے ایک آرکیٹیکٹ سے ڈیزائن کرایا تھا۔" وہ فخر سے بولی۔
"یہ اس کے پیچھے فارم ہے؟"
"ہاں، اس میں باغات ہیں۔ وہ دیکھو وہ دیوار بنگلے اور باغات کو الگ کر رہی ہے۔"
"اس طرف کیا ہے؟"
"اس طرف تمہیں جو دو بڑی کھڑکیاں نظر آ رہی ہیں، یہ بڑے ڈرائنگ روم کی ہیں۔ ان کے پیچھے کچن ہے۔ اس میں کچن کے ساتھ چھوٹا سا ڈائننگ روم ہے۔" روشنا نے بتایا۔
"بیڈ رومز کہاں ہیں؟"
"وہ دوسری طرف ہیں۔"
"یہ اوپر جو حصہ بنا ہوا ہے؟"
"یہ گیسٹ ہاؤس ہے۔"
سوالوں کے دوران میں شامی بنگلے کا معائنہ بھی کر رہا تھا لیکن ابھی تک اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ پھر اس نے دوربین کا رخ مین گیٹ کی طرف کیا، وہاں اسے ایک مسلح چوکیدار نظر آیا۔ شامی نے دوربین روشنا کی طرف بڑھائی۔ "گیٹ پر ایک مسلح شخص ہے، ذرا اسے دیکھ کر بتانا یہ کون ہے؟"
روشنا نے دوربین آنکھوں سے لگائی اور چونکی۔ "یہ ہمارا چوکیدار نہیں ہے۔ یہ کوئی اور شخص ہے۔ میں اسے نہیں جانتی ہوں۔"
شامی نے گہری سانس لی۔ "یہاں بھی اجنبی۔"
"گڑبڑ کی زیادہ بو آ رہی ہے۔" تیمور تشویش سے بولا۔ "ان حالات میں ہماری طرف سے کوئی قدم اٹھانا مناسب ہوگا جبکہ بنگلے میں موجود لوگ مسلح بھی ہیں؟"
"تیرے ذہن میں کچھ ہے؟" شامی بولا۔
"ہم پولیس کو اطلاع کر سکتے ہیں۔"
"پولیس۔" شامی ہنسا۔ "وہ شہر میں گھنٹوں بعد آتی ہے یہ تو دیہی علاقہ ہے۔ اور تو بھول رہا ہے اگر پولیس آئی تو معاملہ دادا حضور تک پہنچ جائے گا۔"
"پلیز! تم دونوں ہی کچھ کرو۔" روشنا بولی۔ "میرا دل گھبرا رہا ہے۔ پتا نہیں کیا ہو رہا ہے۔"
"تم فکر مت کرو، ہم کریں گے لیکن پہلے حالات کا جائزہ لینا لازمی ہے۔" شامی نے اسے تسلی دی اور گیٹ والے شخص کی طرف دیکھا۔ وہ گیٹ کے سامنے ٹہل رہا تھا۔
"میرا خیال ہے کہ آغاز اس سے کرتے ہیں۔"
"کیا کرتے ہیں؟" تیمور نے سوال کیا۔
"اسے قابو کرنا ہے... اور اگر یہ ہاتھ آ گیا تو اس سے اندر کے حالات پتا چل سکتے ہیں۔"
"بیٹے، اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف ہے، ڈنڈا نہیں ہے۔" تیمور نے خبردار کیا۔ شامی نے اپنی کھوپڑی تھپتھپائی۔
"کوئی چیز اس سے زیادہ خطرناک نہیں ہوتی۔"
"یعنی خلا سے زیادہ خطرناک نہیں ہوتی؟" تیمور نے معصومیت سے سوال کیا۔
شامی نے روشنا کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اسے بکواس کرنے دو... کیا تم کچھ کرنے کے لیے تیار ہو؟"
"میں سب کرنے کے لیے تیار ہوں۔" روشنا کا لہجہ پُرعزم تھا۔
شامی نے تیمور سے کہا۔ "تو یہیں رک اور دوربین سے ہم پر نظر رکھ۔ اگر معاملہ الٹ گیا یعنی ہم پکڑے گئے تو تو فوراً پولیس کو مطلع کرے گا۔ دوسری صورت میں ہماری مدد کے لیے آئے گا۔"
"ٹھیک ہے۔" تیمور نے دوربین تھام لی۔
نیچے آ کر شامی نے جیب سے جیک نیور نکالا۔ یہ کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا ٹھوس فولاد کا بنا ہوا تھا اور اس کی ایک ہی ضرب کسی کو آسمان کی عارضی یا ہمیشہ کی سیر کرانے کے لیے کافی ہوتی۔ اسے چھپانا بھی آسان تھا۔ شامی نے اسے جیکٹ میں سامنے چھپا لیا۔ وہ گیٹ سے باہر آئے۔ روشنا نے کہا۔ "ہم کیا کریں گے؟"
"ایک پرانی فلمی ترکیب سمجھ میں آ رہی ہے جس میں ایک حسین اور مظلوم نظر آنے والی لڑکی ولن سے مدد طلب کرتی ہے اور وہ اس کی مدد پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس دوران میں ہیرو کو اس پر قابو پانے کا موقع مل جاتا ہے۔"
"تمہارا مطلب ہے، میں اسے کسی طرح گیٹ سے باہر بلاؤں اور تم اسے قابو کرنے کی کوشش کرو؟"
"بالکل، اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ میری صورت دیکھ کر وہ باہر آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔"
روشنا ڈرتے ہوئے راضی ہو گئی۔ "مجھے کیا کرنا ہو گا؟"
"سب سے پہلے تو یہ جیکٹ اتار دو جو تمہیں چھپا رہی ہے اور اگر دوپٹا بھی چھوڑ دو تو کیا کہنے۔"
"یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟" وہ جھینپ گئی۔ اس نے جیکٹ اتار دی تھی۔ وہ بنگلے کے قریب آ گئے تھے لیکن سڑک کے دوسری طرف جھاڑیوں میں رہے۔ یہاں سے گیٹ نظر آ رہا تھا۔ شامی نے اس کا جائزہ لیا۔ گیٹ کے ایک طرف پھولوں کی بیل لگی تھی اور اس کے نیچے تاریکی تھی کیونکہ وہاں تک روشنی نہیں آ رہی تھی۔ شامی نے اس طرف اشارہ کیا۔
"میں وہاں چھپتا ہوں، تم اسے باہر بلانا۔"
"کس طرح؟" اس نے سادگی سے پوچھا۔
شامی نے سوچا اگر اس پر چھوڑا تو وہ حماقت کر سکتی تھی اس لیے اسے مکمل پلان بتا دینا ضروری تھا۔ "دیکھو، تم جھاڑیوں سے ہلکی سی چیخ مارو گی اتنی ہلکی کہ یہ شخص سن لے لیکن آواز بنگلے کے اندر تک نہ جائے۔"
"میں سمجھ گئی۔"
"اس کے بعد تم کچھ واویلا کرو گی اور کسی نادیدہ شخص سے درخواست کرو گی کہ تمہیں چھوڑ دے۔ پھر تم اس کے چنگل سے چھوٹ کر بھاگو گی اور گیٹ سے پہلے گر جانا تاکہ مسلح شخص تمہیں اٹھانے آئے۔"
"ٹھیک ہے۔" وہ سعادت مندی سے بولی۔
"اب میں جاتا ہوں اور جب میں تمہیں اشارہ کروں تو تم ڈراما شروع کر دینا۔ یاد رہے اس شخص کو کسی بھی طریقے سے اپنی طرف متوجہ رکھنا ہے۔ اگر اسے میری موجودگی کا احساس ہو گیا تو وہ گولی مارنے میں دیر نہیں کرے گا۔"
روشنا خوف زدہ ہوئی... لیکن اس نے سر ہلایا۔ شامی سامنے سے ذرا ہٹ کر جھاڑیوں سے نکلا اور سڑک کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ پھولوں کی بیل کے نیچے مکمل تاریکی نہیں تھی اس لیے وہ اس کے نیچے ممکن حد تک دبک گیا۔ اس نے روشنا کو اشارہ کیا لیکن اس نے نہیں دیکھا پھر شامی کو خیال آیا کہ اسے بھلا کہاں نظر آئے گا۔ وہ ذرا آگے آیا اور ہاتھ لہرایا۔ اس پر روشنا نے فوراً چیخ ماری اور یہ خاصی تیز تھی۔ شامی واپس اپنی جگہ گھس گیا۔ اس نے دل ہی دل میں روشنا کو سنائیں۔ وہ اب مسلسل بول رہی تھی اور خود کو چھوڑ دینے کی اپیل کر رہی تھی۔ اگرچہ اس کی اداکاری میں بناوٹ صاف نظر آ رہی تھی۔
"اے... کون ہے؟" مسلح آدمی نے گیٹ کی کھڑکی سے جھانکا اسی سمے لڑکھڑاتی ہوئی روشنا جھاڑیوں سے نکلی اور گیٹ کی طرف بھاگی۔ شامی نے یہ دیکھ کر سر پیٹ لیا کہ وہ نان اسٹاپ گیٹ تک پہنچ گئی تھی۔ مسلح آدمی نے گیٹ کھول دیا تھا۔ عین وقت پر روشنا کو یاد آیا کہ اسے گیٹ تک نہیں آنا تھا وہ مسلح آدمی کو دیکھ کر پلٹ کر بھاگی اور اس کوشش میں بیچ سڑک پر گر گئی۔
"تم۔" مسلح آدمی نے بے ساختہ کہا۔ شاید وہ روشنا کو پہچان گیا تھا۔ وہ باہر آیا اس نے رائفل کا رخ روشنا کی طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر دیا۔ ”بھاگنا مت ورنہ گولی ماردوں گا۔“

شامی اس کے اتنے آگے آنے کا انتظار کررہا تھا کہ اس کی پشت مکمل طور پر شامی کی طرف ہو جائے۔ اگر وہ اس کی موجودگی محسوس کرلیتا تو اسے پلٹ کر فائر کرنے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگتا۔ اس نے رائفل ہاتھ میں لی ہوئی تھی اور انگلی ٹریگر پر تھی۔ روشنا بغیر جیکٹ اور دوپٹے کے تھی اور ریشمی سوٹ میں اس کا سراپا نمایاں ہورہا تھا۔ مسلح آدمی کی توجہ اس طرف چلی گئی۔ اس نے حریص لہجے میں کہا۔

”تو تو بڑی زبردست چیز ہے۔ باس نے بھی کیا انتخاب کیا ہے۔“

روشنا کو اس کے لہجے اور نظروں پر غصہ آگیا۔ ”بکو مت... میرے قریب مت آنا۔“

جب ایک لڑکی کسی مرد سے یہ الفاظ کہے تو وہ اس کے الٹ ضرور کرتا ہے جیسا کہ مسلح آدمی نے کیا۔ وہ روشنا کے قریب پہنچ کر اس پر جھکا۔ شامی کے لیے یہ مناسب ترین موقع تھا۔ وہ دبے قدموں اپنی پناہ گاہ سے نکلا اور اس نے ہاتھ میں دبا یورتھا کر آدمی کے سر پر رسید کر دیا۔ وہ کراہا اور روشنا پر ڈھیر ہونے لگا تھا کہ شامی نے عقب سے اس کی جیکٹ کا کالر پکڑ کر اسے کھینچ لیا۔ وار اتنا بھرپور تھا کہ وہ فوراً ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ شامی اسے کھینچ کر پھولوں کی بیل تلے لے آیا۔ اس نے رائفل ایک طرف رکھی اور پھر اس نے تلاشی لی۔ اس کے پاس ایک بٹوے اور رائفل کے مزید دو عدد میگزین کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ جوان آدمی تھا۔ زبان اور حلیے سے شہر کا لگ رہا تھا۔ جب تک شامی اس کی تلاشی لے رہا تھا، روشنا بھاگ کر اپنی جیکٹ اور دوپٹا لے آئی تھی۔ اس نے شامی سے کہا۔

”اب کیا کرنا ہے؟“

”اندر جانا ہے۔“ شامی نے رائفل چیک کی، وہ لوڈ تھی۔

”اندر پتا نہیں اور کون ہے... اور بابا کہاں ہیں؟“

”یہ بتاؤ کہ اس گیٹ کے علاوہ کوئی راستہ ہے اندر جانے کے لیے؟“

”وہی راستہ ہے جس سے میں گھر سے نکلی تھی۔“

شامی نے بے ہوش شخص کی نبض دیکھی۔ وہ ابھی کئی گھنٹے تک آرام سے سوسکتا تھا۔ اس کی طرف سے بے فکر ہو کر وہ روشنا کے ساتھ فارم ہاؤس کے بغلی دروازے تک آیا۔ بنگلے کی چاردیواری اونچی تھی لیکن باغ کے گرد کی چاردیواری اونچی نہیں تھی۔ شامی کو یاد آیا کہ وہاں کتے ہوتے ہیں۔ اس نے روشنا سے کہا۔ ”کتے تمہیں پہچانتے ہیں مجھے نہیں... اگر میں اندر اترا تو وہ مجھے بھنبھوڑ کھائیں گے۔“

”تم اندر اترتے ہی دروازہ کھول دینا، کتوں کو میں دیکھ لوں گی۔“

شامی ہمت کر کے دیوار پر چڑھا۔ اسے کتوں سے خوف آتا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ قادر ولا میں موجود کتوں سے بھی دور رہتا تھا۔ نیچے اترنے سے پہلے وہ سن گن لیتا رہا پھر اس نے نیچے چھلانگ لگائی اور جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ روشنا اندر آگئی۔ اس نے آہستہ سے آواز دی۔ ”گیلو، مارش۔“

”یہ کتوں کے نام ہیں؟“

”ہاں، بابا نے باہر سے منگوائے ہیں۔“ اس نے بتایا لیکن گیلو اور مارش کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ روشنا کی تشویش مزید بڑھ گئی۔ ”یہ ممکن نہیں ہے کہ باغ والے حصے میں کوئی قدم رکھے اور ان کو خبر نہ ہو۔“

”یعنی وہ یہاں نہیں ہیں؟“

”شاید۔“ وہ آگے بڑھی۔ باغ میں کہیں کہیں بانس کے کھمبوں پر بلب روشن تھے لیکن ایک جگہ بہت ہی تیز روشنی والے بلب تھے۔ شامی نے ان کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ کیا ہے؟“

”یہاں ایک بڑا سا تالاب ہے، کوئی پچاس فٹ لمبا چوڑا اور تیس فٹ گہرا ہے۔ بابا نے اس میں مچھلیاں ڈالی ہیں لیکن اس کا مقصد خشک دنوں میں درختوں کو پانی دینا ہے اور...“

”اتنی وضاحت کافی ہے۔“ شامی نے اس کی بات کاٹی۔ ”تم نے بتایا تھا کہ یہاں باغ کے دو ملازم اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتے ہیں؟“

”ہاں، ایک شخص صرف اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتا ہے اور دوسرے کی بیوی اور دو بچے بھی ہیں۔“

”وہ اس وقت اپنے گھر میں ہوں گے؟“ شامی کو خیال آیا۔

”بالکل۔“ روشنا نے سر ہلایا اور ایک سمت اشارہ کیا۔ ”اس طرف ان کے مکانات ہیں۔“

”آؤ پہلے ان کو دیکھتے ہیں۔ اگر وہ گھر پر مل گئے تو بتا سکیں گے کہ یہاں کیا ہورہا ہے۔“

وہ دونوں ان کچے مکانات تک پہنچے۔ پانچ فٹ اونچی چاردیواریوں کے اندر دو دو کمرے بنے تھے۔ جن کے اوپر سیمنٹ کی شیٹوں کی چھت تھی۔ یہ یقیناً خود سے بنائے ہوئے مکانات تھے۔ شامی نے سرگوشی میں روشنا سے کہا۔ ”میرا

Digest of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سامنے جانا مناسب نہیں ہوگا۔ تم جا کر دیکھو۔‘‘

روشنا آگے گئی۔ چار دیواریوں میں کوئی دروازہ نہیں تھا اس لیے وہ آرام سے اندر داخل ہو گئی اور رک گئی۔ کمروں کے دروازے کھلے تھے۔ اس نے باری باری دونوں کمروں میں جھانکا یہاں بجلی مہیا کی گئی تھی اس لیے روشنی تھی۔ وہ باہر آئی اور شامی کو بتایا۔ ’’یہاں تو اندر کوئی نہیں ہے۔‘‘

’’دوسرے گھر میں دیکھو۔‘‘

روشنا نے دوسرے گھر میں جھانکا، وہ بھی خالی اور کھلا ہوا تھا۔ ’’یہاں بھی کوئی نہیں ہے۔‘‘

’’اس کا مطلب ہے کہ وہ سب یہاں سے کہیں اور منتقل کیے جا چکے ہیں۔‘‘

’’ان کا سامان ہے۔‘‘ روشنا نے آگاہ کیا۔

’’میرا مطلب ہے وہ اسی فارم میں کہیں ہیں اور اپنی مرضی سے نہیں ہیں۔‘‘

روشنا شامی کا مطلب سمجھ گئی۔ ’’... شاید وہ بنگلے میں ہیں۔‘‘

’’آؤ اس طرف دیکھتے ہیں لیکن اب خاموش رہنا۔ آج ہوا نہیں ہے اور بالکل خاموشی ہے۔ ہماری آوازیں دور تک جا رہی ہوں گی۔‘‘

روشنا نے سر ہلایا۔ اس نے ہتھیار کے طور پر شامی سے جیک لیور لے لیا تھا۔ وہ دونوں بنگلے کی طرف بڑھے۔ وہ پانی کے تالاب کے پاس سے گزرے جس کے پاس بلند بانس پر تیز سفید روشنی والا بلب لگا تھا۔ اس کے پاس سے گزر کر کچھ دیر میں وہ بنگلے اور باغات کو جدا کرنے والی دیوار کے پاس تھے۔ شامی نے روشنا سے کہا۔ ’’میرا خیال ہے کہ تم یہاں رکو، میں اندر جاتا ہوں اور صورتِ حال کا جائزہ لیتا ہوں۔‘‘

’’میں کیوں نہیں؟‘‘ اس نے اعتراض کیا۔

’’ایک آدمی آسانی سے چھپ سکتا ہے اور اگر میں کہیں پھنس گیا تو تم پیچھے بچ جاؤ گی اور میری مدد کر سکو گی۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ روشنا بولی۔ ’’لیکن میں زیادہ دیر انتظار نہیں کروں گی۔‘‘

شامی نے رائفل بھی اس کی طرف بڑھا دی۔ ’’یہ رکھ لو، اس کے ساتھ بھاگ دوڑ ذرا مشکل کام ہے۔‘‘

روشنا نے ڈرتے ڈرتے وزنی رائفل تھام لی اور شامی نے دیوار پھلانگی کیونکہ دروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔ یہ چھ فٹ اونچی دیوار تھی، اسے مشکل نہیں ہوئی۔ یہ خاصا بڑا لان تھا اور وہ اسے پار کر کے عمارت کی طرف بڑھا۔ روشنا دیوار سے جھانک کر دیکھ رہی تھی۔ شامی عمارت کے دائیں حصے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک کسی نے کہا۔ ’’خبردار...! ہاتھ اوپر کر لو... بلڈنامت۔‘‘

شامی ساکت ہو گیا پھر اس نے ہاتھ اوپر کر لیے۔ ایک مسلح شخص لان کے ایک تاریک گوشے سے نکلا اور اس نے ویسی ہی رائفل شامی کی پشت سے لگا دی جیسی روشنا کے پاس تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے اور پھر وہ پلٹ کر بھاگی۔ اس کا رخ باغات کے بغلی دروازے کی طرف تھا۔

شامی ساکت رہ گیا اور اب پچھتا رہا تھا کہ اس نے رائفل روشنا کو کیوں تھمائی لیکن شاید اسی میں بہتری تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ لان میں چھپا شخص اسے مسلح دیکھ کر پکڑنے کے بجائے گولی ہی مار دیتا۔ مسلح آدمی اسے عقبی راستے سے اندر لے گیا۔ وہ اسے ایک بڑے کمرے میں لایا جہاں پروفیسر وقار چنگیزی کے ساتھ مزید چار افراد تھے۔ شامی کو دیکھ کر ان میں سے ایک چونک گیا۔

’’یہ کون ہے؟‘‘

’’باس! یہ پیچھے والے لان میں آیا تھا۔‘‘ شامی کو لانے والا بولا۔

’’کون ہو تم؟‘‘ اس شخص نے شامی سے پوچھا۔

’’میں جی پروفیسر صاحب سے ملنے آیا ہوں۔‘‘ شامی نے کہا۔

’’میں تمہیں نہیں جانتا۔‘‘ پروفیسر صاحب بولے۔ انہوں نے تھری پیس سوٹ اور ٹائی کے ساتھ سر پر ہیٹ بھی لگا رکھا تھا۔ ’’کیوں آئے ہو؟‘‘

’’وہ... میں یہ فارم اور بنگلا خریدنا چاہتا ہوں۔‘‘ شامی بولا۔ ’’مجھے اچھا لگا ہے۔‘‘

’’لیکن مجھے فارم اور بنگلا نہیں بیچنا۔‘‘ پروفیسر صاحب ناگواری سے بولے۔

’’ٹھیک ہے، تب میں جاتا ہوں۔‘‘ شامی مڑا تھا کہ اس سے پوچھنے والے نے کہا۔

’’ایک منٹ برخوردار... اتنی جلدی کیا ہے؟ ابھی آئے ہو بیٹھو۔‘‘

اسے لانے والے نے رائفل سے اسے صوفے کی طرف دھکیل دیا جہاں ایک اور شخص بھی بیٹھا تھا۔ یہ متوسط قد اور گورے رنگ کا مناسب ناک نقشے والا شخص تھا۔ اس نے سفید قمیص اور ہلکے نیلی رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی اور اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے خون جھلک رہا تھا جیسے کسی نے اس پر تشدد کیا ہو۔ اس کے ساتھ والے تھری سیٹر صوفے پر پروفیسر صاحب بیٹھے تھے۔ شامی نے ان کی طرف دیکھا۔

’’یہ کیا چکر ہے جناب؟‘‘

پروفیسر صاحب پہلے ہی بور ہو رہے تھے، انہوں نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔ شامی نے برابر والے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ آہستہ سے بولا۔ ’’تم نے یہاں آ کر حماقت کی ہے۔‘‘

وہاں کھڑے افراد کی تعداد چار تھی۔ ان میں تین مسلح تھے اور چوتھا کسی قدر طویل قامت تھا۔ صوفے پر بیٹھے شخص کے بال کسی قدر سرخی مائل اور پیچھے کی طرف بنے ہوئے تھے۔ ماتھا بال اڑنے سے مزید فراخ ہو گیا تھا۔ شامی کو جاننے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہی ضیا تیموری ہے۔ اس نے پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا۔ ’’تمہیں بتانا ہو گا روشنا کہاں ہے؟‘‘

’’میں نہیں جانتا۔‘‘ وہ سپاٹ لہجے میں بولے۔ ’’تم رات سے یہاں ہو، وہ تمہیں کہیں نظر آئی؟‘‘

’’ہو سکتا ہے... تم دونوں نے اسے کہیں چھپا دیا ہے۔ میں اب مزید انتظار نہیں کر سکتا۔‘‘

’’یہ غلط ہے۔‘‘ صوفے پر بیٹھا ہوا شخص بولا۔ ’’مجھے تو صبح وقار بھائی نے فون کر کے بتایا ہے۔‘‘

ضیا مسکرایا۔ ’’وہ فون میں نے کروایا تھا۔‘‘

’’تب تمہیں معلوم ہو گا، اس وقت میں گھر پر تھا اور مجھے نہیں معلوم کہ روشنا کہاں ہے۔‘‘

ضیا کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ ’’اسے تم دونوں نے غائب کیا ہے ورنہ اسے کل رات باہر آنا تھا۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ وہ باہر نکل گئی تھی اور اس کے بعد مجھے بھی نہیں معلوم وہ کہاں گئی۔‘‘ پروفیسر صاحب بولے۔

شامی صورتِ حال کو سمجھ رہا تھا۔ ضیا تیموری کی نیت خراب تھی ورنہ روشنا کو لینے کے لیے اس لاؤ لشکر کو لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر اس کی بدقسمتی کہ روشنا نے اس کے آدمیوں کی گفتگو سن لی اور بھاگ نکلی۔ شامی کا اندازہ درست نکلا تھا۔ ضیا، روشنا کے ساتھ مخلص نہیں تھا۔ اس نے ضیا سے کہا۔ ’’کیا تم ڈاکو ہو؟‘‘

’’بکو مت... میں تمہیں ڈاکو نظر آتا ہوں۔‘‘ وہ غرایا۔

’’اچھا تو یہ کیا ہے؟‘‘ شامی نے اسلحے کی طرف اشارہ کیا اور ساتھ ہی دل میں ایک بار پھر خدا کا شکر ادا کیا کہ رائفل روشنا کو دے دی تھی ورنہ وہ رائفل دیکھ کر کھٹک جاتے اور اپنے چوتھے ساتھی کی فکر کرتے۔ لیکن شامی نے محسوس کیا کہ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے کیونکہ وہ گزشتہ رات سے یہاں تھا اور یقیناً اسے یہاں سے جانا تھا لیکن وہ روشنا کی وجہ سے رکا ہوا تھا۔ اچانک اس نے کہا۔ ’’گیٹ پر دیکھو... وہ بہت دیر سے اندر نہیں آیا ہے۔‘‘ وہ گیٹ والے ساتھی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ شامی کو اندر لانے والا گیا اور دو منٹ بعد بدحواس واپس آیا۔

’’باس! وہ نہیں ہے۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ ضیا غرایا۔

’’گیٹ پر نہیں ہے اور نہ آس پاس ہے۔‘‘ وہ بولا۔ یقیناً اس نے گیٹ کے ساتھ موجود پھولوں کی بیل تلے نہیں دیکھا تھا جہاں اس کا ساتھی بے ہوش پڑا تھا۔ ضیا نے ایک عدد پستول نکال لیا اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

’’تم لوگ جا کر پورا بنگلا اور آس پاس دیکھو۔‘‘

وہ کمرے سے نکل گئے۔ شامی کے علاوہ کمرے میں موجود تینوں فریق ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ اچانک ضیا نے کہا۔ ’’پروفیسر! میں آخری موقع دے رہا ہوں۔ میرے ساتھیوں کے آنے سے پہلے مجھے روشنا کے بارے میں بتا دو۔‘‘

’’تمہارا کیا خیال ہے اگر مجھے پتا ہوتا، تب بھی میں تمہیں بتاتا؟‘‘

’’مجھے معلوم ہے کہ تم بہت ضدی آدمی ہو لیکن مجھے ضدی آدمیوں کی اکڑ نکالنا آتی ہے۔‘‘

پروفیسر صاحب نے کچھ نہیں کہا۔ ان کے تاثرات حقارت آمیز تھے جیسے ضیا اور اس کے مسلح ساتھیوں کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔ شامی نے دل ہی دل میں ان کے حوصلے کی داد دی۔ ان کے مقابلے میں شاہ جہان خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ ’’تمہیں جو کرنا ہے کر لو۔‘‘ پروفیسر صاحب بولے۔ ’’لیکن تم کیا سمجھتے ہو، تم بچ جاؤ گے؟‘‘

’’میں بچ جاؤں گا۔‘‘ ضیا مسکرایا۔ ’’کیونکہ تمہارا کوئی وجود باقی نہیں رہے گا جو کسی کو کچھ بتا سکے۔‘‘

’’تم ہمیں قتل کر دو گے؟‘‘ شاہ جہان نے لرزتی آواز میں کہا۔

’’اگر مجھے روشنا نہیں ملی تو یقیناً تم دونوں کچھ دیر بعد اس دنیا میں نہیں رہو گے۔‘‘

’’تم کس کس کو قتل کرو گے؟ میرے ملازم اور ان کے گھر والے بھی تمہیں دیکھ چکے ہیں۔‘‘ پروفیسر صاحب

Digest of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بولے۔

"مجھے نہیں میرے ساتھیوں کو۔" اس نے جواب دیا۔

چند منٹ بعد اس کے ساتھی اپنے بے ہوش ساتھی کو لے کر آچکے تھے۔ ایک نے اسے شانے پر اٹھا رکھا تھا۔ "یہ گیٹ کے پاس جھاڑی کے نیچے بے ہوش پڑا تھا اور اس کی رائفل غائب ہے۔" لانے والے نے رپورٹ دی۔

ضیا کے چہرے پر فکر کے تاثرات نظر آنے لگے۔ اس نے غرا کر کہا۔ "اسے ہوش میں لاؤ۔"

بے ہوش آدمی کے چہرے پر ایک جگ ٹھنڈا پانی ڈالنے کا خاطر خواہ ردعمل سامنے آیا اور وہ چھینکتا ہوا ہوش میں آگیا۔ ضیا نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ وہ خوں خوار نظر آنے لگا اور ہوش میں آنے والا خوف زدہ ہوگیا۔ "کیا ہوا تھا؟"

"پتا نہیں باس۔" اس نے ہکلا کر کہا۔ "میں تو گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔ باہر سے آواز آئی تو میں باہر نکلا اور کسی نے پیچھے سے میرے سر پر کچھ مارا۔"

"پیچھے کیسے آیا؟ کیا تم آنکھ بند کر کے باہر نکلے تھے؟" ضیا غرایا۔ اس نے ایک جھٹکا دے کر اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ "تم سے بعد میں نمٹوں گا۔" پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ "ان سب کو تالاب کی طرف لے چلو۔ کتوں کو باندھنے والی زنجیریں اور تالے بھی ساتھ لے لینا۔"

انہوں نے دھکے دے کر پروفیسر صاحب، شاہ جہاں اور شامی کو کھڑا کر دیا۔ وہ دونوں تو نہیں لیکن شامی سمجھ گیا کہ زنجیروں اور تالوں کا کیا کرنا تھا۔ وہ تالاب کے کنارے پہنچے۔ اس کے پانی میں کتوں کی لاشیں تیر رہی تھیں۔ ان کو شاید گولی ماری گئی تھی۔ جب پروفیسر صاحب نے ان کی لاشیں دیکھیں تو ان کے چہرے پر طیش کے تاثرات نظر آئے مگر وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ وہ تینوں نہتے تھے جبکہ ضیا اور اس کے ساتھی تعداد میں ان سے زیادہ تھے بلکہ پوری طرح مسلح بھی تھے۔ ان میں سے کوئی ایک ہی رائفل کا برسٹ مار کر ان کو موت کی نیند سلا سکتا تھا۔ ان کی طرف سے مزاحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ضیا کا ایک آدمی کتوں کی زنجیریں اور ان کو بند کرنے والے تالے لے آیا۔ دونوں کتے بھاری جسامت کے حامل تھے۔ اسی حساب سے ان کی زنجیریں بھی مضبوط اور وزنی تھیں تاکہ وہ ان کو آسانی سے توڑ نہ سکیں۔ ضیا کے اشارے پر اس کے ساتھیوں نے پھرتی سے شاہ جہاں کو زمین پر گرایا اور اسے ان زنجیروں سے سر سے پاؤں تک یوں جکڑ دیا کہ وہ اب حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور دونوں پاؤں ٹخنوں سے جکڑے ہوئے تھے۔ وہ بندھنے کے دوران مزاحمت کرتا رہا لیکن تین چھٹے ہوئے بدمعاشوں کے سامنے اس کی ایک نہیں چلی۔ انہوں نے ایک منٹ میں اسے باندھ دیا۔

اب پروفیسر صاحب بھی کسی قدر فکرمند نظر آنے لگے تھے۔ انہوں نے ضیا سے کہا۔ "تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔"

"یقیناً۔" اس نے تسلیم کیا۔ "ابھی میں اس کے ساتھ اچھا نہیں کر رہا ہوں اور اس کے بعد آپ کی باری ہے۔ آپ آرام سے سوچیں کہ روشنا کہاں ہے؟"

اس دوران میں اس کے آدمیوں نے شاہ جہاں کے پیروں کے ساتھ ایک باریک مگر مضبوط ڈوری بھی باندھ دی تھی۔ ضیا اس کے پاس بیٹھا۔ "میں آخری بار پوچھ رہا ہوں... بتا دو روشنا کہاں ہے؟"

"میں کیسے بتا سکتا ہوں۔" اس نے بے بسی سے کہا۔ "جبکہ مجھے خود نہیں معلوم۔"

"ابھی میں تمہاری یادداشت بہتر کرتا ہوں۔" ضیا نے کہا اور اس کے اشارے پر اس کے دو آدمیوں نے شاہ جہاں کو اٹھا کر تالاب میں پھینک دیا جبکہ تیسرا اس رسی کو تھامے ہوا تھا جو شاہ جہاں کے پاؤں سے بندھی ہوئی تھی۔ وہ وزنی زنجیروں کی وجہ سے پانی میں گرتے ہی سر کے بل نیچے کی طرف جانے لگا اور اسے ابھرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بلب کی تیز روشنی میں وہ نیچے جاتا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پھر وہ تہ سے کچھ اوپر رہ گیا تھا کہ ضیا کے اشارے پر اس کے آدمی نے رسی کھینچنا شروع کی اور وہ واپس آنے لگا۔ جیسے ہی کنارے تک اس کے پاؤں پہنچے پھینکنے والے دونوں افراد نے اسے اوپر کھینچ لیا۔ شاہ جہاں کی حالت بری تھی۔ پانی اس کی ناک اور منہ میں چلا گیا تھا اور وہ بری طرح کھانس رہا تھا۔ آخر اس کی کھانسی کسی قدر تھمی تو ضیا نے پھر اس سے پوچھا۔

"یاد آیا روشنا کہاں ہے؟ اگر تمہیں نہیں معلوم تو اس پروفیسر کو ضرور معلوم ہوگا۔"

"مجھے نہیں... معلوم۔" شاہ جہاں چلایا۔ "اگر معلوم ہوتا تو اس پر لعنت بھیج کر تمہیں بتا دیتا۔"

"شاہ جہاں۔" پروفیسر صاحب دہاڑے۔ "تم میری بچی کے لیے اس طرح بات نہیں کر سکتے۔"

"میں لعنت بھیج چکا ہوں اس پر۔" شاہ جہاں زہریلے لہجے میں بولا۔ "کاش مجھے معلوم ہوتا کہ وہ کہاں ہے تو میں اس کا پتا بتا کر اپنی جان چھڑا لیتا مگر افسوس مجھے نہیں معلوم۔" "مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں ایک ذلیل اور گھٹیا سوچ رکھنے والے شخص سے زبردستی اپنی بیٹی کی شادی کر رہا ہوں۔"

"مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ تمہاری بیٹی یہ کرتوت دکھائے گی۔"

"شاہ جہاں۔" پروفیسر صاحب گرج کر بولے۔ "اپنی زبان کو لگام دو ورنہ..."

ضیا ان دونوں کی لڑائی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے شاہ جہاں سے کہا۔ "مجھے تمہاری بات کا یقین آگیا ہے۔"

"شکر ہے... یعنی اب تم مجھے چھوڑ دو گے؟"

"بالکل اور ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا۔" ضیا نے ایک خوف ناک مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا تو وہ اس کے پاؤں سے زنجیر کھولنے لگے۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پاؤں کی زنجیریں کھول دیں، اسے کھڑا کیا اور اچانک پیچھے سے زوردار دھکا دیا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ تالاب میں جا گرا۔ اس نے ڈبکی کھائی، پھر باہر نکل کر بری طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ "مجھے تیرنا نہیں آتا۔" اس نے گلا پھاڑ کر کہا۔ ضیا مسکرایا اور پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا۔

"اس پر ایک لطیفہ عرض ہے... مجھے بھی گانا نہیں آتا ہے لیکن میں نے کبھی اس طرح چلا کر نہیں بتایا۔"

"یہ مر جائے گا۔" وہ اضطراب سے بولے۔

"مر جانے دیں۔ اس نے آپ کی صاحبزادی کے بارے میں کتنی بے ہودگی سے بات کی تھی۔"

شامی سوچ رہا تھا کہ کہیں روشنا بی جان بچا کر فرار تو نہیں ہوگئیں۔

☆☆☆

روشنا بدحواس ہو کر بھاگی لیکن تالاب تک آتے آتے وہ رک گئی کیونکہ سے پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے کتے نظر آگئے تھے۔ وہ مر چکے تھے۔ روشنا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کچھ ہی عرصے میں اسے ان کتوں سے انسیت ہوگئی تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ شامی کی جان خطرے میں ہے اور یقیناً وہ ان کے کتوں سے زیادہ اہم تھا پھر اس کے بابا بھی تھے۔ روشنا دروازہ کھول کر باہر آئی اور اس نے اسے باہر سے بند کر دیا تاکہ کوئی دیکھے تو اسے کھلا نظر نہ آئے۔ سابقہ تجربے کے پیش نظر اس نے جھاڑیوں سے گزرنے سے گریز کیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہاں کوئی گھات لگائے نہ بیٹھا ہو۔ سڑک پر آنے کے بعد بھی وہ درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں رہی۔ وزنی رائفل لے کر چلنا آسان نہیں تھا۔ بھاگ بھاگ کر اس کی سانس پھول گئی تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ محسن کا فارم ہاؤس کبھی آئے گا ہی نہیں۔ خدا خدا کر کے فارم ہاؤس آیا اور وہ اندر آئی۔ محسن اوپر تھا۔ روشنا نے سیڑھیوں کے نیچے کھڑے ہو کر اسے آواز دی لیکن شاید اسے آواز نہیں گئی۔ مجبوراً وہ اوپر چڑھی جہاں تیمور دوربین آنکھوں سے لگائے کھڑا تھا لیکن اس کا رخ ان کے فارم ہاؤس سے بالکل الٹ سمت میں تھا۔ وہ اتنا محو تھا کہ اسے روشنا کی آمد کی اطلاع ہی نہیں ہوئی۔ روشنا نے اس طرف دیکھا تو اسے برابر والے فارم ہاؤس کے ایک کمرے کی کھڑکی سے اندر لیٹی خاتون نظر آئی۔ اس نے خاصا بے تکلفانہ لباس پہن رکھا تھا اور اس سے زیادہ بے تکلف پوز میں شاید ٹی وی دیکھ رہی تھی کیونکہ اس کا سر ایک طرف ساکت تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ پیالے سے پوپ کارن اٹھا کر کھا رہی تھی۔ یہاں سے بھی وہ

چمڑی جائے پر دمڑی نہ جائے

ایک یہودی بستر مرگ پر پڑا آخری سانس لے رہا تھا۔ بیوی اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ مرنے سے چند منٹ قبل اس نے پتھرائی ہوئی آنکھوں کو تھوڑا سا کھولا اور بیوی سے بولا۔ "ڈارلنگ میرے کمرے میں اس وقت اور کون موجود ہے؟"

"سبھی موجود ہیں۔" بیوی نے جواب دیا۔

"کیا شائل بھی یہیں ہے؟"

"ہاں شائل بھی ہے۔"

"کیا ڈیوڈ بھی ہے؟"

"ہاں ڈیوڈ بھی ہے۔"

"کیا جیکب بھی موجود ہے؟"

"ہاں جیکب بھی موجود ہے۔"

یہودی کے منہ سے فلک شگاف چیخ نکلی۔ "پھر دکان پر کون ہے؟" اور اس چیخ کے ساتھ ہی اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

انوشہ رحمان، فیصل آباد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صاف نظر آرہی تھی لیکن تیمور نے یقیناً دیگر تفصیلات کے لیے دوربین کا استعمال مناسب سمجھا تھا۔ روشا کھنکھاری تو وہ بوکھلا کر مڑا تھا۔

"تم یہاں... میرا مطلب ہے... شامی کہاں ہے؟"

"شامی پھنس گیا ہے اور تم ہماری مدد کرنے کے بجائے یہاں مجھے اور دیکھ رہے تھے۔" روشا نے پُرملامت لہجے میں کہا۔

"شامی پھنس گیا ہے مگر کیسے؟" تیمور فکرمند ہو گیا۔

"فارم ہاؤس میں کوئی گڑبڑ ہے۔ فارم پر کام کرنے والے ملازمین گھر والوں سمیت غائب ہیں۔ رکھوالی کے دونوں کتے مار کر پانی کے تالاب میں پھینک دیے ہیں اور جب شامی بنگلے میں داخل ہوا تو ایک مسلح آدمی نے اسے پکڑ لیا اور اندر لے گیا۔"

"شامی کیسے پکڑا گیا... اس کے پاس بھی رائفل تھی؟"

"نہیں، رائفل وہ مجھے دے گیا تھا۔"

"تو تم نے کچھ کیوں نہیں کیا؟" تیمور بولا۔ وہ اپنی جھینپ مٹا رہا تھا۔

"یہ انکوائری تم بعد میں کرتے رہنا۔ مجھے رائفل چلانی نہیں آتی۔ میں اسے یہاں لے آئی ہوں۔"

تیمور نیچے آیا اور اس نے سب سے پہلے پولیس کو کال کی۔ اس نے پولیس آپریٹر کو بتایا کہ یہاں ڈاکو ایک فارم ہاؤس میں گھس آئے ہیں اور لوٹ مار کرنے کے ساتھ مکینوں کو یرغمال بنا لیا ہے۔ اس کے بعد وہ رائفل بدست باہر نکلا۔ وہ اور شامی جس چیز سے ڈر رہے تھے بالآخر وہی چیز سامنے آ گئی تھی یعنی ان کو اب پہلے پولیس اور پھر دادا جان کا سامنا کرنا پڑتا۔ روشا اس کی راہنمائی کر رہی تھی۔ وہ بغلی دروازے تک آئے۔

"ہمیں یہاں سے اندر جانا ہے۔"

وہ دونوں اندر داخل ہوئے اور تیمور نے رائفل کا سیفٹی لاک ہٹا کر اسے سنگل فائر موڈ پر کر دیا تھا کیونکہ برسٹ کی صورت میں ممکن تھا کوئی بلاوجہ اپنی جان سے چلا جائے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "یاد رکھنا... اگر بھی گولیاں چلنے لگیں تو زمین پر لیٹ جانا اور سر دونوں ہاتھوں سے چھپا لینا۔"

"ٹھیک ہے۔"

وہ باغات کے وسط سے گزر رہے تھے کہ ان کو آوازیں سنائی دیں۔ وہ رک گئے۔ تیمور نے سرگوشی میں پوچھا۔ "یہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں؟"

"تالاب کی طرف سے۔"

"تالاب کہاں ہے؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" روشا نے کہا اور تالاب کی طرف بڑھی۔ وہ پھل دار درختوں کی آڑ میں چل رہے تھے جو زیادہ بڑے تو نہیں تھے لیکن ان کو چھپانے کے لیے کافی تھے۔ وہ تالاب کے سامنے پہنچے تو وہاں چھ سات افراد موجود تھے۔ روشا ان کو دیکھ کر بے تاب ہو گئی۔ "بابا..."

"کون؟" تیمور نے پوچھا۔

"وہ جو ہیٹ اور تھری پیس سوٹ میں ہیں۔"

"سبحان اللہ... بیٹی کے غائب ہونے پر تیاری کا یہ عالم ہے۔" تیمور بولا تو روشا نے اسے گھورا۔

"صرف زبان چلاتے رہو گے یا کچھ کرو گے بھی؟"

"سب سے پہلے تو باقی لوگوں کا تعارف کراؤ۔"

اسی لمحے ان میں سے ایک شخص ان کی طرف مڑا تو روشا اس کی صورت دیکھ کر اچھل پڑی۔ "ضیا... یہ ضیا ہے۔"

تیمور نے اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ لیا تھا۔ باقی چار میں سے تین کے پاس کلاشنکوفیں تھیں۔ یقیناً وہ ضیا کے ساتھی تھے۔ تیمور نے سفید شرٹ والے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کون ہے؟"

"شاہ جہاں۔" روشا نے برا سا منہ بنایا۔ "لیکن یہ ضیا اس طرح مسلح آدمیوں کے ساتھ کیوں موجود ہے؟"

"بی بی! تم ذرا غور کرو۔ انہوں نے تمہارے والد بزرگوار کے ساتھ شاہ جہاں اور شامی کو ہینڈز اپ رکھا ہے۔"

"لیکن ان کے ہاتھ تو نیچے ہیں۔" اس نے اعتراض کیا۔

"ہینڈز اپ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تینوں گن پوائنٹ پر ہیں یعنی یہ تمہارا ضیا تیموری کوئی دو نمبر شخص ہے۔ اس کے ساتھیوں کو دیکھو، سارے چھٹے ہوئے بدمعاش نہیں لگ رہے ہیں؟"

"لگ تو رہے ہیں۔" روشا نے اعتراف کیا۔

"تو یہ ان کا باس ہے۔ یعنی ان سے بڑا بدمعاش ہے بس لگتا نہیں ہے۔"

"ذلیل، کمینہ، دھوکے باز۔" روشا اسے برا بھلا کہنے لگی اور تیمور سے مطالبہ کیا۔ "اسے گولی مار دو۔"

"سوری! صرف تمہاری خاطر میرا قاتل بننے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

اس دوران میں ضیا کے حکم پر اس کے آدمی شاہ جہاں کو گرا کر زنجیروں سے باندھ رہے تھے اور پھر انہوں نے اسے تالاب میں پھینک دیا۔ روشا کی چیخ نکل جاتی اگر اس نے منہ پر ہاتھ نہ رکھ لیا ہوتا پھر اس نے تیمور کو جھنجوڑا۔

"میرے خدا! یہ مر جائے گا، کچھ کرو۔"

"چلو اچھا ہے، تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔" تیمور آرام سے بولا ویسے وہ دیکھ چکا تھا کہ ضیا کے آدمیوں نے اس کے پاؤں میں ایک رسی بھی باندھی تھی یعنی وہ اسے ڈرا رہے تھے۔ فوری مارنا نہیں چاہتے تھے۔

"کیا مطلب... میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی موت چاہتی ہوں۔"

"اس کی تو نہیں، تم میری موت ضرور چاہتی ہو۔" تیمور بولا۔ "اسے بچانے کے چکر میں میں جان سے گزر جاؤں یہی چاہتی ہو نا تم؟"

"نہیں تو۔" روشا نے کہا۔

"ذرا دیکھو، وہ کیا کر رہے ہیں؟" تیمور نے کہا۔

اس کا اندازہ درست نکلا۔ ضیا کے آدمیوں نے شاہ جہاں کو واپس کھینچ لیا تھا۔ یہاں ان کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ تیمور نے روشا سے کہا۔ "تم یہیں رکو، میں آگے جا رہا ہوں۔"

روشا وہیں درخت تلے دبک گئی۔ تیمور درختوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھا اور ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے اسے ان کی گفتگو صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس وقت ضیا اور شاہ جہاں کے درمیان مکالمہ جاری تھا۔ جس سے ظاہر تھا کہ شاہ جہاں روشا سے شادی کا ارادہ کرنے پر پچھتا رہا ہے۔ مگر یہ پچھتاوا اس کے کسی کام نہیں آیا کیونکہ ضیا نے اسے ہاتھ پاؤں کھلوانے کے بعد تالاب میں پھنکوا دیا تھا اور اب وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ تیمور کا خیال تھا کہ روشا نے یہ سب نہیں سنا ہو گا اور وہ شاہ جہاں کے خیالات سے بے خبر رہی ہو گی لیکن جب وہ اس کے بالکل پاس سے بولی تو تیمور اچھل پڑا۔

"ذلیل آدمی... اس کے ساتھ بالکل ٹھیک ہوا ہے۔"

"اور ابھی جو تمہارے ساتھ ہوتا وہ بھی ٹھیک ہوتا۔" تیمور نے جھنا کر سرگوشی کی۔ "میں گولی چلانے والا تھا۔ تمہیں یہاں آنے سے منع کیا تھا۔"

"میں رہ نہیں سکی۔" اس نے اعتراف کیا۔ "اچھا ہوا، میں نے یہ سب اپنے کانوں سے سن لیا۔"

"مہربانی کر کے اب واپس جاؤ۔" تیمور نے کہا۔ "شاید یہاں ابھی گولیاں چلنے والی ہیں۔"

روشا کی یہ سن کر ہوائیاں اڑنے لگیں اور وہ تیزی سے جہاں سے آئی تھی، اسی طرف چلی گئی۔ شاہ جہاں اب بھی جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ تیمور دیکھ رہا تھا کہ ضیا کے دو ساتھیوں نے اپنی رائفلیں شانوں سے لٹکائی تھیں اور ان میں سے صرف ایک کے ہاتھ میں رائفل تھی جبکہ ضیا کے پاس پستول تھا۔ اس نے رائفل کو خودکار موڈ پر کیا اور ضیا اور اس کے ساتھیوں کے پاس زمین پر ایک ہلکا سا برسٹ مارا۔ فائرنگ کے ساتھ ہی سب اچھل پڑے۔ تیمور نے بلند آواز سے کہا۔

"خبردار... کوئی حرکت نہ کرے ورنہ اگلا برسٹ زمین پر نہیں آئے گا۔"

لیکن تیمور کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ضیا کے رائفل بدست ساتھی نے اس درخت کی طرف فائر کیا۔ خوش قسمتی سے اس کی رائفل سنگل موڈ پر تھی اور ایک ہی فائر ہوا۔ گولی تیمور سے کچھ فاصلے سے گزری اور اس نے بے اختیار جوابی برسٹ مارا۔ فائر کرنے والے کے پاؤں میں گولیاں لگیں اور اس کے ساتھ ضیا بھی زد میں آ گیا۔ دونوں نے فلک شگاف چیخیں ماریں اور زمین پر گر پڑے۔ یہ دیکھ کر ضیا کے باقی دو ساتھیوں نے بیک وقت اپنے ہتھیار پھینک دیے۔ چوتھا جسے شامی نے بے ہوش کیا تھا، پہلے ہی نہتا تھا اور اس کی رائفل تیمور کے پاس تھی۔ ضیا اور اس کا ساتھی اپنے زخموں کو رو رہے تھے۔ جیسے ہی باقی دو نے ہتھیار پھینکے، شامی حرکت میں آیا اور اس نے زخمی کی رائفل اٹھا لی اور ضیا کا پستول لات مار کر پروفیسر صاحب کے سامنے کر دیا جنہوں نے اسے اٹھا لیا۔ ایک منٹ کے اندر ضیا اور اس کے ساتھی نہتے ہو چکے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر شامی نے ہاتھ پاؤں مارتے شاہ جہاں کی طرف رسی پھینکی۔ شاہ جہاں نے رسی پکڑ لی اور شامی نے اسے باہر کھینچ لیا۔ وہ باہر نکل کر ایک طرف زمین پر پڑ گیا اور ہانپنے لگا۔

پروفیسر صاحب نے پستول کا رخ ضیا کی طرف کر دیا۔

"اب بولو، کیا خیال ہے؟ تمہارے سر میں سوراخ کر دوں۔"

"نہیں۔" اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ "پلیز! مجھے مت مارنا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" پروفیسر صاحب نے پستول ذرا نیچے کر لیا۔ پھر وہ شاہ جہاں کی طرف پلٹے۔ "تم گھٹیا شخص فوراً سے بیشتر یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ میں تمہیں ضرور گولی مار دوں گا۔"

"ایک منٹ پروفیسر صاحب۔" شامی نے مداخلت کی۔ "اتنی جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی اس سے

digestsofpakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ کام لینے ہیں۔"
"میں کچھ نہیں کروں گا۔" شاہ جہاں نے انکار کردیا۔
"تمہارے اچھے بھی کریں گے۔" شامی غرایا۔ "ورنہ تمہیں دوبارہ تالاب میں دھکا دے دوں گا۔"
یہ دھمکی سن کر وہ سیدھا ہوگیا۔ "وہ... میں نے انکار تو نہیں کیا ہے۔" وہ منمنایا۔ "کیا کام ہے؟"
"یہ رسی لو اور ان پانچوں کے ہاتھ اور پاؤں اسی طرح باندھو جس طرح انہوں نے تمہیں باندھا تھا۔"
شاہ جہاں نے بڑی خوشی سے یہ کام کیا اور ساتھ ہی وہ ان کو مار کر اپنا بدلہ بھی لیتا رہا۔ خاص طور سے اس نے ضیا کے پاؤں کا زخم کچھ اس طرح چھیڑا کہ وہ بلبلا کر اس کی مدح سرائی پر اتر آیا۔ جب ان لوگوں کی طرف سے اطمینان ہوگیا تو پروفیسر صاحب ان کی طرف متوجہ ہوئے۔
"برخوردار! تم دونوں کون ہو اور میری بچی کہاں ہے؟"
تیمور حیران ہوا۔ "آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ ہمارے ساتھ ہے؟"
"مجھے یقین ہے کہ وہ فارم کی طرف آئی ہوگی اور جب ان لوگوں کو دیکھا ہوگا تو وہ مدد لینے گئی ہوگی۔"
شامی نے سوچا اور بلند آواز سے کہا۔ "جی آپ نے بالکل ٹھیک سمجھا۔ ہم یہاں اپنے ایک دوست کے فارم ہاؤس میں مقیم ہیں۔ کل رات مس روشنا ہمارے فارم میں آگئیں اور ہم سے مدد طلب کی۔ اس آدمی کے ساتھیوں نے انہیں اغوا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ان کے چنگل سے نکل کر ہمارے فارم ہاؤس تک پہنچ گئیں۔"
"بکواس کرتا ہے یہ شخص۔ وہ میرے ساتھ بھاگ کر کورٹ میرج کرنے کے لیے گھر سے نکلی تھی۔" ضیا زہریلے لہجے میں بولا۔ "اب یہ اس کی حرکت چھپا رہا ہے۔"
"بکواس تم کررہے ہو۔" تیمور نے اس کے منہ پر ٹھوکر ماری تو ضیا سامنے کے دو دانتوں سے محروم ہوگیا۔ شامی نے افسوس سے گرنے والے دانتوں کو دیکھا۔
"یہ بے چارے دانت اس کی زبان کی وجہ سے باہر آئے ہیں۔" شامی نے تیمور کی طرف دیکھا۔ "ویسے مس روشنا کہاں ہیں؟"
"وہ میں نے انہیں پیچھے چھوڑ دیا تھا کیونکہ یہاں گولیاں چلنے کا خطرہ تھا۔" تیمور نے کہا اور بلند آواز سے بولا۔ "مس روشنا! تم کہاں ہو؟ یہاں آجاؤ، اب حالات قابو میں ہیں۔"

چند لمحے بعد روشنا پروفیسر صاحب کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتے رہے پھر ہاتھ سامنے کیے تو روشنا ان کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ "سوری بابا... آئی ایم ریئلی سوری۔"
"میری بچی۔" پروفیسر صاحب کی آواز ایک لمحے کو لڑکھڑا گئی لیکن انہوں نے فوراً اسے قابو میں کرلیا۔ شامی نے ان سے کہا۔
"جناب! ان باتوں کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ پہلے ان کا بندوبست کرنا ہے۔ یہ بتائیں آپ کے ملازمین کہاں ہیں؟"
"وہ بے چارے اسٹور روم میں قید ہیں۔ میں ان کو آزاد کراتا ہوں۔" پروفیسر صاحب نے کہا اور روشنا کے ہمراہ اندر چلے گئے۔ تیمور اور شامی نے ان کے ساتھ جانے سے گریز کیا۔ دونوں باپ بیٹی جذباتی ہورہے تھے اور بہتر تھا کہ وہ تنہائی میں بات کرلیتے۔ تیمور نے شامی سے کہا۔
"لو... یہاں تو دونوں امیدوار ایک ہی صف میں کھڑے ہیں۔"
"ایک جیسے کمینے اور گھٹیا۔" شامی نے تائید کی۔
"تم لوگوں کو دیکھ لوں گا۔" ضیا غرایا۔
"ضرور... اگر پولیس سے بچ جاؤ۔"
"پولیس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔" وہ بولا۔
"ممکن ہے تم پولیس والوں سے تعاون کرتے ہو لیکن آج برے پھنسے ہو۔" شامی نے کہا۔ "یہ تمہارے چمچے ہی تمہارے خلاف گواہی دیں گے۔"
شاہ جہاں خاموش تھا۔ وہ ایک عام آدمی تھا۔ اس نے کسی طرح پروفیسر صاحب کو اپنی شرافت کا یقین دلا کر اس رشتے پر آمادہ کرلیا لیکن اب یہ بات ختم ہوچکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ آج کے بعد پروفیسر صاحب اس کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کریں گے۔ کچھ دیر میں پروفیسر صاحب کے ملازمین اور باغات کے رکھوالے آگئے تھے اور وہ ضیا اور اس کے ساتھیوں کو اندر لے گئے۔ ان کو اندر بند کرنے کے بجائے لان میں ڈال دیا گیا تھا۔ بندھے ہونے اور پھر سر پر چار تگڑے بندے موجود ہونے کی وجہ سے ان کے بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شامی اور تیمور اندر تھے۔ شاہ جہاں کو بھی اندر بلا لیا گیا لیکن اسے الگ کمرے میں بٹھایا گیا۔ وہ دونوں پروفیسر صاحب کے ساتھ تھے اور روشنا کافی اور اسنیکس سے ان کی خاطر تواضع کررہی تھی۔
"میں لفظوں میں نہیں بیان کرسکتا کہ تم دونوں نے اس

گھر پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔" پروفیسر صاحب بولے۔
"نہیں جناب! ہم نے گھر پر تو کوئی احسان نہیں کیا۔" شامی بولا تو روشنا ہنس پڑی۔ پروفیسر صاحب نے دونوں کو گھورا۔
"یہ کیا بات ہوئی؟"
"بابا! آپ اسے جانتے نہیں ہے۔ یہ بہت اچھا لیکن بہت جوکی انسان ہے۔"
"اچھا... اچھا... روشنا بتا رہی تھی کہ تم کسی نواب خاندان سے ہو؟"
"بدقسمتی سے۔" شامی نے سرد آہ بھری۔
اس بار پروفیسر صاحب بھی مسکرائے۔ "بدقسمتی سے کیوں برخوردار؟"
"کیونکہ نواب زادے ہونے کے باوجود اپنے دادا جان کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔"
تیمور کو شامی کی باتوں سے کوفت ہورہی تھی لیکن جب وہ نواب صاحب کی طرف آیا تو وہ سمجھ گیا کہ شامی کا مقصد کیا ہے۔ اس نے اس کی تائید کی۔ "جی پروفیسر صاحب! اب اپنے معاملے کو ہی لیجیے، ہم نے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر مس روشنا اور آپ کی مدد کی لیکن اب بات پولیس تک جائے گی اور پھر دادا جان تک جائے گی۔ اس کے بعد آنے والا ایک سین کیسے گزرے گا، اس کا آپ یا کوئی اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ صرف ہم جانتے ہیں یا ہمارا خدا جانتا ہے۔"
پروفیسر صاحب بھی شاید سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے سر ہلایا۔ "تو تم چاہتے ہو کہ پولیس کے سامنے تمہیں اس معاملے میں ملوث نہ کیا جائے؟"
شامی خوش ہوکر بولا۔ "جی بالکل... ہم یہی کہنا چاہ رہے ہیں۔"
"یہ مشکل کام ہے۔" پروفیسر صاحب نے غور کرتے ہوئے کہا۔
"بالکل بھی مشکل نہیں ہے۔ دیکھیں، ڈاکو آئے اور انہوں نے نوکروں کو بند کرکے سب کو پکڑلیا۔ ابھی وہ لوٹ مار کررہے تھے کہ نوکروں نے کسی طرح سے خود کو آزاد کرلیا اور ایک ڈاکو کو قابو کرلیا۔ اس کی رائفل کی مدد سے انہوں نے دو ڈاکو زخمی کردیے اور باقی کو پکڑلیا۔ اس میں ہمارا یا شاہ جہاں کا کہیں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"
پروفیسر صاحب شامی کی بات سے متاثر ہوئے لیکن الجھے بھی نہیں۔ "اس کہانی میں جھول ہے۔"
"دیکھیں، غریب آدمی سچ بھی بولے گا تو پولیس اس میں جھول تلاش کرے گی لیکن آپ اگر غلط بیانی بھی کریں گے تو پولیس آپ کی بات مانے گی۔" تیمور نے عرض کیا تو پروفیسر صاحب متفق نظر آنے لگے۔
"ٹھیک ہے لیکن نوکروں کو یہ ساری کہانی تم نے یاد کرانی ہے۔"
"مارے گئے۔" شامی نے دل میں کہا۔
☆☆☆
نواب صاحب کرسی پر جھول رہے تھے اور شامی دست بستہ حاضر تھا۔ نواب صاحب نے اسے طلب کیا تھا۔ "جی دادا حضور! آپ نے یاد فرمایا ہے؟"
"ہاں برخوردار... کیا بات ہے، تم دونوں کی طرف سے خاصی خاموشی ہے؟"
"جی دادا جان! آج کل ہم کم بولنے کی مشق کررہے ہیں۔" شامی نے جواب دیا۔ "شادی کے بعد کام آئے گی۔"
"ہم اس خاموشی کی بات نہیں کررہے۔ آپ کی جانب سے کوئی ایسا کارنامہ سامنے نہیں آیا ہے جس میں ہمیں یا پولیس کو ملوث ہونا پڑے۔"
شامی کا دم خشک ہوگیا۔ اسے خیال آیا کہ شاید بات دادا جان تک پہنچ گئی ہے۔ اس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ "ہم نے ایسے سارے کام چھوڑ دیے ہیں۔"
نواب صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر آپ کہتے کہ آج کل ایسا کوئی معاملہ سامنے نہیں آیا تو ہم مان لیتے لیکن ہم یہ نہیں مان سکتے کہ آپ نے یہ سب چھوڑ دیا ہے۔"
شامی اب بھی ڈرا ہوا تھا۔ بہرحال کچھ دیر بعد اسے اندازہ ہوا کہ نواب صاحب فارغ تھے اس لیے اس سے تفریح لے رہے تھے۔ اس کے موبائل کی بیل بجی تو اس نے سکون کا سانس لیا اور نواب صاحب سے معذرت کرتا ہوا باہر آگیا۔ کال ایک اجنبی نمبر سے آرہی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔
"ہیلو۔"
"میں روشنا بات کررہی ہوں۔"
"زہے نصیب کہ آپ نے ہمیں یاد کیا؟" شامی نے طنز کیا۔
"تو کہاں سے یاد کرتی۔ تم دونوں نے جاتے وقت اپنا کوئی نمبر دیا تھا؟ یہ بھی میں بڑی مشکل سے تمہارے اس دوست سے لیا ہے جس کا یہاں فارم ہے۔ ایک نمبر کا لوفر ہے۔ نمبر دینے کے بجائے میرے چکر میں پڑ گیا تھا۔"
"قصور اس کا نہیں ہے، خود کو آئینے میں دیکھا ہے؟"
وہ ہنسی۔ "دیکھا ہے... یہ بتاؤ ملنے آسکتے ہو؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم یہاں آئی ہوئی ہو؟" شامی خوش ہوگیا۔

"ہاں... خاص طور سے تم دونوں سے ملنے آئی ہوں۔"

"تیمور تو ناک تک پڑھائی میں ڈوبا ہوا ہے۔" شامی نے جلدی سے بتایا۔

"اچھا تم تو آسکتے ہو؟" روشنا ذرا مایوس ہوئی۔ "یا تم بھی کہیں ناک تک ڈوبے ہوئے ہو؟"

"سر کے بل آؤں گا۔ تم کہاں ہو؟"

"میں دوست کے پاس رکی ہوں لیکن باہر ملیں گے۔"

ایک گھنٹے بعد شامی اور روشنا ایک ریسٹوران میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چھیڑ چھاڑ کے بعد شامی مطلب کی بات پر آیا۔

"اس دن ہمارے جانے کے بعد کیا ہوا تھا؟"

"ضیا تیموری کے ساتھ تو بہت برا ہوا۔ بھاگنے کا موقع آیا تو پہلے اس کے ساتھیوں نے اسے مارا۔ بابا نے ان کو کھوا کر اسٹور میں بند کر دیا تھا۔ پھر پولیس آئی اور اس نے ہمارے لان میں ان کی چھترول کی اور بہت مزہ آیا۔"

"ضیا نے ڈاکو ہونے کی تردید نہیں کی؟"

"نہیں کیونکہ بابا نے اس سے کہا تھا کہ دوسری صورت میں وہ اس کے خلاف ڈکیتی کے ساتھ اغوا کی ایف آئی آر بھی درج کرائیں گے۔ اس میں سزا کہیں زیادہ ہوتی ہے اس لیے اس نے اپنی زبان بند رکھی۔ پولیس اسے ساتھیوں سمیت لے گئی۔"

"پروفیسر صاحب نے خود ایف آئی آر درج کرائی ہے؟"

"بالکل... بابا خود گئے تھے اور انہوں نے ایک ڈی آئی جی سے بھی بات کی ہے اور کیس بابا کا وکیل بھی دیکھے گا۔ یوں سمجھو کہ وہ دس بارہ سال کے لیے جیل گئے ہیں اور ممکن ہے پولیس مزید کیس ڈال دے۔"

"یہ ضیا تیموری کا پس منظر کیا ہے؟"

"پڑھا لکھا ہے لیکن جرائم میں پڑ گیا۔ اپنا گینگ بنا کر ڈاکے مارنے لگا اور فراڈ بھی کرتا تھا۔ میری صورت میں اسے ایک اچھا کورٹ مل سکتا تھا اور میری دولت پر عیش الگ کرتا۔"

"یعنی وہ بلڈر نہیں ہے؟"

"اسے بلڈر کی اسپیلنگ بھی نہیں آتی۔" روشنا نے منہ بنایا۔

"اس پر بھی تم اس کی خاطر آدھی رات کو گھر سے نکل گئی تھیں؟" شامی نے ملامت کی۔

"اب تم بابا مت بنو۔" روشنا نے اسے گھورا۔

"معاف کرنے کے باوجود انہوں نے مجھے بہت سنائی ہے۔"

"میرا بھی یہی اندازہ تھا۔ پروفیسر صاحب مجھے داوا جان کے قبیل کے لگے تھے۔" شامی نے سر ہلایا۔ "ہمارے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟"

روشنا شرارت سے مسکرائی۔ "شاہ جہاں منحوس کا معاملہ تو ختم ہو گیا اور بابا تم دونوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔"

"باپ رے۔" شامی گڑبڑا گیا۔ "تم نے بتایا کہ صرف دوست ہیں ہم؟"

"بتایا تھا لیکن بابا نے غالباً یقین نہیں کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ آج کل کے نوجوان اتنے احمق نہیں ہوتے کہ بلاغرض کسی کی مدد کریں۔"

"ہم احمق ہیں۔" شامی نے اسے یقین دلایا۔ "کم سے کم تمہیں تو پتا ہوگا۔"

"ہاں، مجھے پتا چل گیا ہے۔" روشنا مسکرائی۔ "ویسے تم کسی کو پسند کرتے ہو نا؟"

"ہاں۔" شامی نے اقرار جرم کرنے کے انداز میں کہا۔

"کون ہے؟"

"ہے ایک بلائے جان... کبھی ملواؤں گا، جب اس سے لڑائی کرنی ہوگی۔"

"وہ جیلس ہے؟"

"کون لڑکی نہیں ہوتی" شامی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "جو نہیں ہوتی، وہ پھر لڑکی یا عورت نہیں ہوتی۔ اگر وہ اس وقت مجھے یہاں دیکھ لے تو سمجھو میری کم بختی ہے۔"

اسی لمحے شامی کی نظر کاؤنٹر کے پاس موجود نوشی پر گئی۔ وہ نہ جانے کب سے وہاں کھڑی کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی شامی کی نظر اس پر گئی، وہ مڑی اور باہر چلی گئی۔ شامی دنگ رہ گیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے الفاظ اتنی جلدی عملی روپ اختیار کر جائیں گے۔ اسے دم بخود دیکھ کر روشنا نے کہا۔ "کیا بات ہے، کہاں کھو گئے؟ کیا خیال میں موصوفہ کے پاس پہنچ گئے؟"

شامی نے چونک کر بے چارگی سے اسے دیکھا۔ "نہیں، موصوفہ سچ مچ یہاں آگئی تھیں اور ابھی مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کر گئی ہیں۔ اللہ میرے حال پر رحم کرے۔"

روشنا زور سے ہنسی تو سارا ریسٹوران چونک کر اسے دیکھنے لگا اور شامی منہ بنائے بیٹھا تھا۔

Digest of Pakistan
digestpk.blogspot.com
Courtesy www.pdfbooksfree.pk